PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
Aik Rabta Apnon Sey

عمران ڈائجسٹ

محمود ریاض
عامر محمود
محمد شفیع

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

سالگرہ نمبر

باتیں آپ سے — 10
قارئین کے محبت نامے گزشتہ شمارے پر تبصرہ، اپنی پسند...... چاہتیں، مدیر کے نام......!
مدیر

مغل اعظم — 12
تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص، مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان
اسلم راہی

آتش زادہ — 100
ایک ایسے نوجوان کی داستان جو ننھی سی عمر میں دشمنوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ پُرتجسس سلسلہ
تیمور افراسیاب

خوئے سگاں — 50
ہمارے معاشرے کی بے حسی کی ایک جھلک، ایک منفرد داستان۔ ملک کے بااختیار طبقے کی عکاس تحریر
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انجام — 126
مجھے احساس ہے کہ تم نے مجھ پر بہت رقم خرچ کی ہے۔ تم نے شادی کے بعد مجھ پر تحائف کی بھرمار کردی تھی......!!
حسن علی

آسیبی فساد — 70
اس کا ذہن ان کتابوں کی طرف گیا، جو علم البشریات پہ تھیں۔ اس شمارے کی ایک پراسرار تحریر
احمد صغیر صدیقی

یقین — 130
اسے وہ لفافہ ان کے حوالے کرنا تھا اور پھر اس کا کام ختم ہوجاتا۔ اسے اپنے کام کی اجرت مل چکی تھی۔
عمران منظور

دامِ گُل — 83
پچاس برس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ ایک تندرست، توانا اور چاق و چوبند شخص تھا۔ غیر متوقع انجام کی کہانی
ایم الیاس

انعام — 137
آرام اس کے لیے دوزخ تھا۔ کچھ نہ کچھ ہمیشہ کرتی ہی رہتی۔ جب ہاتھ میں کچھ کام باقی نہ رہا تو وہ اندر آئی......!
انجم شہزاد

بیوی پرست — 96
آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح ہماری ازدواجی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے......!
روشن آرا

انوکھا قدم — 142
ہوٹل کلرک نے اسے بتایا تھا کہ جوزف نام کا کوئی شخص ان کے ہوٹل میں قیام پذیر نہیں ہے۔ معصوم عورت کا ماجرا
طارق حفیظ

❖ اپریل 2007ء ❖ قیمت 30 روپے ❖ جلد 36 ❖ شمارہ 12

حادثہ — 149
اگر کوئی ان کاموں کا عادی نہ ہوتو یہ سیڑھیاں اس کے لیے خطرناک ہوسکتی ہے۔ ایک منفرد انجام کی تحریر
اویس احمد

چوہے — 198
اسے معلوم ہوتا تو شاید وہ آہستہ آہستہ سیکھتا اور کبھی اپنے علم کو مکمل نہ ہونے دیتا......! ایک فکر انگیز تحریر
احمد جاوید

بدلہ — 159
نیم اندھیرے کمرے میں بھی مجھے اچانک ان کے خوف کا اندازہ ہوگیا۔ اس شمارے کی ایک منفرد انجام کی تحریر
ابن سعید

شہ زور — 202
ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی......!!
آغا دلاور

عقاب — 162
تجسس انسانی سرشت میں داخل ہے۔ حالات کی گود میں پل کر جوان ہونے والے ایک آتش صفت کی سرگزشت
ایم اے راحت

درد کے بعد — 206
میں ابھی گھر واپس آئی، اور آتے ہی میں نے کیسٹ ریکاڈر میں کیسٹ لگایا کہ سنوں اس میں کیا ہے کہ......!!
صائمہ کاردار

توتا کہانی — 188
ایک حسینہ کا قصہ وہ آئینے سے مطمئن نہ تھی......اس کو مطمئن کرنے کے لیے ایک پرندے نے اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا۔
ڈاکٹر سلیم اختر

احساس کی زنجیر — 219
خط پڑھ کر میں تڑپ اٹھی۔ فرحان نے کس انداز میں مجھے جھنجھوڑا تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔
نوازش شاہین

تکیہ اور غلاف — 195
چند جملوں اور چند اشاروں میں وہ سب کچھ بیان کر دیا جو میں ایک طویل دورانیہ میں پیش کرتی ہوں۔
نسیم سترکھی

انتظار — 238
پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک فالج زدہ اپاہج جسم میں تبدیل ہوگیا، دبلے پتلے گال، پچکی ہوئی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔
کبیر احمد صدیقی

یادش بخیر — 248
اس کا ذہن اس سے مطمئن نہ ہوا کیونکہ اس کے اردگرد دنیا ابھی اتنی نہیں بدلی تھی اور......!! خاص کہانی
ایم اے راحت

ا ا ،، ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار، کراچی

باتیں آپ سے

مدیر

قارئین محترم .... سلام مسنون!

کچھ باتیں اور یادیں انسانی ذہن کے نہاں خانوں میں اس طرح اپنی جگہ بناتی ہیں کہ انمٹ ہو جاتی ہیں۔ انسانی ذہن لامحدود صلاحیتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود بہر حال ایک حد رکھتا ہے۔ ہاں اس کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وقت انسانی کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ صحیح استاد وقت ہے جو انسان کو معاشرے میں جینے کی ڈھنگ سے واقف کراتا ہے۔ کراچی کی فضاؤں میں بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی انتظامی تبدیلی بھی ہے۔ ایک عرصے کے بعد بلدیاتی اداروں کی کارکردگی اس شہر پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے، یہ تو کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ سڑکیں، گلیاں، نالے ہنوز پہلے کی سی حالت میں موجود ہیں۔ عمران ڈائجسٹ میں کی جانے والی تبدیلیوں نے قارئین پر نہایت ہی خوشگوار اثرات ڈالے ہیں، جس کا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے۔ اس ماہ عمران ڈائجسٹ کی سالگرہ ہے، جس میں دیس بدیس کی کہانیوں کے علاوہ سچی داستانوں سے انتخاب، اردو ادب کا شاہکار اور اردو ادب کی خوشبو، اردو ادب سے انتخاب کے علاوہ آپ کے مزاج اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ملکی اور غیر ملکی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ آخری صفحات پر ایک طویل ناول بھی موجود ہے۔ اس شمارے پر آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

اب آیئے اپنے خطوط کی جانب جو تبصرے کے لیے منتظر ہیں

☆ لاہور سے شوکت علی لکھتے ہیں کہ مارچ کا عمران ڈائجسٹ ملا۔ اس شمارے کا ٹائیٹل گزشتہ تمام شماروں سے جاندار ثابت ہوا۔ ورق پلٹنے کے بعد جب فہرست کے صفحے پر نظریں دوڑائیں تو ایک خوشگوار سی حیرت کا احساس ہوا۔ اس انداز کی فہرست اب بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ فہرست کا انداز دل کو لبھانے والا تھا۔ ''باتیں آپ سے'' کا انداز بھی بدلا بدلا سا تھا۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جو اپنے اندر کشش رکھتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے ہمارے معاشرے کی بے حسی کی ایک جھلک ''خوئے سگاں'' کے ذریعے دکھائی۔ اس کی قسط پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں۔ ایک معصوم نوجوان نے اس معاشرے کی بری طاقتوں کے خلاف کس طرح جنگ کی اور آخر میں اس کا کیا انجام ہوگا، اس کا انتظار ہے۔ اس کہانی نے اپنے آغاز سے ہی ہمیں متاثر کیا ہے۔ ایسی کہانیاں بہت خال خال ہی لکھی جاتی ہیں۔ اتنی اچھی تحریر پر میری جانب سے ادارہ عمران ڈائجسٹ اور مصنف دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دیگر کہانیوں میں احمد صغیر صدیقی کی ''ٹرک'' ایم الیاس کی ''کنول'' کرن نورین کی ''مکان'' ایس اے ہاشمی کی ''موت کا مُصَوِّر'' حسن علی کی ''کمزور خانہ'' روشن آرا کی خوبصورت تحریر ''بے حرمتی'' اردو ادب سے انتخاب میں سرور عالم راز کی ''توکلت علی اللہ'' گلزار فاطمہ کی ''آخری بس'' ش صغیر ادیب کی ''یا'' اخلاق احمد کی ایک حساس و دل گداز کہانی ''دھند کا مُسافر'' حسن منظر کی ''رہ رسم و ثواب'' مرزا حیدر عباس کی ''فنکار'' ایم بی فیصل کی ''احساس'' کے علاوہ اردو ادب سے انتخاب اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کا طویل ناول ''نہ جان تم نے جاناں!'' بہت ہی اچھا تھا۔ کہانی کی ہر سطر نے ہمیں جکڑ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے ایک ہی نشست سے ختم کر ڈالا۔ مجموعی طور پر مارچ کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس شمارے سے عمران ڈائجسٹ نے اپنے جس نئے سفر کا آغاز کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔

❀ برادرم شوکت علی! آپ کا بھرپور اور جاندار تبصرہ ملا۔ آپ نے نئے سیٹ اپ کو [illegible] اس کے لیے ہم آپ کے مشکور ہیں۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہم نت نئی تبدیلیاں کرتے [illegible] مقصد عمران پر قائم جمود کو توڑنا ہے۔ دوسرے قارئین کو بھی نت نئی تبدیلیاں پسند آتی ہیں۔ [illegible] بھرپور تبصرے سے نوازیں

گے۔شکریہ۔

☆ ڈاکٹر احمد حسین' کراچی سے اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں کہ مارچ کا شمارہ بروقت مل گیا تھا لیکن نجی مصروفیات کی وجہ سے پڑھنے اور دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ چھٹی کے روز دوپہر کے وقت تمام کاموں سے فارغ ہوکر عمران اٹھایا' اس کے ابتدائی صفحات پلٹے تو ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ عمران ڈائجسٹ کے نئے سیٹ اپ کا سحر تھا جس نے فوری طور پر اثر ڈالا تھا۔ پھر تو صفحات پر صفحات پلٹتا چلا گیا۔ پہلے پورا شمارہ دیکھا۔ اس کے بعد پڑھنا شروع کیا۔ ابتدائی صفحات پر عبدالرب بھٹی صاحب نظر آئے۔ ایسی شاندار تحریر پر مصنف کے ساتھ عمران ڈائجسٹ بھی مبارکباد کا مستحق ہے۔ اس ماہ احمد صغیر صدیقی کی ''ٹرک'' ایم الیاس کی ''کنول'' کرن نورین کی ''مکان'' ایس اے ہاشمی کی ''موت کا مُصَوِر'' حسن علی کی ''کمزور خانہ'' روشن آرا کی خوبصورت تحریر ''بے حرمتی'' اردو ادب سے انتخاب میں سرور عالم راز کی ''توکلت علی اللہ'' گلزار فاطمہ کی ''آخری بس'' ش صغیر ادیب کی ''یا'' اخلاق احمد کی ایک حساس و دل گداز کہانی ''دُھند کا مُسافر'' حسن منظر کی ''رہ رسم و ثواب'' مرزا حیدر عباس کی ''فنکار'' ایم بی فیصل کی ''احساس'' کے علاوہ سچی داستانیں میں رضوان احمد کی ''پیار نبھاؤں گی'' سلیم ناصر کی ''معجزہ'' ہما صفدر کی ''ندامت'' اور آخری صفحات پر طویل ناول ''نہ جان تم نے جاناں'' بھی بہت اچھا تھا۔ اسی طرح کے ناولوں کا انتخاب کیا کریں۔ عمران ڈائجسٹ کی تبدیلیاں پہلے بھی ہمیں پسند آتی رہی ہیں' لیکن یہ تبدیلی ہمیں زیادہ اچھی لگی۔ میری جانب سے ادارہ کے اراکین کو مبارکباد پہنچا دیں۔

محترم ڈاکٹر احمد حسین صاحب! آپ نے اپنے قیمتی وقت سے عمران کے لیے وقت نکالا۔ اول تو ہمارے لیے یہی ایک اعزاز کی بات ہے۔ پرچے کی مجموعی طور پر پسندیدگی کا شکریہ۔ ہم آپ کے بھرپور تبصرے پہ آپ کے مشکور ہیں۔ آپ کی مبارکباد تمام اراکین تک پہنچا دی گئی ہے۔

☆ ڈاکٹر سید علی اظہر صاحب نے جھنگ سے عمران کے لیے چند کہانیاں ارسال کی ہیں۔ آپ کے لیے اطلاع ہے کہ آپ کی کہانیاں اچھی ہیں اور ہم نے ان میں سے چند کہانیاں منتخب کرلی ہیں۔ آپ انہیں عمران کے آئندہ شماروں میں ملاحظہ کرسکیں گے۔ امید ہے کہ آئندہ عمران پر اپنی رائے سے بھی ضرور نوازیں گے۔

☆ عزیز الدین بدر نے بہاولنگر سے عمران ڈائجسٹ پر تبصرہ کیا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ عمران مارچ کا شمارہ اسٹال پر دیکھتے ہی حاصل کیا اور سیدھا گھر کا رخ کیا۔ میں پیشہ تعلیم سے وابستہ ہوں اور شام کے اوقات میں پڑھنے کے لیے اکثر وقت مل جاتا ہے۔ عمران ڈائجسٹ کی نئی تبدیلیاں اپنے اندر بے حد کشش رکھتی ہیں۔ خاص طور پر اس ماہ سے کی گئی تبدیلیاں تو ایسی ہیں جیسے عمران نے نیا جنم لیا ہو۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی 'خوئے سگاں' پڑھنی شروع کی' اس کہانی نے شروع سے ہی متاثر کیا تھا۔ اس کا انجام بھی اتنا ہی متاثر کن ثابت ہوا۔ اس ماہ کی متاثر کن کہانیوں میں ''ٹرک' کنول' مکان' موت کا مصور' کمزور خانہ' بے حرمتی' اردو ادب سے انتخاب میں ''توکلت علی اللہ' آخری بس' یا' دُھند کا مُسافر' رہ رسم و ثواب' فنکار' احساس'' کے علاوہ سچی داستانیں میں رضوان احمد کی ''پیار نبھاؤں گی'' سلیم ناصر کی ''معجزہ'' ہما صفدر کی ''ندامت'' اور ایم اے راحت کا طویل ناول ''نہ جان تم نے جاناں!'' بہت اچھی تھیں۔ اس ماہ کا ٹائٹل بھی جاندار تھا۔ مجموعی طور پر مارچ کا شمارہ ایک یادگار شمارہ تھا۔ اس سلسلے میں آپ کی محنت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

محترم عزیز الدین! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ پرچے میں کی گئی تبدیلیاں آپ کو پسند آتی ہیں۔ اس کے لیے' ہم آپ قارئین کے مشکور ہیں۔ کہانیوں کے انتخاب میں ہم قارئین کی پسند کو اولیت دیتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی یاد رکھیں گے۔

قارئین! یہ تھے آپ کے محبت نامے......اب اگلے ماہ تک کے لیے اجازت دیں۔ مدیر

مغل اعظم

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں' اس کا اہم سبب جہاں اختیارات' اقتدار اور دولت رہی ہے' وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم' ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا' وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے..... شیطان صفت لوگوں نے کس کس انداز سے مسلمانوں کو کمزور کیا اور اس کے دور رس نتائج کیا برآمد ہوئے..... یہ تاریخی حقائق ہیں' جنہیں آپ کے لیے زیب داستان کیا ہے معروف قلم کار اسلم راہی نے..... پڑھیے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال ۔ تاریخی حقائق ۔ طویل داستان

علی قلی شیبانی اور عبداللہ خان ازبک اپنے دیگر سالاروں کے ساتھ اس لشکر کو لے کر پانی پت کے میدانوں کی طرف بڑھے جو ان کے ماتحت تھا اور جو مقدمہ الجیش کہلاتا تھا۔ دوسری طرف ہیمو بقال کو یہ تو خبر ہو چکی تھی کہ اکبر کے مقدمہ الجیش نے اس کے ہراول لشکر کو بدترین شکست دی ہے۔ لہٰذا اس شکست کا انتقام لینے کے لیے اس نے اپنی تیاریاں پہلے ہی کر رکھی تھیں اور جب اس کے مخبروں نے خبر دی کہ اکبر کا مقدمہ الجیش اس کے ہراول لشکر کو بدترین شکست دینے کے بعد پانی پت کے میدان کی طرف بڑھا ہے اور وہاں اس نے پڑاؤ کیا ہے' تب ہیمو بقال کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

اس لیے کہ ہیمو بقال کا مخبروں نے اسے یہ بھی اطلاع کر دی تھی کہ پانی پت کے میدان میں اکبر کے صرف مقدمہ الجیش نے پڑاؤ کیا ہے جبکہ باقی ماندہ مغل لشکر اکبر اور بیرم خان کی سرکردگی میں ابھی پانی پت سے کافی دور ہے۔

مخبروں کی لائی ہوئی یہ خبریں ہیمو بقال کے لیے بڑی حوصلہ افزا تھیں۔ لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اکبر اور بیرم خان کے پورے لشکر کے ساتھ پانی پت کے میدانوں میں پہنچنے سے پہلے وہ پانی پت پہنچے اور اکبر کے مقدمہ الجیش پر حملہ آور ہو کر نہ صرف اپنے ہراول لشکر کی تباہی و بربادی اور شکست کا انتقام لے بلکہ اکبر اور بیرم خان کے پانی پت پہنچنے سے پہلے ہی وہ ان کے مقدمہ الجیش کا خاتمہ کر دے اور پھر اکبر اور بیرم خان پر کاری ضرب لگانے کے لیے تیار اور مستعد ہو جائے۔

یہ سوچتے ہوئے ہیمو بقال نے بھی بڑی برق رفتاری سے پانی پت کے میدانوں کا رخ کیا تھا۔

پانی پت کے وسیع میدان بھی تھے' جہاں اکثر و بیشتر مختلف لشکر ٹکراتے رہے تھے جبکہ پانی پت نام کا قصبہ بھی تھا۔ یہ ہندوستان کے ضلع کرنال کی ایک قصبہ اور اسی نام کی تحصیل دریائے جمنا کے کنارے تھی۔ یہ قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کی تاریخ مہابھارت کے زمانے سے پہلے کی ہے۔

پانڈوؤں اور کوروں کی جنگ میں جو میدان مقابلے کے لیے منتخب کیا گیا تھا' وہ اپنی پت کا ہی میدان تھا۔ بقول سرسید احمد خان دہلی کے راجہ ڈنڈ پانی نے پانی پت بسایا اور اس نے سات سو سات قبل مسیح سے چھ سو اکیانوے قبل مسیح تک ان علاقوں میں حکومت کی۔

مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ پانی پت کی قدیم آبادی ویران ہو گئی ہو اور عمارت تباہ و برباد ہو گئی ہو اور بعد میں راجہ ڈنڈ پانی نے اسے از سر نو آباد کیا ہو۔

بعد کے زمانے میں راجہ ارجن نے شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان قلعہ بنایا اور شہر کے چاروں طرف مضبوط فصیل تیار کرائی جس کے اندر پندرہ دروازے تھے۔ آج کل قلعہ ایک ٹیلے کی شکل اختیار کر چکا ہے جو کافی وسیع ہے۔

پانی پت کے یہ میدان ہمیشہ شمالی مغربی دوروں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے والوں کی جولان گاہ بنے رہے تھے۔ وسط ایشیا سے نمودار ہونے والی مختلف اقوام مغربی دوروں سے ہوتی ہوئی پندرہ سو قبل مسیح سے چار سو قبل مسیح تک انہیں میدانوں میں فیصلہ کن جنگ کرتی رہیں۔

آخر سن ایک ہزار ایک اور ہجری چار سو دو میں سلطان محمود غزنوی نے پانی پت اور تھانیسر پر حملہ کیا۔ سلطان محمود غزنوی کی واپسی پر ہندو راجہ دربارہ اس علاقے پر قابض ہو گیا تھا۔

اس کے بعد سن دس سو تیس اور ہجری چار سو اکیس میں محمود غزنوی کے لڑکے مسعود نے دوبارہ اس علاقے پر قبضہ کیا لیکن حالات کے تغیر نے پھر کروٹ لی اور سن دس سو تینتالیس اور ہجری چار سو چونتیس میں پانی پت پر دوبارہ ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔

اس زمانے میں عرب شام ایران اور عراق سے مسلمانوں کے مختلف خاندان ہندوستان کے مختلف شہروں میں آ رہے تھے تو پانی پت اپنی بہتر آب ہوا

...ان لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اب ... یہ مقام اہل علم ہنر کا مرکز بھی رہا۔ پانی ... کا زمانہ خاص طور پر وہ تھا جب بوعلی ... یہاں ... سلوک اور روحانیت کا درس دیتے ... چنانچہ اس وقت پانی پت ہندوستان کے منتخب ...لوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کہتے ہیں اس زمانے میں پانی پت میں سات سو علماء اور فضلاء موجود تھے۔

پانی پت کی سیاسی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلم ... یہاں پر ہمیشہ قوموں، سلطنتوں اور اور حکومتوں ... فیصلے ہوتے رہے۔ مثلاً سن پندرہ سو انتیس یعنی ... نو سو بتیس میں بابر نے اس میدان میں ابراہیم ... کو فیصلہ کن اور بدترین شکست دی اور اب سن ... سو چھپن اور ہجری نو سو چھیالیس کو اکبر کا مقدمہ ...ش اور ہیمو بقال کے لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

اس کے بعد سن سترہ سو اڑسٹھ اور ہجری گیارہ سو ... میں پانی پت کا انہیں میدانوں کے اندر مسلمانوں کے اجل عظیم احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو بدترین شکست دی تھی۔ شہر کی سیاسی اہمیت کی وجہ سے اس کا محل وقوع تھا کیونکہ شمالی مغربی دوروں سے جو ...حملہ آور ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی پر حملہ کرتا تھا پانی پت اس کے راستے میں آتا تھا۔ نو ستمبر ...ن اٹھارہ سو تین میں پانی پت انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اٹھارہ سو چوبیس میں پانی پت کو ضلع بنا دیا گیا۔ کرنال اور سونی پت اس کی تحصیلیں قرار پائی تھیں۔

بہر حال اکبر اور بیرم خان کا مقدمہ الجیش اور ہیمو بقال کا جرار لشکر پانی پت کے میدان میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے۔ ہیمو بقال بہت جلد اس جنگ کو نبٹانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اکبر اور بیرم خان کے پانی پت کے میدانوں میں پہنچنے سے پہلے وہ ان کے مقدمہ الجیش کو شکست دے کر میدان جنگ کو اپنے حق میں صاف کرے۔

اپنے انہی ارادوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہیمو بقال اپنے لشکر کو کالی راتوں کے دروازے پر دستک دیتی بدبختی کے تیز جھکڑوں کی طرح حرکت میں لایا پھر اس نے گمنامیوں کے لیے انت اندھیروں میں ظلم اور ظلمات کے بھنور کھڑے کرنے' ذلت وخواری کے جوار بھاٹے اور زندگی کا لہو نچوڑتے دلوں کی راحت اور آسودگی چھیننے' بے پناہ منافع اذیتوں کی طرح علی قلی خان اور عبداللہ خان کے لشکر پر یلغار کر دی تھی۔

دوسری طرف علی قلی خان اور عبداللہ خان نے بھی اکبر اور بیرم خان کے آنے کا انتظار نہ کیا جب ہیمو بقال زن کے سامنے آ گیا تو وہ سمجھ گئے تھے کہ ہیمو بقال فی الفور جنگ کی ابتداء کرنا چاہتا ہے۔

چنانچہ جوابی کارروائی کرتے ہوئے ان دونوں نے بھی لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے لشکر کو فنا کے گھاٹ اتارتی موت اور مرگ کے سایوں کی طرح آگے بڑھایا پھر علی قلی خان اور عبداللہ خان دونوں ہیمو بقال ہی کی طرح اپنی جوابی کارروائی کی ابتداء کرتے ہوئے چہروں کے عکس کو شکستہ کر دینے والی عداوتوں کی چلچلاتی دھوپ' بے ثباتی بے قراری اور شکستوں کا غبار طاری کرتے آسمان سے برستے آتشی رولوں اور کارگاہ زیست کے خرمنوں پر گرتی کڑکتی گونجتی برق کی طرح حملہ آور ہو گئے تھے۔

پانی پت کے میدان جنگ میں چمکتی تلواروں' لچک دار نیزوں' برستی ڈھالوں' سنسناتے تیروں' ذوق کے جنگ آوال اور خوفناک نعروں کے سایوں میں نفس کی ذلت آمیز ہواؤں کی آہ زاریوں' انسانی نالوں اور ماتم کا ایک ہیجان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

شروع شروع ہیمو بقال نے علی قلی خان اور عبداللہ خان کے لشکر پر اندھی عفریت وحشتوں کے رقص اور زہریلی آتش فشانی کی طرح تیز حملے شروع کیے تھے' وہ بہت جلد علی قلی خان اور عبداللہ خان دونوں کو شکست دے کر مار بھگانا چاہتا تھا لیکن جب انتہائی خوفناک انداز میں علی قلی خان اور عبداللہ خان نے اپنی جوابی کارروائی کی تو ان کے حملوں کی سختی اور شدت کو دیکھتے ہوئے ہیمو بقال کو دن کے وقت بھی

تارے نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہیمو بقال تو اس کوشش میں تھا کہ اکبر اور بیرم خان کے باقی لشکر کے ساتھ پہنچنے سے پہلے وہ اس کے مقدمہ الجیش سے نبٹ لے اور پھر مطمئن انداز میں اکبر اور بیرم خان سے نبٹے لیکن یہاں تو ان کا مقدمہ الجیش اس کے لیے مصیبت اور جان نہ چھوڑنے والا مبل ثابت ہو رہا تھا۔ ہیمو بقال جس قدر اس ٹکراؤ کو نبٹانے کی کوشش کر رہا تھا' اسی قدر وہ توالت کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ آخر کار جنگ کو جلد اپنے انجام تک پہنچانے کے لیے ہیمو بقال اپنے لشکر کے ہزاروں ہاتھیوں کو حرکت میں لایا تاکہ زن کے ذریعے مغلوں کے لشکر کے انداز ایک ہلچل بدنظمی اور افراتفری پیدا کر کے اپنی کامیابی کو آخری شکل دے لیکن یہاں بھی اس کے لیے مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی۔

جس وقت اسنے اپنے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا' اس وقت وہ خود بھی ہوائی نام کے ایک بڑے سرکش توانا ہاتھی پر سوار تھا لیکن ہیمو بقال کی بدقسمتی کہ سامنے کی طرف سے علی قلی خان اور عبداللہ خان کے تیر اندازوں نے ایسی تیر اندازی کی کہ ہاتھیوں کے مہاوتوں کے علاوہ ہاتھیوں کی اوٹ میں اس کے جو لشکری پیش قدمی کر رہے تھے' ان سب کو ان تیروں نے چھید کر رکھ دیا تھا۔ ہیمو بقال کو یقین تھا کہ مغلوں کا لشکر ان ہاتھیوں کی وجہ سے تتر بتر ہو جائے گا اور ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔ لہٰذا وہ خود بھی ہاتھیوں کے اس لشکر میں آگے بڑھ آیا تھا۔ اس موقع پر مغلوں کے کسی لشکری نے چلا کر ہیمو بقال کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔

''یہی ہیمو بقال ہے۔''

یہ الفاظ آصف خان اور اس کے ساتھ ہی جنگ میں تیر اندازی کرنے والے اس کے چھوٹے بھائی عادل خان نے بھی سن لیے تھے۔ ان الفاظ کو سن کر عادل خان کے چہرے پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ اپنے لشکر کی اگلی صفوں کے کچھ پیچھے تھا' اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک کمان اور پیٹھ پر تیروں بھرا ترکش تھا۔ گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھے نیام میں تلوار بھی تھی۔ اس موقع پر عادل خان نے نجانے کیا سوچتے ہوئے وہ کمان جو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی' گھوڑے کی زین کے ہتے سے لٹکا دی اور ایک طرف بندھی ہوئی کافی بڑی کمان سنبھالی۔ اس کی پیٹھ پر جو ترکش تھی' اس میں دو طرح کے تیر تھے۔ ایک کافی بڑے اور لمبے اور کچھ چھوٹے ان لمبے اور کڑے تیروں میں سے ایک تیر اس نے لیا۔ بڑی کمان کو اپنے بائیں گھٹنے میں رکھ کر اسے استوار کیا۔ بڑا اور کڑا تیر اس نے کمان پر چڑھایا۔ شست لی' سانس کو روکا۔ اس کے بعد اس نے جب تیر چلایا تو اس کا وہ تیر ہیمو بقال کی آنکھ میں پیوست ہوتا ہوا اس کے سر کی پچھلی سمت نکل گیا تھا۔

یہ صورت حال ہیمو بقال اور اس کے لشکریوں کے لیے بڑی اندیشہ ناک تھی۔ اس وقت تک دوسرے تیر اندازوں نے ہاتھیوں کے مہاوتوں اور ان کی اوٹ میں آنے والے لشکریوں کو کیونکہ چھلنی کر دیا تھا' لہٰذا جب سنسناتا ہوا تیر ہیمو بقال کی آنکھ سے ہوتا ہوا سر کے پچھلی سمت نکل گیا اور ہیمو بقال درد کی شدت کا اظہار کرنے لگا' تب اس کے لشکریوں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ ہیمو بقال کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے اور اس کی حالت بری ہے۔ لہٰذا انہوں نے بدحواس آنکھ اور بدحالی کا شکار ہوتی ہوئی جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

مورخین تفصیل کے ساتھ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہیمو بقال کی آنکھ میں جو تیر لگا' وہ اس کے سر کے پشتی حصے سے نکل گیا تھا جس وقت ہیمو بقال اپنے لشکریوں کی بدحالی کو دیکھ رہا تھا اور اس کے لشکری جنگ سے منہ موڑ کر بھاگ رہے تھے' اس موقع پر اس نے اپنے مہاوت کو حکم دیا کہ وہ بھی ہاتھی کو پھیرے اور بھاگ کھڑا ہو۔ چنانچہ جس وقت مہاوت ہاتھی کو موڑ رہا تھا' اس وقت تک کچھ مغل لشکری اس تک پہنچ گئے۔ ایک مغل لشکری اپنے گھوڑے سے جست لگا کر ہاتھی پر چڑھ دوڑا تھا۔

مہاوت کو اس نے گرا دیا اور ہیمو بقال کو اس نے گرفتار کرلیا۔

ہیمو بقال کے وہ لشکری جو میدان جنگ سے بھاگ گئے' انہوں نے دہلی کا رخ نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ پانی پت کے میدانوں میں تو ان کا ٹکراؤ صرف اکبر کے مقدمہ الجیش سے ہوا ہے' ابھی اکبر اور اس کے وزیر بیرم خان ایک خاصے بڑے لشکر کے ساتھ پانی پت کے میدانوں کا رخ کر رہے ہیں اور انہیں یقین تھا کہ پانی پت کے میدانوں سے نکل کر وہ دہلی کا رخ کریں گے اور اگر انہوں نے دہلی میں جا کر محصور ہونا چاہا تو ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ لہٰذا وہ سب اپنی جانیں بچانے کی خاطر ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ یوں ہیمو بقال گرفتار ہوا۔ پانی پت کے میدان میں لڑی جانے والی جنگ کا خاتمہ ہوا اور جب ہیمو کے ماتحت جنگ کرنے والے لشکری ادھر ادھر بکھر گئے تو اس کے ساتھ ہی ہیمو بقال کی طاقت اور قوت بھی منتشر ہو کر رہ گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد اکبر اور بیرم خان بھی باقی لشکر کے ساتھ پانی پت کے میدان میں پہنچ گئے تھے۔ میدان میں آتے ہی سب سے پہلے انہوں نے علی قلی خان اور عبداللہ خان ازبک کو ہیمو بقال کے خلاف ان کی شاندار فتح پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد جنگ میں گرفتار ہونے والے ہیمو بقال کو اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جنگ کے دوران جس لشکر نے ہیمو بقال کو گرفتار کیا تھا' اس کا نام شاہ قلی خان تھا اور اس شاہ قلی خان نے ہیمو بقال کو رسیوں میں جکڑ کر اکبر کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اکبر نے دیکھا کہ ہیمو بقال کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ تاہم وہ تیر جو اس کی آنکھ سے ہوتا ہوا اس کے سر کے پشتی حصے کی طرف نکل گیا تھا' وہ نکال دیا گیا تھا۔ اس موقع پر اکبر کچھ دیر تک بڑے غور اور کسی قدر نفرت آمیز انداز میں ہیمو بقال کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے گرفتار کرنے والے لشکری شاہ قلی خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''اسے گرفتار کرنے پر میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ اس کا تمہیں پورا انعام ملے گا۔ پہلے یہ کہو۔ کیا تو نے پہلے اس کی آنکھ میں تیر مارا' اس کے بعد اسے بے بس کر کے گرفتار کیا۔''

شاہ قلی خان نے انتہائی مودب ہو کر اکبر کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

''شہنشاہ معظم اسے میں نے صرف گرفتار کیا ہے' اس لیے اپنے ہزاروں ہاتھیوں کو ہمارے لشکر کو نقصان پہنچنے کے لیے آگے بڑھایا تھا اور اس کی بدقسمتی کہ انہیں ہاتھیوں میں سے ایک ہاتھی پر یہ بھی سوار تھا اور وہ ہاتھی سب سے زیادہ زور آور قد آور تھا۔ نام اس کا ہوائی تھا۔ میں اس وقت اپنے لشکر کی دو صفوں کے پیچھے تھا کہ وہی لڑکا جس نے اس سے پہلے تیر اندازی کر کے سکندر شاہ کے دونوں بازو زخمی کیے تھے' ہیمو بقال کے خلاف بھی وہی حرکت میں آیا۔ گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے اپنی کمان بدلی۔ چھوٹی کے بجائے بڑی کمان سنبھالی اور پھر ایک تیر ایسا تاک کر اسے مارا کہ وہ تیر اس کی آنکھ سے ہوتا ہوا سر کے پچھلے حصے کی طرف نکل گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھتے ہوئے اس کے لشکریوں پر بددلی اور بدقطعی طاری ہوگئی جس کی وجہ سے اس کے لشکر کو شکست ہوئی۔ جب اس کے لشکر بھی گر رہے تھے' اس نے بھی بھاگنے کی کوشش کی۔ اسی تگ و دو میں اپنا گھوڑا اس کے قریب لے گیا۔ اس کی مہارت کا خاتمہ کر دیا اور اس پر گرفت کر کے اسے گرفتار کر لیا۔''

اس موقع پر اکبر نے اپنے پہلو میں کھڑے ہوئے بیرم خان کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''اس لڑکے کا کیا نام ہے جس نے سکندر شاہ کے خلاف جنگ میں اس کے بازو زخمی کیے تھے۔ بھلا سا نام ہے اس کا۔ میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔''

بیرم خان کچھ کہنا بھی چاہتا تھا کہ اس موقع پر قریب ہی کھڑا عبداللہ خان ازبک بول اٹھا اور دل کھول کر دونوں بھائیوں کی کارکردگی کی تعریف کی۔

عبداللہ خان جب خاموش ہوا' تب اکبر نے ایک گہری نگاہ اپنے قریب کھڑے سالاروں میں سے بیرم خان علی قلی خان عبداللہ خان پر ڈالی پھر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

''اس لڑکے کو میرے پاس لاؤ' میں اس سے پھر ملنا پسند کروں گا۔ ایسے لڑکے جوان ہو کر اجاڑ پھیلاتی کرب خیزیوں میں اپنی روح زخمی کر سکتے ہیں' جسم گھائل کرا سکتے ہیں لیکن سر بلند ہوگا اور اپنے دل کی قندیلوں سے ہر شے کا ضمیر روشن کرے گا۔ اس جیسے نوجوان ہی بازار حیات کی ویرانیوں میں جانثاری کی کتھائیں' فداکاری کی داستانیں رقم کر سکتے ہیں۔ اگر تقدیر نے اس لڑکے کو کسی حادثے سے دوچار نہ کر دیا اور یہ جوان ہو گیا تو میرا دل کہتا ہے کہ یہ کوچۂ قاتل میں وفا شعار ساتھی اور مجلس یاروں میں امیدوں کا بادبان ثابت ہوگا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد اکبر خاموش ہو گیا تھا۔ عبداللہ خان کے کہنے پر ایک لشکری عادل خان کو بلانے چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سمت سے آصف خان اور عادل خان دونوں بھائی آتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھتے ہی اکبر کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا تھا۔ جب دونوں بھائی قریب آئے' تب اکبر نے آگے بڑھ کر باری باری دونوں کے شانے تھپتھپانے پھر عادل خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''میں نے تمہیں اپنے محافظ رستوں میں شامل کیا تھا تاکہ وہاں تمہاری تربیت کے علاوہ تمہاری خوب دیکھ بھال بھی ہو۔ یہ تمہاری جانثاری ہے کہ محافظ دستوں سے نکل کر تم نے جنگ میں حصہ لینا چاہا اور اپنے بھائی کے پہلو بہ پہلو جنگ میں عملی کردار ادا کیا۔ تم نے جو بے خطا تیر اندازی کر کے اس ہیمو بقال کو زخمی کیا جس کی وجہ سے یہ گرفتار ہوا تو تمہاری یہ کارگزاری میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گا۔''

اس موقع پر عبداللہ خان ازبک نے جہاں عادل خان کی تعریف کی' وہاں اس نے آصف خان کی بھی جنگ کے دوران کارکردگی کو سراہا اور اکبر کے سامنے اس کی بھی تعریف کی۔ اکبر نے دونوں سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔ دونوں بھائیوں کو نقد انعامات سے نوازا اور پھر شاہ قلی خان جس نے ہیمو بقال کو گرفتار کیا تھا' اسے بھی اکبر نے نقد انعام دیا۔

اس کے بعد اکبر نے عبداللہ خان ازبک کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''جب ہم آگرہ جائیں تو ہمیں یاد دلانا' وہاں ان دونوں بھائیوں کے لیے رہائش کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس کے بعد ان کی کارروائیوں پر مزید نگاہ رکھی جائے گی اور انہیں بہتر سے بہتر مراعات سے نوازا جائے گا۔''

اس تمام کارروائی کے بعد اکبر نے اپنے سامنے بے بسی کی حالت میں کھڑے ہیمو بقال کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''سوتو ہے۔ ہیمو بقال جس نے گوالیار سے آندھی اور طوفان کی طرح نکل کر پہلے آگرہ میں لوگوں کا خون بہایا' اس کے بعد دہلی میں لوگوں کے مفادات پر ضرب لگائی اور پھر تیرے حوصلے ایسے بڑھ گئے کہ تو پانی پت کے میدانوں میں ہمارے ساتھ فیصلہ کن جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ذرا اپنی بے بسی اور لاچارگی کو دیکھ کہ میرے صرف مقدمہ الجیش نے تیرے پورے لشکر کو بدترین شکست دی۔ تجھے ایک آنکھ سے محروم کر دیا اور اب تو ایک قیدی اسیر کی حالت میں میرے سامنے کھڑا ہے۔''

اس موقع پر اکبر نے بیرم خان کی طرف دیکھا پھر اسے مخاطب کر کے کہا۔

''تمہارے خیال کے مطابق ہیمو بقال کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔''

جواب میں بیرم خان مسکرایا اور کہنے لگا۔

''آپ اپنی تلوار سے بے نیام کریں اور اپنے ہاتھ سے اپنے اس نامور دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔''

اس موقع پر مورخین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گرو کہتا ہے کہ اکبر نے اپنی تلوار بے نیام کی اور ہیمو بقال

کا سر کاٹ کر رکھ دیا اور اس کارروائی کی وجہ سے اکبر کو غازی کا منصب دیا گیا تھا۔

بلہ دوسرے مورخین کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ بیرم خان نے ضرور اکبر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ہیمو بقال کی گردن کاٹ کر رکھ دے لیکن اکبر نے ایک تھے دشمن پر وار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لہٰذا اکبر کے بجائے بیرم خان نے اپنی تلوار بے نیام کی اور ہیمو بقال کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اس طرح پانی پت کے تاریخی میدانوں میں ہیمو بقال کو بدترین شکست دینے کے بعد ایک فاتح کی حیثیت سے اکبر دلی میں داخل ہوا تھا۔

☆☆☆

ریاست گونڈوانہ کی رانی درگاوتی ایک روز اپنے بیٹے بیرنرائن کے علاوہ کملا دیوی اور رتن کماری کے ساتھ اپنے راج محل کے ایک کمرے میں بیٹھی تینوں سے کسی موضوع پر گفتگو کر رہی تھی کہ راج محل کے محافظوں کا سر کردہ دروازی پر نمودار ہوا۔ رانی درگاوتی کو اس نے زمین کی طرف جھکتے ہوئے تعظیم دی پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''مالکن اپنا سینا پتی سنسار سنگھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔''

یہ الفاظ سن کر درگاوتی سنبھل کر بیٹھ گئی اور سنسار سنگھ کو اس نے اندر بھیجنے کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد سنسار سنگھ راج محل کے اس کمرے میں داخل ہوا ہاتھ کے اشارے سے درگاوتی نے اسے ایک نشست پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''تمہارا چہرہ بتاتا ہے کہ ہمارے لیے تم کوئی اچھی خبر لے کر آئے ہو۔'' اس موقع پر سنسار سنگھ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر دبی دبی مسکراہٹ میں کہنے لگا۔

''مالکن آپ کا اندازہ درست ہے آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں دو کاموں کی تکمیل کروں، پہلا یہ کہ ہم سے شکست کھانے کے بعد سارنگ پور کے حکمران باز بہار کے کیا ارادے ہیں، دوسرا حکم آپ نے یہ دیا تھا کہ باز بہادر سے آفند خان اور عادل خان دونوں بھائیوں کو حاصل کر کے آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔

جہاں تک آصف خان اور عادل خان دونوں دیہاتیوں کا تعلق ہے تو جس وقت باز بہادر ہم سے ٹکرایا تھا اور اسے شکست ہوئی تھی اس شکست کے نتیجے میں جب اپنے لشکر کو لے کر باز بہادر سارنگ پور کی طرف بھاگا تھا تو آصف خان اور عادل خان دونوں اس کے ساتھ سارنگ پور نہیں گئے تھے۔

باز بہادر نے کیونکہ آصف خان اور عادل خان کو اپنے ہاں پناہ دی تھی اور یہ پناہ اس بنا پر دی تھی کہ اس کے باپ کے تعلقات آصف خان اور عادل خان کے باپ سے اچھے تھے لیکن جب شکست کے بعد باز بہادر سارنگ پور داخل ہوا تو اس نے آصف خان اور عادل خان کو بلایا لیکن ان کا کچھ پتا نہ چلا اس نے مختلف لشکریوں کے ان کے متعلق پوچھا تو باز بہادر کو بتایا گیا کہ شکست کے بعد جب باز بہار کا لشکر بھاگے تو آصف خان اور عادل خان دونوں بھائی سارنگ پور جانے کے بجائے آگرہ کی طرف بھاگ کر گئے تھے۔

اس سلسلے میں میرے آدمیوں نے ذاتی طور پر تحقیق کی اور سارنگ پور میں مختلف لوگوں سے رابطہ قائم کر کے آصف خان اور عادل خان کے متعلق معلومات حاصل کی تو یہی پتہ چلا کہ آصف خان اور عادل خان واقعی جنگ کے بعد سارنگ پور نہیں گئے بلکہ آگرہ کی طرف بھاگ گئے ہیں۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سنسار سنگھ رکا پھر کہنے لگا۔

''مالکن جہاں تک باز بہادر کا تعلق ہے تو ہم سے شکست کھانے کے بعد اس کے سارے ولولے، سارے ارادے اس کا سارا استقبال غبار اور راکھ ہو کر رہ گیا ہے۔ اب آنے والے دور میں وہ کبھی بھی ہم سے ٹکرانے یا ہمارے مفادات کو نقصان پہنچانے

کی کوشش نہیں کرے گا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اب وہ عشق و موسیقی ساز و آواز کے ماحول میں کھو گیا ہے اس نے ان گنت گانے والوں کو اپنے اردگرد جمع کر لیا ہے اور ہر وقت انہیں مجلس و سنگت سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اب وہ جنگ کے قابل نہیں رہا۔ لہٰذا باز بہار سے کسی مرحلہ پر ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں اٹھ سکتا یہاں تک کہنے کے بعد سنسار سنگھ چپ خاموش ہوا تو کچھ دیر خاموش رہ کر رانی درگاوتی گہری سوچوں میں ڈوبی رہی پھر سنسار سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے اندیشوں بھرآواز میں بول اٹھی۔

''سنسار سنگھ یہ جو آصف خان اور عادل خان دونوں آگرہ کی طرف بھاگ گئے ہیں تو کہیں مغلوں کے لشکر میں شامل ہو کر وہ مغلوں کو ہمارے خلاف کارروائی کرنے پر نہ اکسانا شروع کر دیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں سمجھتی ہوں حالات ہمارے لیے بڑے سنگین ہو جائیں گے۔''

''مالکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آصف خان اور عادل خان کی حیثیت ہی کیا ہے؟'' سنسار سنگھ نے ایک طرح سے رانی درگاوتی کو خوش کرنے کے لیے کہنا شروع کیا تھا۔ ''جہاں تک عادل خان کا تعلق ہے تو وہ ابھی بچہ ہے' آصف خان ابھی جوان ہے لیکن مغل لشکر میں جانے کے بعد اس کی کیا حیثیت ہوگی' زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ مغل لشکر میں ایک عام لشکری کی حیثیت سے شامل ہو کر غم روزگار بے فکر ہو جائے گا وہ کسی ایسے عہدے کسی ایسے منصب کسی ایسے مقام پر تو نہیں پہنچ جائے گا کہ اس عہدے کو استعمال کرتے ہوئے وہ اکبر کو متاثر کر کے ہم پر حملہ آور ہونے کے لیے کوئی لشکر ترتیب دینے کی ترغیب دے سکے۔ جہاں تک عادل خان کا تعلق ہے وہ ویسے بھی ابھی بچہ ہے۔ وہ ہمارے لیے نقصان کا باعث ہی نہیں ہو سکتا لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ آصف خان اور عادل خان دونوں اگر مغلوں کے لشکر میں شامل ہونے کے لیے آگرہ کی طرف بھاگ گئے ہیں تو ان کا بھاگ کر آدھر جانا ہمارے لیے خدشات کا باعث نہیں ہو سکتا۔''

سنسار سنگھ کے خاموش ہونے پر سنجیدہ سے لہجے میں رانی درگاوتی کہہ رہی تھی۔

''یہ امر تو ہمارے لیے سکون اور آسودگی کا باعث ہے کہ باز بہادر اب گانے بجانے والیوں کے جھرمٹ میں کھو گیا ہے' اب وہ کسی کے خلاف جنگ کرنے کے قابل نہیں رہے گا ورنہ جس وقت وہ ہمارے ہاتھوں شکست اٹھا کر بھاگا تب تو مجھے خدشہ ہوا تھا کہ اس شکست کے بعد وہ ہمارے خلاف کوئی جوابی کارروائی کرے گا اور مالوہ کے حاکموں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک طرح سے ہم سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی کوشش کرے گا لیکن اچھا ہوا کہ وہ گانے بجانے والیوں میں ہی کھو گیا ہے اب اس سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔

لیکن جہاں تک آصف خان اور عادل خان کا تعلق ہے وہ دونوں اس وقت تک میری آنکھوں کا کانٹا بنے رہیں گے' جب تک مجھے یہ سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہو جاتا کہ آگرہ جا کر ان دونوں نے ہمارے خلاف کسی انتقامی کارروائی کی بنیاد نہیں رکھی۔ یقیناً انہیں یہ تو خبر ہو چکی ہوگی کہ ان دونوں کی ماں اور بہنوں کو ختم کر کے ان کے مکان کو آگ لگا دی گئی ہے۔ اور ان کا باپ عبداللہ خان تو ان کی موجودگی میں مارا گیا تھا ان حادثات کی وجہ سے وہ دونوں بھائی ہمارے خلاف حرکت میں آنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ بہرحال میں تمہارے ذمے یہ کام لگاتی ہوں کہ اس معاملے پر نگاہ رکھی جائے کہ آصف خان اور عادل خان کہیں مغلوں کے ذریعے ہماری خلاف کوئی بڑا قدم اٹھانے میں کامیاب نہ ہوں۔''

سنسار سنگھ نے اپنی گردن کو خم کرتے ہوئے درگارانی کو یقین دلایا کہ آصف خان اور عادل خان کے حالات پر گہری نگاہ رکھی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی درگاوتی سے اجازت لے کر سنسار سنگھ راج محل اس کمرے سے نکل گیا تھا۔

رانی درگاوتی کو اس کے سنساری نے باز بہادر کے متعلق جو معلومات فراہم کی تھیں وہ حقیقت پر مبنی تھیں' اس لیے کہ رانی درگاوتی سے بدترین شکست کھانے کے بعد باز بہادر واپس سارنگ پور کی طرف بھاگا اور شکست کی صورت حال سے وہ سخت پریشان بھی ہوا۔ میدان جنگ سے بھاگتے وقت اسے یہ بھی بڑا صدمہ ہوا کہ اس کے لشکر کا ایک خاصا بڑا حصہ رانی درگا کاوتی کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ اس طرح بہادر بڑی مشکل سے سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا سارنگ پور پہنچا۔

سارنگ پور پہنچ کر جا تو یہ تھا کہ باز بہادر اپنی کچلی مسلی عسکری طاقت کو پھر سے بحال کرتا' لشکر میں اضافہ کرتا اور رانی درگاوتی سے اپنی اس شکست کا انتقام لیتا لیکن باز بہادر نے ایسا نہیں کیا' اس نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی طرف مطلق کوئی دھیان ہی نہ دیا اور اپنی تھکن شکست کی کوفت اور ذہنی دباؤ کو دور کرنے کے لیے اس نے عیش و عشرت میں مصروف رہنے کا سہارا پکڑ لیا۔ باز بہادر کو ذاتی طور پر بچپن ہی سے فن موسیقی سے بے انتہا دلچسپی تھی لہٰذا رانی درگاوتی سے شکست اٹھانے کے بعد اس نے پھر کبھی کسی کے خلاف سر اٹھانے یا جنگ جاری رکھنے کا نام نہ لیا۔ غم دور کرنے اور ہر وقت جمع گزارنے کے لیے اس نے بہت سے گانے والی عورتوں کو اپنے اردگرد جمع کر لیا تھا اور انہیں گانے اور ناچنے والیوں کی وجہ سے باز بہادر دن بدن امور سلطنت سے بالکل بے گانہ ہو گیا اور اس کا تمام وقت موسیقی کے شغل میں ہی گزرنے لگا انہی دنوں باز بہادر کی ایک اور بدبختی کی ابتدا ہوئی اس لیے کہ اس کی اس عیش و عشرت کی طرف توجہ کو دیکھتے ہوئے بہت سی گانے والی عورتوں کو اپنے اردگرد جمع کر لیا تھا اور انہی گانے اور ناچنے والیوں میں چپ متی باز بہادر کی نظروں میں سما گئی تھی۔

اس عورت نے اپنے حسن اور موسیقی میں کمال کی وجہ سے باز بہادر کی دل کو خوب لبھایا' باز بہادر کو اس عورت سے بے پناہ محبت ہو گئی جب کہ روپ متی بھی اس سے سچی محبت کرنے لگی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہ ہوتے تھے یوں آہستہ آہستہ ان دونوں کی محبت کے چرچے پورے ہندوستان میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے' جس کے نتیجے میں باز بہادر اپنے علاقوں کی حکومت احسن طریقوں سے چلانے کے بجائے حکومت کے ہر کام سے بے خبر ہو کر صرف روپ متی کے عشق میں کھو کر رہ گیا تھا۔

پانی پت کے میدان میں کیونکر عبداللہ خان ازبک اور علی قلی خان نے ہیمو بقال کے خلاف کارہائے نمایاں سرانجام دیئے تھے اور ہیمو بقال کو بدترین شکست دی تھی لہٰذا ان کی اس کارگزاری سے خوش ہوتے ہوئے اکبر نے عبداللہ خان ازبک کو کالپی کے علاقے کا حاکم مقرر کیا جہاں تک علی قلی خان کا تعلق تھا تو یہ شخص جنگ کا خوب تجربہ رکھتا تھا لیکن اخلاق و کردار کا اتنا اچھا نہیں تھا' اندر ہی اندر سازشیں کرنے کا بڑا ماہر تھا اور عموماً اس کے جاننے والے اسے ایک متعصب انسان سمجھتے تھے' تاہم اکبر نے اس کی ان ساری خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پانی پت کے میدان میں اس کی اچھی کارگزاری کو دیکھتے ہوئے اسے خان زمان کا خطاب دیا' ساتھ ہی اسے مشرق سے کچھ علاقوں کا حاکم مقرر کر دیا تھا جہاں تک آصف خان اور عادل خان دونوں بھائیوں کی کارگزاری کا تعلق تھا تو ان سے بھی اکبر نے بے پناہ خوشی اور طمانیت کا اظہار کیا اور آگرے میں چہار باغ کے سامنے انہیں ایک مکان رہائش کے لیے دے دیا گیا تھا۔ آگرہ میں چار باغ بابر نے اپنے دور میں بنایا تھا اور یہ بڑا خوبصورت باغ تھا بعد میں اس کا نام باغ ارم بھی مشہور ہو گیا تھا۔

دہلی ہی میں قیام کے دوران اکبر کو خبر ملی کہ ہیمو بقال کی بیوہ ہیمو مقابل کے سارے خزانے اور مال و متاع لے کر اپنے اہل و عیال کے ہمراہ میوات کی طرف بھاگ گئی ہے چنانچہ اکبر نے بیرم خان کے ساتھ کام کرنے والے ایک شخص پیر محمد خان کو ایک

لشکر دے کر ہیمو مقال کی بیوی کا تعاقب کرنے کے لیے روانہ کیا ساتھ ہی ہیمو بقال کے باپ کو بھی گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ ہیمو بقال سے نجات ملی ہی تھی کہ اکبر کو پنجاب کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ جالندھر سے پانی پت کی طرف کوچ کرتے وقت اکبر نے ایک مخلص خواجہ خضر خان کو اسپور کی طرف روانہ کیا تھا اسے پنجاب کا حاکم مقرر کیا تھا اور اس کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ سکندر شاہ سوری پر گہری نگاہ رکھے جو وقتی طور پر شکست اٹھا کر کوہستان کی طرف بھاگ گیا تھا۔

سکندر شاہ سوری کو جب خبر ملی کہ اکبر اور بھرم خان دونوں اپنے سارے لشکر کو بیٹھتے ہوئے پانی پت کی طرف روانہ ہو گئے ہیں تا کہ وہاں ہیمو بقال سے مقابلہ کریں۔

سکندر شاہ سوری کو قوی امید تھی کہ ہیمو بقال اکبر اور بیرم خان پر غالب ہو گا اس لیے کہ سکندر شاہ کو خبریں ملی تھیں کہ ہیمو بقال نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا ہے اور اپنے لشکر کے اندر لگ بھگ ڈیڑھ ہزار ہاتھی بھی ہیں، جنہیں خصوصیت کے ساتھ جنگ کے لیے سدھایا گیا تھا اس بناء پر اسے امید تھی کہ ہیمو بقال اکبر اور بیرم خان کو پانی پت کے میدان میں شکست دے گا۔ اس نے یہ سوچا کہ اگر اکبر اور بیرم خان کو شکست ہوئی تو ہندوستان کا اصل حکمران تو ہیمو بقال ہو جائے گا لہٰذا شکست اٹھانے کے بعد اکبر مورو بیرم خان یقیناً پنجاب کا رخ کریں گے چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ ان دونوں کے پنجاب کی طرف آنے سے پہلے پہلے وہ پنجاب کو ختم کر کے لاہور میں مقیم ہو کر ایک خاصا بڑا لشکر تیار کر کے لاہور میں قلعہ بند ہو جائے گا اگر اکبر اور بیرم خان نے اس پر ضرب لگانے کی کوشش کی تو شہر میں محصور رہ کر ان کا مقابلہ کرتا رہے گا اور انہیں پنجاب کے کسی علاقے پر قبضہ نہیں کرنے دے گا۔

اپنے ذہن کو میں ان خیالات کو جنم دیتے ہوئے سکندر شاہ سوری ایک بار پھر قسمت آزمانے کے لیے ایک خاصا بڑا لشکر کوہستان سوالک سے نکلا اور لاہور کا رخ کیا۔

خواجہ خضر خان کو جب خبر ہوئی کہ اکبر اور بیرم خان کے علاوہ دوسرے سالاروں کی خصوصیت کو دیکھتے ہوئے سکندر شاہ سوری قسمت آزمانے پر آمادہ ہو گیا ہے اور اس نے لاہور کا رخ کیا ہے تب پنجاب کا حاکم خضر خان بھی جو لشکر اس کے پاس تو اسے لے کر نکلا تا کہ سکندر شاہ سوری کا مقابلہ کرے اور اسے واپس بہتان سوالک کی طرف مار بھگائے۔

لاہور سے بیس میل کے فاصلے پر خواجہ خضر خان اور اور سکندر شاہ سوری ایک دوسرے سے ٹکرائے اس ٹکراؤ کے نتیجے میں سکندر شاہ سوری نے خواجہ خضر خان کو شکست دی اور خواجہ خضر خان اپنے لشکر کے ساتھ بھاگ کر لاہور میں قلعہ بند ہو گیا۔ ان حالات کی خبر جب اکبر اور بیرم خان کو ہوئی تو وہ بڑے پریشان ہوئے۔ بہزاد اپنے ایک سالار خان اعظم کو ایک شکست دے کر فی الفور لاہور کے حاکم خواجہ خضر خان کی مدد کے لیے گیا اور پھر اس کے پیچھے پیچھے اکبر اور بیرم خان خود بھی سارے لشکر کو لے کر لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔

اگر بات خواجہ خضر خان تک ہی محدود رہتی تو شاید سکندر شاہ سوری آگے بڑھ کر لاہور کا محاصرہ کر لیتا اور خواہ خضر خان سے حکمرانی چھین کر پنجاب پر اپنا تسلط مضبوط کر لیتا اسے یہ بھی خبر مل گئی تھی کہ اکبر اور بیرم خان نے اپنے ایک سالار خان اعظم کو ایک لشکر دے کر خواجہ خضر خان کی مدد کے لیے روانہ کیا ہے۔ لیکن سکندر شاہ سوری نے خان اعظم کو بھی کوئی اہمیت نہ دی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جہاں وہ شہر کے نواح میں خان اعظم پر حملہ آور ہو کر اسے تہس نہس کر دے گا اور اس کے بعد لاہور کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے شہر کا محاصرہ کر کے شہر خواجہ خضر خان سے خالی کرا لے گا۔

خان اعظم کا ایک لشکر کے ساتھ لاہور کی طرف آنا ہی سکندر شاہ سوری کے لیے اطمینان کا باعث تھا

اس لیے انہوں نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی تھی کہ اکبر اور بیرم خان خود لاہور کا رخ نہیں کریں گے اس لیے انہوں نے خواجہ خضر خان کی مدد کے لیے اپنے ایک چھوٹے سالار خان اعظم کو ایک لشکر دے کر روانہ کر دیا ہے اور یہ صورت حال حقیقتاً سکندر شاہ سوری کے لیے حوصلہ افزا تھی۔

لیکن اپنے چھوٹے سالار خان اعظم کے پیچھے پیچھے جب خود اکبر اور بیرم خان بھی لشکر لے کر لاہور کی طرف روانہ ہوئے تب سکندر شاہ سوری کے اوسان خطا ہو گئے' وہ جانتا تھا کہ وہ اکبر اور بیرم خان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا لہٰذا جو ارادے اس نے باندھ رکھے تھے ان سے وہ باز آیا پہلے تو وہ خان اعظم کی پروا کیے بغیر لاہور کی طرف پیش قدمی کیے ہوئے تھے اور جب اکبر اور بیرم خان کے آنے کی اسے اطلاع ملی تو بڑی تیزی سے وہ پلٹا اور بڑی برق رفتاری سے سفر کرتے ہوئے مان کوٹ نام کے قلعے میں جا کے محصور ہو گیا۔

یہ قلعہ جموں کی پہاڑیوں کے قریب ہوا کرتا تھا اور اب کشمیر کا ایک حصہ ہے۔ اکبر اور بیرم خان کو جب خبر ہوئی کہ لاہور کی طرف پیش قدمی کرتے کرتے سکندر شاہ سوری رک گیا ہے اور ان آمد کا سن کر وہ مان کی طرف بھاگا۔ اور وہاں قلعے میں محصور ہو گیا ہے تب اکبر اور بیرم خان نے بھی اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ مان کوٹ کا رخ کیا تھا۔

مان کوٹ نام کا یہ قلعہ شیر شاہ سوری کے بیٹے سلیم شاہ سوری نے اپنے دور حکومت میں جنگجو گکھڑوں کی بیخ کنی کے لیے پہاڑی علاقے میں ایک بلند ترین مقام پر تعمیر کروایا تھا۔ اکبر اور بیرم خان بھی اپنے لشکر کو لے کر مان کوٹ پہنچے اور قلعے کا انہوں نے محاصرہ کر لیا۔

سکندر شاہ سوری نے یہ خیال کیا کہ اگر اکبر نے بزور شمشیر قلعہ فتح کیا تو پھر یقیناً اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا چنانچہ اس نے اکبر کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنا ایک معتبر آدمی اکبر کی طرف روانہ کیا اور یہ گزارش لے کر آپ اپنا کوئی امیدوار اس کے پاس بھیجیں تا کہ میں اپنا مدعا بیان کر کے بادشاہ حکم کے مطابق عمل کر سکوں۔

اکبر کو سکندر شاہ سوری کی یہ بات پسند آئی چنانچہ اس سے بات کرنے کے لیے ایک شخص شمس الدین محمد خان کا انتخاب کیا گیا جسے تاریخ کے اوراق میں خان اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا یہ شخص جہاں اکبر کا بڑا وفادار تھا وہاں اکبر بھی اسے بہت زیادہ پسند کرتا تھا چنانچہ خان اعظم شمس الدین خان کوٹ کے قلعہ میں سکندر شاہ سوری سے ملنے کے لیے گیا۔

جب دونوں کی ملاقات ہوئی تب سکندر شاہ سوری خان اعظم شمس الدین کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”مجھ سے بڑی غلطی اور خطا ہوئی کہ اکبر کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے میں کوہستان سوالک سے نکلا اور خواجہ خضر خان پر حملہ آور ہوا۔ ان حالات میں' میں سمجھتا ہوں میرے جرائم اتنے زیادہ ہیں کہ بادشاہ کے سامنے جاتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اپنے بیٹے شیخ عبدالرحمٰن کو شاہی حضور میں بھیجوں اور خود بنگال چلا جاؤں ساتھ ہی میں اس بات کا عہد بھی کرتا ہوں کہ بنگال پہنچ کر پرسکون زندگی بسر کروں گا اور آئندہ کبھی بھی بادشاہ کی اطاعت سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

سکندر شاہ سوری کی اس گفتگو سے خان اعظم شمس الدین بھی بے حد خوش ہوا تھا وہاں سے وہ واپس اکبر اور بیرام خان کے پاس آیا اور جو گفتگو سکندر شاہ سوری سے ہوئی تھی اس کی تفصیل اکبر سے اس نے کہہ دی تھی اکبر یہ گفتگو سن کر بہت خوش ہوا' چنانچہ اس نے سکندر شاہ سوری کی درخواست کو قبول کر لیا اس موقع پر بیرام خان نے بھی اکبر سے سکندر شاہ سوری کی سفارش کی اور بہرام خان کے کہنے پر ہی سکندر شاہ سوری کو اخراجات کے لیے چند اضلاع اس کے ماتحت کر دیئے چنانچہ بنگال جا کر جو اضلاع اس

کے ماتحت کیے گئے تھے وہاں اس نے رہائش اختیار کر لی اور اس حال میں وہ بارہ سال بعد انتقال کر گیا تھا۔

سکندر شاہ سوری کا معاملہ نبٹانے کے بعد اکبر اور بیرام خان نے اپنے لشکر کے ساتھ لاہور کا رخ کیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جولائی کے مہینے میں اکبر لاہور پہنچا کیونکہ اکبر لاہور کو پسند کرتا تھا لہٰذا اپنے لشکر کے ساتھ اس نے چند ماہ لگاتار لاہور ہی میں قیام کیے رکھا اس کے بعد دسمبر میں لاہور سے نکل کر وہ دہلی کی طرف روانہ ہوا' راستے میں جالندھر کے مقام پر اکبر نے اپنی پھوپھی زاد سلیمہ بیگم کی شادی بیرم خان سے کر دی تھی پھر دہلی کا قصد کیا' راستے میں اکبر کے مخبروں نے اسے اطلاع دی کہ میوات کے ایک شخص حاجی خان نے جو کبھی ہیمو بقال کے لشکر میں ایک سالار کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا پانی پت کے میدان میں ہیمو کی شکست کے بعد وہ نرنول کی طرف بھاگ گیا وہاں اس نے مغلوں کے خلاف بغاوت کھڑی کر دی اکبر کو یہ بھی اطلاع دی گئی کہ بغاوت کھڑی کرنے کے بعد اس نے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا اور اب وہ اپنے لشکر کے ساتھ سرہند شہر میں مقیم ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اکبر کی نظر عنایت آصف خان اور عادل خان دونوں بھائیوں پر پڑی چنانچہ ایک لشکر آصف خان کی کمانداری میں دے کر میوات کے حاجی خان کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے روانہ کیا گیا چنانچہ اکبر اور بیرم خان تو اپنے لشکر کو لے کر دہلی کی طرف چلے گئے جب کہ آصف اور عادل خان دونوں بھائی جو لشکر اکبر نے مہیا کیا تھا اسے لے کر سرہند کی طرف بڑھے حاجی خان نے پہلے تو سرہند سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کیا لیکن جو لشکر اکبر نے آصف خان اور عادل خان کے حوالے کیا تھا اس سے کام لیتے ہوئے دونوں بھائیوں نے حاجی خان کو بدترین شکست دی۔ اسی دوران اکبر نے احتیاط کی خاطر اپنے دو اور سالاروں کو بھی سرہند کی طرف روانہ کیا' اس صورت حال کو باغی حاجی خان نے اپنے لیے خطرہ جانا لہٰذا اپنی جان بچانے کی خاطر وہ گجرات بھاگ گیا اور وہاں اس نے پناہ لے لی تھی اس طرح آصف خان اور عادل خان دونوں کامیابی سے اس مہم کو سر کر کے اکبر کے لشکر میں واپس آ گئے تھے اور یوں اکبر کی نگاہوں میں ان دونوں بھائیوں کی قدر و قیمت بڑھ گئی تھی۔

اسی دوران مغل سلطنت کے اندر بیرم خان کی وجہ سے ایک کہرام اور انقلاب اٹھ کھڑا ہوا' بیرم خان جو خان خاناں تھا اور سلطنت کے سارے امور پر اس کی گرفت تھی اس سے کچھ ایسی غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئیں کہ وہ اکبر جو اس سے پہلے ہر کام بیرم خان کے مشورے سے کرتا تھا اب وہی بیرم خان اس کی نگاہوں میں تیزی سے گرنے لگا یہ انقلاب بیرم خان کی چند غلطیوں کوتاہیوں یا کچھ بدگمانیوں کی وجہ سے رونما ہوا۔

پہلی بدگمانی کچھ اس طرح اٹھی کہ مان کوٹ میں جب اکبر نے سکندر شاہ سوری پر قابو پایا اور وہاں سے وہ لاہور کی طرف لوٹا تو راستے میں اکبر اور بیرم خان کے درمیان پہلی بدگمانی پیدا ہوئی ہوا یوں کہ ایک روز بادشاہ نے دو نامی گرامی باغیوں کو آپس میں لڑانے کے لیے میدان میں چھوڑا۔

مغلوں کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر و بیشتر وہ ہاتھیوں کو لڑا کر خود اور دوسروں کو بھی خوش کیا کرتے تھے اور ان کے پاس یہ وقت گزارنے کا بہترین شغل تھا اس سے پہلے بھی بادشاہ ہاتھیوں کو آپس میں لڑا لیا کرتا تھا۔

جب دونوں ہاتھیوں کو آپس میں ٹکرانے کے لیے چھوڑا گیا تو ہاتھی اس جگہ لڑائے گئے جہاں پڑاؤ قائم کیا گیا تھا ایک طرف اکبر تھا دوسری طرف بیرم خان کا خیمہ تھا اب ہاتھی آپ سے آپ لڑتے ہوئے بیرم خان کے خیمے کے پاس پہنچ گئے اس موقع پر تماشائیوں کے شور و غل سے پورا میدان گونج اٹھا تھا۔

بیرم خان نے جب دیکھا کہ دونوں مست ہاتھی

لڑتے ہوئے اس کے خیمے کی طرف گئے ہیں تو اس نے اپنے لیے بدشگونی سمجھا اور اپنے دل میں یہ ٹھانی کہ شاید اکبر کے اشارے پر یہ کام کیا گیا ہے۔ اور ہاتھیوں کو اکبر کے اشارے پر اس کے خیمے کی طرف دھکیلا گیا ہے حالانکہ ہاتھی خود بخود گئے تھے چنانچہ اسی بدگمانی کے تحت بیرم خان نے اکبر کی رضاعی ماں کے شوہر ماہم اتکہ کو پیغام بھجوایا۔

''ان دو مست ہاتھیوں کو لڑاتے ہوئے میرے خیمے کی طرف جانا کس کے اشارے پر عمل میں آیا' میں ہاتھیوں کا خیمے کی طرف جانے کا سبب سمجھنے سے قاصر ہوں اگر کسی چغل خور نے میری طرف سے کوئی ناگوار بات بادشاہ سے کہی ہے اور اس بات سے بادشاہ مجھ سے ناراض ہوگیا ہے تو مجھے بتایا جائے میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔''

جواب میں ماہم اتکہ نے کہا۔

''ہاتھیوں کا لڑتے ہوئے آپ کے خیمے کی قریب پہنچ جانا محض ایک اتفاقی امر ہے اس میں نہ کسی کا ہاتھ ہے اور اس سازش کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔'' لیکن بیرم خان کی بدقسمتی کہ وہ ماہم اتکہ کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔

اکبر کی نگاہوں میں بیرم خان کے گرنے کی دوسری وجہ کچھ اس طرح ہوئی کہ ایک صاحب خواجہ کادم بیگ تھے ان کے بیٹے کا نام مصاحب بیگ تھا یہ مصاحب خان کہیں بیرم خان کے ملازموں میں شامل تھا اور پھر کسی وجہ سے اس نے بیرم خان کی ملازمت ترک کردی اور ایک طرح سے وہ بیرم خان کے مخالف گروہ میں شامل ہوگیا۔ بیرم کو اس کا بڑا دکھ اور صدمہ ہوا اور اس نے مصاحب خان کو اس کے اس حرکت پر ٹوکا بھی لیکن مصاحب خان نے دوبارہ بیرم خان کے پاس آکر اس کے حلقے میں شامل ہونا پسند نہ کیا چنانچہ بیرم خان نے اس موقع پر انتہا پسندی سے کام لیا بجائے اس کے کہ مصاحب خان کو وہ اس کے حال پر چھوڑ دیتا کیونکہ وہ اس کے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوسکتی تھی پھر بیرم خان نے مصاحب خان کو دہلی میں قتل کرادیا مصاحب خان کیونکہ مغل تھا لہٰذا اس کے قتل کیے جانے پر مغل امراء اور سالاروں نے بیرم خان کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

اکبر اور بیرم خان کے درمیان نفرت اور دوری کی خلیج کی تیسری وجہ کچھ اس طرح پیدا ہوئی کہ ایک صاحب پیر محمد نے یہ شخص بہترین سالار بہترین شکوہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا اور پائے کا عالم دین بھی تھا اس کی انہی صفات کو دیکھتے ہوئے اکبر نے اسے اپنا استاد اتالیق اور مقرب خاص مقرر کیا تھا اب اس پیر محمد کی اکبر کی نگاہوں میں ایسی عزت ایسا وقار ہوگیا تھا کہ اکثر اراکین سلطنت اور امراء اس کے گھر کے چکر کاٹتے تھے لیکن ملاقات کی نوبت نہ آتی تھی بیرم خان کو پیر محمد کے بڑھتے ہوئے اس اقتدار اور عزت وقار سے مخالفت پیدا ہوئی چنانچہ اس نے پیر محمد کو بھی اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔

اتفاق سے انہیں دنوں پیر محمد بیمار پڑ گیا اور بیرم خان اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر گیا۔

پیر محمد کے گھر کے سامنے دربان کھڑے ہوتے تھے جب بیرم خان اپنے کچھ مسلح ساتھیوں کے ساتھ وہاں گیا تو دربان نے بیرم خان کو روکا اور کہنے لگے ''پہلے ہم پیر محمد سے اجازت لیں گے پھر آپ کو اندر جانے دیں گے۔''

دربانوں کی اس حرکت پر بیرم خان بڑا برہم ہوا' اسی دوران پیر محمد کو بھی اطلاع ہوگئی کہ بیرم خان اس سے ملنے کے لیے آیا ہے لہٰذا پیر محمد سکونتی حصے سے بھاگا بھاگا باہر آیا دربانوں نے جو بیرم خان کو روکا تھا اس کی پیر محمد نے بیرم خان سے معذرت طلب کی اور بیرم خان کو اپنے ساتھ اندر لے گیا لیکن کیونکہ بیرم خان اپنے ساتھ بہت سے مسلح جوان لے کر گیا تھا لہٰذا سب کو اندر نہیں آنے دیا گیا۔ چند ملازموں کو بیرم خان کے ساتھ اندر جانے کی اجازت دے دی اس حرکت پر بھی بیرم خان پیر محمد کے خلاف چراغ پا ہوگیا تھا۔

اس ملاقات کے بعد جب پیر محمد صحت یاب

ہوگیا تب بیرم خان ایک دم اس کے خلاف حرکت میں آیا اور اکبر سے مشورہ کیے بغیر اس نے پیر محمد کو گرفتار کر کے بیانہ کے قلعے میں بند کر دیا۔ پیر محمد اکبر کا استاد مقرب خاص اور اتالیق تھا اس کے خلاف یہ حرکت بیرم خان کی طرف سے ایک بہت بڑا جرم تھا اور اکبر کو بتائے بغیر پیر محمد کو پکڑ کر قید میں ڈال دینا ایک بہت بری حرکت بھی تھی۔

چند روز تک پیر محمد بیانہ کے قلعے میں قیدی کی حیثیت سے پڑا رہا پھر بیرم خان کو خدشہ ہوا کہ کہیں وہاں سے نکل کر وہ اکبر سے اس کی شکایت ہی نہ کر دے لہٰذا اسے ہندوستان سے نکال کر بذریعہ کشتی مکہ معظمہ روانہ کر دیا اور خود ہی فیصلہ کرتے ہوئے بیرم خان نے پیر محمد کی جگہ حاجی محمد خان ہستیانی کو اکبر کا اوتالیق اور مقرر کر دیا اس لیے کہ حاجی محمد خان ستیانی بیرم خان کا اپنا آدمی تھا۔

اکبر اور بیرم خان کے درمیان چوتھی غلط فہمی کچھ یوں ہوئی کہ علی خان جو کسی دور میں اکبر کا بہترین سالار تھا اور جس کو مشرق کے صوبوں کا حاکم بنا دیا تھا ایک غلام کے سلسلے میں اس کے اور اکبر کے درمیان سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ اکبر کی اس مخالفت کی پروا کیے بغیر بیرم خان علی قلی کو اپنا بہترین ساتھی' بہترین مصاحب اور اس کو اپنا طرف دار خیال کرنے لگا تھا۔

بیرم خان کی ان کوتاہیوں' غلطیوں' زیادتیوں اور قتل کی وارداتوں کی صدائے بازگشت گونجنے لگی تھی لہٰذا اکبر کے اہل خانہ کے علاوہ اس کے قریبی حلقے بھی اکبر سے بیرم خان کی شکایت کرنے لگے۔ اس طرح اکبر کے عزیز اقارب اور اس کے حلقے احباب میں سے دہلی کا حاکم شہاب الدین احمد خان نیشاپوری جو اکبر کی رضائی ماں کا داماد تھا اس کے علاوہ ماہم انکہ جو اکبر کی رضائی ماں کا شوہر تھا وہ کھل کر بیرم خان کے خلاف اکبر سے بات چیت کرنے لگے اس کے بعد اس بات چیت میں ماہم انکہ کا بیٹا ادھم خان اور اکبر کی ماں حمیدہ بیگم بھی شامل ہوگئی تھیں۔ اس لیے کہ حمیدہ بیگم بیرم خان کو اس کی ان غلطیوں کی وجہ سے سخت ناپسند کرنے لگی تھی۔

بیرم خان کے علاوہ اس کے قریبی ساتھی اور دوست علی قلی خان شیبانی علی قلی خان سیستانی بھی کہا جاتا ہے' دونوں کو خبر ہوگئی تھی کہ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اکبر کا حلقہ احباب ان کے خلاف ہو چکا ہے علی قلی خان کو خان زمان بھی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اب دونوں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ایسی کارروائیاں کریں کہ جو غلطیاں' جو کوتاہیاں ان سے ہوئی ہیں ان کی تلافی کر کے اکبر کی نگاہوں میں پھر پہلے جیسا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اسی دوران بیرم خان کو اس کے ساتھیوں نے یہ بھی خبر دی تھی کہ بیرام خان نے جو اکبر کے استاد پیر محمد کی بے عزتی کر کے اسے ہندوستان سے ملک بدر کر دیا ہے تو اس کی اس حرکت کی وجہ سے اکبر کے دل میں اس کے خلاف بدگمانیاں گہری ہو چکی ہیں چنانچہ بیرم خان اپنے کیے پر پچھتانے لگا لہٰذا اپنی ان ساری غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے اکبر کو یہ ترغیب دی کہ گوالیار کے قلعے پر حملہ کروا کر اس کو اپنی مملکت میں شامل کر لینا چاہیے یہ مشورہ لے کر بیرم خان ایک طرح اکبر کی توجہ کو اپنے معاملات سے ہٹا کر فتوحات کی طرف کرنا چاہتا تھا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بیرم خان نے اکبر سے مشورہ کرنے کے بعد عادل خان کے بڑے بھائی کی صف خان کو شاکر کا کماندار بنا کر گوالیار پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کر دیا۔

گوالیار کسی دور میں شیر شاہ سوری کے بیٹے سلیم شاہ سوری کا مسکن ہوا کرتا تھا اور اس کے بعد عادل شاہ کی طرف سے اس کا ایک غلام خان جس کا سہیل تھا وہ اس قلعے پر قابض تھا سہیل نام کے اس غلام کو جب خبر ہوئی کہ بیرم خان کے مشورے پر گوالیار پر حملہ کروانے اور اس پر قبضہ کرنے کے لیے اکبر نے ایک لشکر گوالیار کی طرف روانہ کیا ہے' تب مغلوں سے اس قلعے کو بچانے کے لیے غلام سہیل نے اندر ہی

اور ایک سازش تیار کی۔
اس نے راجہ خان سنگھ کے پوتے راجہ رام شاہ کو پیغام دیا کہ تمہارے آباؤ اجداد اس قلعے کے حاکم تھے اور تمہارے اسلاف سے سوری خاندان نے یہ قلعہ چھین کر قبضہ کرلیا تھا اب بیرم خان کے کہنے پر اکبر کی نظریں اس قلعے پر جم گئی ہیں اور قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے ایک لشکر بھی روانہ کردیا ہے لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اکبر کے لشکر کے پہنچنے سے پہلے تم خود آ کر اپنے اس آبائی قلعے پر قبضہ کرلو اور اس کے معاوضے میں مجھے کچھ رقم دے دو۔

سہیل کے اس پیغام کو روم شاہ نے اپنے لیے خوش قسمتی اور غیبی امداد جانا چنانچہ ایک لشکر لے کر گوالیار پر قبضہ کرنے کے لیے وہ روانہ ہوا۔

اتنی دیر تک آصف خان بھی اپنے لشکر کو لے کر گوالیار کے نزدیک پہنچ گیا تھا ساتھ ہی ایک مقامی جاگیردار جس کا نام اقبال خان تھا اور وہ مغل سلطنت کا وفادار تھا اپنے ذاتی لشکر کے ساتھ حرکت میں آیا اس طرح وہ روم شاہ سے ٹکراتے ہوئے آصف خان اور اقبال خان نے روم شاہ کو بدترین شکست دی اور اسے بھاگنے پر مجبور کردیا روم شاہ کے ساتھ جہاں بہت سا مال اسباب تھا وہاں بے شمار لڑکیاں بھی تھیں اس لیے کہ روم شاہ تو گوالیار میں مستقل رہائش اختیار کرنے کے لیے روانہ ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ ایک بار وہ گوالیار کے قلعے پر قابض ہوگیا تو مغلوں نے اگر اس پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ اور جو لڑکیاں اس کی نشکر میں شامل تھیں جن کے ساتھ وہ گوالیار کا رخ کیے ہوئے تھا۔ وہ بھی گرفتار کرلی گئیں دوسری طرف غلام سہیل خان کو جب خبر ہوئی کہ اس نے روم شاہ سے معاوضہ لے کر گوالیار کا قلعہ اس کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن روم شاہ کو بدترین شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کردیا گیا ہے۔ تو قلعے کے اندر محصور ہوگیا اقبال خان اور آصف خان نے آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کرلیا تھا۔

سہیل خان کو اب اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ زیادہ دن تک تو قلعے میں محصور رہ کر اقبال خان اور آصف خان کا تو مقابلہ نہیں کرسکتا لہٰذا اس نے خفیہ طور پر تیز رفتار قاصد اکبر کی طرف روانہ کیے اور اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اظہار کیا' جس کے نتیجے میں اکبر نے ایک شخص حاجی محمد خان کو گوالیار کا حاکم بنا کر روانہ کیا اور اسے یہ حکم دیا کہ آصف خان سے کہے کہ وہ لشکر لے کر واپس آجائے ساتھ ہی گوالیار کے سابق حاکم سہیل کو بھی آگرہ لے آئے جب کہ حاجی محمد خان کو ایک طرح سے گوالیار کا حاکم مقرر کردیا گیا تھا یوں حاجی محمد خان کو گوالیار اور سہیل کو اس نے آصف خان کے حوالے کردیا حاکم کی حیثیت سے وہ گوالیار میں داخل ہوگیا جب کہ آصف خان سہیل کو لے کر آگرہ کی طرف کوچ کرگیا۔

راجہ روم شاہ کے لشکر کو شکست دیتے وقت جو لڑکیاں ہاتھ لگی تھیں ان میں سے ایک انتہائی خوبصورت اور پرکشش لڑکی تھی نام جس کا سندر دیوی تھا آصف خان اس کی گرفتاری کے وقت ہی اس پر الجھ گیا تھا اور گوالیار پر کارروائی کرنے کے دوران تک اس کی ملاقاتیں جاری رہیں ان ملاقاتوں کے نتیجے میں سندر دیوی نام کی وہ لڑکی بھی آصف خان کو پسند کرنے لگی جب آصف خان کامیاب ہوکر واپس گوالیار پہنچا تو اکبر نے اس کے منصب میں اضافہ کردیا ایک ہزاری سے اسے پنج ہزاری امیر پانچ ہزار لشکریوں کا سالار بنادیا گیا تھا ساتھ ہی آصف خان کی خواہش پر سندر دیوی سے آصف خان کا نکاح ہوگیا تھا۔ صدر کو دیکھتے ہوئے اکبر نے آصف خان کی شادی کے بعد آگے آگرہ میں رہائش کے لیے چھوٹی سی حویلی بھی رہائش کے لیے دی تھی اس سے پہلے جو چہار باغ کے سامنے دونوں بھائیوں کے پاس ایک چھوٹا سا مکان تھا وہ بھی انہیں کے پاس رہنے دیا گیا تھا۔ شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ آصف خان نئی حویلی میں رہنے لگا شروع کے چند دنوں میں عادل خان بھی اپنے بھائی اور بھاوج کے

ساتھ اس حویلی میں رہا لیکن آہستہ آہستہ سمندر دیوی یعنی فخر النساء عادل خان کے وہاں رہنے کو ناپسند کرنے لگی اس کے اس رویے کو عادل خان نے بھانپ لیا تھا لہٰذا بھائی کے پاس رہنے کے بجائے وہ پہلے مکان میں رہنے لگا تھا اس کے اس رویے کو آصف خان نے ناپسند کیا۔ کئی بار اس نے عادل خان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا لیکن عادل خان طرح طرح کے بہانے کرکے ٹال دیتا اس نے کبھی فخر النساء کے رویے کی شکایت اپنے بھائی سے نہ کی تھی تاہم پھر وہ بھائی کے کہنے پر کبھی کبھار اس کی حویلی میں ملنے کے لیے جاتا اگر آصف خان گھر پر ہوتا تو وقت اچھا گزر جاتا لیکن اگر کبھی اس کی غیر موجودگی میں عادل خان وہاں جاتا تو اس کی آمد کو فخر النساء انتہا درجہ کا ناپسند کرتی نہ اس کی آؤ بھگت کرتی نہ اس سے بات چیت کرتی اس کے عادل خان نے اندازہ لگالیا کہ فخر النساء کہ اس کا وہاں آنا جانا بھی پسند نہیں اس بنا پر اس نے ایک عرصہ سے اپنے بھائی کے ہاں آنا جانا بھی کم کردیا تھا۔

گوالیار کی مہم کا آغاز اور اسے سر کرکے یہ بیرم خان یہ خیال کرنے لگا تھا کہ اس نے اکبر کا دل اپنی طرف سے صاف کردیا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا بیرم خان سے جو زیادتیاں اور غلطیاں ہوئی تھیں وہ اکبر کے دل میں جڑ پکڑ چکی تھیں اور اب ان اختلاف کو کچھ لوگ جن میں زیادہ تر اکبر کے لواحقین تھے جہاں تک بیرم خان کے ہم خیال ہم پیالہ اور اسکے زبردست حمایتی علی قلی خان شیبانی کا تعلق تھا تو اکبر شروع میں اس کی کارگزاری سے بڑا خوش تھا اور اسے خان زمان کا خطاب بھی دیا تھا اور مشرق کے کچھ علاقوں کا اسے حاکم بھی مقرر کیا تھا بعد میں ایک غلام زوجہ سے اکبر اور علی قلی خان کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے اور علی قلی خان ہی کی وجہ سے وہ غلام جو ایک عرصہ تک اکبر خدمت میں رہا تھا وہ مار آ گیا تھا اس طرح علی قلی خان کے خلاف ہی اکبر کے دل میں ایک گانٹھ سی لگ گئی تھی علی قلی خان کو بھی پتا چل گیا تھا کہ بیرم خان کی طرح اس کے لیے بھی اکبر کے دل میں نفرت پیدا ہوچکی ہے لہٰذا اس نے اس نفرت کو زائل کرنے کے لیے بیرم خان کا سا ہی طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ان دونوں جون پور اور بنارس کے علاقے مغل سلطانت میں شامل نہیں تھے یہ ہی علاقے ہمایوں کے عہد میں افغانوں کے قبضے میں چلے گئے تھے اب علی قلی خان نے یہ سوچا کہ اگر وہ جون پور اور بنارس کے علاقے میں افغانوں سے چھین کر مغلوں سلطنت میں شامل کردے تو وہ اکبر کے دل میں پہلے کی طرح جگہ بنا سکتا ہے۔

چنانچہ علی قلی خان اس لشکر کو لے کر حرکت میں آیا جو اس وقت اس کی کمانداری میں تھا پرجوش انداز میں جون پور اور بنارس پر حملہ آور ہوا اور ان دونوں علاقوں کو فتح کرکے اس نے مغل سلطنت میں شامل کرلیا تھا اکبر کو جب خبر ہوئے کہ علی قلی خان سیستانی نے یہ دونوں علاقے فتح کرکے مغل سلطنت میں شامل کرلیتے ہیں تب اکبر نے علی قلی خان یا اس کے اقدام کو سراہتے ہوئے اسے پسند کیا اور اکبر علی قلی خان سے مہربانی کا اظہار کرنے لگا ساتھ ہی علی قلی خان کی اس کارگزاری کو سامنے رکھتے ہوئے اکبر نے علی قلی خان کے علاوہ اس کا بھائی بہادر خان کو بھی خلقت کے علاوہ کمر بند اور مرصع شمشیریں عنایت کی تھیں اس نرم علی قلی خان تو اکبر کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا لیکن بیرم خان سے کیونکہ بڑی اور انتہائی مہلک غلطیاں ہوئی تھیں لہٰذا گوالیار کی مہم اس کے حق میں اکبر کے دل کو صاف نہ کرسکی تھی۔

☆☆☆

ریاست گونڈوانہ کی رانی درگاوتی ایک اندر اپنی خواب گاہ میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کی خواب کے دروازے پر اس کی چھوٹی بہن کملا دیوی اور بھتیجی رتن کماری نمودار ہوئیں رانی سے اجازت لے کر دونوں اندر داخل ہوئیں رانی درگاوتی کے سامنے جو خالی نشست تھی دونوں اس پر بیٹھ گئیں پھر عجیب سے

انداز میں دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگی تھیں اس دوران رانی درگاوتی بھی گہری نگاہوں سے دونوں کا جائزہ لے رہی تھی باری باری اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

"دیدی! میں اور رتنا کماری نے آپس میں مشورہ کیا ہے کہ ہم دونوں چند ماہ دہلی رہ آئیں، دہلی سے آگرہ جائیں گی اور وہاں سے واپس آجائیں کہ دراصل رتن کماری کے دو ماموں تھے ایک کی رہائش دہلی اور دوسرے کی آگرہ میں تھی اسی بنا پر رتن کماری اور کملا دیوی نے مل کے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ چند ماہ کے لیے دہلی اس کے بعد آگرہ رہ کر واپس آجائیں گی۔"

رانی درگاوتی نے بڑے غور سے ان کی بات سنی پھر کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ اسی لمحہ کمرے کے دروازے کے قریب سیناپتی سنسار سنگھ نمودار ہوا اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔

رروتی نے جب اسے اندر آنے کے لیے کہا تب وہ آگے بڑھا، رانی کے اشارے پر ایک نشست پر بیٹھ گیا پھر درگاوتی نے اسے مخاطب کیا۔ "کیا تم کوئی اہم خبر لے کر آئے ہو؟"

سنسار سنگھ نے پہلے اثبات میں سر ہلایا پھر دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

"میرا دل کہتا ہے ہمارے لیے کچھ خدشات اٹھنے شروع ہوگئے ہیں۔"

سنسار سنگھ کے ان الفاظ پر رانی درگاوتی نے گھبرانے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر کسی قدر پریشانی کے آثار بھی نمودار ہوگئے تھے پھر سنسار سنگھ کو اس نے مخاطب کیا "کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

جواب میں سنسار سنگھ نے گلہ صاف کیا اس کے بعد وہ کہہ رہا تھا۔

"مالکن میں نے پہلے آپ پر واضح کیا تھا کہ آصف خان اور عادل خان دونوں بھائی بھاگ کر مغلوں کے لشکر میں جا چکے ہیں اب جو نئی خبر آئی ہے وہ کسی قدر پریشانی کا باعث ہے وہ دونوں یہاں سے بھاگنے کے بعد مغلوں کے لشکر میں شامل ہوگئے تھے اور وہاں انہوں نے اپنی بہترین کارگزاری کی بناء پر مغلوں کے لشکر میں اپنا ایک اچھا خاصا مقام بنالیا ہے چند دن پہلے کی جو خبر میرے پاس پہنچی ہے اس کے مطابق اکبر نے آصف خان کو ایک ہزاری سالار مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد گوالیار کی مہم اس کے سپرد کی گئی تھی۔ لشکر نے گوالیار فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا ہے اور آصف خان اب ایک ہزار کے بجائے پنج ہزار سالار ہے۔ اس وقت پانچ ہزار لشکری اس کی کمانداری میں ہے۔

جہاں تک عادل خان کا تعلق ہے تو اس سے متعلق خبریں بھی تشویش کا باعث ہیں آپ جانتی ہیں کہ وہ لڑکپن ہی میں بہترین نشانے باز تھا اور اس کی تیر اندازی شبہے کی حد تک بے خطا تھی، اپنے اس فن اپنی اسی ہنرمندی کا مظاہرہ اس نے اکبر کے لشکر میں جا کر کیا پہلے سکندر شاہ سوائی کے ساتھ ٹکراؤ کے دوران اس نے بہترین تیراندازی کی اور سکندر شاہ کے دونوں بازو زخمی کر کے اسے شکست سے دوچار کرنے کا ایک ذریعہ بنا۔

اس کے بعد جب مغل لشکر ہیمو بقال سے ٹکرایا تو اسی عادل خان نے ہیمو بقال پر ایسا تیر مارا، اس کا تیر ہیمو بقال کی آنکھ سے ہوتا ہوا سر کو پچھلی سمت سے نکلا اور اس کے اس تیر کی وجہ سے ہیمو بقال کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی اسے شکست ہوئی اس کی انہیں کارگزاری کو دیکھتے ہوئے اکبر نے عادل خان کو اپنے محافظ دستے میں شامل کر دیا ہے گو ابھی وہ نوعمر ہے لیکن پھر بھی اکبر کی نگاہوں میں ایک مقام حاصل کرلیا ہے۔ نوعمری میں آ کر اس کی یہ حالت ہے تو جوان ہو کر وہ اس سے بھی زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔

آپ کے پاس آنے اور ساری خبریں سنانے کا مقصد یہ ہے کہ آصف خان اور عادل خان جو بڑی تیزی سے مغل لشکر کے اندر ترقی کر رہے ہیں اور اکبر کی نگاہوں میں آرہے ہیں تو کسی روز وہ ہماری

ریاست پر حملہ آور ہونے کا سبب بھی بن سکتے ہیں اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ ہمیں جہاں اپنے لشکر کو استوار کرتے ہوئے اس کی بہترین تربیت کا کام سو انجام دینا چاہیے لشکر میں اضافہ بھی کرنا چاہیے۔''

سنسار سنگھ کے ان الفاظ پر رانی درگاوتی کسی قدر پریشان ہوگئی تھی کچھ سوچا پھر کہنے لگی۔

''سنسار سنگھ تم اپنے لشکر کی تعداد جس قدر بڑھانا چاہتے ہو بڑھا سکتے ہو اس کے لیے جس قدر رقم تمہیں چاہیے ہوگی وہ میں تمہیں مہیا کروں گی بس میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آنے والے دور میں اگر آصف خان یا عادل خان میں سے کسی نے اپنے باپ اور اپنے اہل خانہ کی ہلاکت کا ہم سے انتقام لینے کا کوئی ذریعہ پیدا کرلیا تو ہمیں اس قابل ہونا چاہیے کہ ہم ان کے حملوں کا ناکام بنا کر نا صرف ان کی انتقامی کارروائی کے بیچ سکیں بلکہ انہیں پسپا کر کے اپنی بقا اور سلامتی کو بحال رکھ سکیں۔''

رانی درگاوتی جب خاموش ہوتی تو سنسار سنگھ پر بول اٹھا۔

''جن سے مجھے یہ خبریں ملی ہیں ان کا کہنا ہے کہ آصف خان نے شادی بھی کرلی ہے دراصل جس وقت اکبر نے گوالیار کی مہم اس کے ذمے لگائی اور گوالیار اس نے فتح کیا تو گوالیار پر قبضہ کرنے کے لیے سب سے پہلے راجہ مان سنگھ کا پوتا رام شاہ اپنے لشکر کو لے نکلا تھا پھر رام شاہ کو اس آصف خان کے شکست دی۔ رام شاہ شکست اٹھا کر جب بھاگا تو اس کے شکر میں جو لڑکیاں تھیں گرفتار ہوگئیں' ان میں ایک لڑکی جو رام شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی نام جس کا سندر دیوی تھا اور انتہا درجہ کی خوبصورت تھی آصف خان اس پر فریفتہ ہوگیا' دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں وہ لڑکی بھی آصف خان کو پسند کرنے لگی اور آخر کار اس لڑکی نے اسلام قبول کرلیا سندر دیوی سے وہ فخر النساء بن گئی اور اب وہ آصف خان کی بیوی ہے بتانے والے نے مجھے یہ ہی بتایا کہ آصف خان کی بیوی کی وجہ سے آصف خان کے چھوٹے بھائی عادل خان نے اس سے علیحدہ رہائش اختیار کرلی ہے۔ اس لیے کہ وہ فخر النساء اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ عادل خان ان کے ساتھ رہے لہٰذا اب دونوں بھائی علیحدہ ہو چکے ہیں۔ آصف خان اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے اور عادل خان جو نوعمر ہے وہ آگرہ میں چہار باغ کے سامنے اپنے اس مکان میں رہتا ہے جو شروع شروع میں اکبر نے ان دونوں بھائیوں کو دیا تھا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سنسار سنگھ خاموش ہوگیا پھر رانی درگاوتی سے اجازت لے کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

اس کے جانے کے بعد رانی درگاوتی نے باری باری گھورنے کے انداز میں کملا دیوی اور رتن کی اس کی طرف دیکھیں پھر کہنے لگی۔

''تم نے سنسار سنگھ کی گفتگو سنی تم دونوں پہلے دہلی پھر آگرہ جانے کا ارادہ رکھتی ہو کیا ان حالات میں تمہارا وہاں جانا محفوظ ہے' ہمارے لوگوں کی وجہ سے آصف خان اور عادل خان کا باپ عبداللہ خان مارا گیا اور پھر اس کی ماں بہنوں کا خاتمہ ہوا' اس کے مکان کو آگ لگادی گئی ان حالات میں اگر تم پہلے دہلی اور پھر آگرہ جاؤ گی تو کیا تم دونوں سلامت وہاں سے واپس آسکو گی۔ آصف خان اور عادل خان کو جب خبر ہوئی کہ تم دونوں وہاں پہنچی ہو تو کیا وہ تم دونوں سے انتقام نہیں لیں گے۔''

رانی درگاوتی جب خاموش ہوئی تب کملا دیوی بولی کہنے لگی۔

''وہ دونوں بھائی ہم سے کیوں انتقام لیں گے ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے اور پھر دیدی رتن کماری کے ماموں بھی تو دہلی اور آگرہ میں رہتے ہیں اگر انہوں نے انتقام ہی لینا ہوتا تو کیا وہ رتن کماری کے ماموں جن میں سے ایک دہلی اور دوسرا آگرہ میں رہتا ہے ان کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے ہوئے ان کا خاتمہ نہیں کرسکتے تھے جب کہ انہیں کچھ نہیں کہا گیا۔''

اپنی چھوٹی اور نوعمر بہن کملا دیوی کے ان الفاظ پر رانی درگاوتی مسکرائی گھورنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''تم کچھ زیادہ ہی بولنے نہیں لگ گئی ہو دیکھو پہلے مجھے حالات کا جائزہ لینے دو اگر میں نے دیکھا کہ تمہارا دہلی اور آگرہ جانا تم دونوں کے لیے نقصان دہ نہیں تو فکرمند نہ ہو میں تم دونوں کو جانے کی اجازت دے دوں گی فی الحال اس معاملے میں خاموشی اختیار کیے رہو۔''

کملا دیوی اور رتن کماری بھی کسی حد تک رانی درگاوتی کے اس فیصلے سے مطمئن ہوگئی تھیں پھر اس کی خواب گاہ سے نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

بیرم خان اپنی جگہ مطمئن تھا کہ گوالیار کی فتح کے بعد اس نے ایک طرح سے اپنی طرف سے اکبر کا دل صاف کر دیا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا اکبر بظاہر خاموش تھا اس لیے کہ اس وقت سلطنت کے سارے امور پر بیرم خان کی گرفت تھی لیکن انہیں دونوں بیرم خان سے ایک ایسی غلطی ہوئی جس کی بناء پر اکبر اس کے خلاف حرکت میں آنے پر آمادہ ہوا۔

ہوا یوں کہ اکبر سلطنت کے سارے امور بیرم خان کے حوالے کر کے خود شکار کے لیے روانہ ہوا جب وہ دہلی کے مضافات میں سکندر آباد پہنچا تب اس کی خدمت میں اس کی دودھ شریک ماں کا شوہر ماہم انکہ اور اس کا بیٹا ادھم خان حاضر ہوئے اور اکبر پر یہ انکشاف کیا کہ اس کی ماں دہلی میں سخت بیمار ہے اگر حضور اس کی عیادت کے لیے چلیں تو ان کو خوشی ہوگی چنانچہ اکبر نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے دہلی کا رخ کیا دہلی پر اس وقت اکبر کی طرف سے شہاب الدین احمد خان نیشاپوری حاکم تھا جو ماہم انکہ کا داماد تھا سب نے مل کر اکبری کا بہترین استقبال کیا کیا بہت سے گراں قدر نادر تحائف بھی اکبر کی خدمت میں پیش کیے آخر ایک روز شہاب الدین نیشاپوری اور ادھم خان دونوں آپس میں اتفاق کرنے کے بعد اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شہاب الدین اکبر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''ہمیں یقین ہے کہ ہمارے آخر دن قریب آ گئے ہیں کیونکہ بیرم خان حضور کے اس سفر کو ہماری التجا اور درخواست کا نتیجہ سمجھ کر مصاحب بیگ کی طرح ہمیں بھی تلوار کے گھاٹ اتار دے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ حضور ہمیں مکہ معظمہ اور دیگر مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے کی اجازت دیں تاکہ ہم خیر خواہان حکومت اپنی باج بچا سکیں اور حضور کے اقبال اور عمر کی زیادتی کے لیے دعا مانگتے ہیں۔''

ان دونوں کی یہ التجا سن کر اکبر بہت متاثر ہو لیکن ان کے کہنے پر اس نے بیرم خان کو معزول کر دینا بھی مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس نے بڑی جانفشانی سے حکومت اور بادشاہ کی خدمت کی تھی تاکہ شہاب الدین نیشاپوری اور ادوم خان کو تسلی اور تشفی کے لیے اکبر نے ایک خط بیرم خان کے نام لکھا اس خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

''میں دہلی میں اپنی والدہ کے احوال پرسی کے لیے آیا ہوں دہلی کی طرف میرا آنا شہاب الدین اور ادھم خان کے مشورے کا نتیجہ نہیں ہے اس لیے اگر تم ان دونوں کو ایک تسلی آمیز خط اپنے قلم سے لکھ کر بھیج دو تو یہ دونوں مطمئن ہو جائیں گے۔''

یہ خط بیرم خان کی طرف بھجوا دیا گیا اور دہلی میں قیام کے دوران شہاب الدین سے اکبر کے سامنے تھلم کھلا ایسی باتیں کیں جن سے بیرم خان کی غداری اور سرکشی کا پتا چلا تھا اس طرح گویا شہاب نے اکبر کو بیرم خان سے پوری طرح بدگمان اور بدظن کر کے رکھ دیا تھا۔

بیرم خان کو جب اکبر کا یہ خط ملا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے اس وقت اکبر کو خط لکھا' اس کے خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

اس قسم کی بدگمانیوں سے میں لاکھوں کوس دور ہوں۔ یہ ناممکن ہے کہ خیر خواہان حضور اور جان نثاران سلطنت کے متعلق کوئی برا خیال میرے دل

میں آئے۔

بیرم خان نے یہ خود اپنے قلم سے لکھا اور ایک شخص حاجی محمد خان سیستانی اور ترسون بیگ کے ذریعے اس نے یہ خط اکبر کی طرف دہلی روانہ کردیا۔

لیکن بیرم خان کی بدقسمتی کہ انہیں دنوں اس سے ایک اور غلطی سرزد ہوئی جو ناقابل معافی تھی اور جس کی وجہ سے اکبر اس کے خلاف حرکت میں آ گیا تھا۔

کچھ یوں ہوا کہ اکبر کی تخت نشینی کا وقت آیا تو ایک شخص ابوالمعالی نے اس کی مخالفت کی جس کی بنا پر اسے گرفتار کر کے لاہور کے زندان میں ڈال دیا گیا تھا۔

چنانچہ یہی ابو المعالی انہی دنوں لاہور کے قید خانے سے فرار ہو کر ایک شخص کمال خان گکھڑ کے پاس پناہ گزین ہوا اور اس نے کمال خان کو کشمیر کی فتح کے لیے اکسایا۔ کمال خان گکھڑ نے ابوالمعالی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے کشمیر پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر واپس آ گیا۔ اس شکست کی وجہ سے اس نے ابوالمعالی کو اپنے ہاں سے نکال باہر کیا۔

چنانچہ وہ دیپالپور پہنچا' وہاں ایک سازش میں ملوث ہوا اور دیپالور کے حاکم نے بھی اسے دیپالپور سے نکالا اور سندھ کی طرف بھیج دیا۔

سندھ میں داخل ہونے کے بعد ابو المعالی گجرات چلا گیا' وہاں اس سے ایک قتل ہو گیا۔ لہٰذا گجرات سے بھاگ کر وہ جون پور علی قلی خان سیستانی کے پاس چلا گیا جو بیرم خان کا بہترین ساتھی تھا۔

چنانچہ علی قلی خان نے اس سلسلے میں بیرم خان سے مشورہ کیا۔ بیرم خان کے اشارے پر علی قلی خان نے اسے جون پور سے آگرہ روانہ کردیا۔ ان دنوں اکبر نے دہلی میں قیام کیا ہوا تھا۔ چنانچہ بیرم خان نے وقتی طور پر لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے ابو المعالی کو بیانہ کے قلعے میں قید کردیا۔ بعد میں بیرم خان نے اسے وہاں سے بھی آزاد کردیا اور یہ ایسی غلطی تھی جسے اکبر برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

ان حالات کی خبر جب دہلی میں اکبر کو ہوئی تو اس نے فی الفور اس کے خلاف کارروائی کی۔ اس نے ایک فرمان جاری کیا' جس کے تحت اس نے سلطنت کا سارا اقتدار خود سنبھال لیا اور یہی اعلان کردیا کہ آئندہ ایسا کوئی حکم نہ مانا جائے جو شاہی مہر کے بغیر جاری کیا گیا ہو۔

بیرم خان کو جب ان حالات کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے کچھ وفاداروں کو خفیہ طور پر دہلی بھیجا تا کہ وہ اکبر کو بیرم کی طرف سے وفاداری کا یقین دلائیں لیکن اس میں اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

ان حالات میں بیرم خان ایسا بوکھلایا کہ اس سے غلطی پر غلطی سرزد ہونے لگی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے ارادہ کیا کہ وہ آگرہ سے نکل کر مالوہ کا رخ کرے جو لشکر اس کے تحت کام کرتا ہے' اسے اپنے ساتھ لے جائے اور مالوہ کو فتح کر کے وہاں اپنی خودمختار حکومت قائم کرنے کا اعلان کردے۔ ان دنوں وہاں کا اکثر و بیشتر حصہ باز بہادر کے تحت تھا جو گانے والیوں کے جھرمٹ میں پھنسا ہوا تھا۔ لہٰذا اسے فتح کرنا آسان تھا۔

چنانچہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بیرم خان آگرہ سے بیانہ پہنچا۔ وہاں اس نے کچھ دیگر سالاروں اور لشکریوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا لیکن جب اس کا ساتھ دینے والے سالاروں کو خبر ہوئی کہ وہ تو اکبر کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے اور مالوہ پر حملہ آور ہو کر وہاں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے تو اکثر سالار اور لشکر بیرم خان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ چنانچہ بیرم خان کو اپنی تباہی اور بربادی سامنے دکھائی دینے لگی۔ ان حالات میں بیرم خان اپنے مالوہ کے سفر پر بڑا نادم اور شرمندہ ہوا۔

اس کے بعد اس نے جون پور جانے کا ارادہ کیا' اس لیے کہ جون پور پر اس وقت علی قلی خان حاکم تھا جو بیرم خان کا دست راست تھا اور ایک طرح سے وہ بیرم خان کا طرف دار بھی تھا۔ بیرم کان کا ارادہ تھا کہ وہ جون پور پہنچ کر علی قلی خان سیستانی کی مدد سے بنگال پر حملہ آور ہوگا' وہاں سے افغانوں کو نکال کر بنگال کو

فتح کرکے وہاں اپنی خودمختار حکومت قائم کرے گا۔

اس ارادے کے پیش نظر بیرم خان نے اب جون پور کا سفر اختیار کیا لیکن وہ ایسا بدحواس ہوا تھا کہ چند منزل کا سفر طے کرنے کے بعد رک گیا۔ اپنا ارادہ بدل دیا اور پھر اس نے بیت اللہ کا حج کرنے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ اس ارادے سے وہ ناگور کی طرف روانہ ہوا۔

چنانچہ بیرم خان جب اپنے لشکر کی ساتھ ناگور پہنچا تو اس کا ارادہ اس کی نیت پھر بدل گئی۔ اس نے اپنے بعض ساتھیوں کو بہلانے پھسلانے پر حج کا ارادہ ترک کردیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے یہ ترغیب دی کہ وہ سارے علاقوں کو فراموش کردے۔ پنجاب کا رخ کرے۔ پنجاب ایک وسیع اور مضبوط علاقہ ہے' وہاں پر قبضہ کرنا آسان ہے۔ چنانچہ پنجاب پر قبضہ کرکے وہ اپنی خودمختار حکومت قائم کرکے اکبر کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

دوسری طرف اکبر بھی بڑا چوکنا تھا' اب سلطنت کے امور میں وہ ماہر ہوچکا تھا اور پھر اس کے مخبر بیرم خان کی نقل و حرکت سے پوری طرح آگاہ کررہے تھے۔ چنانچہ جن دنوں بیرم خان نے ناگور میں قیام کیے ہوئے تھا' اکبر نے فوری طور پر بیرم خان کو اس کے عہدے سے برطرف کرکے ایک فرمان جاری کیا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

''اب ہم براہ راست اپنی رعایا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ ہمارا خان خاناں بیرم خان دنیاداری سے دست بردار ہوکر مکہ چلا جائے اور عوامی زندگی سے لاتعلق ہوکر اپنی باقی زندگی خدا کی عبادت میں گزار دے۔''

بیرم خان کو اکبر کا یہ حکم نامہ ایک شخص امیر عبدالطیف کے ذریعے ملا اور اکبر کا یہ حکم نامہ پاکر بیرم نے حج کے لیے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ اس کے پاس سرکاری منصب کی جو علامات تھیں' وہ سب اس نے آگرہ روانہ کردیں اور خود روانہ ہوا تاکہ گجرات کے راستے مکہ معظمہ کی طرف چلا جائے۔

اب بیرم خان کا ذہن کچھ اس طرح پراگندہ ہوچکا تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی مفقود ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ناگور سے وہ حج کے لیے روانہ ہوا' اس کا ارادہ پہلے گجرات جانے کا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ جب وہ بیکانیر پہنچا' وہاں اس نے ستانے کے لیے آرام کیا تو اس کی نیت اس کے ارادے پھر بدل گئے۔ اس نے حج کا ارادہ ترک کردیا۔ ایک بار پھر اس نے پنجاب پر قبضہ کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

اکبر کو جب بیرم خان کے ان ارادوں کا علم ہوا تو اسے بے حد دکھ اور صدمہ ہوا اور غصے میں آکر اس نے بیرم خان کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔

دوسری طرف بیرم خان بیکانیر سے پلٹ آیا۔ پہلے اس نے بٹھنڈہ کا رخ کیا۔ اس کے پاس جو فالتو سامان تھا' وہ اس نے بٹھنڈہ کے قلعے میں چھوڑا۔ اس کے بعد بیرم خان بٹھنڈا سے نکل کر دیپالپور کے حاکم درویش محمد ازبک کے پاس جائے گا اور اس کے ساتھ مل کر اکبر کا مقابلہ کرے گا کیونکہ درویش محمد ازبک کے ساتھ بیرم خان کے پرانے تعلقات تھے لیکن درویش محمد نے اس سلسلے میں بیرم خان کی کوئی مدد کرنے سے انکار کردیا۔ چنانچہ بیرم خان کو درویش محمد کیاس رویے سے بڑی مایوسی ہوئی۔ لہٰذا وہ جو لشکر اس کے ساتھ تھا' اسے لے کر جالندھر کی طرف ہولیا۔

اکبر بیرم خان کے خلاف حرکت میں آیا۔ ایک لشکر اس نے خان اعظم شمس الدین کی کمانداری میں بیرم کی سرزنش کے لیے پنجاب کی طرف روانہ کیا۔

ماچھی واڑہ کے قلعے کے قریب خان اعظم شمس الدین اور بیرم خان کے لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے اور ٹکرائے۔ چنانچہ ہولناک جنگ شروع ہوئی۔ شروع میں بیرم خان اور اس کے سالاروں نے تیز حملے کرتے ہوئے خان اعظم شمس الدین کے لشکر میں ایک طرح سے کھلبلی مچادی لیکن

جب خان اعظم شمس الدین نے ہولناک انداز میں جوابی کارروائی کی تو اس کارروائی میں خان اعظم نے بیرم خان کے بڑے بڑے نامور سالاروں اور عہدے داروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بیرم خان نے جب جنگ کا یہ رخ دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ خان اعظم شمس الدین کے ہاتھوں اسے بدترین شکست ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ خان اعظم فتح کی صورت میں اس کا سر کاٹ کر اکبر کے سامنے پیش کردے۔ چنانچہ اپنی شکست کو قبول کرتے ہوئے بیرم خان ماچھی واڑہ کے میدان جنگ سے بھاگ کر کوہستان سوالک کی طرف چلا گیا تھا۔

یہ صورت حال بیرم خان کے لیے انتہائی نازک تھی' اسی دوران اکبر بھی حرکت میں آیا۔ اس نے لاہور کا رخ کیا۔ چند دن لاہور میں قیام کرنے کے بعد اکبر نے کوہستان سوالک کا رخ کیا' جہاں بیرم خان نے پناہ لی تھی۔ کوہستانی سلسلے کے پاس جاکر اکبر کے لشکر کا ایک حصہ کوہستان میں داخل ہوا' وہاں بیرم خان کے حامیوں نے مقابلہ کیا لیکن انہیں شکست فاش ہوئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے بیرم خان نے مجبور اور معذور اپنے غلام جس کا نام جمال خان تھا' اسے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور اپنی سابقہ خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے اکبر سے اپنے قصور کی معافی طلب کی۔ چنانچہ اکبر نے بیرم خان کی تسلی اور تشفی کے لیے اپنے ایک امیر کو جس کا نام عبداللہ سلطان پوری تھا' بیرم کی طرف روانہ کیا اور عبداللہ سلطان پوری بیرم کو لے کر اکبر کی طرف روانہ ہوا۔

اکبر کو جب خبر ہوئی کہ بیرم اس کی طرف آرہا ہے تو اس نے اپنے امیروں اور اراکین سلطنت کو بیرم خان کے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ یہ امیر بیرم خان کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ اکبر کے پاس لے کر گئے۔ چنانچہ اکبر کے پاس آتے ہی بیرم خان نے اظہار فرمانبرداری کے طور پر دینی پگڑی گلے میں ڈال لی اور پھر اکبر کے قدموں میں گر کر زاروقطار رونے لگا۔

اکبر نے بہت خلوص اور محبت سے بیرم خان کا سر اپنے قدموں سے اٹھایا اور اس کی عزت افزائی کی۔ بیرم خان کی ندامت اس کی شرمندگی اور خجالت کو مٹانے کے لیے اکبر نے اسے خلعت سے سرفراز کیا اور اسے مخاطب کرکے کہا۔

''اگر تم نظم ونسق کے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہو تو میں کالپی اور چندیری کا علاقہ تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ اگر تم میری مصاحبت میں رہنا چاہتے ہو تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگر حرمین الشریفین کی زیارت کی تمنا رکھتے ہو تو میں تمہیں حج کے لیے مکہ معظمہ بھجوادوں گا۔''

بیرم خان نے اکبر کی اس گفتگو کے جواب میں حج کے لیے جانے پر رضامندی کا اظہار کیا جس پر اکبر نے بیرم کو پچاس ہزار روپے کی گراں قدر رقم عنایت کی اور اسے حج پر جانے کی اجازت دے دی۔

بیرم خان کو رخصت کرنے کے بعد خود اکبر پنجاب میں شکار کھیلتا ہوا آگے بھا۔ حصار فیروز پور کے راستے آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ دوسری طرف بیرم خان مکہ معظمہ جانے کے لیے گجرات کی طرف چل دیا تاکہ وہاں کسی بندرگاہ سے بذریعہ کشتی مکہ معظمہ کا راستہ لے۔

بیرم خان گجرات پہنچا اور ایک نواحی علاقے میں مقیم ہوا' وہاں قیام کے دوران ایک افغان جس کا نام مبارک خان تھا' بیرم خان کے پیچھے پڑ گیا اور اسے قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ دراصل اس لوحانی افغان کا باپ بیرم خان کے ان ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا' جنہوں نے پانی پت کی جنگ میں ہیمو بقال کا مقابلہ کیا تھا' اس لیے کہ اس مبارک خان نام کے افغان نوجوان کا باپ ہیمو بقال کا ساتھ دیتے ہوئے فصلوں کے خلاف لڑا تھا۔

چنانچہ جس وقت بیرم خان ان علاقوں میں مقیم تھا۔ مبارک خان اس کے پاس آیا اور اس نے اپنے

خنجر سے بیرم خان پر تین وار کیے۔ بیرم خان لاعلمی کی وجہ سے اپنا تحفظ نہ کر سکا۔ زخم اتنے کاری تھے کہ وہ ان کی تاب نہ لا کر ٹھنڈا ہو گیا۔ بیرم خان کے قتل کے بعد افغانوں نے اس کے لشکر پر چھاپہ مارا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے لگے تھے۔

بیرم خان نے کئی شادیاں کی تھیں اور اس کی کئی بیویوں سے ایک بیوی حسن خان میواتی کے چچا زاد بھائی جمال خان کی بیٹی تھی۔ اس سے بیرم خان کا ایک چار سالہ بیٹا عبدالرحیم بھی تھا جو اس وقت بیرم خان کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بیرم خان کے ساتھ اس کے چار سالہ بیٹے عبدالرحیم کو لے کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ بیرم خان کے اس قتل میں کسی عورت کا ہاتھ تھا جو روانگی کے وقت بیرم خان کے ساتھ منسلک ہو گئی تھی۔

اس طرح بیرم خان کا بیٹا عبدالرحیم آگرہ میں اکبر کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اکبر نے اس بچے کی تعلیم و تربیت کا بہترین اہتمام کیا۔ یہی وہ عبدالرحیم تھا جس نے اکبر کے آخری دور نہ صرف ایک اعلیٰ منصب حاصل کیا بلکہ اکبر نے اسے خان خانان کا بھی خطاب دیا تھا۔

بیرم خان بدخشاں کا رہنے والا تھا۔ اس کے دادا کا نام شیر علی تھا۔ اپنے ابتر حالات کی وجہ سے شیر علی مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا کابل پہنچا' وہاں اس نے اپنے آٹھ سو ساتھیوں کا ایک لشکر تیار کیا اور شیراز کو فتح کرنے کے ارادے سے فارس کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں سیستانی اور ترکمانی نوجوانوں کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لیے اور جب وہ شیراز پہنچا تو اس کے ساتھ اچھا خاصا لشکر تھا جب شیراز پر حملہ آور ہوا۔ لڑائی ہوئی تو اس معرکے میں شیر علی کو شکست ہوئی' وہ اپنا تمام مال اسباب تباہ کر کے بحال خراسان کی طرف روانہ ہوا۔

خراسان کی طرف جاتے ہوئے بھی شیر علی ہر ممکن طریقے سے لشکر اور مال اسباب جمع کرتا رہا۔ اس سلسلے میں وہ طرح طرح کی دست درازیاں بھی کرتے رہا۔ مختلف قصبوں بستیوں پر حملہ آور ہو کر اپنے لیے ضرورت کے سامان کے علاوہ لشکر بھی جمع کرتا رہا۔ اس نے شیر علی پر راستے ہی میں حملہ کر دیا۔ فریقین میں معرکہ آرائی ہوئی۔ شیر علی میدان جنگ میں کام آ گیا۔ اس کی اولاد اور ملازم ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

شیر علی کے فرزند کا نام یار علی بیگ تھا اور اس نے قندز پہنچ کر خسرو شاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ جب بابر نے خسرو شاہ کے علاقے پر قبضہ کر لیا تو یار علی بیگ اور اس کا بیٹا سیف علی بیگ بابر کے ملازم ہو گئے۔

یار علی بیگ کے بعد سیف علی بیگ باپ کا جانشین ہوا اور اسے غزنی کی جاگیرداری ملی۔ سیف علی نے جب غزنی ہی میں وفات پائی تو اس کا بیٹا بیرم خان اس وقت بہت چھوٹا تھا' اس لیے وہ اپنے عزیزوں کے پاس بلخ چلا گیا۔

بیرم کی تعلیم و تربیت بڑی اچھی ہوئی تھی۔ اس نے متعدد علوم میں کمال حاصل کیا۔ جب وہ جوان ہوا تو کابل چلا گیا۔ وہاں نصیرالدین ہمایوں جوان دنوں کابل میں ایک شہزادے کی حیثیت سے قیام کیے ہوئے تھا' اس کے پاس ملازم ہو گیا۔

بیرم خان نے اپنی پسندیدہ عادات' موزوں طبع' بلند کرداری اور فن موسیقی میں مہارت کی وجہ سے ہمایوں کے دل میں گھر کر لیا اور اس کا مصاحب خاص بن گیا تھا۔

جب بیرم خان کی عمر سولہ سال کی تھی' اس نے ایک جنگ میں بڑی بہادری اور جواں مردی کا مظاہرہ کیا اور اس وجہ سے اسے شہرت ملی۔ بابر نے بھی بیرم خان کا تذکرہ جب سنا تو اسے اپنے حضور میں طلب کیا۔ بابر نے اس سے گفتگو کی۔ بیرم خان کی قابلیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے حکم دیا کہ بیرم خان اس کے بیٹے ہمایوں کے ساتھ اس کی محبت میں ہمیشہ رہا کرے۔

جہاں تک بیرم خان کی قابلیت کا تعلق تھا تو ہمایوں کے بعد بیرم خان ہی مغل سلطنت کو استحکام بخشنے کا ذمہ دار تھا۔ اس میں شک نہیں' اس نے نہایت وفاداری اور دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکبر بچپن ہی میں ایک سست اور پڑھائی سے دل چرانے والا شخص تھا۔ بیرم خان کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ اکبر کی تعلیم و تربیت اس انداز میں ہو کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کا نظم بطریق احسن سنبھال سکے۔ ہمایوں نے بھی کئی بار اکبر کو تنبیہ کی تھی کہ وہ اپنا رویہ پڑھائی کے سلسلے میں درست کرے۔ چنانچہ بیرم خان بھی ہمایوں کی خواہش کو پورا کرنا چاہتا تھا۔

جہاں تک اکبر کی ذات کا تعلق تھا تو اکبر میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بے حد ذہین اور حافظے کا تیز تھا۔ بچپن میں اس نے تاریخ' فلسفہ اور دینیات سے جتنا دل چرایا' بڑے ہو کر ان علوم میں اس قدر دلچسپی کا اظہار کیا لیکن بنیادی تعلیم کی کمی کے باعث اس کا ذہن مختار فرقوں اور تنازعات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کے نورتن میں سے ابو الفضل یہ سمجھتا تھا کہ اس کا آقا نہ صرف انتہائی عالم و فاضل دانش مند بلکہ شاید انسان سے بھی آگے کوئی چیز ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ غالباً آج تک کسی شہنشاہ کو اتنا بڑا چاپلوس شخص نہیں ملا تھا جتنا ابو الفضل کی صورت میں ملا تھا۔

بہرحال بیرم خان کے مارے جانے کے بعد سلطنت کے سارے امور اکبر نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ سلطنت کے اندر اس نے کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔ کابل کے حاکم کو اس نے دہلی طلب کرلیا۔ اس کا نام منعم خان اور اسے اپنی سلطنت کے وکالت کے عہدے پر مقرر کرتے ہوئے اسے خان خانان کا خطاب عطا کیا اور دہلی کے انتظامات ایک نئے شخص خواجہ عبدالمجید کے سپرد کردیے تھے۔

اکبر ایک روز آگرہ کے مستقر کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس کے محافظ دستوں کا سربراہ عادل خان کے بڑے بھائی آصف خان کو لے کر اکبر کے سامنے آیا۔ آصف خان نے اکبر کو تعظیم دی۔ کچھ دیر تک بڑے غور سے آصف خان کو دیکھتا رہا پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''تھوڑی دیر پہلے تمہارا چھوٹا بھائی عادل خان بھی مجھ سے گفتگو کر کے گیا ہے۔ میں نے اسے بلایا تھا' اس کے طور طریقے اس کا اٹھنا بیٹھنا اور حرب و ضرب میں اس کی مہارت اور مناعی مجھے بے حد پسند ہے۔ اس بنا پر میں نے اب اسے اپنے محافظ دستوں میں شامل کرنے کے بعد اس کے منصب میں بھی اضافہ کردیا ہے جس وقت تم دونوں بھائی ریاست گونڈوانہ سے بھاگ کر یہاں آئے تھے اور میری تم لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی تو تم نے مجھ پر انکشاف کیا تھا کہ تم وہی بھائی ہو لیکن آج عادل خان کے ساتھ میری تفصیلی گفتگو ہوئی تو اس کا کہنا تھا کہ تم تین بھائی ہو اور تمہارا تیسرا بھائی بھی اب چند روز تک آگرہ پہنچنے والا ہے۔ کیا اس کا کہنا درست ہے۔''

جواب میں آصف نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر کہنے لگا۔

''شہنشاہ معظم میرے بھائی عادل خان نے درست کہا ہے۔ اب تک ہم پوچھنے والوں کو صرف یہی بتاتے تھے کہ ہم دو بھائی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہم تین بھائی ہیں۔ دراصل ہمارے ماموں کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہمارے ماموں کی رہائش لاہور کے روشنی دروازے کے اندر تھی۔ لہٰذا بے اولاد ہونے کی وجہ سے میری ماں نے ہمارے ایک بھائی کو ماموں کے حوالے کردیا تھا۔ لہٰذا اسے ہم ماموں کا بیٹا ہی خیال کرتے تھے اور ہم اپنے آپ کو یہی سمجھتے تھے کہ ہم دو بھائی ہیں۔ پوچھنے والے کو بھی یہی بتاتے تھے۔ اب ماموں اور ممانی کی کیونکہ کوئی اولاد نہ تھی' ان کی محبت کا مرکز ہمارا بھائی تھا۔ پہلے ممانی فوت ہوئی' اب ماموں بھی فوت ہوگیا ہے۔ لہٰذا ہمارا بھائی وہاں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ ماموں کے مکان کو مقفل

نے کے بعد ہماری طرف آرہا ہے۔ ہمارے اس بھائی کا نام وزیر خان ہے۔ میرے چھوٹے بھائی عادل خان کا کہنا درست ہے۔ چند روز تک وہ آگرہ پہنچے گا۔''

آصف خان جب خاموش ہوا تب اس کی گفتگو سے اکبر نے اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا تھا پھر کہنے لگا۔

''اب تک تم نے اور تمہارے بھائی عادل خان نے انتہائی جانثاری سے میرے ہاں خدمات انجام دی ہیں۔ تمہارا تیسرا بھائی وزیر خان کیسا ہے' میں نہیں جانتا لیکن تمہاری خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے تمہیں مانک پور کے علاقے کا حاکم بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں سے تم پانچ ہزار کا ایک لشکر لے کر جاؤ گے' باقی لشکر کو تم وہاں تیار کرو گے۔ ان علاقوں کی دیکھ بھال بھی کرو گے' ساتھ ہی ساتھ اپنی طاقت اور قوت میں اضافہ بھی کرو گے۔ اس کے بعد رانی درگاوتی پر ضرب لگاؤ گے۔

رانی درگاوتی کی ریاست مانک پور کے علاقے سے بالکل متصل ہے۔ لہٰذا وہاں پہنچ کر تم اپنی عسکری طاقت اور قوت میں اضافہ کرنا اور پھر رانی پر ضرب لگانا۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ رانی کو اگر تم شکست دینے میں کامیاب ہوگئے تو تم اپنے باپ کے علاوہ اپنی ماں اور بہنوں کے قتل کا اس سے انتقام لے سکو گے اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ رانی کا وسیع علاقہ ہماری ملکیت میں شامل کرلیا جائے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد اکبر رکا۔ اس کے بعد اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس سلسلے میں' میں نے عادل خان سے بھی بات کی ہے۔ وہ فی الحال تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن وہ ریاست گونڈوانہ کی رانی درگاوتی سے انتقام لینے کے لیے بھی بے چین ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پہلے آصف خان مانک پور جائے' وہاں اپنے لشکر کو تیار کرے۔ اس نے مزید یہ کہا ہے کہ جب تم وہاں جاکے اپنے لشکر کی تیاری کی آخری شکل دے دو گے اور اس قابل ہو جاؤ گے کہ رانی پر ضرب لگاؤ تو اطلاع دینا۔ اس اطلاع پر عادل خان بھی تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ وہ رانی کے خلاف جنگ میں ضرور حصہ لینا چاہتا ہے اور میں تم سے یہ بھی کہوں کہ وہ تمہاری فتح کا باعث بھی بن سکتا ہے۔''

اکبر جب رکا' تب بڑا مودب ہوکر آصف خان کہنے لگا۔

''شہنشاہ معظم! آپ کا کہنا درست ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے تیسرے بھائی وزیر خان کا انتظار کرلوں' جب وہ لوٹ کر یہاں میرے پاس پہنچے تو میں اسے اپنے ساتھ لے کر مانک پور چلا جاؤں گا اور دونوں بھائی وہاں لشکر کی تیاری کر کے رانی کے خلاف حرکت میں آنے کی کوشش کریں گے۔''

آصف خان کی اس گفتگو کو اکبر نے پسند کیا۔ کچھ سوچا پھر دوبارہ وہ آصف خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''عادل خان نے مجھ پر انکشاف تو نہیں کیا لیکن اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ تم سے خوش نہیں ہے۔ آج پہلی بار مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ تمہاری شادی کے بعد جو حویلی میں نے تمہیں دی تھی' عادل خان اس حویلی میں تمہارے ساتھ قیام نہیں کرتا بلکہ اس نے اپنے مکان میں قیام کیا ہوا ہے۔''

اکبر کے ان الفاظ پر آصف خان شرمسار سا ہو گیا تھا۔ کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے۔ دراصل میری بیوی کا رویہ میرے چھوٹے بھائی عادل خان کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ پہلے تو مجھے خبر نہ تھی لیکن بعد میں جب میں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ میری بیوی کو میرے چھوٹے بھائی عادل خان کا اپنے ہاں آنا جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے عادل خان نے محسوس کیا۔ لہٰذا اس نے پہلے مکان میں رہائش اختیار کرلی ہے۔ عادل خان مجھے بڑا عزیز اور پیارا ہے اور وہ میرے

پاس میرے ماں باپ کی نشانی ہے۔ میں نے تو اسے یہ بھی پیشکش کی تھی کہ تم میرے ساتھ رہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری بیوی کے ہوتے ہوئے تم وہاں نہیں رہ سکتے تو میں اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہوں لیکن عادل خان نے مجھے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے اپنی بیوی کو چھوڑا تو وہ زندگی بھر مجھ سے کلام نہیں کرے گا۔ اس بنا پر میں خاموش ہو رہا اور حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ آپ کا کہنا درست ہے۔ عادل خان واقعی پہلے والے مکان میں رہتا ہے جبکہ حویلی میں' میں اپنی بیوی کے ساتھ رہائش رکھتا ہوں۔''

اکبر نے خاموش رہ کر کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

''میں نے خانان خان منعم خان سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہاری روانگی کا بندوبست کر دے۔ اس سلسلے میں اس سے مل لینا۔ تمہارا تیسرا بھائی وزیر خان لاہور سے آگرہ پہنچ جائے تو اسے ساتھ لے کر مانک پور روانہ ہو جانا۔''

اس کے ساتھ ہی اکبر وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

چند دن بعد ہی آصف خان اور عادل خان کا تیسرا بھائی جو آصف خان سے چھوٹا اور عادل خان سے بڑا تھا۔ لاہور سے آگرہ پہنچ گیا اور اس کی آمد کے چند روز بعد آصف خان اپنی بیوی کے ساتھ جو لشکر اسے مہیا کیا گیا تھا' اسے لے کر مانک پور کی طرف کوچ کر گیا تھا۔

☆☆☆

اکبر نے جس طرح آصف خان اور وزیر خان دونوں بھائیوں کو مانک پور کی طرف روانہ کیا تھا' اسی طرح اس نے ماہم اتکہ کے بیٹے ادھم خان کو ان علاقوں پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا جن پر باز بہادر حکومت کرتا تھا اور یہ علاقے مالوہ کے تھے۔

رانی درگاوتی سے شکست اٹھانے کے بعد بہادر بالکل ہی عیش و عشرت اور رنگ موسیقی میں کھو کر رہ گیا تھا۔ اس کی عیاشی اس کی عیش و عشرت کی خبریں اور انتہائی خوبصورت گانے والی کے عشق کی داستانیں آگرہ میں اکبر تک بھی پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔

چنانچہ باز بہادر کی انہی عیاشیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اکبر نے فیصلہ کیا کہ مالوہ کے علاقے پر حملہ کر ڈالو' اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لینا چاہیے اور اس مقصد کے لیے اس نے ادھم خان کو مالوہ پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا تھا۔

ایک طرف ادھم خان ایک لشکر کے ساتھ مالوہ کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا تو دوسری طرف باز بہادر مالوہ کے حاکم کا یہ حال تھا کہ وہ رنگ رلیوں اور موسیقی کے اشغال میں اس قدر گم تھا کہ اسے کچھ معلوم ہی نہ ہوا کہ اکبر کے کیا ارادے ہیں۔ اس کی آنکھیں اس وقت کھلی جب ادھم خان کی سرکردگی میں مغلوں کا لشکر مالوہ میں داخل ہوا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے باز بہادر نے جلدی جلدی لشکر کو تیار کیا تاکہ ادھم خان کا مقابلہ کر کے اسے اپنے علاقوں سے مار بھگائے۔

چنانچہ سارنگ پور سے ایک کوس کے فاصلے پر دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ باز بہادر نے جنگ کا ارادہ کر تو لیا لیکن حریف کے سامنے ٹھہرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ مغلوں کے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لا سکا اور شکست اٹھا کر مالوہ کے ایک انتہائی دور دراز گوشے میں چلا گیا۔

باز بہادر کی زندگی بھر کا سرمایہ بس گانے بجانے اور رقص و موسیقی والی عورتیں ہی تھیں اور ہندوؤں کی اصطلاح میں ان عورتوں کو یاتر کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ادھم خان کے لشکر کا مقابلہ کرنے سے پہلے باز بہادر نے اپنے آدمیوں کے ایک گروہ کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ اگر اسے مغلوں کے لشکر کے مقابلے میں شکست ہو جائے تو پھر اس کے دربار میں جس قدر گانے ناچنے والیاں ہیں' سب کو قتل کر دیا جائے۔

ادھم خان کے مقابلے میں جب باز بہادر کو شکست ہوئی تو اس نے جو اپنے آدمی ان حسین عورتوں کو قتل کرنے کے لیے مقرر کیے تھے' وہ حرکت میں آئے۔ عورتوں پر انہوں نے تلوار اٹھالیں اور

ی طرح گھائل کرنا شروع کر دیا کیونکہ باز شکست دینے کے بعد اودھم خان کی سرکردگی مغلوں کا لشکر سارنگ پور کا رخ کیے ہوئے تھے۔ باز بہادر کے ان آدمیوں نے جلدی جلدی ن کے عالم میں عورتوں پر تلواریں برسائیں۔ نے یہ دیکھا کہ کون زیادہ زخمی ہوئی ہے، کون کم تلواریں برسنے کے بعد وہ بھاگ گئے۔ چنانچہ انہوں نے ان عورتوں پر تلواریں برسائیں تو وقت کیونکہ بدحواسی کے عالم میں تھے، کچھ تیں ان سے بچ کر بھاگ گئیں۔ اب قاتلوں کو فرصت کہاں تھی کہ وہ تحقیق کرتے کہ کون سی زندہ ہے، کون قتل ہونے سے بچ گئی ہے اور بھاگنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ چنانچہ جو میں بچ گئیں، جب انہوں نے بھاگ کر باز بہادر پیچھے جانا چاہا تو اس وقت اودھم خان اپنے لشکر ساتھ شہر میں داخل ہوا اور بھاگنے والی تمام عورتوں ان نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

اودھم خان نے آگرہ میں قیام کے دوران متی کے عشق اس کے حسن اس کے گانے اور کی خوبصورتی کے چرچے سن رکھے تھے اور غائبانہ پردہ اس پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ جن عورتوں کو نے گرفتار کیا، ان سے اس نے پوچھا۔

''روپ متی کہاں ہے؟''

ان عورتوں نے بتایا کہ روپ متی فلاں محل میں سہیلیوں کے ساتھ قتل کر دی گئی ہے۔

چنانچہ اودھم خان نے اس بیان کی تصدیق کے اپنے چند آدمیوں کو روپ متی کے محل میں بھیجا۔ آدمیوں نے جا کر دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ متی اور اس کی سہیلیاں زخمی ضرور ہوئی تھیں لیکن تک زندہ تھیں۔

اودھم خان کے آدمیوں نے یہ خبر جب اودھم سنائی تو وہ بڑا خوش ہوا۔ لہٰذا اس نے روپ متی باغ دکھاتے ہوئے اسے پیغام دیا۔

''تم اچھی طرح اپنا علاج کراؤ، جب تم کامل صحت یاب ہو جاؤ گی تو میں تمہیں تمہارے چاہنے والے باز بہادر کے پاس پہنچا دوں گا۔''

یہ خوشخبری سن کر روپ متی کی جان میں جان آ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اودھم خان کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد روپ متی نے بڑی محنت سے اپنا علاج کرانا شروع کیا اور جلد ہی وہ اپنے زخموں سے صحت یاب ہوگئی۔ جب روپ متی کے زخم ٹھیک ہو گئے تو روپ متی نے اودھم خان کو مطلع کیا اور پیغام بھیجا۔

''میں اب خدا کے فضل و کرم سے صحت یاب ہوگئی ہوں۔ لہٰذا آپ اپنا وعدہ پورا کیجئے اور مجھے باز بہادر کے پاس بھجوا دیجئے۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی اور تمام عمر دعا گو رہوں گی۔''

اودھم خان کے سر پر تو ہوس کا بھوت سوار تھا۔ اس نے کون سا سچے دل سے وعدہ کیا تھا جو اس وعدے کو وفا کرتا۔ اس نے روپ متی کو یہ جواب بھجوایا۔

''باز بہادر بادشاہ کا باغی ہے۔ اگر وہ اطاعت گزاری کرتا اور شاہی درگاہ میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا تو میں تجھ کو اس کے پاس بھجوا دیتا لیکن اب معاملہ دوسرا ہے۔ اگر اس وقت میں نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر باز بہادر کے حوالے کر دیا تو بادشاہ مجھ سے ناراض ہوگا اور مجھ پر عتاب شاہی نازل ہوگا۔''

روپ متی کو یہ جواب دینے کے بعد اودھم خان روپ متی کو پھانسنے کے حیلے بہانے کرنے لگا تھا۔ بالآخر اس نے اپنے ایک انتہائی رازدار مقرب کو روپ متی کے پاس آدھی رات کے وقت بھیجا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

روپ متی بڑی ذہین عورت تھی، وہ فوراً اودھم خان کی نیت کو بھانپ گئی اور اس نے سوچا۔ اگر اس نے اودھم خان سے ملنے سے انکار کر دیا تو وہ زبردستی تصرف میں لائے گا اور اگر اقرار کیا تو اس سے محبت کی آبرو جاتی رہے گی، اس لیے کہ روپ متی باز بہادر کو دل سے پسند کرتی تھی، چاہتی تھی اور اس سے وعدہ

لر چکی تھی کہ وہ زندگی بھر کسی دوسرے سے کوئی تعلق پیدا نہ کرے گی اور کسی سے محبت نہ کرے گی۔

چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد روپ متی نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی ایسی ترکیب کرنی چاہیے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہ سوچ کر اس نے اودھم خان کے قاصد سے کہا۔

''میں تو اودھم خان کی کنیز ہوں' وہ جو کہیں میں کرنے کو تیار ہوں' ان کے پاس جانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر وہ خود یہاں تشریف لے آئیں تو یہ امر میری عزت افزائی کا باعث ہوگا۔''

جب قاصد یہ پیغام لے کر اودھم خان کے پاس گیا تو اودھم خان کی خوشی اور مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ چنانچہ روپ متی سے ملاقات کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اب اودھم خان کو یہ بھی ڈر تھا کہ اس کی اس حرکت کا کہیں بادشاہ کو علم نہ ہو جائے' اس لیے اکبر نے جس وقت اودھم خان کو مالوہ کو حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا تھا تو اس کے لشکر میں اس کے نائب کی حیثیت سے پیر محمد کو روانہ کیا تھا۔ پیر محمد بھی اکبر کا ایک نامور سالار تھا اور وہ اودھم خان کے ساتھ لشکر میں شامل تھا۔

چنانچہ اودھم خان کو پیر محمد سے بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ واپس جا کر میرے ان کاموں کی اطلاع اکبر کو نہ کر دے' لہٰذا وہ اپنا حلیہ بدل کر صرف دو تین ساتھیوں کے ہمراہ روپ متی کے محل میں پہنچا۔

چنانچہ وہاں پہنچ کر اودھم خان نے کنیزوں سے دریافت کیا کہ روپ متی محل میں کس جگہ ہے۔ جواب ملا کہ وہ سو رہی ہے۔ کنیزوں نے اس کمرے کی طرف اس کی رہنمائی کی جہاں روپ متی سو رہی تھی۔ چنانچہ اودھم خان اس کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پلنگ کے قریب گیا۔ اس نے دیکھا پلنگ پر روپ متی لیٹی ہوئی تھی اور ایک چادر سے اس نے اپنا جسم اور چہرہ تک ڈھانپ رکھا تھا۔ اودھم خان نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے جسم سے چادر ہٹائی۔ اودھم خان نے دیکھا اس وقت روپ متی ان گنت خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار تھے اور وہ بڑی طمانیت سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ چنانچہ اودھم خان نے جب اس کے جسم پر ہاتھ لگایا تو پتا چلا کہ روپ متی کا جسم تو بے جان ہے اور وہ مر چکی ہے۔ اس پر اودھم خان کانپ اٹھا۔

چنانچہ اپنے آپ کو سنبھالنے کے بعد اودھم خان نے سوچا کہ اب وہ کیا کرے' اس لیے کہ روپ متی کو اس حالت میں دیکھ کر اودھم خان سخت حیران ہوا تھا۔ چنانچہ محل میں جو روپ متی کے خدمت گار تھے' ان سے اس معاملے کے متعلق پوچھا' تب ان خدمت گاروں میں سے ایک نے اودھم خان کو بتایا۔

''آپ کا قاصد روپ متی کو بلانے کے لیے آیا تو اس نے جواب دے کر آپ کے قاصد کو رخصت کر دیا۔ بعد ازاں وہ باز بہادر کو یاد کر کے روتی رہی اور اس رنج والم کے عالم میں اس نے کافور اور روغن کنجد ملا کر کھا لیا۔ جب اس کی حالت بگڑنے لگی تو وہ پلنگ پر جا لیٹی اور اب وہ جیسی ہے' آپ کے سامنے ہی ہے۔''

اس صورت حال کے تحت اودھم خان نے باز بہادر کے تمام ساز و سامان اس کی مغنیوں اور لونڈیوں پر قبضہ کر کے مالوہ کے امراء میں تقسیم کر دیا۔ اودھم خان نے جو مال غنیمت اسے مالوہ سے حاصل ہوا تھا اس میں سوائے چند ہاتھیوں کے بادشاہ کے لیے کچھ نہ بھیجا۔ حالانکہ وہاں سے اسے بہت کچھ ملا تھا۔

اودھم خان ابھی یہ کام انجام دے ہی رہا تھا کہ اسے خبر ملی کہ اکبر بھی ایک لشکر کے ساتھ مالوہ کے علاقوں کا رخ کیے ہوئے ہے۔ یہ خبر سن کر اودھم خان بڑا فکر مند ہوا۔ اکبر پہلے مالوہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کالنجر کے قلعے میں پہنچا۔ قلعہ باز بہادر کے ایک عامل کے تحت تھا۔ اسے جب خبر ہوئی کہ اکبر ادھر ہی کا رخ کر رہا ہے تو وہ قلعے سے نکلا۔ اکبر کی اطاعت اختیار کی اور قلعہ اکبر کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد اکبر نے سارنگ پور کا رخ کیا اور

ے سارنگ پور جا پہنچا۔ چنانچہ سہا ڈرا اودھم بان اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے اس نے چند ہاتھی مال غنیمت کے طور پر بھجوائے تھے لیکن اب ندامت اور معذرت کے ساتھ تمام مال غنیمت اکبر کے حوالے کردیا۔ اکبر نے اودھم خان کا قصور وقتی طور پر معاف کردیا۔ لشکر کی کمانداری سے اسے معزول کر کے پیر محمد کو نہ صرف لشکر کا کماندار بلکہ مالوہ کا حاکم بھی مقرر کردیا۔

جس وقت اکبر سارنگ پور کا رخ کیے ہوئے تھا' ہندوستان میں ایک اور بڑا حادثہ اٹھا۔ ہوا یوں کہ عادل شاہ جس کا وزیر ہیمو بقال ہوا کرتا تھا' اس کے بیٹے شیر خان نے چالیس ہزار کا ایک لشکر جمع کیا اور اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ جون پور پر حملہ آور ہو' وہاں قبضہ کرنے کے بعد مختلف علاقوں کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے بنگال پر بھی قبضہ کر کے اپنی مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ شیر خان نے ایسا اس لیے سوچا تھا کہ جون پور میں اکبر کا سالار علی قلی خان تھا اور اس کے پاس صرف بارہ ہزار کا لشکر تھا۔

چنانچہ شیر خان چالیس ہزار کے لشکر کے ساتھ جیون پور پر حملہ آور ہوا۔ علی قلی خان نے بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ فریقین میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ گو شیر خان کا لشکر علی قلی خان کے لشکر سے بہت زیادہ تھا لیکن علی قلی خان نے شجاعت اور بہادری کا ایسا مظاہرہ کیا کہ شیر خان کو شکست دی۔ شیر خان کے قدم ایسے اکھڑے کہ بھاگ کھڑا ہوا۔ علی قلی خان کے ساتھ اس معرکے میں اس کا بھائی بہادر خان بھی شامل تھا۔ چنانچہ شیر خان کے چالیس ہزار کے لشکر کو شکست دینے کے بعد علی قلی خان اور بہادر خان کی شجاعت اور دلیری کی بڑی شہرت ہوئی' جہاں دوسروں نے ان کی بہادری کی تعریف کی' وہاں یہ دونوں بھائی خود بھی خودستائی سے کام لیتے ہوئے اپنی بہادری کے نشے میں ایسے چور ہوئے کہ انہوں نے اس ٹکراؤ کے نتیجے میں جس قدر ہاتھی ملے اور جو مال غنیمت ہاتھ لگا' اس میں سے کچھ بھی اکبر کی طرف روانہ نہ کیا۔

اکبر کو جب ان دونوں بھائیوں کی اس حرکت کا علم ہوا تو سارنگ پور سے پلٹ کر اور اودھم خان کو اپنے ساتھ لے کر وہ کالپی کے راستے واپس ہوا۔ علی قلی خان اور بہادر خان کو بھی خبر ہوگئی تھی کہ بادشاہ انہیں کی طرف آرہا ہے اور ان سے مال غنیمت کا حساب ضرور لے گا۔ چنانچہ وہ بڑے فکرمند ہوئے اور مانک پور کے نواح میں جا کر علی قلی اور بہادر خان دونوں اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس جنگ کے نتیجے میں جو ہاتھی اور دوسری اشیاء ان کے ہاتھ لگی تھیں' اکبر کی خدمت میں پیش کیں۔

چنانچہ ایک بار پھر اکبر نے علی قلی خان کو معاف کردیا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اور اکبر نے درگزر سے کام لیتے ہوئے اسے معاف کیا تھا' اس کے بعد اکبر آگرہ کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔

ادھر اکبر نے اپنے سالار پیر محمد کو نہ صرف مالوہ میں اپنے لشکر کا سالار بلکہ مالوہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ چنانچہ پیر محمد نے مندو کے مقام پر قیام کیا۔ سب سے پہلے اس نے مالوہ کے سارے علاقوں کو باز بہادر کے متعلقین اور بہی خواہوں سے معاف کردیا۔ اس کے بعد اس نے مالوہ کے سب کے بڑے اور مضبوط اور مستحکم قلعے بجے گڑھ کا رخ کیا۔ اس پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کرلیا اور قلعے کا اندر جس قدر حفاظتی لشکر تھا' اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دوسری طرف مغل لشکر کے شکست کھا کر باز بہادر برہان پور کے حاکم کی پشت پناہی کی وجہ سے خان دیش میں قیام کیے ہوئے تھا۔ وہ اکثر و بیشتر کچھ لشکر جمع کر کے مالوہ پر حملہ آور ہونا شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ پیر محمد نے خان دیش پر حملہ کیا اور برہان پور میں اس نے قتل عام شروع کردیا۔ اس قتل عام اور غارت گری میں بہت سے علماء اور مشائخ بھی مارے گئے۔ پیر محمد اپنے لشکر کے ساتھ ابھی برہان پور ہی میں

تھا کہ باز بہادر برار کے حاکم مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پیر محمد کے خلاف اس سے مدد طلب کی۔ چنانچہ اس نے ایک لشکر تیار کیا اور پیر محمد کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔

اس طرح ایک خاصا بڑا لشکر لے کر مبارک شاہ حاکم برار اور باز بہادر پیر محمد کی طرف بڑے مالوہ کا حکم مقرر ہونے کے بعد پیر محمد کا دماغ بھی کسی حد تک خراب ہوگیا تھا اور وہ لوگوں پر ظلم اور جبر کرنے لگا تھا اور اس کے لشکری اس کی بداخلاقی اور ظلم کی وجہ سے اس سے دل برداشت ہو چکے تھے۔ لہٰذا جس وقت مبارک شاہ اور باز بہادر اپنے لشکر کے ساتھ اس کی طرف بڑھے تو اس کے لشکریوں نے پیر محمد کی اجازت کے بغیر ہی دریائے نربدا کو پار کر کے واپسی کا سفر اختیار کرلیا۔ مالوہ کے علاقے کے وہ امراء اور سالار جو پیر محمد کی مدد کے لیے آئے تھے۔ وہ بھی ناراض ہو کر علیحدہ ہوگئے۔ یہ عالم دیکھ کر پیر محمد بھی واپس ہوا۔ اسے خبر ہوگئی تھی کہ اس کے پاس چھوٹا سا لشکر رہ گیا ہے جس سے وہ باز بہادر اور مبارک شاہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

پیر محمد جب واپس ہوا تو باز بہادر اور مبارک شاہ نے اس کا تعاقب کیا۔ پیر محمد نے انتہائی پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں راستہ طے کرتے ہوئے دریائے نربدا کے قریب پہنچا جس وقت وہ دریائے نربدا کو عبور کررہا تھا تو اس وقت بار بردار اونٹوں کی قطار اس کے گھوڑے سے ٹکرا گئی جس کے باعث اس کا گھوڑا پل سے پھسلا اور دریا میں جا گرا۔ اس موقع پر پیر محمد کے ساتھیوں نے اس کی جان بچانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی اور پیر محمد ڈوب کر ہلاک ہوگیا۔

پیر محمد کے مارے جانے کے بعد اس کے لشکری ادھر ادھر بھاگ گئے۔ چنانچہ باز بہادر اپنے علاقوں میں داخل ہوا۔ ایک بار پھر برار کے حاکم مبارک شاہ کی مدد سے وہ مالوہ پر قابض ہونے میں کامیاب بھی ہوگیا اور برار کا حاکم مبارک شاہ واپس چلا گیا۔

اکبر کو خبر ہوئی کہ مالوہ کے حالات پھر ابتر ہوگئے اور باز بہادر پیر محمد کے مرنے کے بعد مالوہ پر پھر قابض ہوگیا ہے۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اکبر نے کالپی کے اپنے حاکم عبداللہ خان ازبک کی طرف حکم روانہ کیا کہ وہ مالوہ پر حملہ آور ہو کر اسے پر مغل سلطنت میں شامل کرے۔

باز بہادر بہادر عیش و آرام کا عادی تھا۔ اسے جب خبر ہوئی کہ عبداللہ خان ازبک کے ایک لشکر نے کر اس پر حملہ آور ہونے کے لیے آیا ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکلنے شروع ہوگئی تھی۔ وہ عبداللہ خان ازبک کی بہادری شجاعت اور اس کی کاگزاری سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ عبداللہ سے ایک بار ٹکرا کر اپنی قسمت آزمائے کا فیصلہ کیا' جب ٹکراؤ ہوا تو عبداللہ ازبک نے اسے بدترین شکست دی اور باز بہادر بھاگ کھڑا ہوا۔

کچھ عرصہ باز بہادر مالوہ خان دیش اور دکن کے پہاڑی اور جنگلوں میں آوارگی کی زندگی بسر کرتا رہا جب اسے اپنے مقصد میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو آخر کار مجبور ہو کر اکبر سے امان طلب کی۔ اکبر نے اسے امان دے دی۔ باز بہادر اس کے دربار میں حاضر ہوا اور اکبر نے اسے اپنے دو ہزار لشکریوں کا سالار مقرر کردیا تھا۔ اس طرح باز بہادر کا قصہ سالوں میں ختم ہوا۔

اودھم خان جو روپ متی کی موت کا باعث بنا تھا۔ اسے جب اکبر نے معاف کردیا تو اس کا دماغ خراب ہوگیا۔ وہ یہ سمجھنے لگا کہ کیونکہ وہ اکبر کی دایہ کا بیٹا ہے۔ لہٰذا وہ کتنا بھی بڑا قصور کرے' اکبر اسے معاف کردے گا' اس لیے کہ اس کی ماں کی وجہ سے شاہی حرم میں اس کی بڑی عزت اس کا بڑا احترام ہے۔

انہیں دنوں خان اعظم شمس الدین کو اکبر کے ہاں بڑی عزت بڑا وقار تھا اور اس کے اس وقار سے اودھم خان حسد اور رشک کرنے لگا تھا۔ پہلے تو اودھم خان نے بیرم خان کی طرح خان اعظم شمس الدین کو

بھی اکبر کی نگاہوں سے گرانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے اودھم خان نے چغل خوری اور دیگر حربوں کو استعمال میں لاکر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہا لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

آخر اس نے ایک روز یہ بہانہ کر کے خان اعظم سے وہ ملنے کے لیے گیا تو خان اعظم نے اودھم خان کی تعظیم نہیں کی اور ایسے بہانہ بنا کر اودھم خان نے خان اعظم کو اس وقت قتل کر دیا' جب وہ قرآن مقدس کی تلاوت کر رہا تھا۔

اودھم خان کو اپنی ماں کی وجہ سے کیونکہ شاہی عنایات کا بڑا بھروسہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بادشاہ اس سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا' اس لیے خان اعظم شمس الدین کو قتل کرنے کے بعد اودھم خان ایک ایسے مکان میں جو شاہی حرم کے قریب ہی تھا' مقیم ہو گیا۔

خان اعظم جب قتل ہوا تو اس کے قتل کی خبر چاروں طرف شور وغل کی طرح پھیل گئی اور لوگ اس کے مرنے پر شور وغل کرنے لگے۔ اس وقت اکبر حرم سرا میں سو رہا تھا۔ اس شور کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ چنانچہ لوگوں سے اس شور وغل کا سبب دریافت کیا۔ چنانچہ اکبر کو بتایا گیا کہ اودھم خان نے آپ کے چہیتے خان اعظم شمس الدین کو قتل کر دیا ہے۔

یہ خبر سن کر اکبر ایسا غضب ناک ہوا کہ شب خوابی کے لباس ہی میں وہ شمس الدین کے مکان پر آیا اور شمس الدین کی نعش دیکھ کر اکبر غصے کی وجہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔

اس غصے کے عالم میں اکبر نے اپنی تلوار سنبھالی اور اس عمارت میں داخل ہوا' جہاں اودھم خان موجود تھا۔ چنانچہ اودھم خان اکبر سامنے آیا تو اکبر نے پوچھا۔

''تم نے خان اعظم شمس الدین کو قتل کیوں کیا؟''

اکبر کے اس سوال پر اودھم خان نے کوئی جواب دینے کے بجائے بادشاہ کے پاؤں پکڑ لیے اور زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ اکبر اس بے ادبی پر اور بھی زیادہ برہم ہوا۔ اس نے نیچے جھک کر اودھم خان کو اٹھایا اور غصے کے عالم میں اودھم خان کے گال پر ایک گھونسا مارا جس پر اودھم خان بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

اس کے بعد اکبر نے حکم دیا کہ اودھم خان کو اسی دیوان خانے کی چھت سے جس سے میں وہ مقیم تھا' نیچے گرا کر ہلاک کیا جائے۔ وہ دیوان خانہ زمین سے بارہ گز بلند تھا۔ چنانچہ اکبر کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ اودھم خان کو نیچے گرایا گیا لیکن اس بلندی سے گرنے کے باوجود اودھم خان زندہ رہا۔ جب پتا چلا کہ وہ زندہ ہے تو اکبر کے حکم پر اسے پھر چھت پر لے جایا گیا۔ دوبارہ زمین پر پھینکا گیا۔ اس مرتبہ اودھم خان مر گیا۔ اس طرح اودھم خان کو بھی اپنے کیے کی سزا مل گئی۔

☆☆☆

عادل خان ایک روز چھوٹے سے ایک لشکر کے ساتھ مانک پور پہنچا۔ اس کی آمد کی اطلاع پہلے اس کے دونوں بڑے بھائیوں آصف خان اور وزیر خان کو ہو چکی تھی۔ لہٰذا دونوں نے مانک پور سے کافی باہر شاندار انداز میں اس کا استقبال کیا۔ آصف خان اور وزیر خان کے ساتھ مانک پور کے کچھ سرکردہ لوگ بھی آئے تھے' انہیں دیکھتے ہوئے عادل خان اور اس کے ماتحت جو سالار تھے' وہ اپنے گھوڑوں سے اتر گئے۔ سب پُر جوش انداز میں ایک دوسرے سے ملے۔ عادل خان سب سے پہلے اپنے بھائی آصف خان اور وزیر خان سے ملا۔ وزیر خان اور آصف خان شکل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے اور دونوں کی عادات بھی ایک جیسی تھیں جبکہ عادل خان کافی حد تک ان سے مختلف تھا۔ جب سب لوگ آپس میں مل چکے' تب آصف خان اور وزیر خان کی طرف دیکھتے ہوئے عادل خان کہنے لگا۔

''آپ دونوں بھائیوں نے شہنشاہ کو جو اپنی عسکری تیاریوں کی اطلاع دی تھی' اس کے جواب

میں مجھے اس لشکر کے ساتھ آپ کی مدد کے لیے بھیجا گیا ہے لیکن جنگ سے پہلے گونڈوانہ کی رانی درگاوتی سے گفتگو کرنی ہے۔ اگر وہ لڑے بغیر صلح جوئی سے اپنا علاقہ مغل سلطنت میں شامل کرنے میں رضامند ہوجائے تو اس کے خلاف جنگ نہیں کی جائے گی۔''

عادل خان کے ان الفاظ پر وزیر خان اس کا بھائی جو اس سے بڑا تھا' بھڑک اٹھا۔ غصے کی حالت میں کہنے لگا۔

''یہ تم کس قسم کی گفتگو کررہے ہو' ہم رانی درگاوتی سے کیوں گفتگو کریں۔ وہ جہاں ہمارے باپ کے قتل کی ذمہ دار ہے' وہاں اس کے حکم پر ہماری ماں ہماری بہنوں کا خاتمہ کیا گیا اور پھر ہمارے مکان کو آگ لگائی گئی۔ اس کے باوجود ہم اس سے صلح کی گفتگو کریں۔''

وزیر خان مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ عادل خان نے گھورنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

''تم ان علاقوں میں پہلے نہیں رہے۔ جذباتی ہوکر گفتگو نہ کرو۔ جہاں تک رانی سے اپنے باپ' اپنی ماں اور بہنوں کے انتقام کا تعلق ہے تو وہ تو رانی سے ہر صورت میں لیا جائے گا بلکہ رانی کی علاوہ ہم نے کیدار سنگھ اور اس کے سینا پتی سنسار سنگھ کو بھی معاف نہیں کرنا۔ ان میں سے کوئی بھی ہمارے انتقام سے بچ نہیں سکے گا۔ وزیر خان تم چپ رہو' تم حالات سے واقف نہیں ہو' نہ ہی تحسین جنگ کا کوئی اتنا تجربہ ہے۔ تم نے لاہور میں بڑی پُرامن زندگی بسر کی ہے۔ پہلے مجھے پانے بھائی آصف سے گفتگو کرنے دو' اس کے بعد تم بیچ میں بولنا۔''

وزیر خان نے جب دیکھا کہ عادل خان اس سے چھوٹا ہونے کے باوجود اس کی گفتگو پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے ساتھ برہمی کا اظہار کررہا ہے تو وہ چپ ہوگیا۔ اس موقع پر آصف خان مسکراتے ہوئی عادل خان کی طرف دیکھ رہا تھا' یہاں تک کہ عادل خان نے آصف خان کی طرف دیکھتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔

''میرے عزیز بھائی! آپ کو پتا ہوگا کہ رانی درگاوتی کے بھائی کے دو برادر نسبتی ہیں' ان میں سے ایک دہلی میں رہائش رکھتا ہے اور ایک آگرہ میں۔ چوڑ گڑھ میں جو لڑکی کملا دیوی کے ساتھ رہا کرتی تھی جس کا نام رتن کماری تھا' وہ ان دونوں کی بھانجی ہے۔ اب اس رتن کماری کا وہ ماموں جو ان دنوں آگرہ میں قیام کیے ہوئے ہے' اس کا نام سانول ہے۔ میری اس طرف روانگی سے قبل سانول درس شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس نے التماس کی تھی کہ رانی درگاوتی پر حملہ آور ہونے سے پہلے اسے اس سے گفتگو کرنے کے اجازت دی جائے تاکہ رانی درگاوتی اگر اپنے علاقے صلح صفائی سے مغل سلطنت میں شامل کرنے پر رضامند ہوجائے تو جنگ کی نوبت نہ آئے۔ شہنشاہ نے سانول داس کی اس پیشکش کو قبول کرلیا تھا۔ لہٰذا سانول داس اور اس کے بیٹے چندرسین دونوں کو میرے ساتھ روانہ کیا گیا ہے۔ پہلے یہ دونوں باپ بیٹا یہیں سے چوڑھ گڑھ کا رخ کریں گے اور رانی درگاوتی سے بات کریں گے۔ اگر درگاوتی مان گئی تو اس کے علاقوں پر قبضہ کرلیا جائے گا لیکن اس کے باوجود درگاوتی کیدار سنگھ اور سنسار سنگھ ہمارے انتقام سے نہیں بچ پائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے مڑتے ہوئے عادل خان نے ہاتھ کا اشارہ کیا جس پر تھوڑے فاصلے پر سانول داس اور چندرسین دونوں باپ بیٹا اپنے گھوڑوں سے اترے' اسے جگہ آئے جہاں آصف خان وزیر خان اور عادل خان کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے عادل خان بول اٹھا۔

''یہ سانول داس اور ان کا بیٹا چندا سینا ہے۔ یہیں سے چوڑھ گڑھ کا رخ کریں گے جو گفتگو یہ درگاوتی سے کرنا چاہتے ہیں' وہ گفتگو کرکے واپس ہمارے پاس آئیں گے۔ اس کے بعد ان کی گفتگو ہوئی روشنی میں اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد عادل خان جب رکا' تب سانول داس آصف خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''رانی درگاوتی سے گفتگو کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اپنی بھانجی رتن کماری کے علاوہ رانی درگاوتی کی بہن کملا دیوی دونوں کو بچا سکوں' ورنہ جہاں تک درگاوتی کا تعلق ہے تو میں جانتا ہوں وہ بڑی ضدی ہے اور ہٹ دھرم عورت ہے جس مقصد کے لیے میں جارہا ہوں' میں جانتا ہوں وہ میری بات نہیں مانے گی لیکن کوشش کر دیکھنا کوئی بری بات نہیں۔ یہ کوشش میں صرف کملا دیوی اور رتن کماری کے تحفظ کی خاطر کررہا ہوں۔''

سانول داس جب خاموش ہوا تب ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں آصف خان بول اٹھا۔

''سانول داس اس سلسلے میں تمہیں پریشان اور فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس پہلے ہی اپنے سارے سالاروں اور لشکریوں کو سمجھا چکا ہوں کہ جب ہم رانی درگاوتی سے ٹکرائیں گے' اس کے خلاف ہمیں کامیابی نصیب ہو تو ہر صورت ہم نے دو لڑکیوں کملا دیوی اور رتن کماری کی حفاظت کرنی ہے اور انہیں عافیت ہی تو میرے پاس لے کر آنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا ایک ماموں دہلی میں ہے اور ایک آپ ہیں۔ ان دونوں سے متعلق آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر صورت میں ان کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا۔ تاہم چونکہ آپ نے اس سلسلے میں شہنشاہ سے گفتگو کرلی ہے' لہٰذا میں عادل اور اس کے لشکریوں کو لے کر جاتا ہوں۔ آپ سیدھا آگے چوڑھ گڑھ کی طرف نکل جائیں۔ اس سلسلے میں رانی سے بات کریں اور جو فیصلہ وہ کرتی ہے' اس سے آکر ہمیں آگاہ کریں اور اس کی روشنی میں ہم اگلا قدم اٹھائیں گے۔''

سانول داس اور اس کے بیٹے چندرسین نے آصف خان کی اس گفتگو کو پسند کیا تھا۔ لہٰذا اجازت لے کر وہ اس وقت اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور چوڑھ گڑھ کی طرف نکل گئے جبکہ آصف خان اور وزیر خان اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ عادل خان اور اس کے لشکریوں کو اپنے ساتھ لے جارہے تھے۔

مانک پور میں چند دن قیام کے بعد عادل خان اپنے بھائی آصف خان اور وزیر خان کے ساتھ اس لشکر کا جائزہ لینے کے لیے نکلا جوان دونوں بھائیوں نے مانک پور میں تیار کیا تھا اور جس کے ساتھ وہ رانی درگاوتی پر ضرب لگانا چاہتے تھے۔ تینوں بھائی اس لشکر کا جائزہ لینے کے بعد جب وہاں سے ہٹنا ہی چاہتے تھے کہ ان کے سامنے ایک طرف سے سانول داس اور چندرسین دونوں باپ بیٹا آتے دکھائی دیے۔ قریب آکر وہ دونوں گھوڑوں سے اترے سب سے پُرجوش مصافحہ کیا پھر سانول داس آصف خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہم دونوں باپ بیٹا پہلے شہر میں داخل ہونے لگے تھے لیکن پتا چلا کہ آپ لوگ لشکر کا جائزہ لے رہے ہیں۔ لہٰذا ہم اس سمت نکل آئے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سانول داس رکا' دم لیا۔ اس موقع پر آصف خان اسے مخاطب کرکے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سانول داس پھر بول اٹھا۔

''میں جس مقصد کے لیے رانی درگاوتی کی طرف گیا تھا' اس میں یوں جانیں مجھے اور میرے بیٹے کو انتہائی بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ میں اور میرے بیٹے نے بھی درگاوتی کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ بڑی ہٹ دھرم اور ضدی عورت ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ صلح صفائی سے معاملہ طے کرے تو ریاست پر حکومت اس کی رہے گی۔ سارے علاقے کو مغلوں کی سلطنت میں سمجھا جائے گا لیکن وہ نہیں مانی۔ اس کے بعد میں نے اس سے یہ بھی التجا کی۔ اگر تم نے مغلوں کے لشکر سے ٹکرانا ہی ہے تو پھر اپنی بہن کملا دیوی' میری بھانجی رتن کماری اور اپنے اکلوتے بیٹے فرائن ہی کو میرے ساتھ بھیج دو تاکہ کم از کم وہ تو جنگ میں محفوظ رہیں۔''

میری اس پیشکش پر رانی درگاوتی اور زیادہ

بھڑک اٹھی اور کہنے لگی۔ ”جہاں تک کملا دیوی کا تعلق ہے تو وہ اس کی بہن ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ رتن کماری سے متعلق وہ کہنے لگی۔ رتن کماری بے شک میری بھانجی ہے۔ پر اس سے پہلے وہ اس کی بھتیجی ہے۔ لہٰذا وہ بھی میرے ساتھ نہیں جائے گی۔ بس یوں جانو جس مقصد کے تحت ہم نے چوڑھ گڑھ کا رخ کیا تھا' اس میں ہمیں ناکامی ہوئی ہے۔ اب آپ کا جو جی چاہے کریں لیکن اس موقع پر میری اور میرے بیٹے چندرسین کی التماس یہ ہے کہ جو لشکر آپ لے کر درگاوتی پر حملہ آور ہونے کے لیے نکلیں' اس لشکر میں ہم دونوں باپ بیٹا بھی شامل ہوں گے تاکہ ہم کم از کم آپ کے ساتھ مل کر کملا دیوی اور رتن کماری کو تو وہاں سے حفاظت سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

آصف خان نے اس موقع پر سوالیہ سے انداز میں عادل خان کی طرف دیکھا پھر عادل خان سانول داس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”آپ دونوں کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا لشکر جب یہاں سے کوچ کرے گا تو آپ مطمئن رہیں ان کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا جائے گا۔“

سانول داس اور چندرسین دونوں مطمئن ہو گئے تھے پھر وہ سب کے ساتھ شہر کی طرف جا رہے تھے۔

اپنی تیاری کرنے کے بعد آصف خان' عادل خان اور وزیر خان تینوں بھائی اپنا لشکر لے کر مانک پور سے نکلے اور رانی درگاوتی کے مرکزی شہر چوڑ گڑھ کا رخ کیا۔

دوسری طرف رانی کے مخبروں نے بھی اسے اطلاع کر دی تھی کہ مانک پور کا حاکم آصف خان اپنے بھائیوں کے ساتھ اس پر حملہ آور ہونے کے لیے کوچ کر چکا ہے۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے رانی بھی اپنے لشکر کے ساتھ اپنے مرکزی شہر چور سے نکلی اور دموہ کے تاریخی میدانوں میں اس نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیا تھا۔

یہ وہی میدان تھے جس کے اندر اس سے پہلے رانی درگاوتی باز بہادر کو بدترین شکست دے کر بھاگ جانے پر مجبور کر چکی تھی اور رانی کا یہ بھی گمان تھا کہ دموہ کے میدانوں میں اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ وہ ان میدانوں کو اپنے لیے کامیابی اور کامرانی کا میدان خیال کیا کرتی تھی۔ چنانچہ انہیں میدانوں کے اندر اس نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیا۔ چند دن کے بعد آصف خان' وزیر خان اور عادل خان بھی وہاں پہنچ گئے اور اپنے لشکر کے ساتھ انہوں نے رانی درگاوتی کے لشکر کے سامنے پڑاؤ کیا۔

جس روز دونوں لشکروں نے آپس میں ٹکرانا تھا' صبح سویرے ہی رانی درگاوتی کے لشکر میں ہلچل مچ گئی تھی۔ دراصل درگاوتی نے حملہ آور ہونے میں پہل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ آصف خان اور عادل خان کے مخبروں نے بھی انہیں اطلاع کر دی تھی کہ رانی آج جنگ کی ابتداء کرے گی اور اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کرے گی۔ ایک حصہ اپنی کمانداری میں رکھے گی اور خود وسطی حصے میں رہے گی۔ دوسرا حصہ اپنے سالار سنسار سنگھ کی کمانداری میں دے گی اور تیسرے لشکر کی کامنداری کیدار سنگھ کرے گا۔ یہی کیدار سنگھ آصف خان اور عادل خان کے قتل کا ذمہ دار تھا۔

یہ خبر ملنے کے بعد آصف خان اور عادل خان نے بھی اپنے لشکر کو صفیں درست کرنے اور اپنی ترتیب درست کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اس موقع پر آصف خان اپنے چھوٹے بھائی عادل خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”اب جبکہ رانی درگاوتی اپنے لشکر کے تین حصے کر کے ہم پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے تو کہو میرے بھائی' تم اس سلسلے میں کیا کہنا چاہتے ہو۔“

جواب میں عادل خان مسکرایا اور کہنے لگا۔

”درگاوتی کو آپ میرے حوالے کر دیں۔ میرے خداوند نے چاہا تو میں اس کا انجام دموہ کے ان میدانوں میں ویسا ہی کروں گا جیسا میں نے اس

پہلے پانی پت کے میدانوں میں ہیمو بقال کا کیا لشکر کے باقی دو حصوں میں سے ایک آپ اپنی کمانداری میں لے لیں۔ وزیر خان کو اپنے ساتھ رکھیں' اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں اس کا جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے یہ کچھ سیکھے گا۔ لشکر کے تیسرے حصے کی کمانداری اپنے کسی سالار کو سونپ دیں۔ مجھے امید ہے کہ رانی درگاوتی کے خلاف ہم ہی کامیاب رہیں گے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد عادل خان رکا۔ کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔ "اگر درگاوتی اپنے وسطی حصے کے ساتھ جنگ کی ابتداء کرتی ہے تو آپ کو اور آپ کے سالار کو چاہیے کہ بالکل مطمئن رہیں' اس موقع پر میں اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ درگاوتی سے ٹکراؤں گا۔ آپ اور آپ کے سالار کا کام یہ ہوگا کہ درگاوتی کا لشکر کے پہلوؤں کو سنبھالے۔ انہیں اوران پر حملہ آور ہوکر انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ میں درگاوتی کے لشکر پر حملہ آور ہونے کے ساتھ ساتھ رانی درگاوتی پر نگاہ رکھوں گا کہ وہ کہاں اور کس جگہ ہے۔ جونہی وہ میرے تیروں کی زد میں آئی' میں اسے ہیمو بقال کی طرح اسے بھی ایک آنکھ سے محروم کروں گا تو رانی درگاوتی کے پاس شکست تسلیم کرنے اور میدان چھوڑ کر نکلنے کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہیں رہے گا۔"

آصف خان نے اپنے بھائی عادل خان کی اس گفتگو کو پسند کیا تھا پھر کہنے لگا۔

"وزیر خان کی تم فکر نہ کرو' اس کے ساتھ میں نے پہلے ہی اس موضوع پر گفتگو کی ہوئی ہے۔ یہ میرے ماتحت میرے نائب کی حیثیت سے کام کرے گا' اس لیے کہ اسے پہلے جنگوں میں حصہ لینے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لشکر کے تیسرے حصے کی کمانداری میں مانک پور کے ایک اچھے اور تربیت یافتہ سالار کے سپرد کروں گا اور میرے خداوند نے چاہا تو وہ ہماری منشاء' ہماری خواہش کے مطابق دشمن پر ضرب لگائے گا۔"

آصف خان کی اس گفتگو کا جواب عادل خان دینا ہی چاہتا تھا کہ خاموش رہا' اس لیے کہ رانی درگاوتی کے لشکر کے اندر پڑے پڑے ڈھول اور نفیریاں بجنے لگی تھیں جن کا مطلب تھا' رانی جنگ کی ابتداء کرنے لگی ہے۔ اس پر آصف خان اور عادل خان بھی وہاں سے ہٹ کر اپنے حصے کے لشکر کے سامنے چلے گئے تھے۔ تیسرے حصے کی کمانداری آصف خان کے ایک سالار نے سنبھال لی تھی۔ اس طرح دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے اور ایک دوسرے پر ضرب لگانے کے لیے تیار اور مستعد ہو گئے تھے۔

آخر حملے کی ابتداء رانی درگاوتی نے ہی کی۔ اپنے لشکر کے وسطی حصے کو سب سے پہلے موت کے آنچل بکھیرتی ہولناک نادیدہ آگ کی طرح آگے بڑھایا تھا پھر وہ تہذیبوں کے ورثے کا جگر چیرتی وسوسوں کی داستانوں' ذلت کے بحران اور بے چہرہ المیے کھڑے کرتے رنج وغم کے بحران کی طرح اس لشکر پر حملہ آور ہوئی تھی جس کی کمانداری عادل خان کر رہا تھا۔ حملے کی ابتداء کر کے رانی درگاوتی نے گویا بے درد رسموں کی صلیب کھڑی کرتے ہوئے کورے کاغذ پر بدی کی پہلی لکیر اور انسانیت کی شریانوں میں پہلی خراش کھینچنے کی ابتداء کر دی تھی۔

رانی درگاوتی کو معلوم تھا کہ دشمن کے لشکر کے وسطی حصے کی کمانداری عادل خان کر رہا ہے' اس کا گمان تھا کہ عادل خان اس کے مقابلے میں بچہ ہے۔ اس کے ہاتھوں کا پلا پوسا ہے۔ وہ اس کا کیا مقابلہ کرے گا لیکن عادل خان اب وہ عادل خان تو نہیں رہا تھا' وہ بھی بگولے سے طوفان نرم جھونکوں سے بے روک آندھی اور دھوپ کی تمازت سے آتش فشانی لاوے کی صورت دھار چکا تھا۔ رانی نے جب اس کے خلاف جنگ کی ابتداء کی تو عادل خان نے پہلے اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ قوت کے سارے کرشموں فکر کی ساری اڑانوں کو راکھ کر دینے والے انداز میں تکبیریں بلند کیں۔ اس کے بعد اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ وہ دل کی طغیانیوں کے دلولوں کو

مانند کرتے گردیش دہر کے طوفانوں' حیات کی مشعل بجھاتے جوان جذبوں کو کھنڈر' سارے ارادوں کو ویرانہ کردینے والے رسوا کن دکھ کی مار کی طرح رانی درگاوتی کے لشکر پر حملہ آور ہوگیا تھا۔

رانی کے پیچھے ہی پیچھے اس کے لشکر کے دونوں حصے بھی اپنے کام کی ابتداء کر چکے تھے اور جواب میں آصف خان اور اس کے دوسرے حصے کے سالاروں نے بھی اپنے کام کی ابتداء کی اور وہ بھی رانی کے لشکر کے دونوں حصوں پر تپتے ہونٹوں کی تشنگی بڑھاتے امیدواروں کے راستوں کو لہولہو ذات کی تہوں میں درد و کرب کے پیوند لگاتی پرانی اذیت بھری کٹھاروں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

دونوں طرف کے لشکری بے منزل اڑانوں کے پرندوں کی طرح ایک دوسرے پر منزل کرنے لگے تھے۔ بڑے بڑے سورما' بڑے بڑے تیغ زن' بڑے بڑے جواں مرد اور اپنے آپ کو ناقابل تسخیر کرنے والے شمشیر زنوں کے بدن خوابوں کی طرح پارہ پارہ ہونا شروع ہوگئے تھے۔ دونوں لشکریوں کا اس طرح ٹکرانے سے چہرے لہولہو اولوں کے جذبوں دل کے نہاں خانوں میں لہو کی حرارت بھاپ بننا شروع ہوگئی تھی۔

میدان جنگ میں چار سو ہجر کی تلخیاں کھولتے لمحوں کے طوفان اور زہر آگیں تلخیاں ناچ اٹھی تھیں۔

رانی درگاوتی اپنی پوری ہولنا کی اور اپنی پوری ہنر مندی سے حملہ آور ہورہی تھی۔ وہ ہر صورت میں اپنی کامیابی اور کامرانی کو یقینی بنانا چاہتی تھی۔ شروع میں جب اس نے اپنے حملوں کی ابتداء کی تھی تو اس کے ذہن میں یہی ظن و گمان تھے کہ اس کا ٹکراؤ عادل خان سے ہے جو زیادہ دیر اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا لیکن جب عادل خان نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے رانی درگاوتی کے لشکر کو اگلی صفوں کو بساط کی طرح سمیٹ کر رکھ دیا تھا' تب درگاوتی کو کسی قدر پریشانی لاحق ہوئی' اس لیے کہ عادل خان کے حملہ آور ہونے کا انداز اس کی امیدوں سے کہیں بالا اس کا اندازوں سے کہیں ارفع تھا۔

دوسری طرف عادل خان بھی رانی درگاوتی کے لشکریوں پر ضرب لگاتے ہوئے تاک میں تھا' وہ بیمو بقال کی طرح رانی درگاوتی کو بھی اپنے تیر کا نشانہ بنانا چاہتا تھا اور اپنے لشکریوں کے ساتھ دشمن پر ضرب لگانے کے ساتھ ساتھ وہ اس تاک' اس جستجو میں بھی تھا کہ رانی درگاوتی اسے کہیں دکھائی دے تو وہ اس کے خلاف اپنی کارروائی کی ابتداء کرے۔

آخر جنگ جب طول پکڑنے لگی تو رانی کو بھی فکرمندی ہوئی کہ اگر جنگ کسی طرح طول پکڑ گئی تو اس کی جھولی اس کے مقدر میں شکست اور ہزیمت بھی آسکتی ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے جو وہ اپنے لشکر کی کئی صفوں کے پیچھے تھی اور وہیں رہتے ہوئے اپنے لشکریوں کو للکار رہی تھی اب جو اس نے دیکھا کہ دور دور تک کہیں کامیابی کی صورت دکھائی نہیں دیتی' تب وہ اپنے گھوڑے کو ریڑ لگاتی ہوئی اگلی صفوں کی طرف آئی اور یہیں سے رانی درگاوتی کی بدبختی کی ابتداء ہوگئی تھی۔

پچھلی صفوں سے آگے آکر تو رانی درگاوتی یہ چاہتی تھی کہ زور زور سے چلاتے ہوئے اپنے لشکریوں کا حوصلہ بڑھائے گی اور جب اس کی اگلی صفوں کے لشکری یہ دیکھیں گے کہ ان کی رانی اب اگلی صفوں میں آکر دشمن کے خلاف خود بھی ضرب لگانا چاہتی ہے تو وہ زیادہ جوش اور جذبے کے ساتھ تو جنگ کرتے ہوئے اس کی فتح کو یقینی بنادیں گے لیکن دوسری طرف عادل خان بھی رانی درگاوتی ہی کی تاک میں تھا۔

چنانچہ رانی کو مزید آگے لانے کے لیے عادل خان نے زوردار انداز میں تکبیریں بلند کرتے ہوئے اپنے لشکریوں کو پہلے سے بھی زیادہ ہولناک انداز میں حملے کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم ملتے ہی اس کے لشکری بپھر گئے تھے اور رانی درگاوتی کے کئی لشکریوں کو انہوں نے لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ ایسی صورت میں

عادل خان کے اندازوں کے مطابق رانی مزید کچھ آگے آئی اور اپنے لشکریوں کو للکارتے ہوئے انہیں دشمن پر زیادہ خوفناک ضربیں لگانے کی ترغیب دینے لگی تھی۔

اس طرح رانی کے مزید کچھ آگے گرنے سے رانی درگاوتی عادل خان کے تیروں کی زد میں آ گئی تھی۔ یہ دیکھتے ہوئے عادل خان نے اپنے اردگرد اپنے کچھ لشکریوں کو مستعد رہنے کا حکم دیا' ساتھ ہی اس نے اپنی زین کے ساتھ بندھی ہوئی ایک کافی بڑی دو اکڑی کمان کا اپنے ترکش میں سے سب سے لمبا اور کڑا تیر نکالا اور اسے کمان پر جمایا۔ سانس روکی۔ اس کے بعد جو اس نے تیر چلایا تو اس کا تیر سیدھا جا کے رانی درگاوتی کی آنکھوں میں لگا اور سر کے پچھلے حصے سے جا نکلا تھا۔

رانی درگاوتی کی حالت عادل خان نے وہی کر دی تھی جو اس نے پانی پت کے میدانوں میں ہیمو بقال کی تھی۔

عادل خان نے یہیں بس نہ کی۔ ایک دوسرا تیر چلے پر چڑھایا اور وہ بھی تاک کر چلایا۔ دوسرا تیر بھی رانی کے لگا تھا۔

عادل خان کے ان دو تیروں نے رانی کو نڈھال کر دیا تھا۔ رانی کے اردگرد جو لشکری جنگ کر رہے تھے' انہوں نے بھی رانی کی یہ حالت دیکھ لی تھی اور پھر آن کی آن میں رانی کے زخمی ہونے کی یہ خبر اطراف میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ رانی کی اس حالت کی وجہ سے اس کے اردگرد لشکریوں کے علاوہ دوسری طرف کے لشکریوں کی حالت بھی بڑی تیزی سے بدلنا شروع ہو گئی تھی' جہاں تھوڑی دیر پہلے رانی کے لشکری زوردار انداز میں جنگ کر رہے تھے' وہاں اب رانی کی حالت دیکھتے ہوئے ان کی حالت بڑی تیزی سے مجمل الفاظ کی داستانوں' سسکتے تڑپتے جذبوں' شب ہجر کے پھیلتے زہر' رات کے ویران گوشوں اور صدیوں پرانے شکستہ کواڑوں سے بھی بدتر ہونا شروع ہو گئی تھی۔

دوسری طرف رانی کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ دو تیر اس کے لیے جان لیوا ہو جائیں گے' وہ جنگ جاری نہیں رکھ سکے گی۔ اسے شکست ہو گی اور وہ گرفتار ہو جائے گی۔ لہٰذا اس کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اس بنا پر اس نے اپنا خنجر نکالا' اپنے جسم پر اس نے خنجر کے دو وار کیے اور اپنے آپ کا اس نے خاتمہ کر لیا تھا۔

مورخین تفصیل سے لکھتے ہیں کہ رانی درگاوتی کو جب دو تیر لگے تو اس نے خود ہی اپنا خنجر نکال کر دو وار کیے اور اپنے آپ کا خاتمہ کر لیا۔ رانی کی اس حالت پر اس کے لشکر میں چاروں طرف بددلی پھیل گئی اور لشکری پیچھے ہٹنے اور سمٹنے لگے اور جب آصف خان اور عادل خان کی طرف سے زوردار حملے شروع ہوئے تب رانی کے لشکر کو بدترین شکست ہوئی۔ رانی کا سینا پتی سنسار سنگھ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ باقی کو تعاقب کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح آصف خان اور عادل خان دونوں بھائی فاتح کی حیثیت سے ریاست گونڈوانہ کے مرکزی شہر چوڑھ گڑھ میں داخل ہوئے تھے۔

Drh ay bht

ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی بیوی کو ٹیلی فون کا ریسور ٹی وی سے لگاتے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔

بیوی بولی ''حیران کیوں ہو رہے ہیں۔ ممی کے ٹی وی پر آواز نہیں آ رہی بس ڈیڑھ گھنٹے کا پروگرام ہے صرف۔'' ☆

سنسنی خیز تاریخی داستان جاری ہے
مزید واقعات کے لیے
آئندہ ماہ کا شمارہ ملاحظہ کریں

ہمارے معاشرے کی بے حسی کی ایک جھلک ایک منفرد انداز میں

(آخری حصہ)

خوئے سگاں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ہمارے ملک میں اختیارات رکھنے والے طبقے نے اس معاشرے اور قانون کو کس طرح اپنے قبضے میں کر رکھا ہے...... اس کے بارے میں کبھی کبھار ہمیں اخبارات میں چھوٹی چھوٹی خبروں کے ذریعے بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے...... مگر ہم اسے محض ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے...... حالانکہ وہ حقیقت کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا...... اس شمارے سے ہم معروف قلم کار ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی حقیقت پر مبنی تحریر کو تین قسطوں میں پیش کیا گیا۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو ہمارے ملک اور اس "مخصوص" طبقے کے حالات اور اختیارات کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملے گا۔ اس تحریر کے بارے میں ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ملک کے با اختیار اور قانون کو کھلونا سمجھنے والے طبقے کی عکاس تحریر......!!!

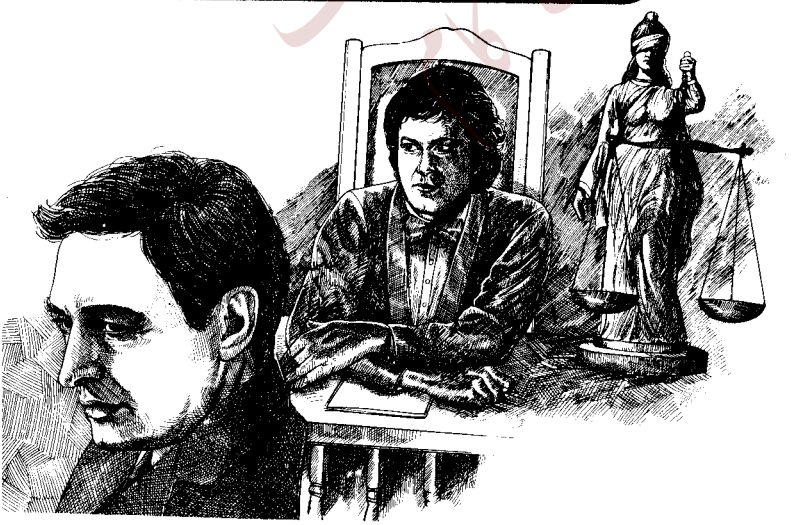

کو اتنی جلدی بابو خان کے فون کے آنے کی توقع ہرگز نہ تھی۔ تاہم انہیں بابو کی بات نے مکدر سا ضرور کر دیا تھا۔

بہرطور..... وہ اپنے حلق کی کڑواہٹ پر قابو پاتے ہوئے گہری متانت سے بولے۔

''بابو سائیں! آپ ضرور آئیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے، رہی انگوٹھی پہنانے والی بات..... تو اس بارے میں ابھی ہماری طرف سے فیصلہ ہونا باقی ہے۔''

لمحہ بھر بعد توقف کے وہ پھر بولے تو ان کے لیے میں ایک ہلکی سی کاٹ عود کر آئی۔

''دراصل آپ کی طرح ہماری بھی کچھ روایات ہیں۔''

''ٹھیک ہے بابا! آپ کی روایات کا ہم دل سے احترام کریں گے۔''

دوسری طرف سے وڈیرے بابو خان کی آواز ابھری۔

''مجھے آپ سے یہی امید تھی بابو سائیں!'' یہ سوچ کر احتشام الحق نے پرانی دوستی کا لحاظ سموتے ہوئے کہا۔ مگر باوجود اس کے جب وہ دوبارہ بولے تو ان کے لہجے میں ہلکا سا طنزیہ عنصر بھی شامل تھا۔

''دراصل بابو سائیں..... ہم بچوں کے معاملے میں کھلے دل کے مالک ہیں۔ ان پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ کیونکہ آگے زندگی انہوں نے گزارنی ہوتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس معاملے میں اپنی بیٹی سیمی کی رائے کو ہی پہلی فوقیت دیں گے۔''

''اڑے بابا! بچیوں سے کیسی رائے لینا؟''

دوسری طرف سے بابو خان کی کھرکھراتی آواز اُبھری۔

''عورتوں کو اگر اتنا عقل کل سمجھا جاتا تو طلاق کا اختیار مرد کے پاس نہیں ہوتا بابا۔''

''آپ بھول رہے ہیں بابو سائیں، عورت کے پاس بھی مرد سے طلاق لینے کا اختیار ہوتا ہے۔ جسے خلع کہا جاتا ہے۔''

''اچھا بابا! اب میں تم شہری لوگوں سے بحث تو کرنے سے رہا۔''

''دیکھو.....'' بابو خان جیسے آخر میں بحث سمیٹنے کی غرض سے بولا۔

''آپ پھر بے شک سیمی بٹی سے اس کی مرضی پوچھ لیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر یہ بھی ذہن میں رکھنا بابا..... کہ وہ ہمارے بیٹے قادر بخش کی ہی پسند ہے اور قادر بخش وڈیرے بابو خان کا بیٹا ہے۔ اللہ حافظ بابا'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

''ایڈیٹ.....!'' احتشام الحق نے دانت پیستے ہوئے فون پٹخا۔ وہ شاید بابو خان کے لہجے میں پوشیدہ دھمکی کے عنصر کو بھانپ چکے تھے۔

''یہ خود کو سمجھتا کیا ہے؟ اپنی اوطاقوں میں دو چار غریب ہاریوں پر تسلط جما کر ساری دنیا کو اپنی جاگیر سمجھنے لگا ہے۔ اس نے اچھا کیا جو فون خود ہی بند کر دیا۔ ورنہ مجھ سے بھی اس نے کھری کھری سن لینی تھی۔'' احتشام الحق کا پارہ ابھی تک چڑھا ہوا تھا۔

''کم آن شامی، ٹیک اٹ ایز، پلیز ڈونٹ ٹیک دی سرنیڈل دس میٹر'' ان کی بیگم نے ازراہ تشفی کہا۔ احتشام الحق اپنے طیش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

قادر بخش اور مومل پر بھی موجودہ حالات کی تبدیلی واضح ہو چکی تھی۔ جس کا واضح ثبوت شعیب یا سیمی کی وہ سرد مہری جو انہوں نے ان سے روا رکھی تھی کیونکہ کافی روز گزر چکنے کے باوجود بھی شہر سے ان دونوں بہن بھائیوں کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ ان کو بان کے گوٹھ آ کے اکثر فون پر گفتگو ہو جایا کرتی ہے۔ ادھر جب مومل کے بھائی قادر بخش نے سیمی سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تو اسے دوسری طرف سے کوئی دوستانہ رسپانس نہیں ملا تھا۔ سوائے سرد مہری کے ''ہائے ہیلو'' کے علاوہ سیمی نے قادر بخش سے کسی خاص ٹاپک پر بھی گفتگو کرنے سے احتراز ہی برتا تھا۔ وہ بعدہ

انتہائی سرد مہری سے یہ گفتگو منقطع بھی کر ڈالتا تھا۔ اس لیے شعیب نے خود ہی اب تک مومل سے کوئی ٹیلی فونک رابطہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ ایک سلجھا ہوا شخص تھا۔ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑنے والے عاشقوں میں سے وہ نہ تھا۔ جنہیں صرف اپنے پیار سے غرض ہوتی ہے اور دوسروں کی بالفاظ دیگر بڑوں کی عزت کا بھی پاس نہیں ہوتا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی کسک نہ رکھتا ہو۔ وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ مومل جیسی لڑکیاں کیسی خود ساختہ و جاہلانہ رسموں کی دیواروں میں چن دی جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی تھی۔ اپنے جائز حقوق کے لیے وہ لڑ بھی سکتی تھی۔ مگر شعیب اس کی معصومانہ اور غیر سرکشی فطرت سے یہ خوبی واقف تھا۔ وہ اس لڑکیوں میں سے نہ تھا جو سمجھوتے کی صلیب پر لٹکنے کو پہلے ہی سے اپنا مقدر سمجھے ہوئے پژمردہ بیٹھی تھی۔

مومل کی شخصیت دوسروں کے اس اذیت ناک پہلو کا علم شعیب کو اس بار اس وقت ہوا تھا' جب وہ اس کے ہمراہ تپتے ریگستانوں میں سفر کر رہا تھا' شعیب نے باتوں باتوں میں اس کے دل دروں کا عندیہ لینے کی کوشش کی تھی۔ تو مومل نے بھی اشاروں کنایوں میں بڑی آزردہ سی آہ بھری مسکراہٹ کیساتھ کہا۔

''شعیب ہمیں سوچنے اور فیصلے کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہمارے اعلیٰ تعلیم' ہمارا باشعور ہونا سب ان خود ساختہ اور جاگیردارانہ روایتوں کے تپتے سلگتے صحرا میں دفن ہو جاتا ہے۔''

یوں تو شعیب کا جی چاہتا تھا کہ وہ مومل سے ٹیلی فونک رابطہ تو کم از کم ایک بار کر ہی لے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

بہر طور..... سیمی کی بے رخی اور رکھائی پر قادر بخش جیسے اکڑ مزاج شخص کی روایتی اور خود ساختہ انا نے بلدم ضد و سرکشی کا روپ دھار لیا تھا۔ یوں بھی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سیمی کی یہ بے اعتنائی اس کی بہن مومل کے سیمی کے بھائی شعیب کو رشتہ دینے سے انکار کی وجہ سے تھا۔

تاہم اب دونوں خاندان کے دلوں میں رنجش اور خلیج بڑھنا شروع ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''بابا سائیں! سیمی صرف اور صرف میری ہے اور بس! میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں' دیکھتا ہوں میں یہ آپ کا احتشام الحق کیا کرتا ہے۔؟''

شہر حیدر آباد سے واپسی پر ہی سیمی وغیرہ کی مسلسل سرد مہری پر قادر بخش نے غصے سے دانت پیس کر اپنے باپ بابو خان کے سامنے اپنے خطرناک عزائم کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''نامیڈ اپٹ..... نا..... ذرا صبر کر' اس طرح گرما گرمی سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جو ہوں تیرا' وڈیرا بابو خان اب سنبھال خود کو۔''

وڈیرے بابو خان نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بابا سائیں..... احتشام الحق تو آپ کے خاص دوستوں میں سے تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی بیٹی سیمی کا رشتہ ہمیں دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اب بھلا میں کس بات کا صبر کروں؟''

بیٹے کی بات پر وڈیرے بابو خان کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر بڑی پراسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔ جیسے اپنے بیٹے کی گرم جوشی پر فخر کر رہا ہو' تاہم وہ بولا۔

''دیکھو بابا! قادر بخش ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ سیاست بھی کی ہے اور دھونس' دھمکی سے بھی کام نکالا ہے۔ مگر بہت ٹیڑھے اور ناممکن کام ہم نے دھمکی سے نہیں سیاست سے نکالے ہیں۔ آج جس سیٹ پر تمہارا احتشام الحق موجود ہے ناں بابا! یہ بھی اسے ہماری ہی دلائی ہوئی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بچوں کے معاملے میں اچھے اچھے لنگوٹیے یار بھی دانت نکوس کر سامنے آجاتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر بابو خان مزاحیہ انداز میں مسکرا کر بیٹے کا کاندھا تھپتھپانے لگا۔

لیکن قادر بخش نے اپنے باپ بابو خان کی بات ایک کان سے سنی' دوسرے کان سے اڑادی۔ وہ اسی وقت اپنی سنگل ڈور بجارو جیب میں بیٹھا اور گوٹھ سے سیدھا حیدر آباد بھٹائی ہاؤس پہنچا۔

حیدر آباد کے ''ہیرا جی'' علاقے میں ایک پسماندہ تھا جس کا نام ''گڑھی بدھل شاہ'' تھا وہاں ایک چھپر نما ہوٹل تھا زیادہ تر اس میں مزدور طبقہ چائے پینے اور روٹی کھانے آتا ہے۔

''بھٹائی ہاؤس'' میں ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد قادر بخش یہاں پہنچا تھا۔ جو دانستہ اپنی گاڑی کے بجائے رکشے میں آیا تھا۔ ہوٹل کا مالک صوبو دیرو نامی ایک سائن باٹن شخص تھا اور اس وقت وہ ایک سالخوردہ سے لکڑی کے دخل (کاؤنٹر) پر بیٹھا' منھ میں بابو بیڑی دبائے بڑے مزے سے کش لینے میں مگن تھا۔ صوبو دیرو نے جیسے ہی قادر بخش کو دیکھا تو اسے پہچان کر یک دم جیسے اسے کرنٹ لگا' اور وہ اپنے سر پہ دھرے شیشوں کے کام والی سرخ سندھی ٹوپی درست کیے ہوئے فوراً قادر بخش کی طرف بڑھا۔

''بھلی کرے آیو۔ سائیں وڈا' بھلی کر آیو'' (خوش آمدید)

''حکم کرو سائیں''

''ہاؤ بابا' ایک ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

''آؤ سائیں سب اندر آجاؤ۔'' صوبو نے خوش آمدید مسکراہٹ سے کہا۔

اس وقت ہوٹل میں ذرا اونچی آواز میں سندھ کی معروف لوک فنکارہ ''مائی بھاگی'' گیت کا کیسٹ بج رہا تھا۔ ہوٹل کی کچی دیواروں پر بڑے بڑے اخباری فلمی پوسٹر آویزاں تھے۔ ایک اونچی جگہ پر بلیک اینڈ وائیٹ ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ صوبو نے قریب کھڑے ایک پیش گار (بیرا) لڑکے کو چائے وغیرہ کا آرڈر دینا چاہا تو قادر بخش نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

''صوبو! بابا' ہم اس وقت ذرا جلدی میں ہیں۔ تیری چائے پھر کبھی سہی' ایک ضروری کام کردے ہمارا......'' اس کی بات پر صوبو کے چہرے پہ ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پھر وہ دونوں اندر گارے مٹی والی ایک کچی کوٹھڑی میں آکر زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔

''ہا سائیں' اب حکم کرو۔'' صوبو چٹائی پر پالتی مار کر بولا۔

کوٹری کے اندر کی فضاء خاصی ٹھنڈی اور سوندھی خوشبو لیے ہوئے تھی۔ شاید ہی بلا ناغہ تازہ پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا رہا تھا۔

''صوبو...... یار! تو یہ بتا۔ دھاڑیل محب شیدی آج کل کہاں اور کون سے بیلے (جنگل) میں ملے گا۔؟'' قادر بخش نے قدرے دھیمی آواز میں کہا تو اس کے استفسار پر صوبو کے چہرے پر ایک لمحے کو گہری سوچ کے آثار امنڈے پھر وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''سائیں! شیدی' تھوڑے دن پہلے ہی دھاڑ یلوں (ڈاکوؤں) کی بھرتی کے لیے یہاں آیا تھا ان کے انٹریو (انٹرویو) لیے اس کے بعد واپس اپنے جنگل ڈیرے لوٹ گیا بتاؤ ویسے آج کل اپنا شیدی بادشاہ خیر پور کے بیلے میں ہے۔ کوئی کام تھا؟''

''ہاں یار'!'' قادر بخش نے کہا۔ اس کے بعد دونوں باتیں کرتے رہے۔

☆☆☆

سیمی پر آج کل قنوطیت نے پوری شدت سے حملہ کر رکھا تھا۔

وہ اسی وجہ سے فکر مند تھی۔ یا اسے اس بات کا کوئی ذرا سا بھی قلق تھا کہ اس کے بھائی شعیب اور مول کی آپس میں رشتے کی بات نہ بن سکی تو اس نے اس کے بعد قادر بخش سے اب شادی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے برعکس تو شروع ہی سے قادر بخش کے ساتھ شادی کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ سانپ

والے واقعہ کے بعد سے تو اسے قادر بخش سے بھی برا لگا تھا۔ نا ہی وہ قادر بخش کے معاملے پہ سنجیدہ تھا مگر اپنے بھائی شعیب اور مومل کی وجہ سے وہ متفکر اور پریشان ضرور تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو واقعی بہت چاہتے ہیں اور مومل تو اسے بھی ذاتی طور پر پسند تھی۔

بہرطور یہی سبب تھا کہ اس نے خود بھی قادر بخش سے شادی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔

وہ اوائل جون کی ایک گرم شام تھی۔ سیمی کا دل اس دن اتنا اکتایا ہوا تھا کہ اس نے اپنی کار نکالی اور بلا ارادہ ڈرائیونگ پر نکل گئی۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھی کہ ایک اور گاڑی بھی اس کے تعاقب میں لگ چکی ہے۔

وہ بڑے اطمینان سے کار میں لگے اسٹیریو ڈیک پر سننے میں مگن تھی۔ وہ اپنی کار کو ذرا دیر یونہی مختلف اور بھری پری شاہراہوں پر دوڑاتی رہی پھر ایک اس ذیلی سڑک کی طرف مڑ گئی جو نسبتاً ویران تھی۔ اس کا گاڑیوں کے علاوہ وہاں کسی کے گزر نہ تھا۔ اس کے تعاقب میں آتی ہوئی گاڑی اچانک اسے کراس کرتی ہوئی عین سڑک پر ترچھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

سیمی اگر بروقت بریک نہ لگاتی تو اس کی کار سامنے راہ روکے ہوئے کھڑی جیپ سے ٹکرا جاتی' کار کے ٹائر زور سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ سیمی کی کار کے رکتے ہی سامنے ترچھی کھڑی جیپ سے چند ڈھاٹے پوش اسلحہ بردار افراد بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کڑے مار کر اس کی کار کے قریب پہنچتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر یک بک بیٹھی سیمی کو دروازہ کھول کر بے دردی سے کھینچا اور باہر نکال کر ان میں سے ایک نے اس کی ناک پر رومال رکھ دیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو کر ان کی بانہوں میں جھول گئی۔ تب انہوں نے سیمی کے بے سدھ جسم کو اٹھا کر آناً فاناً اپنی جیپ میں ڈالا اور فی الفور وہاں سے ہوا ہو گئے۔

☆☆☆

وڈیرا بابو خان اپنی اوطاق میں اجرک اوڑھے ایک نسبتاً اونچے اور چوڑے پشتے والے موڑھے (مونڈھے) پر براجمان تھا اور اس کے سامنے مفلوک الحال ہاریوں کی پوری جماعت فرش پر بیٹھی تھی۔ اتنے میں منشی جبل نے موبائل اسے تھماتے ہوئے مودبانہ کہا۔

''سائیں آپ کا فون''

وڈیرا بابو خان نے کارڈلیس کا ریسیور تھام کر کان سے لگایا۔

''ہالو بابا! وڈیرا بابو خان بولتا پڑا ہے۔''

''بابو خان! میری بیٹی کو اغوا کرنے کا مطلب جانتے ہو تم؟''

دوسری طرف سے احتشام الحق کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔ وڈیرا بابو خان ایک لمحے کو بری طرح چونک گیا تاہم پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

''تم ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہو بابا' ٹھنڈے ہو جاؤ پھر بات کر لیں گے۔''

''بابو خان! میری بیٹی کا بال بھی بیکا ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا''

''زبان سنبھال کر بات کرو احتشام' میں اس کا عادی نہیں' صرف مجھے دوستی کا خیال آ رہا ہے اور بس.....''

''دوستی اب رہی کہاں ..... بابو خان'' دوسری جانب سے احتشام الحق نے بھی اس لہجے میں کہا۔

''تم دوستی کیا کرو گے بابو خان! تمہیں تو دشمنی کا بھی سلیقہ نہیں آیا۔ بزدلوں کی طرح عورتوں پر ہاتھ ڈال کر سمجھتے ہو کہ تم اپنی مرضی کر لو گے۔''

''بس احتشام! بہت ہو گیا' مجھ سے اس لہجے میں گفتگو کر کے تم خود کو بہت بڑے جنجال میں ڈال رہے ہو۔ اس کا شاید تمہیں اندازہ نہیں ہے۔'' بابو خان نے دانت پیس کر سراسر تے لہجے میں کہا۔

''تم نے کسی ہاری کی لڑکی کو نہیں بلکہ احتشام الحق 'فرسٹ کلاس بیوروکریٹ آفیسر کی بیٹی کو اغوا کرنے کی جرات کی ہے۔' بابو خان! جو تلافی کی صورت

چاہو موت سے کم کی سزا پر راضی نہ ہوگا۔'' احتشام الحق نے بدستور پھنکارتے ہوئے بے وجہ کہا۔

وڈیرہ بابو خان اور بیورو کریٹ آفیسر احتشام الحق دونوں ٹکر کے اور ہم پلہ ہیں۔ اگر وڈیرا اپنا ووٹ بینک رکھتا تھا تو احتشام الحق کے ساتھ بھی پوری انتظامیہ کی مشینری تھی۔

تاہم یہ اپنی جگہ حقیقت تھی کہ وڈیرے بابو خان کو اس بات کا علم تک نہ تھا۔ سیمی کو اس کے بیٹے نے ہی دھاڑیل محبِ شیدی کے ساتھیوں کے ذریعے اغوا کروایا' یوں اسے اب اندازہ ہونے لگا تھا یہ حرکت اس کے بیٹے کے سوائے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ وڈیرے بابو خان کو مفاہمت والا لہجہ اختیار کرنا پڑا' اور اس بار وہ معتدل لہجے میں احتشام الحق سے بولا۔

''دیکھو بابا! احتشام! اللہ گواہ ہے کہ یہ حرکت میں نے نہیں کی ہے۔ مجھے حیرت ہے تمہیں بھلا مجھی پر کیوں شک گزرا ہے؟''

''میں تمہاری دھمکی کو بھولا نہیں ہوں' بابو خان'' جواباً دوسری طرف سے احتشام الحق کی آواز ابھری۔ ''تم نے مجھ سے خود پر اپنا گھناؤنا عزائم کا ارادہ پہلے ہی کر ڈالا تھا کہ..... میری بیٹی سیمی صرف تمہارے بیٹے قادر بخش کی ہی بیوی بن سکتی ہے۔ کیا تم زبردستی ایسا کرسکتے ہو بابو خان؟ احتشام الحق کی ناز و نعم میں پلی ہوئی بیٹی کے ساتھ میں تمہیں صرف دو گھنٹوں کی مہلت دے رہا ہوں' بابو خان میری بیٹی خیریت کے ساتھ میرے پاس پہنچ جائے' ورنہ پورے ملک کی مشینری میں تمہارے پیچھے لگا دوں گا۔''

یہ دھمکی دے کر..... دوسری طرف سے احتشام الحق نے رابطہ منقطع کردیا۔

وڈیرے بابو خان کے چہرے پر اب غصے یا طیش کے بجائے الجھن آمیز پریشان کے تاثرات امنڈ آئے تھے۔ وہ نہایت پرسوچ اور پرمتانت خاموشی سے سرکنڈوں کے موڑھے (مونڈھے) پر براجمان ہوگیا۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ یہ کام کے لاڈلے بیٹے قادر بخش کا ہی ہوسکتا تھا۔

''اڑے بابا جل''

''حاضر سائیں وڈا!'' منشی جبل سندھ سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے مودبانہ بولا۔

''اڑے بابا! وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔''

''کیا ہوا سرکار؟ پھر خیریت تو ہے ناں؟''

''تم ایسا کرو..... فوراً قادر بخش سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔ جلدی بابا'' وڈیرے بابو خان نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے گھمبیر لہجے میں کہا۔

وہ اب خاصا بے چین اور پریشان نظر آرہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے بیٹے قادر بخش نے غلط حرکت کی تھی جو اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ اگرچہ وہ خود معمولی انسان نہ تھا مگر اس کے بیٹے نے بے وقوفانہ حرکت کرکے ایسے کمزور بنا ڈالا تھا۔ اس سے اس کی سیاسی ساکھ بھی متاثر ہوسکتی تھی۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ آئندہ ہونے والے انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ ایسے میں یہ واقعہ اس کی سیاسی ساکھ کو دھچکا پہنچا سکتا تھا۔

اس کا ذہن اب گھمبیر صورت حال سے خاطر خواہ طریقہ سے نمٹنے کے لیے تیزی سے کام کررہا تھا۔

☆☆☆

کوٹھڑی کی سیاہ زرد اور گھٹن آمیز محبوس فضا میں وہ دونوں پیوند زنداں کی تصویر بنیں بری طرح سسک رہی تھی لیکن انہوں نے ابھی ہمت نہیں ہاری۔

اگرچہ اپنے نجات دہندؤں کی لرزہ خیز موت کا وہ خونیں منظر ہنوز چشم تصور میں گردش کررہا تھا لیکن اب وہ خود کو سمجھا چکی تب' تک جانتی تھی کہ یوں مایوس ہونے اور رونے دھونے کے سوائے کچھ ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے اب وہ دونوں سنجیدگی کے ساتھ ایک بار پھر وہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچنے لگیں۔

''اختیاراں' ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ورنہ

میں زندہ درگور کردی جاؤں گی۔''

ملوکاں نے اپنے قریب سیاہی زدہ فرش پر بوسیدہ سی دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے بیٹھی مضطرب الحال اختیاراں سے اس کے آواز میں ایک پرجوش عزم کی جھلک تھی۔

''مجھ آپ کون سا راشی زندوں میں ہوتا ہے۔ ملوکاں .....'' اختیاراں نے آزردہ سی لرزتی آواز میں کہا۔

''مایوسی کی بات کروگی تم..... کچھ حاصل نہ ہوگا۔'' ملوکاں نے اسے ٹوکا۔

''تم نے دیکھا نہیں کہ آہستہ آہستہ ہم جیسی قیدی عورتوں کو دو سے سودا گردوں کے حوالے کیا جارہا ہے کل کلاں ہماری باری بھی آسکتی ہے۔''

''ہاں.....''

''تو پھر ہمیں نکلنا ہوگا۔''

''مگر کیا؟''

''ہمت کرکے''

''اس قید خانے کی دیواروں کو ہم بھلا کیسے گرا سکتے ہیں۔؟''

''سنو.....! تم نے اس موٹے کالے پہرے دار کو نہیں دیکھا۔ جو سارا سارا دن اور رات شراب چڑھائے پڑا رہتا ہے۔'' ملوکاں نے کہا۔

''ہاں! مگر وہ ہماری مدد کیوں کرے گا۔؟''

اختیاراں اس کی بات کا مطلب سمجھے بغیر بولی۔

''وہی ہماری مدد کرے گا..... تم دیکھتی جاؤ میں کرتی کیا ہوں؟''

ملوکاں نے پراسرار لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں مضحکہ خیز چمک ابھری تھی۔ وہ اختیاراں کے مقابلے میں زیادہ حوصلہ منداور دلیر لڑکی تھی۔

''تم کیا کروگی ملوکاں؟'' اختیاراں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''دیکھتی جاؤ' اور ذرا رات ہونے دو۔'' ملوکاں نے اختیاراں سے سرگوشی کی۔

''اختیاراں..... اب تم ویسا ہی کرنا جیسا کہ میں کہوں؟'' اور اختیاراں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم ادھر ایک کونے میں سوتی بن کر لیٹ جاؤ۔ میں اس موئے کالے شرابی کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔'' اختیاراں اٹھ کر ذرا دور کونے میں جا دبکی..... اور ملوکاں اپنی جگہ سے اٹھ کر سلاخ دار دروازے پہ آ کر بیٹھ گئی۔ باہر مختصر سی راہداری میں مدھم روشنی تھی۔ جب کہ وہی موٹا کالا پہرے دار سامنے ہی راہداری کی دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا۔ شراب کی بوتل تھامے ہوئے تھا۔

ملوکاں دانستہ اس کی نظروں کے سامنے سلاخ دار دروازے کے قریب بیٹھ کر اسے تکنے لگی۔

پھر جب موئے پہرے دار نے اپنی نیم باز نظروں کے ساتھ ملوکاں کی طرف دیکھا تو ذرا چونک سا گیا۔ ملوکاں ایک قیامت خیز انگڑائی لینے کے بعد اب مڑ کر اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پہرے دار نے جو اسے اپنی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تو اس کا نشہ دو چند ہوگیا۔ ادھر ملوکاں نے اسے اپنی طرف متوجہ پا کر اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ پہرے دار دانت نکالتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ تو ملوکاں نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور دل لبھانے والے انداز میں اس طرف دیکھا مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ظالم تنہائی نے مار ڈالا ہے..... تم کتنے خوبصورت اور صحت مند مرد ہو' کیا میرے ساتھ تھوڑی دیر باتیں کروگے۔''

موئے شرابی پہرے دار نے ایک حسین اور جوان لڑکی کو یوں خود پر فریفتہ ہوتے دیکھا تو چاروں شانے چت ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں اب ہوس ناچنے لگی تھی۔ وہ گھور گھور کر ملوکاں کے حسین وشباب وجود پر نظریں گاڑتے ہوئے ہوس سے بولا۔

''ہاں..... تو صحیح کہتی ہے۔ چھوکری میں خود بھی یہاں دن رات ڈیوٹی دے کر بیزار سا ہونے لگا ہوں' کیا ہم آج کی رات کو رنگین بنالیں؟''

''ہاں..... میرے شہزادے! میں بھی یہی چاہتی

ہوں۔ مگر..... ہمارے درمیان یہ سلاخوں والی دیوار جو کھڑی ہے'' وہ چالاکی سے بولی تو شرابی پہرے دار الجھ سا گیا۔ ملوکاں نے اسے متامل پا کر مکاری سے کہا۔

''نہیں..... اس بار یہ تو نہیں..... مگر .....وڈیرا.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''وڈیرے کو کیا پتہ' ہم کیا کر رہے ہیں؟ سب لوگ سو چکے ہیں۔ یہ سنہری موقع ہے۔ ذرا دیر کو ہم اپنا دل بہلا کر پیاس بجھا لیں گے۔ تو کون سی آفت آجائے گی۔'' ملوکاں نے دلکش مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو شرابی پہرے دار نے دل باندھا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی شیشے کی بوتل کو منہ سے لگا کر ایک گھونٹ اور لیا پھر اپنے نیفے میں اڑسی ہوئی چابی نکال کر..... سلاخ دار دروازے کے تالے میں گھمائی اس کے بعد دروازہ کھول دیا..... ملوکاں مسکراتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔

پہرے دار خوش ہو گیا۔ اس نے بوتل ملوکاں کی طرف بڑھا دی۔ اب ملوکاں اسے دکھانے کی خاطر بوتل اپنے منہ کے قریب لا کر ہٹا کر اسے منہ سے لگا لیتی۔

''اب شراب ہی پلائے جاؤ گی یا اپنے اس پر شباب و مرمریں جسم سے بھی کھیلنے دو گی۔''

وہ لڑکھڑاتی ہوئی ہانپتی کانپتی آواز میں ملوکاں سے بولا تو وہ مکاری سے اٹھلا کر بولی۔

''ذرا نشہ تو چڑھنے دو۔ تاکہ پیار کرنے میں مزہ بھی آئے..... لو پیو۔''

یہ کہہ کر اس نے دوبارہ پہرے دار کے ہونٹوں سے بوتل لگا دی۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ایک مرد عورت کے ہاتھوں بہ آسانی بے وقوف بنتا ہے۔ وہ بھی ملوکاں کی دل لبھانے والی باتوں پر بے وقوف بن گیا تھا یہاں تک کہ شراب پی پی کر جب بالکل نڈھال ہو گیا تو ملوکاں نے کھڑے ہو کر شراب کی بوتل سے اس کے سر پر وار کیا۔ پہرے دار کے حلق سے کراہ بلند ہو گئی اور اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ اب اس کے زخمی سر سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

یہ کام نمٹانے کے بعد ملوکاں نے اختیاراں کو آواز دی۔ اس کے بعد وہ دونوں قید خانے سے باہر نکل آئیں۔

☆☆☆

''ادا سائیں ربا مجھے پورا یقین ہے کہ..... اختیاراں اور ملوکاں ابھی تک اس خبیث وڈیرے بابو خان کے قبضے میں ہوں گی۔''

ایڈووکیٹ عنایتاں نے تمتماتے ہوئے لہجے میں سامنے اک کرسی پر براجمان اپنے بھائی ڈی ایس پی آچر خان سے کہا۔

''اگر بابو خان کی حویلی پر ریڈ کر دیا جائے تو وہ دونوں مظلوم لڑکیاں بھی اس کی نجی جیل سے برآمد ہو سکتی ہیں۔ جنہیں وڈیرے بابو خان کے خلاف بہ طور گواہ بنایا جا سکتا ہے۔ یوں میرا کیس اس کے خلاف مزید مضبوط ہو جائے گا۔''

آچر خان نے چائے کی آخری چسکی لے کر کپ خالی تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ادی! یہ سب اتنا آسان تو نہیں ہے۔ مگر بہر حال میرا مطلب یہ ہی نہیں کہ ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے لیکن میں سب سے پہلے وڈیرے بابو خان کی جڑیں کاٹوں گا تاکہ قانون کے نرغے میں آنے کے بعد وہ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں نہ لا سکے۔''

''ادا سائیں' یہ سب پھر کب ہو گا؟ وڈیرے بابو خان ظالم شخص کو مزید مہلت دینا اسے طاقت ور بنانے کے مترادف ہو گا..... کیونکہ آئندہ ہونے والے انتخابات میں اس کی اسمبلی کی سیٹ پکی ہے۔''

''ہاں! مجھے معلوم ہے'' آچر خان نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''مگر..... ادا اب جلد بازی سے کام بگڑ بھی سکتا ہے۔ اس کا سراسر فائدہ وڈیرے بابو خان کو ہی ہو گا۔

اب دیکھو کہ تمہارے سائیں کی لاشوں کو میں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر وہ مردار خور گدھوں کی خوراک بن کر بالکل ناقابل شناخت بن چکی تھیں۔ اب تک اس کے گرد مضبوط گھیرا ڈال سکوں گا اس پر ڈائریکٹ ایکشن لینا ناکامی کا باعث ہوگا ایک طرف اسے فائدہ ہی ہوگا۔'' چند ثانیے توقف کے بعد وہ اپنی بہن سے بولا۔

''ادی! تم تھوڑا صبر کرو اور مجھ پر بھروسا کرو۔ اب اس کا گہرا اور قریبی دوست رہ چکا ہوں اور اس کے سارے سیاہ رازوں سے واقف ہوں۔''

ایڈووکیٹ عنایاں کو بھائی کی بات سے کافی حد تک تشفی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

سیمی کو اغوا کرنے کے بعد قادر بخش کو دھاڑیل محب شیدی کے ''جنگلی ڈیرے'' تک پہنچنے میں کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ سوائے تین چار گھنٹوں کے مسلسل اور تھکا دینے والے سفر کے..... صوبو کے آدمی بھی اس کے ہمراہ تھے۔ محب شیدی خود بھی ساتھ تھا۔ جس کی مدد سے ہی قادر بخش نے یہ ''معرکہ'' انجام دیا ہے۔ سیمی کو ذرا ہوش آتا تو اسے دوبارہ کلوروفارم کی ہلکی مقدار سنگھا دی جاتی۔

دھاڑیل محب شیدی کی کمین گاہ آج کل دادو کے علاقے میں گنجان پہاڑی علاقے کوہ کیر پہاڑ میں ہے۔ جدھر اس کے اور بھی گروہی دھاڑیل ساتھ موجود ہیں۔ وہاں ان کی خفیہ کمین گاہ تھیں۔

یہاں جا بجا سرکنڈھوں اور پھونس کی سیڑھیاں بھی بنی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سیمی کسی معمولی باپ کی بیٹی نہیں تھی۔ اس لیے قادر بخش اسے اپنے مقصد کی برآری تک اسے شہر سے دور افتادہ یہاں جنگل پہاڑیوں میں لے آیا تھا۔ اگرچہ وہ خود ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔

سیمی کو ایک پھونس کی چھوٹی سی مڑھی (جھونپڑی) میں مقید کر دیا تھا اندر چارپائی رکھی تھی۔ پیالی کے اوپر بڑی سی رلی بچھی ہوئی تھی۔ سیمی کو اس پر بے سدھ ڈال دیا گیا تھا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ یہ سارا کام نمٹانے کے بعد اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا' قادر بخش کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد اس کی آواز ابھری تو دھاڑیل محب شیدی نے مودبانہ آواز میں کہا۔

''چھوٹے سائیں! آپ کا کام ہو گیا ہے۔''

''ویری گڈ..... کہاں ہو تم لوگ..... اور شکار؟''

دوسری طرف سے قادر بخش کی پرمسرت آواز سنائی دی۔

''ہم اپنے جنگلی ڈیرے میں آ چکے ہیں' چھوٹے سائیں..... شکار بھی ہے''

محب شیدی بولا اور ساری تفصیل سے قادر بخش کو مختصراً آگاہ کر دیا۔

''ٹھیک ہے میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔'' قادر بخش نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

ڈی ایس پی آچر خان اس وقت اپنے آفس میں ریوالونگ چیئر پر براجمان تھا اس نے گھنٹی بجا کر اردلی کو اندر بلایا۔

''جی سر!'' وہ مودبانہ بولا۔

''رب نواز کو اندر بھیج دو.....'' اس نے اردلی سے کہا۔

''ابھی بھیجتا ہوں سر'' اور واپس لوٹ گیا۔

ذرا دیر میں ہی ایک تیس پینتیس سالہ شخص مخصوص وردی میں اندر داخل ہوا۔ اور سیلوٹ جھاڑ کر بولا۔

''سر''

''اللہ ڈنو کہاں ملے گا؟'' آچر خان اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے گویا ہوا۔

''وہ سائیں پاڑا میں منشیات فروشوں کی مخبری کرنے گیا ہوا ہے۔''

''اسے آدھے گھنٹے کے اندر اندر میرے سامنے پیش کرو۔''

''یس سر!'' اے ایس آئی رب نواز نے سیلوٹ جھاڑ کر مودبانہ جواب دیا اور واپس لوٹ گیا۔

بیس منٹ بعد ایک چالیس پینتالیس سالہ سا شخص جس کے جسم پر عام سے کپڑے تھے' ڈی ایس پی آچر خان کے سامنے کھڑا تھا۔

''بیٹھو!'' آچر خان نے اس کی طرف دیکھ کر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ پولیس کے لیے مخبری کرتا تھا۔ اللہ ڈنو کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

''وڈیرے بابو خان کو جانتے ہو۔؟'' اس کے کرسی پر بیٹھتے ہی ڈی ایس پی آچر خان نے اس کے چہرے کو اپنی نظروں میں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ وہی تو نہیں سر جو کھر میں رہتا تھا۔؟'' مخبر بولا۔

''ہاں وہی ہے۔''

''ٹھیک ہے سر اس کے لیے کیا حکم ہے۔''

''تمہیں کھر جانا ہوگا۔ بھاگل پور میں اس کی حویلی ہے۔ وہاں تمہیں اس کی نجی جیل کے بارے میں پتا چلانا ہوگا۔ نیز اس کے ایک ارباب علی خان نامی شخص سے خفیہ تعلقات ہیں۔ جو ٹھٹھے میں رہتا ہے۔''

ڈی ایس پی آچر خان نے اسے مختصراً تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے چند ہدایات دیں۔ مخبر نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

سرکنڈوں اور پھونس کی جس مڑھی (جھونپڑی) کے اندر سیمی کو رکھا ہوا تھا اس کے اندر سے سیمی کی ہسٹریائی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ بڑے غصے اور طیش کے عالم میں قادر بخش سے باتیں کر رہی تھی۔ جو ذرا دیر پہلے ہی وہاں پہنچا تھا۔

''یو باسٹرڈ..... جانتے نہیں تم۔ میں کس کی بیٹی ہوں۔ میرے پپا تم ساروں کو پھانسی پر لٹکوا دیں گے۔ مم..... مجھے باہر نکالو۔'' قادر بخش مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سیمی کی چیخ سن کر محبِ شیدی اندر داخل ہو گیا تھا۔ وہ قادر بخش سے وحشیانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''واہ سائیں واہ..... چھوٹے سائیں! آپ کے انتخاب کی بھی داد دینا پڑے گی۔ واقعی یہ خوبصورت اور حسین چھوکری ہماری بھاجائی (بھابھی) بننے کے لائق ہو سکتی ہے۔''

''یہ..... یہ..... غلیظ اشارہ' شاید شاید اس نے ہی مجھے اغوا کرنے کی جرات کی تھی۔'' سیمی قطعاً خوف زدہ تھی۔ وہ ایک جرأت مند لڑکی تھی۔ پھر وہ قادر بخش کی طرف دیکھ کر غصے سے دانت پیس کر بولی۔

''قادر بخش..... مجھے تم سے ایسی اوچھی حرکت کی امید نہ تھی کہ تم نے دوستی کی آڑ میں پیٹھ پر خنجر گھونپا ہے ہمارے۔ تم اب میری نظروں سے گر چکے ہو۔''

سیمی کی نفرت بھری پرطیش گفتگو پر قادر بخش کو بھی غصہ آ گیا۔ اور وہ سیمی کو خوف ناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''مجھے ضرورت ہی نہیں ہے تمہاری نظروں میں اپنا مقام بنانے کی۔ سمجھی تم' مجھے جو چیز اچھی لگ جاتی ہے پھر وہ صرف اور صرف میری ہو جاتی ہے یا پھر دو گز زمین اس کا مقدر ہوتی ہے۔'' سیمی کو اس کے سفاک لہجے پر ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا۔

''شٹ اپ! ایسا تم اپنی باریوں کی بیٹیوں کے ساتھ تو ظلم کر سکتے ہو' لیکن..... لیکن میرے سلسلے میں تو ایسی کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ قادر بخش میں تو تمہارے چہرے پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔''

سیمی کے اس حقارت آمیز جواب پر قادر بخش بھڑک اٹھا اور اگلے ہی لمحے اس نے آگے بڑھ کر سیمی کے گال پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔

غصے اور بے بسی کے مارے سیمی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

قادر بخش پھر وہاں نہ رکا۔ ٹیرس سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر وڈیرے بابو خان کو نہ صرف یہ معلوم ہو چکا تھا کہ سیمی کو اغوا کرنے

لی حرکت اس کے لاڈلے بیٹے قادر بخش کی ہے۔
بابا۔ اس کے آدمیوں نے اسے یہ اطلاع بھی دی تا کہ اس کے بیٹے قادر بخش کے خلاف اغواء کی رپورٹ بھی درج کروادی گئی ہے اور ایک پوری کمان قادر بخش کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔
مگر وڈیرا بابو خان کو سب سے زیادہ پریشانی اس بات پر ہو رہی تھی اس کا ابھی تک اپنے بیٹے قادر بخش سے کوئی رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ وڈیرے بابو خان کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کو تلاش کر کے اپنے ''پیروں'' کے نیچے چھاپے سلسلے میں اس نے منشی جبل سندھو کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی۔ مگر منشی جبل سندھو بھی کیا کرتا۔ وہ ہنوز قادر بخش کا پتہ چلانے اس سے کسی بھی قسم کا ٹیلی فونک رابطہ کرنے کے سلسلے میں ہر طرح ناکام رہا تھا۔

یہی سبب تھا کہ وہ اس وقت اپنی ناکامی کا منہ لیے وڈیرے کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا۔ جب کہ وڈیرے بابو خان دونوں ہاتھ اپنی پشت پر ہاتھ سے عالم پریشانی میں ٹہل رہا تھا۔

''آڑے منشی بے آ پڑیں قادر بخش کا۔ جلدی پتہ لگا بابا! وہ ابھی بچہ ہے' نادان ہے' اس کے پیچھے پولیس نہیں لگی ہوئی۔ اس حرام زادے احتشام نے پوری کمان کو اس کی تلاش میں لگا رکھا ہے۔ وہ ہمارے پٹ (بیٹے) کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرے گا۔ پولیس ہوتی تو اور بات تھی۔'' وڈیرے نے دانت پیس کر تلملاتے ہوئے کہا۔

''سس...... سائیں...... وڈیرے' میں نے تو آدمی بھی چھوٹے سائیں کی تلاش میں بھی بھیج چکا ہوں۔ جب کہ انہوں نے اپنا موبائل شاید آف رکھا ہوا ہے۔'' منشی نے لرزتی آواز میں کہا۔

''تو بالکل بے کار آدمی ہے۔ ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔''

☆☆☆

ڈی ایس پی آچر خان کا پولیس مخبر اللہ ڈنو عرف مڑا یا ڈا اس روز تک روانہ ہو گیا تھا اور عمر کوٹ پہنچ کر اس نے ایک کیکڑا گاڑی میں ''بھاگل پور'' کا رخ کیا۔

اس کے دوست کا ایک دور کا رشتہ دار سائیں رکھیو' وڈیرے کا چاکر (نوکر) کے وسیلہ صاحب سے جا کر ملا' اور نوکری کی درخواست کی۔ سائیں رکھیو نے وڈیرے کے زرعی فارم میں لگوا دیا تھا۔ چور کہ مڑ (ساڈ) ایک پیشہ ور مخبر تھا۔ اس نے اپنا کام تیزی سے شروع کر دیا اور وہ حویلی کے ملازموں کے درمیان میں اٹھنے بیٹھنے لگا اس نے اپنے ساتھ دوستی لگالی تھی۔

ایک دو روز کے اندر ہی اندر اسے یہاں کی بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔

چنانچہ اس روز جب وڈیرے بابو خان تک پاس ایک چاکر نے آ کر...... ارباب علی خان کی ٹھٹھے سے آنے کی اطلاع دی تو اس کی بھنک اس کے کانوں پر بھی پڑ گئی۔ وہ مال کی تازہ کھیپ لینے آ رہا تھا۔

ادھر وڈیرا بابو خان اپنے بیٹے قادر بخش کی تلاش میں حویلی سے نکل گیا تھا۔

حویلی میں اب اس وقت مومل اور اس کی ماں تنہا رہ گئی تھیں۔

دونوں ماں بیٹیاں پریشان تھیں۔ انہیں علم ہو چکا تھا کہ ان کے لاڈلے قادر بخش نے احتشام الحق کی بیٹی سیمی کو اغوا کیا تھا اور خود بھی اب تک روپوش تھا۔

''اللہ سائیں اب میرے بچے قادر بخش پر رحم کرنا۔ اسے اپنی امان میں رکھنا''

مومل کی ماں روہانسے انداز میں دعا مانگنے لگی۔

مومل اسے تسلی دینے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ حالانکہ اسے خود اپنے بھائی قادر بخش کی اوچھی حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر بہر حال وہ اس کا بھائی تھا۔ اس لیے وہ اندر سے متفکر تھی۔

☆☆☆

چہار سو تاریک رات کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

دونوں دم بہ خود سایوں کی مانند کھڑی تھیں۔ یہ اختیاراں اور ملوکاں تھیں۔

قید خانے سے فرار ہونے کے بعد انہوں نے آگے قد بڑھائے۔ تو اس وقت تیز روشنی میں نہا گئیں۔ یہ ٹارچوں کی روشنی تھی۔ ان کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئیں۔ وڈیرے بابو خان کے بیرونی مسلح پہرے داروں نے انہیں فوراً ہی بھانپ لیا تھا۔ دونوں کم نصیب عورتیں اپنی ناکامی پر غش کھا کر ریت پر گر پڑیں۔ اور وڈیرے کے خونخوار حواریوں نے دونوں کو بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے دوبارہ پیوند زنداں کر دیا۔

دونوں کو خاصی دیر بعد ہوش آیا تو..... ایک بار پھر خود کو پیوند زنداں پا کر اپنے روٹھے نصیبوں پر آنسو بہانے لگی۔ بار بار کی ناکامی پر اختیاراں بے حوصلہ ہونے لگی' اس پر ہسٹریائی دورے پڑنے لگے۔ اس نے اپنی کلائی کی رگ دانتوں سے کاٹ کر خودکشی کرنے کی بھی کوشش کر لی مگر ملوکاں جو اختیاراں کے مقابلے میں باہمت لڑکی تھی۔ اس نے ابھی تک حوصلہ نہیں ہارا تھا۔

اس نے فوراً اختیاراں کو ایسا کرنے سے روک دیا اور پھر اسے خود سے لپٹا کر تسلیاں دینے لگیں۔

''مجھے..... مجھے مر جانے دو ..... ملوکاں اس ذلت والی زندگی سے تو موت اچھی۔'' اختیاراں نے روتے سسکتے ہوئے کہا۔

''حوصلہ کر..... اختیاراں بہن! اللہ سائیں ہمارے ساتھ ہے۔ ہم ایک نہ ایک دن ضرور اس جہنم سے نکل جائیں گے۔'' ملوکاں نے اسے خود سے چمٹ کر حوصلہ دیا تو اختیاراں شکستہ لہجے میں بولی۔

''بے یقینی ہے' ملوکاں! ہم اس جہنم زار قید خانے سے کبھی بھی نہیں نکل پائیں گے..... اب اب موت ہی ہمیں یہاں سے آزادی دلا سکتی ہے۔'' اس کی بات پر ملوکاں نے اسے جھڑکا مگر دوسرے ہی لمحے رسان آمیز ملائمت سے بولی۔

''کیوں مایوسی کی باتیں کر کے گناہ مول لے رہی ہو۔ دیکھو اختیاراں دل میں خدا ہوتا ہے اور..... اور میرا دل کہتا ہے کہ دن اس جہنم سے ضرور نکلیں گے۔''

ملوکاں کے لہجے کی پر یقین اثر پذیر سے اختیاراں کو ذرا حوصلہ ہوا۔

☆☆☆

ڈی ایس پی آچر خان اپنی اب تک کی وڈیرے بابو خان کے خلاف خفیہ کارروائی پر مسرور و مطمئن تھا۔ مخبر بھی..... مسٹر اے ڈی نے وہاں پہنچتے ہی اپنا ''کام'' دکھانا شروع کر دیا۔ مسٹر اے ڈی نے بہت مفید باتوں سے آچر خان کو آگاہ کیا تھا۔

''سب سے پہلی بات اس نے وہاں جا کر اطلاعاً یہ بات بتائی..... وڈیرے بابو خان کے بیٹے قادر بخش نے احتشام الحق کی بیٹی سیمی کو اغواء کر لیا تھا' اور خود بھی ابھی تک روپوشی کے دوسری طرف یا یہ بتائی گئی کہ وہ دونوں بدنصیب لڑکیاں اختیاراں اور ملوکاں بھی ابھی تک وڈیرے بابو خان کی نجی جیل میں قید تھیں۔ جنہوں نے چند روز پہلے' وڈیرے بابو خان کو ایڈووکیٹ عنایت اور ان کے ساتھیوں پر اندھا دھند گولیاں برسا کر قتل کر ڈالا تھا اور اس خونیں اور لرزہ خیز واردات میں خوش قسمتی سے ایڈووکیٹ عنایت زندہ بچ گئی تھی۔

تیسری..... سب سے اہم اور چونک دینے والا اطلاع مخبر مسٹر اے ڈی نے یہ کہ عنقریب عورتوں کا وہ بیوپاری ارباب خان ٹھٹھے سے کراچی ..... وڈیرے بابو خان کی حویلی میں مال کی تازہ کھیپ لے کر پہنچنے والا ہے۔ دو روز بعد۔ یہ تیسری اطلاع ڈی ایس پی آچر خان کے لیے اہم ہے۔ کیوں کہ اب وہ موقع تھا جب وہ رنگے ہاتھوں..... وڈیرے بابو خان پر ہاتھ ڈال کر اسے گرفتار کر سکتا تھا۔

بہر طور ..... یہ ایک سیر حاصل معلومات جس سے ڈی ایس پی آچر خان کو بابو خان کے خلاف جستجو اور آخری فیصلہ کن کارروائی کرنے کے لیے حکمت عملی کو جوڑنے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ چنانچہ اب ڈی ایس پی آچر خان ان سارے عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے وڈیرے بابو خان کے خلاف ڈائریکٹ

ایلاشن لینے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

پھر جس وقت ارباب خان ٹھٹھے سے سیدھا مال کی تازہ کھیپ لینے وڈیرے بابو خان کی حویلی پہنچا تو بابو خان وہاں نہیں رکا۔ وہ اپنے بیٹے قادر بخش کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ تاہم وہ اپنے خاص حواری منشی چل سندھو کو اس سلسلے میں ہدایات دے کر گیا تاکہ اب جب ہی ارباب خان آئے تو اسے سارا مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔

چنانچہ..... منشی جبل سندھیو نے ہی ارباب خان کا استقبال کیا اور دیگر ضروری معاملات طے کرنے کے بعد جیل کی سیر اسے کروائی۔

اس کے بعد وہ دونوں واپس اوطاق میں آ کر بیٹھ گئے۔

ارباب خان اور منشی جبل سندھیو کے درمیان یہ معاملات طے ہو ہی رہے تھے کہ اچانک جیسے بھونچال آ گیا۔

ایک شخص بوکھلایا ہوا سا اندر داخل ہوا' اس کے چہرے پہ ہوائیں اڑ رہی تھیں..... ''غضب ہو گیا۔'' وہ لرزتی آواز میں بولا۔

''پپ پولیس.....'' ارباب خان یک دم اچھل کر کھڑا ہوا۔ منشی جبل سندھو بھی پریشان ہو گیا تھا۔

ٹھیک اس وقت متعدد بھاری بوٹوں کی دھمک ابھری اور ابھی وہ لوگ سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ اگلے ہی لمحے پولیس کے مسلح سپاہی اندر گھس آئے اور انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ حیران پریشان کھڑے ارباب خان اور منشی جبل سندھو کی طرف کر دیا۔ اسی طرح آفیسر ڈی ایس پی آچر خان بھی تھا۔ وہ انہیں گھورتے ہوئے کڑک دار آواز میں بولا۔

''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ پولیس نے اوطاق کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔''

ارباب خان اور منشی جبل سندھو کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے۔

☆☆☆

احتشام الحق کی حالت بڑی دیدنی حد تک پریشان نظر آ رہی تھی۔ وہ کبھی موبائل پر کسی سے بات کرتا تو کبھی قریب ہی صوفے پر روتی سسکتی اپنی بیگم کی تسلی تشفی کرنے لگتا۔ اس کا بیٹا شعیب بھی ماں کے پاس ہی بیٹھا اسے سنبھالا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم حوصلہ رکھو بیگم! صوبے کی ساری انتظامیہ حرکت میں آ چکی ہے۔ بس کوئی دم میں تم خوش خبری سنو گی۔'' انہوں نے اپنی بیگم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''جب تک میری بیٹی میری نگاہوں کے سامنے نہ ہو گی۔ مجھے سکون نہیں ملے گا۔'' بیگم احتشام رندھے ہوئے لہجے میں بولیں۔

ٹھیک اس وقت موبائل کی بیل گنگنائی۔ احتشام الحق نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائل کو فوراً اپنے کان سے لگا لیا۔

☆☆☆

سیمی اندر ہی اندر بری طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ قادر بخش کے زوردار تھپڑ سے ابھی تک اسے اپنے نرم و نازک گال پر جلن ہو رہی تھی۔ وہ وقت کو بری طرح کوس رہی تھی' جب اس نے قادر بخش جیسے بدقماش اور جاہل انسان سے روابطہ بڑھائے تو نا وہ اسے اتنا اپنے قریب کرتی نہ ہی آج اسے یہ دن دیکھنے پڑتے۔ وہ اس وقت جن حالات سے گزر رہی' وہ بالکل غیر یقینی اور سر بہ سر مخدوش حد تک کر کے آئندہ کیا ہونے والا تھا؟ سیمی کو باہر قدر بخش سمیت ڈاکو محبّ شیدی اور تویہ کے ساتھیوں بدمست قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

پھر ذرا دیر بعد مڑھی کا دروازہ کھلا۔ وہ ذرا ٹھٹکی۔ اندر داخل ہونے والا قادر بخش تھا جو بڑی معنی خیز اور مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے گھورے جا رہا تھا۔

''سیمی سر! اب غصہ تھوک دو۔ میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے باپ کے بلاوجہ انکار کی وجہ سے میں ایسا کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔ ہم شادی کر لیں گے تو پھر معاملہ خود ہی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔'' وہ بولا

''یو شٹ اپ، میں تمہارے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔''

سیمی پرطیش لہجے میں اسے نفرت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ قادر بخش نے اپنے ابال پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف گھورا۔ پھر نفرت خیز لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے پھر ...... میں بھی اسے زبردستی شادی کر کے رہوں گا۔ میں نے سارے انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑھی سے باہر نکل گیا۔ سیمی اس کے لہجے کی قطعیت پر لرز اٹھی تھی۔

☆☆☆

بابو خان کی اوطاق پہ کامیاب چھاپہ مارنے اور وہاں سے قیدی عورتوں کی خرید و فروخت جیسے مذموم کاروبار کے بیوپاری ارباب خان اور مصاحب خاصی منشی جبل سندھو کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر کے ازاں بعد...... ان بے کس و مجبور قیدی عورتوں اور لڑکیوں کے علاوہ وہاں عرصے سے بیگار کاٹنے والے دیگر غریب مفلوک الحال ہاریوں کو وڈیرے بابو خان کی نجی جیل سی بازیاب کرنے کے بعد ڈی ایس پی او آچر خان کو بہر کیف اس بات کا قلق رہا تھا کہ وہ اس قبیح واردات کا اصل مجرم وڈیرے بابو خان کو 'ریڈ ہینڈڈ' گرفتار نہیں کر سکا تھا۔ تاہم اسے تسلی تھی کہ اب وہ قانون کی آہنی گرفت سے نہیں بچ سکتا تھا۔ کیوں کہ قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے اس کی نجی جیل سے بازیاب ہونے والی دو اہم لڑکیاں اختیاراں اور ملوکاں ہی کافی تھیں۔ جن کی نظروں کے سامنے وڈیرے بابو خان اور اس کے خونخوار کارندوں نے انسانیت بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اس کی بہن ایڈووکیٹ عنایتاں کو بری طرح زخمی کر دیا تھا بلکہ انسانی حقوق کمیشن سے وابستہ اراکین کو بھی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

بہر طور...... آچر خان نے آناً فاناً حویلی کے دیگر افراد کو نظر بند رہنے کا حکم دیتے ہوئے باہر پولیس کا سخت پہرہ بٹھا دیا تھا۔ ادھر اس کی بہن ایڈووکیٹ عنایتاں نے وڈیرے بابو خان کے خلاف دوہرے تہرے قتل اور لبر بانڈڈ ایکٹ کے تحت مقدمے کی کاغذی تیاریاں بھی مکمل کرنے میں بڑے تندہی کے ساتھ جت گئی' غرض دونوں بہن بھائیوں نے گویا وڈیرے بابو خان کے خلاف ہر طرف سے جال بننا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

وڈیرے بابو خان کو جیسے ہی اپنے ایک آدمی میر جمعہ کے ذریعے یہ پتہ چلا کہ اس کا لاڈلا بیٹا قادر بخش سیمی کو اغوا کرنے کا کارنامہ انجام دینے کے بعد اب اس کے دست راست ڈاکو محبت شیدی کے ساتھ اس کے جنگل ڈیرے کو خفیہ کمین گاہ میں فروکش ہے تو وڈیرا بابو خان فوراً بیٹے سے ملنے کے لیے اپنی پجیرو دادو کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ اسے دونوں پہ غصہ آرہا تھا۔ بیٹے پر بھی کہ جس نے اس سے رابطہ تک نہیں کیا تھا اور اپنے دست راست اور راتب خود ڈاکو محبت شیدی تھے جس نے اب تک اس سے یہ بات چھپا رکھی تھی۔

بہر طور اگلے دو تین گھنٹوں بعد وڈیرا بابو خان دادو کے کوہ کھر پہاڑی کے علاقے میں پہنچا۔

ڈاکو محبت شیدی کے آدمی اسے عزت و احترام کے اپنی کمین گاہ تک لے آئے جدھر رہائشی مڑیاں اور چھولداریاں بنی ہوئی تھیں۔

''بابا سائیں...... آ...... آ...... آپ یہاں......''

قادر بخش اپنے باپ کو دیکھ کر بوکھلا سا گیا تھا۔ جب کہ ڈاکو محبت شیدی ایک طرف خاموش ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ یوں بھی بھلا وہ ''بڑے سائیں'' اور 'چھوٹے سائیں' کے درمیان میں کیا بولتا؟

''آڑے بابا...... تو خود کو کب سے عقل کل سمجھنے لگا ہے۔ ہیں......'' وڈیرا برہمی سے بیٹے سے بولا۔

''تجھے میں نے اس جلد بازی سے روکا بھی تھا۔ پھر تو نے ایسا کیوں کیا۔ یہ لوگ کسی معمولی لڑکی کو اغوا نہیں کیا ہے۔ وہ احتشام الحق کی بیٹی ہے''

باپ کی بات پر قادر بخش حیرت سے بولا۔

''بابا سائیں! یہ..... یہ..... آپ کہہ رہے ہیں۔''

''دل تو کرتا ہے تیرے کو ایک چپاٹ (تھپڑ) رسید کر ڈالوں'' وڈیرا تلملا کر بولا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ فضا' میں چلنے والی لو پر تپش لپیٹ طاری تھی۔ ڈاکو محبّ شیدی اور اس کے ساتھی ایک جانب مودبانہ سے خاموش کھڑے باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی تکرار سن رہے تھے۔ جب کہ وڈیرے بابو خان کے مسلح محافظوں میں پجیرو کے قریب ہی کھڑے تھے۔

''دیکھ میڈ اپٹ! احتشام سے میں نہیں ڈرتا۔''

وڈیرے نے اپنے لہجے کو اس بار قدرے معتدل رکھتے ہوئے قادر بخش سے کہا۔

''تو نے اپنی نادانی میں آ کر اسے میرے مقابلے میں بہت طاقت ور بنا دیا ہے۔ آج کل میری حیثیت وہ نہیں رہی' مخالفین کی چیرہ دستیاں بڑھی گئی ہیں۔ مجھ پر کیچڑ اچھالنے کے لیے۔ وہ مجھ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ خیر' بات اب بھی بگڑی نہیں ہے۔ تو ایسا کر اس چھوکری سیمی کو میرے حوالے کر دے ابھی اور اس وقت میں معاملا ادھر ہی دبانے کی کوشش کروں گا۔''

''بابا سائیں! تو..... تو یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' قادر بخش حیرت سے چونک کر بولا۔

''آڑے بابا اب تو کیا میرا بھی باپ بنے گا۔'' وڈیرا تلملا کر بیٹے سے بولا۔

''نہیں بابا سائیں! معاف کرنا۔ میں جو قدم اٹھاتا ہوں پھر پیچھے نہیں ہٹتا۔'' قادر بخش یک دم فیصلہ کن لہجے میں باپ سے بولا۔

''آڑے بابا! میں تیرے بھلے کے واسطے کہہ رہا ہوں جو طریقہ تو نے اختیار کیا ہے وہ غلط اور خطرناک بھی ہے۔ میڈ اپٹ (میرے بیٹے) میں خود تیری اپنی جان کو خطرہ ہے۔''

''نہیں بابا سائیں' آپ کو میری جان کو نہیں بلکہ اپنی سیاسی ساکھ کی پرواہ ہے۔'' بالآخر قادر بخش نے یک دم بدلے ہوئے بے حد باپ سے کہا۔

''قادر بخش!'' بابو خان کو یکدم طیش آ گیا۔ مگر پھر جلد ہی وہ اپنے برہم لہجے پر قابو پاتے ہوئے ملائمت آمیز لہجے میں بولا۔

''تجھے ابھی میری بات بری لگے گی۔ مگر بعد میں تجھے خود ہی اس کا احساس ہو جائے گا کہ میں صحیح کہہ رہا تھا۔'' یہ کہہ کر وڈیرا بابو خان' قریب کھڑے ڈاکو محبّ شیدی کو مخاطب کر کے جھلکے دار لہجے میں بولا۔

''آڑے یار! شیدی تو ہی اپنے یار کو سمجھا۔''

''بس بابا سائیں بہت ہو گیا' میں سیمی سے ہر صورت میں شادی کر کے رہوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے زبردستی ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔'' بالآخر قادر بخش نے حتمی لہجے میں کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ جواباً وڈیرا بابو کچھ کہتا۔ معاً قریب ہی ایک بلند و بالا کبھی کے درخت پر مچان میں بنائے بیٹھے محبّ شیدی کے ڈاکو ساتھی نے چلا کر کہا۔

''ہوشیار پولیس آ رہی ہے۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ اچانک وہاں افراتفری پھیل گئی۔

البتہ قادر بخش کا اس ناگہانی اطلاع پر پہلے تو اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور پھر ایک ایک اس کی آنکھوں میں اپنے باپ کے لیے نفرت کی چنگاریاں سی سلگ اٹھیں۔ ادھر وڈیرا بابو خان بھی ایک لمحے کو بدحواس اور پریشان سا نظر آنے لگا۔

''بابا سائیں مجھے آپ سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔'' قادر بخش کو باپ کی طرف سے غلط فہمی ہونے لگی۔

''آڑے بابا کیا بکواس کرتا ہے تو۔ کیا میں یہاں پولیس لاؤں گا؟'' وہ بیٹے کی اس خطرناک غلط فہمی پر یک دم بھڑک اٹھا۔

ادھر قریب کھڑے ڈاکو محبّ شیدی کے چہرے پر ہی ناگواری کے تاثرات ابھرے پھر فوراً چلا کر اپنے ساتھیوں کو چوکس ہو کر پوزیشن سنبھالنے کی تلقین کرنے لگا۔ تاہم وہ دونوں باپ بیٹے کی طول پکڑتی تکرار کے درمیان پہلی بار لب کشائی کر کے

دونوں سے بولا۔

''یہ وقت اس بحث میں پڑنے کا نہیں ہے۔ ادھر مورچوں میں آ جاؤ ہمیں پولیس سے مقابلہ کرنا ہوگا۔''

''نہیں شیدی' تم لوگ پولیس پر فائرنگ نہیں کرو گے۔ اس میں میرے بیٹے کی جان کو خطرہ ہے۔'' بابو خان نے دھاڑ کر کہا۔ اس کی آواز میں لرزش عود کر آئی۔

''سائیں وڈیرا یہ آپ کیا کہہ رہے ہو۔'' محب شیدی حیرت آمیز ناگواری سے بولا۔

''بابا سائیں! محب شیدی صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں پولیس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ جب تک سیمی ہمارے قبضے میں ہے پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بابا سائیں آپ فوراً یہاں سے یا تو نکل جائیں' ہماری راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دیں۔''

''اڑے پٹ (بیٹا)! میری بات مان لے۔ اب بھی قت ہے سیمی کو میرے حوالے کر دے' خطرناک معاملے کو یہیں دبا دے۔''

اس سے چند قدموں کے فاصلے پر اس مڑھی کے اندر اچانک سیمی کی ہسٹریائی انداز میں چلانے کی آواز بلند ہوئی وڈیرا بابو خان نے چونک مڑھی کی طرف دیکھا۔ وہ سیمی کی آواز پہچان کر جلدی سے مذکورہ سمت کی طرف بڑھا تو اس کا بیٹا قادر بخش باہر کا ارادہ بھانپ کر اس کے سامنے راستہ روکے کھڑا ہوگیا۔

''بابا سائیں بس یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''آگے سے ہٹ جا میرے قادر بخش میں سیمی کو یہاں سے لے کر ہی جاؤں گا۔ یہ تم سب کے حق میں بہتر ہوگا۔''

''نہیں بابا سائیں جب آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ آپ یہ سب اپنی سیاسی ساکھ بچانے کی خاطر کر رہے ہیں۔ اپنے بیٹے کی خوشیوں کو اس پر قربان کر رہے ہیں۔''

مگر بابو خان بیٹے کی ایک نہ سنی۔ اور اسے اپنے ساتھ لے کر بیٹے کو پرے ہٹاتے ہوئے مڑھی کی جانب دوبارہ بڑھا تو قریب کھڑے عجب مخمصے کا شکار ڈاکو محب شیدی نے بھی قادر بخش کی دیکھا دیکھی فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی اور وڈیرے بابو خان کا راستہ روکے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا کہ بابو خان اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے انتہائی نخوت سے بولا۔

''شیدی' تیری یہ جرات کہ تو میرا راستہ روکے۔ میں کہتا ہوں ہٹ جا میرے آگے سے۔''

''مجبوری ہے سائیں وڈیرا'' ڈاکو محب شیدی نے وڈیرے پر آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

دفعتاً ہی جنگلی وڈیرے کی مشرقی سمت سے گولیوں کی زوردار تڑتڑاہٹ ابھری سب لوگ ایک لمحے کو بری طرح چونک پڑے اور پھر اگلے ہی لمحے دو طرف تبادلہ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ڈاکو محب شیدی نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور مڑھی کی طرف دوڑ پڑا۔ اندر داخل ہونے کے بعد جب وہ دوبارہ برآمد ہوا تو اس نے ڈری سہمی سیمی کو دبوچ رکھا تھا۔ فائرنگ جاری تھی۔ بابو خان سیمی کو ڈاکو محب شیدی سے چھیننے کے لیے لپکا تو قریب کھڑے اس کے بیٹے قادر بخش نے فوراً اپنی جیب سے پستول نکال کر اپنی کنپٹی پر رکھ دیا اور جوش وجنون سے لرزاں آواز میں باپ سے بولا۔

''بابا سائیں' آپ نے اب ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں خود کو گولی مار دوں گا۔'' وڈیرے بابو خان کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ اور پھر وہ بوکھلا کر بیٹے کی طرف متوجہ ہوا۔

''بابا کی جان! میرے قدر یار! میری بات مان لے' دیکھ اپنی زندگی کو اس طرح خطرے میں نہ ڈال'' وڈیرے بابو قادر خان کا لہجہ نڈھال اور شکستہ ہوگیا تھا۔ دفعتہً تبادلہ فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہوا تو اچانک میگافون سے پولیس کے ہلکارکی آواز گونجی۔

''تم سب کو پولیس اور رینجرز نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر

ہے کہ یرغمال کو زندہ سلامت ہمارے حوالے کر کے ہتھیار ڈال دو۔'' اس طرح سب نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ ان کے عقب میں تقریباً کہیں سے چالیس قدموں کے فاصلے پر پولیس اور رینجر کے اہلکاروں کی بھاری نفری جدید گنیں تھامے بھربھری مٹی والے ٹیلوں پر اوٹ لیے موجود تھی۔ عنایت ڈی ایس پی آچ خان کے علاوہ' میجر رینگ کا ایک آفیسر بھی کھڑا تھا اور احتشام الحق بھی موجود تھا۔ وڈیرے بابو خان نے جو یہ دیکھا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

وہ اپنے بیٹے قادر بخش کی جان کو خطرے میں پا کر بری طرح بوکھلا گیا۔

تب پھر اگلے ہی لمحے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے اشارے کرتا ہوا بدحواسی کے عالم میں ان کی طرف چلاتے ہوئے دوڑا۔

''ٹھہرو بابا ٹھہرو..... میں اپنے بیٹے کو سمجھا رہا ہوں۔'' پھر معاً ہی اس کی نگاہ احتشام الحق پر پڑی اور وہ اس کے قریب پہنچ کر ملتجی لہجے میں بولا۔

''احتشام! بابا دیکھو۔ میں..... میں اپنے بیٹے کو سمجھا رہا ہوں مجھے تھوڑی مہلت تو ملے گی ناں بابا! سیمی میری بھی بیٹی ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں اسے خود بہ حفاظت تمہارے پاس لے کر آتا ہوں۔ ابھی ٹھہرو۔''

مگر سب کے چہروں پہ سرد مہری چھائی ہوئی تھی تاہم دوسرے ہی لمحے میجر رینجر آفیسر نے سوچتی ہوئی نظروں سے وڈیرے بابو خان کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''وڈی مہربانی بابا..... تمہاری وڈی مہربانی'' مہلت ملتے ہی بابو خان پر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ بچوں کی طرح خوش نظر آنے لگا۔ ادھر سیمی کو گن پوائنٹ پر دبوچے ڈاکو محب شیدی نے وڈیرے بابو خان کو گھورتے ہوئے غصے سے بڑبڑایا۔

''اس بڈھے نے سارا کام بگاڑ دیا ہے۔''

وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ پوری پولیس انتظامیہ اس کے سر پر پہنچنے کا مطلب یہی تھا کہ اس کے سارے ساتھی یا تو مقابلے میں مارے جا چکے تھے یا پھر ہتھیار ڈال چکے تو اس کی گھاگ نظروں نے فوراً تاڑ لیا کہ ان سب کا تعلق اینٹی ڈکیت فورس سے تھا جو بھاری ایمونیشن اور جدید اسلحے سے لیس ہے۔ ادھر وڈیرا بابو خان واپس اپنے بیٹے قادر بخش کی طرف پلٹا اور منت کرتے ہوئے بولا۔

''بیٹا پٹ مم..... میرے بات مان لے..... یہ دیکھو تو دیکھ یہ سب لوگ تجھے جان سے مارنے کے لیے آ گئے ہیں۔''

وڈیرے بابو خان کا لہجہ بہت جذبات انگیز ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی ہیت کذائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی مطلق العنان اور جابر شخص تھا جو اپنی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتا تھا اور آج خستہ حالت میں گڑگڑا رہا تھا۔

''بابا سائیں! آپ پرے ہٹ جائیں۔''

اچانک قادر بخش نے باپ سے چلا کر جنونی انداز میں کہا۔ اور پھر اس نے ڈاکو محب شیدی سے سیمی کو بے دردی سے کھینچ کر اپنے شکنجے میں کس لیا اور اپنے پستول کی نالی سیمی کی کنپٹی سے لگا دی۔ ذرا دور پولیس اور رینجر کے ساتھی موجود کھڑے احتشام الحق اپنی بیٹی سیمی کو اس حال میں دیکھ کر غصے اور پریشانی کے باعث بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ادھر پولیس رینجر نے بھی اپنی پوزیشن سنبھال کر اپنی گنوں کا رخ قادر بخش اور ڈاکو محب شیدی کی طرف کر دیا تھا۔ وہ جیسے ایک اشارے کے منتظر تھے۔ قریب کھڑے ڈاکو محب شیدی کے باقی ماندہ چند ساتھیوں نے بھی اپنی کلاشنکوفیں تھام لی تھیں۔ وڈیرا بابو خان گم صم کھڑا تھا۔

صورت حال اس کی جان لیوا حد تک سنگین تر اور سنسنی خیز ہو چکی تھی۔ اچانک قادر بخش پولیس رینجر والوں کی طرف دیکھ کر چلاتے ہوئے بولا۔

''ہمیں یہاں سے نکلنے دیا جائے۔ ورنہ میں اس چھوکرے کے سر میں گولی اتار دوں گا۔'' اب تو احتشام الحق کی حالت دیدنی حد تک مضطرب الحال ہونے لگی۔ اب نرم و نازک بیٹی کو ایک موت کے خونی پنجوں میں پا کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ڈی ایس پی آچر خان اور میجر کی عقابی نظریں قادر بخش اور ڈاکو محب شیدی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ان کی دیکھا دیکھی حرکات و سکنات کو بہ غور گھور رہے تھے۔ ڈاکو محب شیدی نے بھی اب اپنی روسی ساختہ کلاشنکوف سیدھی کر لی تھی۔ اپنی لخت جگر بیٹی سیمی کو پولیس انتظامہ اور خطرناک مجرموں کے درمیان سینڈوچ پا کر احتشام الحق گھبراہٹ آمیز تشویش سے اپنے قریب دائیں بائیں کھڑے میجر اور ڈی ایس پی آچر خان سے بولا۔

''مم..... میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کو فی الحال یہاں سے جانے دیا جائے۔ میری بچی ان کے قبضے میں ہے۔ اس کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہے۔'' اس کی بات پر میجر نے تشفی آمیز لہجے میں احتشام سے کہا۔

''ذرا صبر کرو۔ احتشام صاحب''

''میں کیسے صبر کروں۔ میجر درانی؟'' احتشام اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''میری بچی کی جان خطرے میں ہے ہمیں ہر قیمت پر مجرموں کی بات ماننا ہوگی۔'' لیکن میجر درانی اس کی بات سنی ان سنی کیے سامنے بہ غور نظریں جمائے باپ بیٹے کے بیچ ہونے والی گرما گرم تکرار پر توجہ اپنی مرکوز کیے ہوئے تھا۔

وہ اسپیشل ایٹنی ڈکیٹ ٹاکس فورس کا سربراہ تھا۔ اگرچہ اسے باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی گرما گرم تکرار سے کوئی سروکار نہ تھا مگر وہ باز کی طرح کسی ایسے موقع کی تاک میں ضرور تھا کہ آپس میں الجھے ہوئے شکار تک اس کی رسائی ممکن ہوتی۔ پھر وہ ان پر جھپٹ پڑتے۔

مگر احتشام الحق کو اس کی خاموشی بری طرح کھل رہی تھی۔ اسے بدستور خود سے اور خاموش پا کر وہ دوبارہ میجر درانی سے بولا۔

''میجر درانی میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

اس کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔ میجر درانی نے اپنے اہلکاروں کو اثبات کے عالم میں ڈاکو محب شیدی پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی' محب شیدی کے حلق سے کریہہ انگیز چیخ خارج ہوئی اور وہ بھی وہیں رقص اجل کرتا ہوا تیوار کر گرا۔ قادر بخش اپنی گن پھینک کر ''بابا سائیں!'' کہتا ہوا باپ کے خاک مشن اور خون آلود وجود کی طرف دوڑا مگر وڈیرے بابو خان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ قادر بخش وہیں باپ کی لاش سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ادھر پولیس فورس کے اہلکاروں نے بجلی کی سرعت کے ساتھ حرکت کی اور فوراً سیمی کو اپنے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔ قادر بخش اور باقی ماندہ پر بیک وقت کئی گنیں تن چکی تھیں۔

☆☆☆

حویلی میں کہرام برپا تھا۔

ایک بڑے احاطے میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ وڈیرے بابو خان کی رسم قل پڑھی جا رہی تھی۔ ماحول میں اگربتیوں کے خوشبو رچی ہوئی تھی۔ زنان خانے میں عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں دل چیرے دے رہی تھیں' گوٹھ کی عورتیں' مرد' بوڑھے سبھی چہرے سوگوار اور آنکھیں پرنم تھیں۔ دور و نزدیک کے عزیز و اقارب بھی شامل تھے۔

دوسری طرف اوطاق میں بھی مردوں سے بھری ہوئی تھیں اور لوگ ایک طرف بچھے ہوئے نمدے کے نیچے حسب روایت واسطاعت عذر خوئی کے طور پر روپے رکھ کر اور بہ آواز بلند حکم اللہ جو (حکم اللہ کا) کہہ کر واپس اپنی جگہوں پر بیٹھ رہے تھے۔ قدر حویلی کا ایک نسبتاً بلند چھت والے کمرے میں جدھر پرسے کے لیے آئی ہوئی رشتہ دار خواتین موجود تھیں وہ مومل اپنی ماں کو ہر جیسے نیم بے ہوشی کے عالم میں

بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ سنبھالے ہوئے تھی۔

خود بے چارے مومل کا اپنی ہی غم کے مارے برا حال تھا۔ اسے بھی خاندان کی چند رشتے دار عورتیں عملی تشفی دے رہی تھیں۔

ظلم، جبر اور ناانصافی نے بالآخر بلند و بالا حویلی کی بنیادیں تک لرزا کر رکھ دی تھیں۔

☆☆☆

انہی دنوں مومل کو اس کی سہیلی سیمی اور اس کے گھر والوں کی طرف سے تعزیتی فون بھی موصول ہوا تھا۔

ایک روز مومل کو ایک لفافہ موصول ہوا جس میں ایک رقعہ تھا۔ وہ اسے کھول کر دیکھنے لگی تو چونک گئی یہ شہر سے شعیب نے اس کے نام بھیجا تھا۔

اپنے مرتعش جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے وہ اسے پڑھنے لگی۔

''مومل!

اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے تمہارا نام مومل لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

جو کچھ ہوا مجھے اس کا دلی افسوس رہے گا۔ پلیز مومل اسے تم میرا الو لیٹر مت سمجھنا۔

مومل! میں ایک ایسا بند سیپ ہوں جس نے تمہارے چاہت کا سچا موتی اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔ تم نے شاہ سائیں کی ایک نظم سناتے ہوئے ایک دن مجھ سے کہا تھا ناں کہ سیپ کو سچا موتی تب ہی ملتا ہے جب وہ گہرے پانیوں میں بھی پیاس سہتا ہے۔ میں بھی تمہاری بحر الفت میں پیاسا ڈوبا رہوں گا۔ کہ شاید تمہاری محبت کا سچا موتی نصیب ہو جائے۔ مگر اس کے ساتھ میں تم سے یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ مومل تم تھر کی ایک ایسی انارکلی ہو جو فرسودہ روایات کی دیواروں میں چن دی گئی ہو۔ ایسی سسی ہو جو ایک تپتے ریگ زار میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔ خدارا مومل! جو بے نام اور غیر مرئی دیوار ہمارے بیچ بے حس سماج نے کھڑی کر ڈالی ہے اسے گرا دو۔ خود کو ریت میں دفن ہونے سے بچا لو۔ کاش وہ وقت سرخروئی آئے جب میں تمہاری محبت کا سچا موتی پالوں ہاں مومل! میں منتظر رہوں گا۔ اس وقت سرخروئی کا۔

صرف تمہارا شعیب.....''

شعیب کا خط پڑھنے کے بعد مومل نے اپنے غم دوروں کے کرب کو ضبط کرنے کی غرض سے اپنی کاجل سے بھیگی آنکھیں موند لیں۔ اس کی آنکھوں کے بند سر میں گوشوں سے، باریک لکیروں کی صورت میں آنسو بہہ کر لرزیدہ ہاتھوں میں پکڑے شعیب کے محبت نامے کو یوں بھگونے لگے جیسے اس پر ابر نیساں بن کر شعیب کی محبت کے بند سیپ کو اپنی چاہت کا سچا موتی بخش رہے ہو۔

ارے لوگو! تمہارا کیا
میں جانوں میرا خدا جانے
ارے مُلا جنازہ پڑھ
میں جانوں میرا خدا جانے

☆

بتاؤ

ایک عورت اپنے شوہر کو روزانہ بس کے کرائے کے لیے دو روپے دیتی تھی۔ ایک دن دفتر سے واپسی پر شوہر صاحب خوشی سے چیختے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ''بیگم..... بیگم..... مبارک ہو، میرا لاٹری میں پچاس ہزار روپے کا انعام نکل آیا ہے۔''

بیگم نے شعلہ باز نگاہوں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ''مبارک باد تو میں بعد میں دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے کے لیے تمہارے پاس پانچ روپے کہاں سے آئے۔؟''☆

آسیبی فساد

احمد صغیر صدیقی

مارلن نے باہر پھیلے منظر کو دیکھا جس میں اب بارش کا اضافہ ہو گیا تھا اور سوچا۔ آخر ایک پتھریلے اور چٹانی علاقے کو "مقدس" کیوں سمجھا گیا ہے۔ اس کا ذہن ان کتابوں کی طرف گیا' جو علم البشریات پہ تھیں۔ یہ باتیں تو انہی میں سے کسی میں چل سکتی تھیں یا پھر ان کتابوں سے کوئی مدد مل سکتی تھی جو انڈین لوگوں کے بارے میں تھیں۔ جین ویلی کی لائبریری میں بہت کم کتابیں تھیں۔ مارلن وہاں جا چکی تھی۔ یہ صرف ایک کمرے پر مشتمل تھی اور یہاں زیادہ تاریخی ناول رکھے ہوئے تھے پھر جیالوجی پر کچھ کتابیں تھیں۔ البتہ یہاں لائبریرین کی ضرورت پڑنے پر آس پاس کی لائبریریوں سے کتابیں منگا سکتا تھا۔

اس شمارے کی ایک سنسنی خیز کہانی

باڑے کے دوہرے دروازے ایک موٹی سی زنگ آلود زنجیر سے بند تھے اور ان پر پیڈلاک بھی لگا ہوا تھا۔

مارلن نے قفل کو ایک ہاتھ سے جھٹکا دے کر دیکھا اور دوسرے ہاتھ سے زنجیر کو۔ اس نے ایک نظر دروازے کی پرانی لکڑی پر ڈالی جو جگہ جگہ سے اکھڑ رہی تھی۔ اس نے بے یقینی سے سوچا۔ آخر یہ لڑکے اندر کیسے پہنچے تھے۔

اپنے ہاتھ کو صاف کرتے ہوئے مارلن ٹہلتی ہوئی پرانے باڑے کی سمت گئی۔ مردہ پتیاں اور پھرتی ہوئی "گھاس" اس کے جوتوں تلے دب کر کراہیں۔ اس نے ٹھنڈی ہوا محسوس کرتے ہوئے شانوں کو سکوڑا۔

"یہاں گھوڑوں کے لیے کافی جگہ ہے۔" رات کے کھانے سے قبل کیلی نے تبصرا کیا تھا۔ "یہ ایک اچھا باڑہ ہے۔ یہاں گھوڑے رکھے جا سکتے ہیں۔" کیلی ڈریک کی بیٹی تھی۔ اس کی عمر گیارہ سال تھی' اسے گھوڑوں سے بے پناہ شغف تھا۔

یہ باڑہ بھی بطور اصطبل استعمال ہوتا ہوگا۔ مارلن نے سوچا۔ اسے دوبارہ پھر اسی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیلی کو ایک گھوڑا دلانے میں کیا حرج ہے؟ اور وہ اپنے لیے بھی کیوں نہ ایک گھوڑا لے لے؟ مارلن جب کم سن تھی' وہ سینٹرل پارک میں گھوڑے کی سواری کیا کرتی تھی۔ اس نے باڑے کی لمبائی پہ نظر ڈالی۔ یقیناً کسی سبب سے ہی دونوں کے دروازے اچھی طرح مقفل رکھے گئے تھے۔

مارلن کو احساس ہوا کہ اسے سردی لگ رہی ہے۔ وہ مڑی اور جسم کو گرم کرنے کے لیے وہ گھر تک واک کرتی چلی۔

مکان بڑا بھی تھا اور مضبوط بھی۔ یہ سرمئی پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ کوئی ایک سو ستر سال پہلے۔ البتہ اس کی تعمیر اس نہایت سرد اور سنسان حصے پر تھی۔ بھلا ادھر رہنا کون پسند کرتا۔ یہ زمین پتھریلی تھی' یہاں تو کچھ اگانا بھی ممکن نہ تھا۔

یہ پرانا مکان اور آس پاس کی ویرانی جو اس دیہی خطے کی خصوصیت تھی' مارلن کے ایک ناول میں دلھائے گئے ماحول سے مشابہ تھی' جسے اس نے کبھی لکھا تھا کیونکہ وہ سسپنس ناولیں لکھتی تھی۔ بہرحال اسے یہ حقیقی جگہ اپنی ہیروئن کے مقابلے میں کچھ زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔

کچن بڑا سا تھا اور آرام دہ بھی تھا۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا سے وہ اندر پہنچی تو اسے بڑا آرام ملا۔ مارشل سنک نے پاس رک کر اپنی سانسیں درست کیں اور اعضاء کو سکون پہنچایا پھر بھی وہ اندر ایک تناؤ سا محسوس کر رہی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے' لڑکوں نے اپنے شور وغل اور مطالبوں سے خاصا تنگ کر کے رکھ دیا تھا اور اب جبکہ وہ سب اسکول بھیجے جا چکے تھے' جہاں وہ روزانہ 9 گھنٹے رہتے تھے۔ اسے بہت سکون محسوس رہا تھا۔

تو یہ ہے میری زندگی کی کہانی۔ مارلن نے سوچا۔ ابھی صرف ایک سال قبل جب ان کی شادی زیادہ پرانی نہیں ہوئی تھی' پروگرام بنا رہے تھے کہ ان کے گھر میں ایک بچے کو آنا چاہیے یا دو بچوں کو۔

پھر جون نے جو ڈریک کی سابقہ بیوی تھی' طے کیا تھا کہ اس کی مادرانہ خواہش کو پورا کر دیا جائے اور پھر اس سے قبل کہ مارلن کچھ سوچ سکتی' ان کے گھر میں ایک تقریباً جوان ہوتی بیٹی پہنچا دی گئی تھی۔

ابھی واقعہ ظہور میں آیا ہی تھا کہ اس کے پیچھے ایک اور بات ہوئی۔ ڈریک کی بیوہ بہن چل بسی تھی۔ اس کے چار بچے تھے اور یہ چاروں ڈریک کو اپنی

سرپرستی میں لینے پڑتے تھے جبکہ مارلن ابھی پہلی ہی لڑکی کیلی کو صحیح طرح نہیں سمجھ سکی تھی۔

یہ پانچ بچے تھے' شاید ان کی یہ تعداد کوئی بڑا اثر نہ ڈالتی۔ اسی طرح بڑھتی جیسے سال بہ سال گھرانوں میں ہوتا رہتا ہے یا کچھ وقفے وقفے سے۔

یہی بچے تھے جنہوں نے نیویارک میں ان کا رہنا دوبھر کردیا تھا۔ یہ گھر ڈریک کے گھرانے میں اس وقت سے تھا جب یہ نیا تھا مگر اس میں برسوں سے کوئی رہا نہیں تھا۔ بے شک کبھی کبھی تعطیلات گزارنے کے لیے اسے استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ تاہم یہ جگہ تعطیلات کے لیے بھی کسی طرح موزوں نہ تھی کیونکہ ادھر نہ تو کوئی پہاڑی تھی نہ جھیل اور پھر یہاں کا موسم بھی عموماً ناخوشگوار ہی رہتا تھا۔ یہ دیہی علاقہ بہت غیر مہمان نواز قسم کا تھا اور نیویارک کا ایک دور افتادہ حصہ تھا۔

البتہ ان کے دوستوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ کسی لکھنے لکھانے والے کے لیے یہ جگہ رہائش کے لیے بے موزوں کہی جاسکتی ہے۔ یعنی ایک بہت قدیم مکان دیواروں پر اس کی تاریخ لیے چھپی ہوئی۔ سنسان جگہ پر استادہ' چٹانی ماحول' شہر کے ہنگاموں سے بہت دور مگر ڈریک تو کسی بھی جگہ رہ کر لکھ سکتا تھا۔ وہ اپنا ماحول اپنے اندر اور اپنے ساتھ رکھتا تھا جبکہ مارلن کو شہری زندگی کی طلب تھی یا میوزیم' ریسٹوران' دکانیں' لائبریریاں وقت گزاری کے سہارے جب حروف ساتھ نہ دیتے ہوں۔

پھیلی ہوئی خاموشی بوجھ کی طرح محسوس ہونے لگی۔ ڈریک ٹائپ نہیں کررہا تھا اسے بات چیت کی ضرورت تھی۔ مارلن نیم تاریک ہال میں چلی جو خاصا لمبا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اس مکان میں زیادہ لائٹس لگوانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دیواروں پر پکچر کی بھی ضرورت تھی۔ لکڑی کے ٹھنڈے فرش پر رگ بھی بچھنا چاہیے تھا۔

ڈریک ایک بڑی سی میز پر پیچھے بیٹھا ہوا تھا جسے وہ بطور ڈیسک استعمال کررہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے 67 پائپوں میں سے ایک کی صفائی میں لگا ہوا تھا۔ فرش پر بچھا ہوا رگ پرانا ضرور تھا مگر اس میں شوخ رنگوں کے نمونے بنے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ کتابوں کے ایک اور لیمپ کی تیز روشنی میں ڈریک کی یہ لائبریری اور آفس نہ صرف اچھا لگ رہا تھا بلکہ یہاں نسبتاً فضا بھی گرم اور دلخوش کن تھی۔

''باتیں کروگے؟'' مارلن نے پوچھا۔

''آجاؤ' میں ذرا سوچ رہا تھا کہ اپنے ناول کے ایک غلام کردار کو ملکہ سے کس طرح قریب کروں۔''

''پہلے اسے کسی وقت ضرورت پر جان نثاری کرتے دکھاؤ۔''

مارلن نے کہا اور تاریک ہال وے میں کھلنے والے دروازے کو بند کرکے اندر آگئی۔

''دیکھتا ہوں۔'' ڈریک نے کہا۔ ''کوئی مسئلہ تو نہیں جس میں میری ضرورت ہو؟''

''کم از کم وہ ٹریری نہیں۔'' مارلن نے کہا۔ ''میں سوچ رہی تھی کہ کیلی کے لیے ایک گھوڑا منگا دوں۔ میں باڑہ دیکھنے نکلی تھی۔ یہ اچھی طرح بندا اور مقفل تھا مگر ہم اسے درست کراسکتے ہیں۔ اس میں ہم ایک یا دو گھوڑے رکھ سکتے ہیں۔''

''دو؟'' ڈریک نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تو کیا تم اس باڑے کو واقعی استعمال کرنے کے م میں ہو جس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اچھا تو کیا میں نے تمہیں اس کی کہانی نہیں سنائی؟ تمہیں نہیں بتایا کہ نگر انکل کی موت کس طر واقع ہوئی تھی؟''

مارلن نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے شا بھرے تاثر سے اسے دیکھا۔

''بھئی یہ ایک خاصی خوف انگیز کہانی ہے۔''

''ڈریک.....''

''میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔ یہ سچ ہے۔ تمہ میرا پہلا ناول یاد ہے؟''

''بالکل یاد ہے۔ اسی کی آمدنی سے ہم نے ہنی مون منایا تھا۔''

''اس ناول کا وہ حصہ بھی یاد ہوگا جس میں وہ بدمعاش باس جو اپنے علاقوں کو بھی گھوڑوں کی طرح اذیت دیتا۔ بالآخر ایک بگڑے ہوئے گھوڑے کی دولتی کھا کر مرا تھا؟''

''اچھا تو پھر؟''

''دراصل ناول میں یہ سین میں نے اپنے نگر انکل کی موت کے واقعہ میں سے اخذ کر کے ڈالا تھا۔ اس کے گھوڑے..... ہاں ان کے پاس بہت سے گھوڑے تھے۔ سب کے سب پگلا گئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے واقعی انکل کو کھالیا تھا مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب ان کی لاش ملی تھی تو وہ اچھی طرح چبائی ہوئی شکل میں ملی تھی۔'' ڈریک نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا۔ ''انکل مارٹن کوئی بے رحم آدمی نہ تھے' نہ ہی وہ اپنے گھوڑوں کے ساتھ برا سلوک رکھتے تھے بلکہ انہیں یہ گھوڑے بہت عزیز تھے۔ تاہم انہیں انڈین لوگوں سے خوامخواہ کا بغض تھا اور روایت یہ تھی کہ اس مکان کا اصطبل زمین پر تعمیر ہوا تھا۔ وہ انڈین لوگوں کا کوئی مقدس استھان تھی۔ انہوں نے انکل مارٹن کو اس زمین پر قبضے کی وجہ سے شراپ دی تھی۔ تم سے بددعا کہہ سکتی ہو۔''

مارلن نے سر ہلایا۔ ''اور یہ سب کب کی بات ہے؟''

''1880ء کے آس پاس کی۔''

''تو کیا تبھی سے اس باڑے کو مقفل کر دیا گیا تھا؟''

''میرا یہی خیال ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں اینا اور میں ادھر آئے تھے تو ہمیں اس کے اندر جانے کا راستہ نہیں ملا تھا۔ ہم لوگوں نے کہانیاں گھڑ لی تھیں کہ باڑے کے اندر گھوڑوں کی بدروحیں رہتی ہیں مگر وہ بھوت تھے' روحیں تھیں' انہیں دیواریں یا بند دروازے کہاں روک سکتے تھے۔ یہ سب کی سب راتوں میں نکل کر پھرتی تھیں۔ مجھے وہ راتیں یاد ہیں جس میں ہم لوگ سکڑے سمٹے بیٹھے ہوئے تھے اور ہمیں ماہرانی روحوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔'' بات کرتے ہوئے ڈریک کی آنکھیں پُرخیال ہوگئی تھیں۔ وہ اس وقت اداس ہوگیا تھا کیونکہ اسے اپنی بہن لینا سے بہت محبت تھی۔ مارلن کو اندر سے اپنے جرم کا احساس ہوا۔ اس نے اس کے بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے میں کچھ چوں چرا کا مظاہرہ کیا تھا۔ اینا کے بچے ہی اب اینا کی یادگار تھے۔

''گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔'' مارلن نے کہا۔

''میں گھر کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' ڈریک نے جلدی سے کہا۔ ''انکل مارٹن باڑے میں ہلاک ہوئے تھے۔''

''ان اجداد کے بارے میں کیا کہو گے جو اس واقعہ سے پہلے یہاں رہتے تھے؟ کیا انڈین لوگوں کے شراپ نے ان پر اثر نہیں ڈالا تھا؟''

''دیکھو.....''

''ڈریک۔'' مارلن نے اسے تنبیہ کی۔

''میں کوئی غلط بات نہیں کہوں گا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارے اجداد کا پہلا جتھا یعنی ہاسکن گھرانے کے ابتدائی لوگ جو یہاں آ کر مقیم ہوئے تھے' انہیں انڈین لوگوں نے ختم کر دیا تھا۔ والدین اور دو عدد ملازم ذبح کر دیے گئے تھے اور بچوں کو اٹھا لیا گیا تھا۔ مکان کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ یہ مکان جو ہے' یہ وہ نہیں ہے جو ابتدا میں بنا تھا۔''

''مگر یہ بھی اسی زمین پر کھڑا ہے۔''

''نہیں' وہ مکان اس جگہ نہیں تھا' وہ باڑے کی دوسری سمت میں تھا۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت یہ باڑہ بھی موجود تھا یا نہیں۔ میں اور اینا اس کی بنیادوں کے آس پاس کھیلا کرتے تھے۔ ایک بار مجھے وہاں سے ایک چاقو ملا تھا اور اسے ایک چھوٹا سا بٹن کا بکس جس میں کچھ راکھ تھی اور ایک انگوٹھی تھی۔''

''مگر تم نے کبھی کوئی بھوت تو نہیں دیکھا؟''

ڈریک نے اسے گھورا۔ ''جب ان کا گھر جلا دیا

جائے تو بھوت ادھر کب رکتے ہیں؟''

''ہوسکتا ہے رکتے ہوں۔''

''نہیں، ہم نے کبھی کوئی بھوت نہیں دیکھا۔ ہم نے تو کبھی کوئی انڈین گھوسٹ بھی نہیں دیکھا۔''

''کبھی تم نے گھوڑوں کے بھوت دیکھے؟''

''مجھے یاد نہیں۔'' ڈریک نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے دیکھے ہوں۔ بچپن کی سب باتیں یاد نہیں رہتیں۔''

''ہاں ہم بڑے ہوکر بہت مختلف ہوجاتے ہیں۔'' مارلن نے کہا۔ ڈریک نے ذرا دیر تک خلا میں دیکھا پھر اس نے اپنے عقب میں موجود کتابوں کی دیوار کی سمت اشارہ کیا۔ ''اگر تم میرے خاندان کی تاریخ میں دلچسپی رکھتی ہو تو تمہیں ادھر وہ کتاب مل جائے گی جس کا کور گہرے سبز چمڑے کا ہے۔ یہ ہمارے ایک بزرگوں میں سے کسی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں ہاسکن گھرانے کا شجرۂ نسب بھی ہے۔ مجھے یاد ہے، میں یہاں ایک بار جب زیادہ عرصہ رکا تھا، اس وقت میری عمر گیارہ سال تھی۔ میں نے گھر میں موجود متعدد کتابیں پڑھی تھیں۔ یہ تاریخ بھی نظر سے گزری تھی۔''

''میں اسے ضرور پڑھوں گی۔''

''جاؤ، نکالو۔''

اس نے مارلن کو ادھر جاتے دیکھا پھر وہ سیڑھی کو ادھر لے گئی پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا تم ہماری فیملی پر کوئی ناول لکھنا چاہتی ہو؟''

''نہیں، میں صرف تجسس کے تحت اسے پڑھنا چاہتی ہوں۔ جاننا چاہتی ہوں آخر تمہارے اجداد نے اس جگہ پہ گھر کیوں بنایا تھا۔ یہ جگہ تو کسی بھی طرح گھر بنانے کے لائق نہ تھی۔''

☆☆☆

مارلن نے جین آئر کے بارے میں سوچا۔ وہ اس وقت ونڈو سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بھاری سبز پردے اپنی جگہ گرے ہوئے تھے اور وہ کمرے سے محفوظ تھی۔ اس نے وہاں سے ٹھنڈک سے یخ زمین کی سمت دیکھا اور کتاب کی پہلی جلد کھولی۔

جیمس ہاسکن کے تاش کے کھیل میں نیویارک کے دیہی حصے میں ایک قطعہ اراضی جیتا تھا۔ (مارلن نے سوچا جب انہوں نے اپنی جہت کی جگہ دیکھی ہوتی تو یقیناً بہت مایوس ہوئے ہوں گے۔) مگر جیمس ایک ضدی آدمی تھا اور وہ تاش کے کھیل میں عموماً ہارتا رہتا تھا۔ یہ زمین جیسی بھی تھی، اب اس کی تھی پھر وہ اپنے اہل خانہ کو ساز و سامان کے ادھر لے آیا، جہاں ایک معمولی سا لکڑا کا مکان بنا ہوا تھا۔ اسے اس کی جگہ ایک زیادہ اچھا اور مستقل قسم کا مکان بنوانا تھا۔

مگر جیمس ہاسکن اسے کبھی نہ بنوا سکا۔ ہوسکن نے اپنے ایک عزیز کو ایک خط میں لکھا تھا جو فلاڈلفیا میں رہتا تھا۔

''یہ اراضی جو میں نے جیتی ہے، بہت قیمتی ہے۔ کم از کم ایک غریب خانہ بدوش انڈین قبیلے کے لیے کل ان کے دو سو رما میرے پاس آئے تھے اور جب میری بیوی کو معلوم ہوا تھا کہ یہ انڈین لوگ جادو جانتے ہیں اور یہ قطعہ اراضی ایسا ہے جسے منحس کہا جاسکتا ہے تو وہ رونے لگی تھی۔

بہتر ہے کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ تمہارا خدا اس قدیم اور عظیم روح سے تمہاری حفاظت نہیں کرسکتا جو پتھروں کی طرح قدیم ہے۔ یہ زمین کسی بھی نسل کے لیے اچھی نہیں۔ ایک روح ہے جس کا نام نہیں لیا جاتا۔ اس پر اپنا نشان نحوست نقش کردیا ہے۔ یہ زمین منحوس اور شراپ زدہ ہے۔ ال لوگوں نے اسی طرح کی اور باتیں کی تھیں پھر مجھے غصہ آ گیا تھا اور میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اب یہاں سے دفع ہوجائیں کیونکہ میرے پاس بھی رائفل کی صورت میں ایک بہت بڑا جادو موجود ہے حالانکہ میری بیوی ڈر گئی تھی مگر میری بیٹی ما سے مختلف نکلی تھی۔ اس نے میرا ساتھ دیا تھا اور بو تھی۔ وہ ہر قدیم یا جدید روح کو قیمہ بنا کر کھا جا گی۔ میں اس کی بات پر خوب ہنسا تھا اور آنے وا اندیشوں نے سر ہلائے تھے اور پھر وہ واپس ہو تھے۔

مارلن نے سوچا۔ اس بے خوف لڑکی کا کیا بنا ہوگا۔ کیا انڈین لوگ اسے اغواء کر کے لے گئے تھے؟

پھر وہ اس ہوسکن گھرانے کی موت کے بارے میں پڑھنے لگی۔ جو جادو ٹونے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ انڈین لوگوں نے نہ صرف اس کے لکڑی کے مکان میں آگ لگادی تھی بلکہ سب سے پہلے انہوں نے مکان کے خاص مکینوں کو ذبح کردیا تھا۔

''خاندان کے ان لوگوں کے ہاتھ پیر کاٹ دیے گئے تھے اور ان کے پیٹ پھاڑ دیے گئے تھے اور یہ سارا برتاؤ ان کے ساتھ ان وحشی انڈینوں نے صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ لوگ ایک ایسی مقدس زمین پر رہنے لگے تھے جو ان کی کسی بے نام روح کے لیے مخصوص تھی۔''

مارلن نے اس چاقو کے بارے میں سوچا جو ڈریک کے بیان کے مطابق اسے یہاں سے ملا تھا' جب وہ چھوٹا تھا۔

کوئی چیز کھڑکی سے ٹکرائی۔ مارلن کا سر جھٹکے سے اٹھا۔ اس نے کھڑکی کے ادھر دیکھا۔ دراصل ایک دم سے بارش شروع ہوگئی تھی اور ہوا کے جھونکے تیز ہو کر کھڑکی کے شیشے سے ٹکرانے لگے تھے۔

مارلن نے باہر پھیلے منظر کو دیکھا جس میں اب بارش کا اضافہ ہوگیا تھا اور سوچا۔ آخر ایک پتھریلے اور چٹانی علاقے کو ''مقدس'' کو سمجھا گیا ہے۔ اس کا ذہن ان کتابوں کی طرف گیا' جب علم البشریات یہ تھیں۔ یہ باتیں تو انہی میں سے کسی میں چل سکتی تھیں یا پھر ان کتابوں سے کوئی مدد مل سکتی تھی جو انڈین لوگوں کے بارے میں تھیں۔ جین ویلی کی لائبریری میں بہت کم کتابیں تھیں۔ مارلن وہاں جا چکی تھی۔ یہ صرف ایک کمرے پر مشتمل تھی اور یہاں زیادہ تاریخی ناول رکھے ہوئے تھے پھر جیالوجی پر کچھ کتابیں تھیں۔ البتہ یہاں لائبریرین کی ضرورت پڑنے پر آس پاس کی لائبریریوں سے کتابیں منگا سکتا تھا۔

مارلن نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اسے احساس ہوا کہ اسکول میں تو چھٹی ہوئے دیر ہوگئی ہے۔ بچے بس اسٹاپ پر کھڑے بس کے منتظر ہوں گے اور یہ موسم بہت پریشان کن تھا۔ اس نے بھاری بند پردے کو ایک طرف کھسکا دیا۔

''ڈریک.....''

مگر کمرہ خالی تھا' وہ بچوں کو لانے کے لیے نکل چکا تھا۔ اسے سکون محسوس ہوا۔ بلاشبہ وادین کی حیثیت سے ڈریک کا کردار اس کے مقابلے میں کہیں اچھا اور ذمہ دارانہ تھا۔

بلاشبہ کیلی اسی کی بیٹی تھی مگر اسے ابھی باپ کے روپ میں ایڈجسٹ ہونے میں وقت لگ سکتا تھا۔ اس نے سوچا معلوم نہیں' وہ کیلی کو گھوڑا خرید کر دے گا یا نہیں۔ اس نے سوچا۔ اچھا ہوگا اگر وہ انکار کردے۔

یہ بات بہرحال احمقانہ ہی تھی کہ قدیم دور کے انڈین لوگوں کے شراپ وغیرہ پر سوچا جاتا یا اس خوف میں مبتلا ہوا جاتا ہے کہ ماضی کے واقعات پھر سے پیش آسکتے ہیں۔ مارلن بہرحال اب کسی ایسے باڑے میں کوئی گھوڑا نہیں دیکھنا چاہتی تھی جس میں کبھی گھوڑے پاگل ہو چکے تھے۔ یہاں اب کوئی انڈین نہیں تھا' نہ ہی گھوڑے تھے۔ اس طرح اسے امید تھی کہ وہ محفوظ ہیں۔

مارلن نے کتابوں کی سمت دیکھا جو نیچے ڈھیر کی شکل میں رکھی تھیں۔ وہ اس میں گھوڑوں والے حصے کو نکالنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر پھر وہ اس خیال کے ساتھ ہی سکڑ گئی۔ ڈریک نے تو اسے ساری کہانی پہلے ہی سنائی دی تھی۔ وہ حقائق کو بعد میں چیک کرسکتی تھی۔ اس وقت جب وہ گھر میں اکیلی نہ ہوتی۔

وہ اٹھ پڑی۔ کچن میں کچھ کام تھا۔ وہ گرم کیک بنانا چاہتی تھی تاکہ جب بچے اسکول سے پلٹیں تو انہیں کھانے کو مل سکیں۔

☆☆☆

چیخ ابھی تک ان کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کا ارتعاش اس کے بدل میں محسوس ہو رہا تھا۔ مارلن بستر پر چت پڑی چھت کو تکے جارہی تھی۔ اس

کی سانسیں تیز ہو چکی تھیں۔ آخر وہ یہ کیسا خواب دیکھ رہی تھی؟ چیخ مدھم تھی مگر اس میں کسی برفیلے چاقو جیسی کاٹ موجود تھی۔ گویا وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھی' ضرور کوئی ہے جو یہاں سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔ چیخ رہا تھا۔

مارلن نے سوچا بھلا ادھر کون چیخے گا۔ یہ آواز ضرور کسی پرندے کی تھی۔ ادھر تو میلوں تک کسی کے ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور ڈریک بدستور نیند میں تھا' بے پروا۔ پہلے مارلن نے سوچا کہ وہ ڈریک کو جگا دے مگر اس نے ارادہ بدل دیا۔ اس سے کیا فائدہ ہوتا۔ البتہ وہ خود ضرور اٹھ کر بیٹھ گئی پھر اسے بچوں کا دھیان آیا۔ ہوسکتا ہے کوئی انہی میں سے خواب میں ڈر کر چیخ پڑا ہو۔ وہ کھڑکی کی طرف نہیں گئی۔ ادھر جانا فضول تھا۔ کچھ بھی ادھر دیکھنے کا نہ تھا۔

مارلن کو کیلی بستر سے باہر دکھائی دی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنے بدن سے باندھ رکھا تھا اور کھڑکی کی طرف توجہ سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا معاملہ ہے؟''

کیلی نے نظریں نہیں ہٹائیں۔ ''میں نے ایک گھوڑے کی آواز سنی تھی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''وہ ہنہنا رہا تھا۔ اس سے میری نیند ٹوٹ گئی تھی۔''

''تم نے گھوڑے کو سنا تھا؟''

''ہاں' یہ کوئی جنگلی گھوڑا ہوگا۔ کاش میں اسے پکڑ سکتی اور سدھا سکتی۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ چاندنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''نہیں کیلی! میرا خیال ہے تم کوئی خواب دیکھ رہی تھیں۔''

''میں کہہ رہی ہوں' میں نے اسے سنا تھا۔ میں جاگ اٹھی تھی۔ میں نے پھر اسے سنا تھا۔ یہ کوئی میرا واہمہ نہیں۔'' اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''اگر یہ کوئی گھوڑا تھا تو پھر وہ ادھر سے کسی کاشت کار کا ہی ہوگا۔''

''نہیں' میرا خیال ہے یہ کسی کا بھی نہیں۔''

مارلن کو کھٹکن کا احساس ہوا' اس کا جسم دکھ رہا تھا۔ وہ کیلی سے بحث کے موڈ میں نہ تھی۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی گھوڑا ہی رہا ہو۔ ہنہناہٹ بھی کبھی کبھی چیخ کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

''اچھا کیلی! اب تم جا کر سو جاؤ۔ تمہیں صبح کو اسکول بھی جانا ہے۔ اب گھوڑے کے بارے میں کیا ہوسکتا ہے۔''

''میں اسے دیکھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔'' کیلی نے کہا اور اپنے بستر پر چلی گئی۔ ''میں اسے تلاش کروں گی۔'' اس نے کہا۔

''اچھا یہ سب کچھ بعد کی باتیں ہیں۔''

مارلن نے کہا اور سوچا۔ مجھے بقیہ بچوں کی خیریت معلوم کرنا چاہیے۔

اس کا خیال تھا یہ سب سو رہے ہوں گے مگر اس نے دیکھا کہ وہ سب کے سب جاگ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی نیند بھری آنکھوں سے اسے دیکھا پھر وہ آہستہ آہستہ بڑبڑائے' جب اس نے انہیں پیار کیا۔

جس وقت وہ دوبارہ بستر میں داخل ہوئی۔ ڈریک جاگ گیا۔ ''کہاں گئی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ تمہارے پیر تو برف کی طرح سرد ہو رہے ہیں۔''

''کیلی جاگ رہی تھی' اس کا خیال تھا اس نے کسی گھوڑے کی آواز سنی تھی۔''

''میں نے تم سے کہا تھا نا؟'' اس نے اسی آواز میں بیوی سے کہا۔ ''یہ ہمارے ہی کسی گھوڑے کا بھوت ہوگا۔''

☆☆☆

مطلع ابر آلود تھا۔ برف باری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دن بے حد سرد اور رکا ہوا تھا۔ مارلن نے بے زاری سے اپنا ٹائپ رائٹر چھوڑ دیا۔ اٹھی اور نچلی منزل کی طرف چل دی۔ پورا گھر خاموش تھا' سوائے ڈریک کے ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ کے جو دور سے ادھر آ رہی تھی۔

''یہ بچے کہاں ہیں؟'' اس نے پردے پر سے پوچھا۔

ڈریک نے اسے سرسری نظروں سے دیکھا۔ ''میرا خیال ہے وہ سب کے سب باڑے کی صفائی کرنے گئے ہوئے ہیں۔''

''مگر باڑہ تو بند ہے' مقفل ہے۔''

''اچھا۔''

مارلن نے سانس بھری اور واپس ہوگئی۔ گھر کی نگرانی کا کام اس پر بوجھ بنتا جارہا تھا۔ اسے بچوں کی فکر رہتی تھی' جب تک وہ اسکول میں رہتے تھے' اسے اطمینان رہتا تھا۔ اس نے سوچا۔ یہ بچے کس قدر نازک ہوتے ہیں۔ کسی بھی وقت انہیں ضرر پہنچ سکتا ہے۔ یہ مر بھی سکتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو کیسے خطرات ہر وقت لاحق رہتے ہیں۔ اس نے کورل کلرک والا سوٹ الماری سے نکالا اور سوچا۔ نہ جانے وہ لوگ کس طرح ذمہ داری نبھاتے ہوں گے' جنہیں دوسروں کی حفاظت کا کام سونپا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا۔

بچوں نے خود کو ایک چھوٹی سی فوج میں بدل رکھا تھا۔ وہ باڑے کے اندر اپنے اوزاروں اور اشیاء کے ساتھ آجارہے تھے۔ مارلن نے کیلی کو تلاش کیا جو بڑے سے ڈبل ڈور کے اندر کھڑی تھی اور اس ساری کارروائی میں ہدایت کاری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

''باڑے کے دروازے تو مقفل تھے۔'' مارلن نے حیرت سے پوچھا۔

''آخر تم لوگ.....''

''ہم نے اسے کاٹ ڈالا تھا۔'' کیلی نے کہا۔ ''تل شیڈ ہمیں ایک آرا رکھا مل گیا تھا۔'' اس نے مارلن کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ ''ڈیڈی نے کہہ رکھا ہے کہ ہم اس شیڈ سے جو چیز چاہیں لے سکتے ہیں۔''

مارلن نے اسے بے چینی سے دیکھا پھر ادھر نظر ڈالی' جدھر دوسرے بچے بڑے انہماک سے ہتھوڑیاں' کیلیں اور تختہ لیے تمام دروازے پر مصروف تھے۔ باڑے کے اندر کا اندھیرا ایک طوفانی لالٹین کی مدد سے دور کیا گیا تھا جو ایک ہک کے ساتھ اٹکی ہوئی تھی۔

''کسی نے اس جگہ کو بڑی مضبوطی سے بند کیا ہوا تھا۔'' کیلی نے کہا۔ ''کیا آپ کو پتا ہے کیوں؟''

مارلن ہچکچائی پھر اس نے فیصلہ کیا۔ ''ہاں' اسے اس لیے اچھی طرح بند کیا گیا تھا کہ اس جگہ تمہارے اجداد میں سے ایک کو ہلاک کردیا گیا تھا۔''

کیلی کے چہرے پر تجسس ابھر آیا۔ ''اچھا۔ وہ ہلاک کیے گئے تھے۔ کیسے؟''

''اسے ہلاک کرنا تو نہیں کہا جاسکتا۔ مارلن نے مار ڈالا تھا۔ بس ایک رات وہ سب کے سب ان پر چڑھ دوڑے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم کیوں۔'' کیلی کی آنکھیں چمکیں۔ ''ضرور انہوں نے جانوروں کے ساتھ زیادتی کی ہوگی کیونکہ گھوڑے عموماً بہت سی زیادتیاں سہنے والے جانور ہوتے ہیں۔ ضرور انہوں نے کوئی حرکت کی ہوگی۔''

''نہیں۔ وہ بہت نرم مزاج آدمی تھے۔''

''ہوسکتا ہے جانوروں کے ساتھ.....''

''کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی موت کا سبب قدیم انڈین باشندوں کا جادو تھا۔ کوئی بددعا یا شراپ۔ یہ زمین بقول ان کے انڈین لوگوں کی مقدس زمین تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں کی قابض روح نے ان سے بدلہ لیا تھا۔''

کیلی ہنسی۔ ''اچھا جواز ہے۔ اچھا اب میں کچھ کام کروں گی' اوکے؟''

☆☆☆

مارلن نے خواب دیکھا کہ ایک رات میں وہ ایک گھوڑے پر زین رکھنے نکلی ہے۔ پورا باڑہ گھوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سب اس کے اپنے گھوڑے تھے۔ ابھی وہ ایک گھوڑے پر زین سجا ہی رہی تھی کہ اسے اپنے بازو میں تیز قسم کا درد محسوس ہوا۔ اس نے گھر کر دیکھا۔ گھوڑے نے اپنے مضبوط دانت اس کے بازو پر گاڑ دیے تھے۔ اس کو اپنی ہڈی کڑکڑاتی

سنائی دی۔ پھر گوشت ادھڑنے کی آواز آئی اور پھر خون.....

اس نے دہشت بھری نظروں سے دیکھا۔ گھوڑے کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

پھر ایک جھٹکے سے وہ زمین میں جا گری۔ جہاں تنکے اور گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی سانس اٹک گئی تھی پھر ایک اور گھوڑا جوان سب میں بہت شائستہ مزاج کا تھا' اس نے اسے ایک لات رسید کی۔ اسے اپنے پیر میں زبردست درد پھیلتا محسوس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو پہلے گھوڑے کا منہ دکھائی دیا' اس کے دانت اس کے خون سے رنگے ہوئے تھے پھر دونوں نے اس پر منہ مارنے شروع کر دیے۔ اس کے چاروں طرف موجود گھوڑے بھی اب حرکت میں آ رہے تھے۔ وہ سب اپنے تھانوں پر اچھل رہے تھے۔ سب اس ضیافت میں شرکت کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

☆☆☆

بچے لنچ ٹائم پر اچھلتے کودتے ظاہر ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ کیچڑ اور برف بھی لے آئے تھے جو سرخ اینٹوں والے فرش پر بکھر رہی تھی۔ صبح ہی سے برف باری ہو رہی تھی مگر بچوں کو اس کی ذرا فکر نہ تھی۔ اصولاً انہیں برف میں دوڑنا بھاگنا چاہیے تھا مگر اس کے بجائے وہ سیدھے باڑے کی طرف گئے تھے۔ پچھلی چھٹی میں بھی وہ اسی طرح مصروف رہے تھے۔

''یہ اب بالکل ٹھیک حالت میں آ چکا ہے۔'' انہوں نے اعلان کیا۔

کیلی اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ اس نے اپنے سوپ میں نمک چھڑکا۔ ''ذرا انتظار کریں پھر دیکھتے ہیں۔ ہم نے کیا پایا ہے۔'' اس نے تیز سانسوں کے درمیان کہا۔

''جانور' کوئی معدنی چیز؟'' ڈریک نے پوچھا۔

''جانور اور خوردنی معدنی چیز۔''

''کہاں سے ملے ہیں؟'' مارلن نے پوچھا۔

سب سے چھوٹے بچے نے اپنا سوپ لڑھکا دیا اور چیخا۔ جب مارلن دوبارہ میز پر آئی تو سب باڑے میں ملنے والی چیز کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ڈریک متجسس ہو رہا تھا اور بچے پُراسرار۔

''آخر کیا چیز تھی؟'' مارلن نے پھر پوچھا۔

''دیکھ لیجئے گا خود' کھانا کھالیں پھر چلیں گے۔''

☆☆☆

بچوں نے واقعی بڑی محنت کی تھی۔ اسٹالوں کے ادھ کھلے دروازوں سے موسم سرما کی کفن پوش روشنی باڑھ کی خالی جگہوں پر پہنچ رہی تھی۔ یہاں جو بھوسا اور گھاس وغیرہ پڑا سڑ رہا تھا' اب صاف کر دیا گیا تھا۔ فرش کو اچھی طرح صاف کیا گیا تھا۔ حالانکہ یہاں کوئی ادھ انچ موٹی گرد جمی ہوئی تھی۔ اب یہ باڑہ بہت کشادہ اور سفید سفید نظر آ رہا تھا۔

یہ کوئی گھوڑے نہ تھا۔ غور سے دیکھنے کے بعد مارلن نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ کوئی جنگلی گھوڑے کی قسم تھی۔ گھوڑوں کے کھر ہوتے ہیں۔ ان کے پیروں میں تین شاخہ نکیلے ناخن نہیں ہوتے اور ان کی دُمیں کسی سانپ کی طرح کی نہیں ہوتیں۔ اسی طرح اس کی جسم کی بناوٹ میں بھی تناسب نہ تھا۔

ڈریک جھکا ہوا اس جانور کے بدن کے خاکے پر انگلیاں پھیر رہا تھا جسے چاک کی مدد سے بنایا گیا تھا مگر یہ صرف ایک ڈرائنگ نہ تھی۔ لکیریں جیسے زمین کے اندر تک کھسی ہوئی تھیں پھر ان درزوں کو سفید مٹی سے بھر دیا گیا تھا۔

''یہ غالباً کھریا مٹی ہے۔'' ڈریک نے کہا۔ ''پتا نہیں کتنی گہری ہیں لکیریں۔'' اس نے انگلی سے مٹی کھودنی شروع کی۔

کیلی نے جھک کر اس کو روکا۔ ''یہ نہ کریں' یہ خراب ہو جائیں گی۔'' ڈریک نے سر اٹھا کر مارلن کو دیکھا۔

''مجھے تو یہی وہ انڈین شراپ لگتی ہے۔'' وہ

مسکرائی مگر اندر سے اسے خوف سا لگ رہا تھا۔

"تمہارا خیال ہے یہ اسی روح کی تصویر ہے جو اس اراضی پر آسیب کی طرح مسلط ہے؟" ڈریک نے پوچھا۔

"اور کیا ہوسکتی ہے یہ؟"

"عجیب بات ہے کہ یہ ایک گھوڑا ہے یا پھر...... حالانکہ اسے کوئی مقامی جانور ہونا چاہیے تھا۔ یہ روایت میرا خیال ہے سفید فاموں کے یہاں آنے کے بعد سے چلی تھی۔"

"مگر یہ کوئی گھوڑا نہیں۔" مارلن نے کہا۔ "غور سے اسے دیکھو۔"

"ہاں یہ گھوڑا نہیں ہے۔" ڈریک اٹھ گیا۔ اسے اپنے ہاتھ جھاڑے۔ "مگر یہ گھوڑے سے بہت مشابہ ہے۔"

"اس میں ایک ہیبت ہے۔" مارلن بڑبڑائی۔ اس نے کیلی کی طرف دیکھا جو بڑے اشتیاق سے ان کے چہروں کو دیکھ رہی تھی۔ "اب تم نے باڑھ تو صاف ستھرا کردیا۔ اب کیا کروگی؟"

"اب ہم گھوڑے کو پکڑیں گے۔"

"کون سے گھوڑے کو؟"

"وہی جو راتوں کو ہنہناتا ادھر بھرتا رہتا ہے۔"

"اچھا...... وہ...... مگر وہ نہ جانے کہاں ہوگا۔ میلوں پرے بھی ہوسکتا ہے اور ہوسکتا ہے۔ اب تک کسی نے اسے پکڑ بھی لیا ہو۔"

کیلی نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، پچھلی رات بھی میں اسے سنا تھا اور وہ میری کھڑکی سے بہت قریب تھا مگر جب میں نے دیکھا تو وہ چلا گیا تھا۔ مجھے اس کے نشان برف پر نظر آئے تھے۔"

☆☆☆

"تم اب باہر نہیں جاؤ گے دوبارہ۔"

بچوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ مخالفت پر کمربستہ لگ رہے تھے۔ اگر وہ سختی کرتے تو شاید وہ ...نے ہی والے تھے۔

"دیکھو۔" مارلن نے پیار سے کہا۔ "تم لوگ صبح سے باہر رہے ہو اور برف ابھی تک پڑ رہی ہے۔ کیوں نہ تم لوگ ڈرائنگ کاپی اٹھالو اور کوئی تصویر بناؤ۔ یہاں کمرے میں سردی بھی نہیں ہے۔"

"نہیں۔" کیلی نے ضدی لہجے میں کہا۔ "ہم ابھی رک نہیں سکتے، ہمیں اس وحشی گھوڑے کو پکڑنا ہوگا۔"

"اور اگر وہ نہ ملا تو کیا اس کے چکر میں روز رہوگی؟"

"بالکل۔" کیلی نے کہا۔ دوسرے بچوں نے بھی تائید کی۔ مارلن نے ہتھیار ڈال دیے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "مگر دیکھو گھر سے زیادہ دور ہرگز نہ جانا اور زیادہ دیر بھی باہر مت رکنا۔"

بچے اس کی باتوں کے درمیان ہی چل پڑے تھے۔ "یہ بھی کسی اور ہی دنیا میں رہتے ہیں۔" مارلن نے سوچا۔

اسے سوچ لگی ہوئی تھی، آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ بھلا یہ بچے اس وحشی گھوڑے کو کس طرح پکڑ سکتے تھے۔ اسے تو یہ بھی یقین نہ تھا کہ اس برف باری میں باہر کوئی گھوڑا ہوگا۔ ویسے گھوڑے کی ہنہناہٹیں

کمی......!

"واہ بھئی واہ...... ماشاء اللہ کیا ترقی کی ہے تمہارے گھر میں پہلے تو یہ سب کچھ نہیں تھا۔" پہلا دوست بولا۔

"مثلاً کیا؟" دوسرے دوست نے پوچھا۔

"یہ بڑا سا ریفریجریٹر، ایئرکنڈیشنر، رنگین ٹی وی، وی سی آر، واشنگ مشین یہ نئے ماڈل کی فوڈ فیکٹری، سونی کا ڈیک یہ خوبصورت فینسی لائٹس۔"

"بس یار ایک چیز کی کمی ہے۔"

دوسرے دوست نے کہا "وہ کیا؟"

"ہمارے علاقے میں بجلی آجائے۔" ☆

سن کر وہ خود متعدد بار جاگی تھی۔

مارلن اوپر جا کر ڈریک کے آفس کی چھپی ہوئی ونڈو سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بھاری پردوں کی وجہ سے ڈریک کے ٹائپ رائٹر کی ٹپ ٹپ کی آوازیں مدھم ہو رہی تھیں اور باہر کی برفباری نے اس دیہات میں سناٹا طاری کر رکھا تھا۔ اس نے ان سبز جلدوں والی کتاب سے ایک جلد اٹھالی اور پڑھنے لگی۔

جینی ویل میں پہنچتے ہی مارٹن ہاسکن کو دو باتوں کی وجہ سے اچھی طرح جانا جانے لگا تھا۔ پہلی بات یہ تھی کہ وہ اس مقام پر ایک انڈسٹری قائم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے دیہات کو ایک بڑے ٹاؤن میں تبدیل کرنے والا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس کی نہ بیوی تھی' نہ بچے۔ وہ اپنا تمام ارمان گھوڑوں پر لگائے ہوئے تھا۔ اس کے پاس چھ عدد عمدہ نسل کے گھوڑے تھے۔

مارٹن کو یہاں کی روایت کا علم تھا کہ یہ اراضی منحوس ہے مگر اس نے نیویارک میں ایک جوان عورت کو خط میں لکھا تھا۔ ''اس علاقہ سے انڈین باشندوں کو عرصہ ہوا نکال باہر کیا جا چکا ہے۔ ان کے ساتھ ان کے جادو اور شراپ بھی یہاں سے نکل چکے ہیں۔ یہ شراپ وراپ میری سمجھ میں نہیں آتے' میں تو صرف گولی اور خنجر کی زبان بولتا اور سمجھتا ہوں۔''

یہ حقیقت تھی کہ انڈین باشندوں کے عظیم قبیلے یا تو برباد کر دیے گئے تھے یا انہیں تتر بتر کر دیا گیا تھا پھر بھی ان سفید فاموں کے درمیان جو چار بے خانماں انڈین ابھی باقی رہ گئے تھے۔ ایک روز سڑک پر مارٹن کی مڈبھیڑ ایک ایسے ہی سورما سے ہوئی تھی۔

''سر! میں آپ کو ہشیار کرنا چاہتا ہوں۔'' چیتھڑوں میں ملبوس اس غریب سے انڈین نے اس سے کہا۔ ''آپ جس زمین پر رہ رہے ہیں' وہ منحوس اور شراپ زدہ ہے۔ یہاں ایک بہت طاقت ور روح کا ڈیرا ہے۔''

''میں نے یہ کہانی سن رکھی ہے۔'' ہاسکن نے اس سے کہا۔ ''اور میں تمہارے ان دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا' نہ ہی میں ان سے خوف زدہ ہوں۔''

''یہ روح ہماری کوئی دیوتا نہیں ہے مگر میرے لوگ اس کی حقیقت سے آشنا ہیں۔ وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جب وہ یہاں آباد تھے۔ آپ اسے کوئی دیوتا نہ سمجھیں' یہ ایک روح ہے۔ ایک طاقت ور ہے جس سے جنگ نہیں کی جا سکتی۔ اسے ایک طوفان سمجھیں۔''

''تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' مارٹن نے اس سے پوچھا۔

''اس جگہ کو چھوڑ دیں' ادھر مت رہیں۔ آپ چلے جائیں گے تو روح آپ کا پیچھا نہیں کرے گی مگر آپ اس روح کو یہاں سے نہیں بھگا سکتے۔ یہ روح اس زمین سے مربوط ہے اور یہ زمین اس روح سے۔''

مارٹن ہاسکن ہنسا۔ ''تم چاہتے ہو میں ایک ایسی چیز کے خوف سے بھاگ جاؤں جس پر مجھے کوئی یقین نہیں۔ بے شک میں طوفانوں پر یقین رکھتا ہوں مگر میں ان سے بھی نہیں بھاگتا۔ میں مضبوط ہوں' یہ روح میرا کیا بگاڑے گی۔''

انڈین نے بے بسی اور افسردگی سے گردن ہلائی۔ ''سر! میں نہیں کہہ سکتا یہ کیا کر سکتی ہے۔ میں بس اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی موجودگی اسے غصہ دلائے گی۔ وہ آپ کو تباہ کرنے پر تل جائے گی۔ یہ زمین بس ایک ہی آقا کو قبول کرتی ہے۔ یہ کسی دوسرے آقا کو خود پر مسلط نہیں کرے گی۔ یہاں بس ایک قانون ہے اور ایک ہی آقا ہے اور ایک ہی زمین ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے' رہیں یا چلے جائیں۔''

''میں کسی آقا کا تابع نہیں' میں خود اپنا آقا ہوں اور بندہ میں صرف خدا کا ہوں۔''

مارلن نے اتنا ہی پڑھا تھا پھر اس نے کتاب بند کر دی۔ وہ اب مزید پڑھ کر مارٹن کے خوفناک انجام کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مارٹن کو جانور رکھنے کا شوق تھا۔ اگر اس کے پاس جانور نہ ہوتے اور وہ کوئی

کاشت کار ہوتا تو یہ روح اسے کس طرح تباہ کرتی؟

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس نے بچوں کو کھیلتے دیکھا تو اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ گویا انہوں نے گھوڑے کی تلاش سے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ اور اب کھیل میں غرق تھے۔ ''کیا یہ لوگ Follow the leader نامی کھیل کھیل رہے ہیں جس میں ایک لڑکا سردار بنتا ہے اور بقیہ اس کی ہدایت پر چلتے ہیں؟ کیا یہ لوگ اس طرح کا رقص کر رہے ہیں جو انڈین ڈانس کہلاتا ہے؟ یا یہ لوگ گھوڑے بنے ہوئے ہیں اور انہیں کی طرح چلنے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' اس نے غور سے دیکھا تو اُسے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی گھوڑے بنے ہوئے تھے۔

☆☆☆

مارلن کی آنکھ ایک دم سے کھلی تھی۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا منہ خشک تھا۔ اس نے دوبارہ وہی آواز سنی تھی۔ کسی گھوڑے کے منہ سے نکلنے والی ایک وحشی آواز۔ ہنہناہٹ۔ اس نے یہ آواز پہلی بھی سنی تھی مگر اتنی قریب سے نہیں۔ اس میں انسانی آواز کی سی مشابہت تھی۔

مارلن میز سے اتری' وہ اندر ہی تھی۔ اس کے پیر برف کی طرح ٹھنڈے فرش پر پڑے۔ وہ ٹھنڈی ہوا میں کھڑی تک گئی۔ اس نے پردہ کھسکایا اور باہر کی طرف دیکھا۔

رات مکمل طور سے سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا اور آدھے سے زائد بڑا چاند چاندنی پھیلائے ہوئے تھا۔ خیر چھوٹے چھوٹے ہیولے گروپ کی شکل میں برفیلی زمین پر رقصاں تھے۔ وہ برف کے گولوں کو ٹھوکریں مار مار کر ادھر ادھر اڑا رہے تھے۔ کبھی کبھار یہ اپنے منہ سے بلند آوازیں بھی نکال رہے تھے۔ کسی گھوڑے کی آواز کی طرح ہنہناتے تھے۔ مارلن کو اپنے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے محسوس ہوئے کیونکہ اس نے ان چھوٹی چھوٹی شبیہوں کو پہچان لیا تھا۔ یہ اس کے بچے تھے۔

پیاری باتیں

حضرت خدیمؓ بن فاتک کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی اور رخ مبارک لوگوں کی طرف پھیرا تو خلاف معمول بیٹھے رہنے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے کھڑے ہو گئے اور تین بار فرمایا:

''جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا، دونوں برابر کے گناہ ہیں۔''

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بتوں سے دور رہو' جھوٹی بات کہنے سے دور رہو' خدا تعالیٰ کے لیے یکسو ہو جاؤ، شرک چھوڑ دو، توبہ اختیار کرو۔''

☆.....☆.....☆

☆ جب مسلمان دعا مانگنا کم کریں گے.....تو مصائب نازل ہوں گے۔

☆ جب صدقات دینا بند کریں گے..... تو بیماریاں بڑھیں گی۔

☆ جب زکوٰۃ دینا بند کریں گے.....تو مویشی ہلاک ہوں گے۔

☆ جب بادشاہ ظلم کریں گے..... تو بارشیں روک لی جائیں گی۔

☆ جب بدفعلیاں عام ہوں گی.....تو اچانک اموات آئیں گی۔

☆ جب لوگ بداعمال ہو جائیں گے..... تو زلزلے بہ کثرت آئیں گے۔

☆ جب حکم خدا کے خلاف فیصلے ہوں گے..... تو ان پر ان کے دشمن غالب آجائے گے۔

☆ جب عہد شکنی بہت ہوگی..... تو اللہ تعالیٰ انہیں قتل کے ذریعے آزمائے گا۔

☆ جب ناپ تول میں کمی کی جائے گی.....تو ان پر قحط نازل کیا جائے گا۔☆

اس نے سوچا۔ پردے گرا کر لیٹ جائے۔ ان سے کچھ نہ کہے' انہیں نہ چھیڑے مگر یہ اس کے بچے تھے اور وہ اس طرح کی غیر ذمہ دار حرکت کیسے کر سکتی تھی۔

اس نے کھڑکی کو کچھ اور کھولا تو وہ کھڑکھڑائی۔ آواز سنتے ہی بچوں نے رقص روک دیا پھر سب نے ایک ساتھ ادھر نگاہ دوڑائی اور مارلن کو دیکھا۔

مارلن کی نگاہیں ان کے اٹھے ہوئے چہروں پر پڑیں تو خون جیسے اس کی رگوں میں جم گیا۔

ہر طرف بلا کا سناٹا چھا گیا تھا۔ مارلن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

اس نے جلدی سے گردن اندر کر لی اور پردہ کھینچ دیا پھر وہ پلٹی اور بستر تک گئی۔

''ڈریک..... ڈریک.....'' اس نے شوہر کو ہلایا۔

''اٹھو۔'' وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

ڈریک کے پپوٹے پھڑکے۔

''ڈریک..... اٹھو.....''

بالآخر ڈریک نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہے؟'' اس نے پوچھا پھر اس نے بیوی کے چہرے پر آیا خوف دیکھ لیا۔ وہ اپنی جگہ تھا۔

''کیا ہوا؟ کوئی خواب دیکھ لیا ہے؟''

''نہیں ڈریک! یہ خواب نہیں۔ تمہارے انکل یہاں رہ سکتے تھے۔ اگر وہ خود اپنے آقا نہ ہوتے۔ اگر انہوں نے گھوڑے نہ رکھے ہوتے۔ گھوڑے ان کے خلاف صرف اس لیے ہو گئے تھے کہ انہیں ایک دوسرا آقا مل گیا تھا۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' ڈریک نے بھنویں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

''وہ روح جو اس اراضی پر مقیم ہے۔'' اس نے کہا۔ وہ اب کپکپی پر قابو پا چکی تھی۔ البتہ اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ ''وہ..... وہ اس جگہ کسی اور کی حکمرانی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پھر اپنے غلاموں کو یا جو نام تم انہیں دینا چاہو' استعمال کیا تھا۔ اگر ہم.....''

''اوہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔'' الجھتے ہوئے ڈریک نے کہا۔

اس نے عورت کو پکڑ کر ہلایا۔ ''کیا تم کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔'' مگر مارلن نے خود کو چھڑا لیا۔ وہ اب انہیں سن رہی تھی' وہ زینے چڑھ کر اوپر آ رہے تھے۔

''کیا ہمارے کمرے کا دروازہ مقفل ہے؟'' اس نے عجلت سے پوچھا۔

''ہونا چاہیے۔'' تذبذب سے ڈریک نے کہا۔ ''کیا تم کچھ سن رہی ہو۔ میرا خیال ہے کہ.....''

''یہ بچے بھی جانوروں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ کبھی سوچا ہے تم نے؟ ہم لوگ انہیں سمجھدار سمجھتے ہیں مگر.....''

''میں کچھ آوازیں سن رہا ہوں۔ یہ بچوں کی آوازیں ہیں۔'' ڈریک نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں۔''

''نہیں ڈریک..... نہیں..... نہیں۔''

کمرے کی ڈور ناب کھڑکھڑائی۔

پھر جیسے سب نے مل کر دروازے پر مکے برسانے شروع کر دیے۔ وہ اسے توڑ رہے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ڈریک چیخا۔

''یہ بچے ہیں۔'' مارلن نے سرگوشی میں کہا۔

اور دروازہ بڑے زور سے کڑکڑایا پھر اس سے قبل کہ ڈریک وہاں تک پہنچ سکتا' یہ گر گیا اور بچوں کا جتھا اندر گھسا۔

یہ کافی تعداد میں تھے۔ وہ بستر پر ہی رکی دیکھتی رہی۔ اس کی نظریں بس ایک نظر دیکھ رہی تھیں۔ یہ ان کے مضبوط چوڑے چوڑے دانت تھے جو ان کے کھلے ہوئے منہ سے جھانک رہے تھے۔

☆

دام گل

ایم الیاس

پچاس برس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ ایک تندرست، توانا اور چاق و چوبند شخص تھا۔ نوجوان لڑکوں کی طرح سیدھا چلتا تھا۔ دراز قد نے اس کی وجاہت میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ لندن پہنچ کر جب اس کی مالی حالت اچھی ہو گئی اور آمدنی میں بے تحاشا اضافہ ہونے لگا تو اس نے عورت اور شراب سے دل بہلانا شروع کیا اور اس کے نزدیک اس سے اچھی تفریح کوئی نہیں تھی۔ اس میں اس نے بڑا حسن، کشش اور سنسنی خیزی محسوس کی تھی۔

غیر متوقع انجام کی ایک خوبصورت کہانی

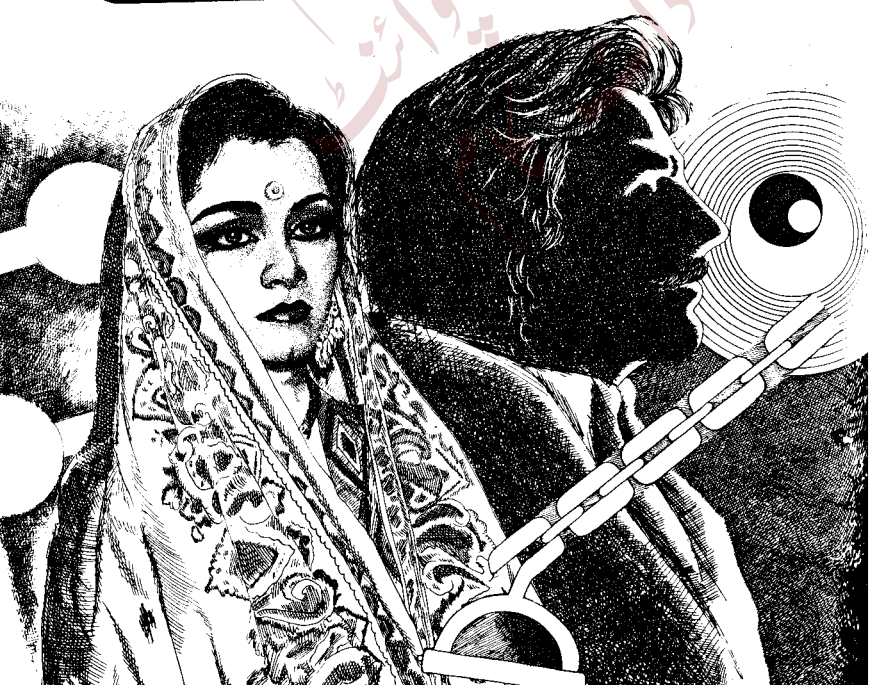

کشور آنند یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز دولت سے خریدی جاسکتی ہے۔ اس کی اس بات کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ وہ اس بات کی سچائی کو بڑی آسانی سے ثابت کرسکتا تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں ہر وہ چیز دولت کے بل پر حاصل کی تھی جو اس نے پسند کی تھی اور جن کی تمنا کی تھی۔ اس نے وہ چیزیں بھی خریدی تھیں جس کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ بڑی سے بڑی دولت ہی انہیں خرید نہیں سکتی ہے۔ مثلاً عورت' ضمیر اور ایمان وغیرہ وغیرہ..... اس نے دولت سے وہ لڑکیاں اور عورتیں بھی خریدی تھیں جو کسی کی بیویاں اور بہنیں تھیں۔ انہیں بستر کی زینت بنایا۔ اس وقت تک ان سے کھیلتا رہا تھا جب تک اس کا جی نہیں بھر گیا۔ ان میں کشش نہ رہی اور اس کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ اس نے لوگوں کے ضمیر اور ایمان خرید کر بے تحاشا دولت کمائی تھی۔ اس دولت کی وجہ سے اسے ساری دنیا کی راحت و آسائش اور بے پناہ حسرتیں ملی تھیں۔ اسے اندازہ تھا کہ دولت میں کتنی بڑی اور حیران کن اور بے پناہ قوت موجود ہے۔ اس میں اتنی بڑی قوت ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی چیزیں اس کے آگے ہیچ ہے۔

ایک روز اس پر یہ حیران کن اور ناقابل یقین انکشاف ہوا کہ دنیا میں ہر عورت بکنے' بستر کی زینت بننے' اشاروں پر ناچنے اور دولت کے آگے سر جھکانے والی نہیں ہوتی ہے۔ یہ پہلی ایسی عورت جس سے اس کا واسطہ پڑا تھا اور جس نے اس کی بات کو غلط ثابت کردیا تھا۔ وہ عورت جولین تھی۔ ایک معمولی سی عورت تھی۔ اس کا شوہر جیمس بھی ایک عام قسم کا آدمی تھا۔ ان کی زندگی بھی سادہ اور پُرسکون تھی۔ ان کا گھر ان کی خوشیوں اور محبت سے ہمکنار رہتا تھا۔ محبت ان کی خوشیاں تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ذات کا جزو تھے اور ان کی چاہت مثالی تھی۔

جولین ایک معمولی گھرانے کی عام عورت تھی لیکن بہت حسین و جمیل تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ ساری دنیا جیمس پر رشک کرتی تھی اور جولین کی بدنصیبی پر ہر کوئی افسوس کرتا تھا۔ دنیاداری کے خیال میں جولین کو کسی امیر کبیر شخص کی بیوی ہونا چاہیے تھی۔ جولین نے کبھی اس انداز سے سوچا اور نہ کبھی خواب دیکھا' نہ کبھی احساس محرومی کا شکار ہوئی تھی۔ وہ اور لڑکیوں اور عورتوں سے مختلف سوچ رکھتی تھی۔

کشور آنند نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو یقین نہیں آیا کہ کوئی عورت اتنی حسین بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی زندگی میں جتنی لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں آئی تھیں' وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھیں۔ جولین کے بجلی بھرے پُرشباب بدن میں ایک ایسی گداز اور کشش تھی کہ اس نے اسے تڑپا دیا تھا۔ اس میں ایک ہیجان برپا کردیا اور وہ اس کے حصول کے لیے بے تاب ہوگیا۔ جولین کے نشیب و فراز اور خطوط نے نیندیں حرام کردی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ جولین کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ معمولی حیثیت کے میاں بیوی ہیں اور ایک عام سی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس میں نہ تو کوئی حسن ہے اور نہ ہی رنگینی..... پھر اس نے سوچا کہ جولین کا حصول بہت آسان ہوجائے گا کیونکہ ہر عورت کے خواب بڑے سہانے ہوتے ہیں۔ ایک پُرعیش زندگی کے ارمان ہوتے ہیں اور کمزوری بھی۔ پھر اس نے جولین کی تمنا کی تھی' اس لیے اسے خریدنے کی کوشش کی۔ اس کے سارے اندازے اور تدبیریں ناکام ہوگئیں پھر اس نے بالتو غنڈوں کی مدد سے میاں بیوی کو یرغمال بنا لیا۔ جیمس کو ایک ایسے مکان میں قید کردیا گیا جو بدمعاشوں کا ٹھکانا تھا پھر اس نے جولین سے بیس دنوں تک خوب جی بہلایا۔ وہ ایسا کھلونا ثابت ہوئی تھی کہ اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔ ایسا پھول تھا' جس کی خوشبو اس نے کسی اور پھول میں نہیں پائی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ تین چار مہینے تک رُکتا لیکن اس بیس دنوں میں جولین نے اسے فریب دے کر فرار ہونے کی کوشش کی تھی پھر اس نے سوچا کہ وہ ہر حال میں

پولیس کے پاس جائیں گے۔ یہ فلم اور تصویریں اس کا دل بہلائیں گی۔ جب اس کا دل بھر جائے گا انہیں تلف کردے گا۔ بیس دن کے بعد جولین اور جیمس کی نعشیں جو برہنہ تھیں' ویرانے میں پڑی ہوئی پائی گئیں۔ لندن پولیس نے بڑا جھک مارا لیکن وہ دونوں قاتلوں کا سراغ نہ پاسکی۔ وہ خوش تھا کہ قانون کے ہاتھوں سے بال بال بچ گیا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ کاش جولین اس کی بات مان کر اس کی داشتہ بن جاتی کیونکہ جولین جیسی عورتیں لاکھوں میں ایک ہوتی ہیں۔ وہ اس کا حسن' پُر شباب گداز بدن اور کشش کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ بات اس کے علم میں تھی کہ ایڈز کے مریض یوں تو ساری دنیا میں موجود ہیں لیکن سب سے زیادہ امریکا' یورپ اور افریقہ میں ہیں لیکن وہ عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا' عورت اس کی سب سے بڑی کمزوری بن چکی تھی۔ وہ ایک ایسا نشہ تھا کہ کسی اور میں بھی اس نے ایسا نشہ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ شراب کا نشہ کیسا ہی تیز کیوں نہ ہو' وہ اتر جاتا تھا لیکن شباب کا نشہ نہیں۔ اسے عورت کے شباب کے نشے کی لت پڑ گئی تھی۔ شراب کی طرح چھوٹتی ہی نہیں تھی۔ جب وہ رنگین تتلیوں اور ان کے بھڑکیلے جسموں کو دیکھتا تو اس کی بھوک ایک بھوکے بھیڑیے کی سی ہوجاتی تھی۔ جب تک وہ کسی سے سرفراز نہ ہوجاتا اسے چین نہ آتا۔

آخر اس نے ایک روز فیصلہ کیا کہ اس کا یہاں رہنا بیکار ہے۔ فضول ہے۔ اگر وہ یہاں رہا تو اپنی کمزوریوں پر قابو نہ پاسکے گا۔ اگر ایک ایڈز زدہ عورت غلطی سے اس کی زندگی میں آ گئی' وہ اس سے کبھی بھی چھٹکارا نہ پاسکے گا۔ یہ ایک لاعلاج مرض تھا۔ موت ہی اس سے نجات دلاتی تھی۔ وہ انتہائی دردناک موت سے لوگوں کو مرتے دیکھ چکا تھا پھر اس نے سوچا کہ عورت کے معاملے میں ہندوستان سے بہتر ملک کوئی نہیں ہے۔ وہاں ہر قوم' مذہب اور رنگ و نسل کی عورتیں ہیں۔ بہت حسین' پُرکشش اور جاذبیت سے بھرپور..... ہندوستان کا حُسن ساری دنیا میں مشہور تھا۔ آسام اور بنگال کا گندمی اور روغنی حسن زلف بنگال بھی تو ہے۔

اس نے لندن میں تو پچیس برس رہ کر صرف جولین اور جیمس کے قتل کے سنگین جرم نہیں کیے تھے' اس نے اور بھی جرائم کیے تھے۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ قسمت کی دیوی اس پر مہربان تھی۔ وہ قانون کے ہاتھوں سے بچتا رہا تھا۔ اس کی بے عیب منصوبہ بندی اور ذہانت نے ہر قدم اور ہر جرم میں ساتھ دیا تھا' جس پر وہ بہت خوش' نازاں اور ایک فاتح کی طرح مسرور اور سرشار بھی ہوجاتا تھا۔ لندن کی پولیس کے ہاتھوں سے شاید ہی شاذونادر کوئی مجرم بچا ہو۔ پولیس جانتی تھی لیکن اس پر ہاتھ اس لیے نہیں ڈالتی تھی کہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ ہوتا تھا لیکن پھر بھی پولیس نے اس پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں رہے گا تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

اس لیے ہی وہ ہندوستان پہنچ کر پُرسکون اور شاہانہ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہاں عورت بہت سستی تھی۔ سستی اور مہنگی سے اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس کی سات پشتیں بھی پُرتعیش زندگی گزار سکتی تھیں پھر ایک روز وہ اپنی تمام دولت سمیٹ کر ہندوستان آ گیا۔ وہ سال دو سال میں ہندوستان کچھ دنوں کے لیے آتا تھا لیکن اب تو وہ مستقل طور پر آ گیا تھا۔

اس نے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ وہ کسی ایک شہر میں رہ کر زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ جس جس شہر گیا تھا' وہاں اس نے راتیں رنگین کی تھیں لیکن اسے ممبئی شہر بے حد پسند آیا تھا۔ ممبئی میں جو رونق' چہل پہل' زندگی اور رنگینیاں تھیں' وہ دوسرے شہروں میں مفقود تھی پھر اس نے مستقل طور پر اس شہر میں سکونت اختیار کرلی پھر اس نے ممبئی کے سب سے اعلا علاقے میں ایک نہایت شاندار لگژری فلیٹ خرید لیا۔ اسے خصوصی طور پر آراستہ کیا پھر ایک شان دار قسم کی گاڑی بھی خرید لی۔ وہ اپنے آپ کو

مصروف رکھنے کے لیے کاروبار کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ لندن میں ایک کاروباری شخص تھا۔ وہ سارا دن سو کر اور ساری رات رنگینیوں میں کھو کر اپنی زندگی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح سے آدمی کسی کام کا نہیں رہتا تھا۔ وہ مریض کی طرح ہو کر رہ جاتا تھا۔

ایک روز شیو کرنے کے بعد آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اسے ایک طرح سے اپنے چہرے پر اطمینان کی لکیریں دکھائی دیں لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر ایک چٹان کا سا بوجھ ہے۔ کچھ دنوں سے اس کے اعصاب پر ایک نامعلوم سا اضطراب غلبہ پا رہا ہے۔ ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ وہ لندن نہیں ہندوستان میں ہے۔ اس سے قتل کے علاوہ جو جرائم سرزد ہوئے تھے' وہ لندن میں' ہندوستان میں اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ وہ اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے۔ وہ پچپن برس لندن میں گزار کر آ رہا ہے۔ یہ ایک طویل مدت تھی۔ اس مدت میں زمین و آسمان کی سوا ہر چیز بدل جاتی ہے۔ بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ جوان بوڑھا ہو جاتا ہے۔ شہروں کا جغرافیہ بدل جاتا ہے۔ پچپن برس نہیں صدیاں ہوتی ہیں۔ زندگی کی تلخیوں' نشیب و فراز اور ہنگاموں سے بھرپور اپنے ماضی کو کسی حد تک بھول جاتے ہیں۔ یادداشت پر وقت کی گرد کی تہ جم جاتی ہے۔ اس نے اپنا ماضی بھلا دیا تھا۔ اب اسے ماضی سے کیا لینا دینا تھا' لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کا ماضی ذہن کے تاریک گوشوں سے جھانکنے لگا ہے۔ وہ ان گوشوں کو بند بھی نہیں کر سکتا ہے۔ ماضی کی یادیں زہریلے ناگ کی طرح سے پھنکار رہی تھیں جیسے اسے ڈس لینا چاہتی ہیں۔ اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ماضی کی یادیں بے رحم اور سفاک ہوتی ہیں۔

جو کچھ ہوا تھا' اس میں اس کی اپنی کوئی غلطی نہیں تھی کہ سارا جرم اس کے سر منڈھ دیا جائے۔ اگر اس سے قصور سرزد ہوا تھا تو کم از کم وہ اشوک مہتا سے زیادہ قصوروار نہیں تھا۔ ان دونوں نے مل کر کاروبار کا آغاز کیا تھا اور ان کے درمیان مکمل طور پر کاروباری شراکت تھی۔ اشوک مہتا نے اسے مشورہ دیا تھا کہ فنانس کمپنی کی رقم فلم سازی میں لگا دی جائے۔ ان دنوں شمیتا کا طوطی بول رہا تھا۔ اشوک مہتا کا خیال تھا کہ ان کی فلم میں شمیتا کو ہیروئن لے لیا جائے تو ان کی فلم ہٹ ہو جائے گی۔ اگر وہ اشوک مہتا کو سمجھاتا تو اشوک مہتا اس کی بات مان لیتا۔ اس نے اشوک مہتا کو کسی قدر جذباتی پایا تو اشوک مہتا کو سمجھانے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ فلمی دنیا میں قدم رکھے' اس لیے کہ ایک سے ایک حسین' نوجوان اور کنواری لڑکیاں ہیروئن بننے کے شوق میں گھروں سے بھاگ کر اور گھر والوں کی مرضی' خوشی اور خواہش سے آئی ہیں۔ وہ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے بڑی سے بڑی خواہش کی خاطر اپنا تن من نچھاور کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آتی تھیں۔ اس میں مفت کے مزے بھی ہو جاتے تھے۔

آخر کار انہوں نے ایک ہدایت کو لے کر ایک فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ شمیتا نے عین وقت پر انکار کر دیا جبکہ تمام معاملات طے ہو گئے تھے۔ وہ ایک رات ہی مفت بھی گزار چکا تھا کیونکہ اس نے کچھ دنوں کے بعد نصف پیشگی رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ معاوضہ چونکہ منہ مانگا تھا' اس لیے شمیتا نے اس رات کو بڑی محبت خود سپردگی اور والہانہ انداز سے خوش کر دیا تھا پھر انہوں نے ایک نئی ابھرتی ہوئی اداکارہ رنجنا کو لے لیا۔ فلم کی تکمیل تک سائیڈ ہیروئن اور اس فلم میں چانس لینے کے لیے جو لڑکیاں اور عورتیں آئی تھیں' ان سے اور رنجنا سے بھی خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ جب کہ اشوک مہتا کو لڑکیوں سے اس کی جیسی دلچسپی نہیں تھی جبکہ وہ منع کرتا تھا کہ معصوم لڑکیوں کی زندگی اور عزت کو تباہ نہ کرے۔ ہاں ہیروئن و سائیڈ ہیروئن اور رقاصاؤں کو آلودہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے سے ہی میلی ہو چکی تھیں۔

ایک برس سے پہلے ہی فلم بن گئی۔ فلم اس بری

طرح فلاپ ہوئی تھی کہ اشوک مہتا کے ہوش اڑ گئے اور اس نے جیسے اپنے حواس کھو دیے۔ وہ جانتا تھا کہ فلم کا کیا حشر ہوگا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک دن بھی ضائع نہیں کیا۔ اس نے چار لاکھ روپے کی رقم تجوری سے نکالی۔ انہیں ڈالر میں تبدیل کیا اور دوسرے دن لندن روانہ ہوگیا۔ اشوک مہتا شدید صدمے سے گھر پر پڑا ہوا تھا۔ اس لیے اسے رقم تجوری سے رقم نکالنے کا موقع مل گیا۔ اس نے ہندوستان چھوڑنے میں عافیت سمجھی تھی۔ اس طرح ساری مصیبت اشوک مہتا کے سر آ گئی۔ اگر وہ خودغرضی کا مظاہرہ نہ کرتا تو اس کی خیر نہ ہوتی کیونکہ یہ پیسہ عوام کا تھا۔ اس نے بھی اپنا پیسہ نہیں لگایا تھا۔ اس کے مزے اس لیے تو آ گئے تھے کہ وہ فلم مکمل ہونے تک ہیروئن' سائڈ ہیروئن اور رقصاؤں سے راتیں کالی کرتا رہا تھا۔

لندن پہنچ کر اس نے سنا کہ اشوک مہتا کو گرفتار کرلیا گیا ہے اور اس کی تلاش ہندوستان کے شہروں میں کی جارہی ہے پھر ایک مہینے بعد اس نے ممبئی کے انگریزی اخبار میں جو لندن آتا تھا' اس میں پڑھا کہ اشوک مہتا کو تین سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی ہے۔

لندن پہنچ کر اس نے نہ صرف اپنا نام بدل لیا بلکہ حلیہ بھی اور پھر اس نے رقم کو کاروبار میں لگا دیا۔ اس نے ہر وہ کام کیا جس سے اس کی خوش حالی اور دولت میں اضافہ ہو۔ اس کے نزدیک جائز اور ناجائز میں ذرا برابر بھی فرق نہیں تھا۔ بس اسے ہر قیمت پر دولت کی ضرورت تھی۔ پھر اس کا شمار جلد ہی لندن کے سرمایہ داروں اور معززین میں ہونے لگا۔ آج جب کہ وہ ہندوستان واپس آ گیا تھا۔ ماضی اس کے وجود پر کسی گھن کھجورے کی طرح رینگنے لگا تھا پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھاتا تھا کہ بلراج مانیال کو جانتے ہیں کشور آنند کو نہیں۔ شاید بلراج مانیال کو بھی بھول گئے ہوں۔ آخر انہیں اسے یاد رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہوگی۔ پھر اس نے اشوک مہتا کے بارے میں سوچا۔ اسے پھر پتا نہیں چلا تھا کہ اشوک مہتا پر کیا گزری ہوگی۔ نہ ہی اسے اشوک مہتا سے اب کوئی دلچسپی رہی تھی۔ اسے دو ایک مرتبہ اپنے دوست اور سابق بزنس پارٹنر کا خیال آیا تھا جسے وہ بیچ منجدھار میں چھوڑ آیا تھا۔ آج اب وہ اسے شدت سے یاد آرہا تھا۔ اگر وہ زندہ رہا ہے تو پھر شادی شدہ رہا ہوگا۔ اس کے پانچ سات بچے ضرور رہے ہوں گے۔ ہندوستان میں لوگوں کو بچے پیدا کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اب وہ کسی گاؤں یا چھوٹے سے شہر میں ملازمت کرکے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زندہ ہی نہ ہو۔ کسی بیماری یا حادثے کی نذر ہو کر اس دنیا سے سدھار گیا ہو۔ اگر وہ مر گیا ہے تو اس کے لیے اچھا ہے۔ اگر وہ زندہ بھی ہے تو اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا' اس لیے کہ پاس بے پناہ دولت ہے۔ ہندوستان میں تو دولت سے ہر چیز آسانی سے خریدی جاسکتی ہے' اس لے کہ وہاں غربت و افلاس اور تنگ دستی کا راج ہے۔ ہر کسی کو دولت کی ضرورت ہے۔

وہ دو روز سے دن اپنی بالکل نئی' بے حد قیمتی اور نائی نویلی دلہن جیسی گاڑی میں پونا کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے اخبار میں ایک مویشی فارم کے فروخت کا اشتہار پڑھا تھا۔ وہ اس فارم کو ایک نظر دیکھ کر خریدنا چاہتا تھا۔ وہ پچپن برس بعد پونا جارہا تھا۔ پونا سے اس کی خوش گوار یادیں وابستہ تھیں۔ یہ پونا شہر ہی تھا جہاں پہلی لڑکی اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ زندگی کی رنگینیوں سے محظوظ ہونے کے لیے یہاں آتا رہتا تھا۔ ممبئی شہر کے مقابلے میں پونا شہر نسبتاً پُرسکون تھا۔ یہاں کی فضا میں اس شہر جیسی آلودگی نہ تھی۔ یہاں گھٹا ہوا پن اور حبس نہیں تھا' جیسا ممبئی شہر میں تھا۔

پونا شہر میں داخل ہو کر اس نے ایک شخص سے اس مویشی فارم کا پتا اور محل وقوع کے بارے میں پوچھا اور اس کے بتانے پر اس سمت چل پڑا تھا۔ کوئی پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے اپنی گاڑی ایک جگہ روکنا پڑی۔ وہاں سے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ وہاں ایک سائن بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔

دائیں طرف جو سڑک جارہی تھی' وہ جھرنا نگر کی طرف جارہی تھی۔ دوسری طرف کی سڑک پریم نگر کی طرف..... وہ اس شخص سے یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ مویشی فارم کس نگر میں ہے؟ اس نے وقت ضائع کرنے سے یہی بہتر سمجھا کہ جھرنا نگر کی طرف چلا جائے۔ یہاں اسے دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ادھر سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ فصل تیار کھڑی تھی۔ کسی بھی دن کٹائی شروع ہوسکتی تھی۔

وہ جھرنا نگر کے راستے پر چل پڑا۔ اسے یہ علاقہ تو بہت پسند آیا۔ ایک تو یہ سرسبز و شاداب اور خوبصورت علاقہ تھا۔ ہوا بھی بڑی خوشگوار چل رہی تھی۔ قدرتی مناظر بھی بہت حسین تھے جس نے اس کا دل موہ لیا تھا اور نگاہ ان پر سے ہٹتی نہیں تھی۔ وہ یہ علاقہ اچھی طرح سے گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اگر یہاں کوئی فارم ہوا تو وہ اسے ہر قیمت پر خریدے گا۔ اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ یہ پُرسکون جگہ اس کی ہر قسم کی تفریحات کے لیے بہت اچھی ثابت ہوسکتی ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور رہنے سے اس کی زندگی خوابوں سے کہیں حسین ہوجائے گی۔

کوئی ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ سڑک کے ایسے دوشاخے کے پاس پہنچ گیا جہاں جھرنا نگر جانے کی کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی سڑک پر روک دی۔ وہ پریشان سا ہوگیا تھا کہ اب کس سمت جائے۔ یہاں کوئی ایسا سائن بورڈ بھی نہیں تھا جو جھرنا نگر کی نشان دہی کرسکے۔ اس نے سوچا کہ یہاں کھڑے رہنے سے تو بہتر ہے کہ کسی نہ کسی سڑک پر چلا جائے پھر اس نے کچھ سوچ کر دائیں جانب والی سڑک پر جانے کا فیصلہ کرلیا' اس لیے کہ یہ سڑک بائیں والی سڑک کے مقابلے میں نہ صرف اچھی حالت میں تھی بلکہ صاف ستھری اور کشادہ بھی لگ رہی تھی۔ سڑک کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا کہ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ اس نے اپنی گاڑی کو اس سڑک پر ڈال دیا۔ وہ گاڑی آہستہ آہستہ چلاتا ہوا جارہا تھا۔ سڑک کے کنارے جو اونچے اونچے درخت تھے' ان کا نظارہ بھی کم دل کش نہیں تھا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا' اس لیے کہ یہ سڑک آگے جاکر تنگ اور شکستہ ہونے لگی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ اس پر گاڑی چلائی جائے۔ اسے نظر آرہا تھا کہ سڑک آگے سے بند ہی ہے۔ اس نے بائیں طرف دیکھا تو نصف فرلانگ کے فاصلے پر اسے کھیتوں میں بھیڑ بکریاں چرتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کے علاوہ دور دور تک زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا تھا کہ وہ اس سڑک پر آیا کیوں.....اور وہ آگے برابر کس لیے چلا جارہا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی گاڑی روک لی۔ گاڑی کے رکتے ہی اس کا انجن ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہوگیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو انجن نے اس کا منہ چڑا دیا۔ اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ اسے جھنجھلاہٹ اس لیے ہورہی تھی کہ گاڑی بالکل نئی اور قیمتی تھی۔ اس کی جو گاڑی تھی' وہ ہندوستان میں سب سے قیمتی تھی۔ بڑے سرمایہ داروں میں وہ فلمی ستاروں کے پاس کسی کسی کے پاس ہوتی تھی۔ ہر کوئی جب اس گاڑی کو اپنے سامنے سے گزرتا ہوا پاتا تو اس طرح دیکھتا تھا جس طرح ایک نوجوان اور پُرکشش دلہن کو دیکھتا ہے' اس لیے اس نے اس گاڑی کو خریدا تھا کہ لوگوں کی توجہ گاڑی کی طرف ہوجاتی تھی اور وہ اسے حسد و رشک سے دیکھتے تھے۔ لڑکیاں اور عورتیں لفٹ بھی مانگتی تھیں۔ وہ ایسی گاڑی سے لفٹ مانگنے والی لڑکیوں سے خوب فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ وہ ماضی میں لفٹ دے کر فائدہ اٹھا چکا تھا۔

وہ اس دلہن جیسی گاڑی کا مالک تھا اور تیس برس سے گاڑی چلاتا آرہا تھا مگر وہ انجن کے الف بے سے بھی واقف نہیں تھا کیونکہ اسے کبھی گاڑی کے انجن سے واسطہ نہیں پڑا تھا' اس لیے کہ اس نے ہمیشہ نئی اور

اچھی حالت کی گاڑیاں استعمال میں رکھی تھیں۔ اسے نہ صرف حیرانی ہو رہی تھی بلکہ غصہ بھی آ رہا تھا کہ اچھی خاصی چلتی ہوئی گاڑی کو کیا ہو گیا ہے۔ اسے پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس سڑک پر کیوں آیا۔ اس نے گاڑی سے باہر نکل کر باسکٹ باہر نکالا۔ وہ دور دراز سفر پر جاتا تو باسکٹ لے کر نکلتا تھا تاکہ راستے میں ضرورت پڑے تو اس میں اسنیک اور پینے کی چیزیں استعمال کر سکے۔ باسکٹ میں بسکٹ' سینڈوچز' کافی کا تھرماس اور وہسکی کی بوتل بھی رکھی تھی۔ اس نے باسکٹ گاڑی کے بونٹ پر رکھی اور اس میں سے سینڈوچز نکال کر کھانے لگا۔ اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ سینڈوچز کھاتے ہوئے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس اچانک افتاد نا گہانی سے کس طرح نمٹنا چاہیے۔ اس کے نزدیک ایک راستہ تو یہ تھا کہ وہ واپس پیدل چلتا جائے۔ آگے شاید وہاں کوئی گاڑی یا آبادی تو ہوگی بلکہ ہونا بھی چاہیے۔ کسی دیہاتی کو معاوضہ دینے سے وہ اپنی بیل گاڑی سے اس کی گاڑی کو باندھ کر شہر کے کسی بھی ورکشاپ تک پہنچا دے گا یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ وہ یہاں بیل گاڑی کا انتظار کرے۔ ممکن ہے دن ڈھلنے تک کوئی بیل گاڑی مخالف سمت سے آ جائے۔ اسے اس لیے کسی بیل گاڑی کے آنے کی امید تھی کہ اس نے سڑک پر بیل گاڑی کے پہیوں کے نشانات دیکھے تھے جو تازہ نگاہ موجود تھے۔

پچاس برس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ ایک تندرست' توانا اور چاق و چوبند شخص تھا۔ نوجوان لڑکوں کی طرح سیدھا چلتا تھا۔ دراز قد نے اس کی وجاہت میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ لندن پہنچ کر جب اس کی مالی حالت اچھی ہو گئی اور آمدنی میں بے تحاشا اضافہ ہونے لگا تو اس نے عورت اور شراب سے دل بہلانا شروع کیا اور اس کے نزدیک اس سے اچھی تفریح کوئی نہیں تھی۔ اس میں اس نے بڑا حسن' کشش اور سنسنی خیزی محسوس کی تھی' اس لیے اس نے بیوی بچوں کا جھنجٹ بھی نہیں پالا تھا۔ طبعاً وہ ایک اوباش شخص تھا۔ آرام و آرائش کا عادی ہو چکا تھا۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ وہ کبھی ایک میل بھی پیدل چلا ہو۔ واپس پیدل جانے کا خیال بڑا روح فرسا تھا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر کسی کا انتظار اس کے لیے اور بھی اذیت ناک تھا۔ اس بات کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی کہ کوئی بیل گاڑی ادھر آ نکلے۔ اس ویرانی میں وہ رات گزارنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے گاڑی سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ اس کا بٹوا چھوٹے بڑے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی جیب میں بھی ہزاروں روپے موجود تھے مگر اس وقت اس کے کسی کام کے نہیں تھے۔ اگر اسے کوئی شخص نظر آتا تو وہ اسکسی ایک نوٹ کی جھلک دکھا کر اس سے کام لے سکتا تھا۔ اس نے پانی تھرموس سے گلاس میں انڈیلتے ہوئے گاڑی کو نفرت بھری نظروں سے گھورا جیسے وہ اس کی دشمن ہو۔ اس کی جیب میں میرا پستول ہوتا تو وہ اس کی ساری گولیاں گاڑی پر خالی کر دیتا۔ اسے کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا اس وقت اس گاڑی پر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ حیرت اور خوشی سے اچانک اچھل پڑا۔ اس نے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی جو مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک ٹریکٹر چلا آ رہا ہے۔ ٹریکٹر دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور پھر اس کی نس نس میں فرحت دوڑ گئی۔ یہ ایک زرد رنگ کا ٹریکٹر تھا جو اس کی گاڑی سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر رکا تھا۔ اس نے ٹریکٹر والے کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا جو ٹریکٹر سے کود کر اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ شخص بھی اس کی عمر کا لگ رہا تھا اور اس کی صحت قابل رشک تھی۔ وہ جوانوں کی طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فرنچ کٹ نما داڑھی تھی۔ جس نے اسے بارعب اور پُرکشش بنا دیا تھا۔ اس نے قریب پہنچ کر کشور آنند سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ وہ اپنے لباس سے کاشت کار ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی تازگی بھی تھی۔

''کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں؟'' اس نے بڑے پُرخلوص لہجے میں کہا اور کشور آنند پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔

''میں یہاں کسی کی مدد کے لیے کھڑا انتظار کررہا تھا۔'' کشور آنند نے جواب دیا۔ ''اگر آپ نہیں آتے تو شاید رات اس ویرانے میں بسر کرنی پڑتی۔''

''خیریت تو ہے۔'' اس نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ کی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے؟''

''جی ہاں۔'' کشور آنند نے اپنا سر اثباتی انداز میں ہلا دیا۔ ''معلوم نہیں اس میں کیا خرابی ہوگئی ہے کہ اس کا انجن اچانک ایک گڑگڑاہٹ سے بند ہوگیا۔ کیا آپ انجن کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ اگر جانتے ہو تو پلیز ذرا دیکھ لیں۔''

''گو میں مکینک تو نہیں ہوں، البتہ تھوڑی بہت شد بد ضرور رکھتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ باسکٹ ہٹالیں تو اس کا انجن ایک نظر دیکھ لوں۔''

کشور آنند نے اپنی باسکٹ اٹھا کر نیچے رکھ لی۔ وہ گاڑی کے انجن کا چند لمحوں تک جائزہ لیتا رہا پھر اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''گاڑی کے انجن میں ایسی کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے جس کا پتا تو ایک موٹر مکینک ہی چلا سکتا ہے۔ اسے کسی گیراج تک لے جانا ہوگا یا پھر کسی مکینک کو لاکر دکھانا ہوگا۔ میں اسے ہاتھ لگانا اس لیے نہیں چاہتا کہ کہیں کوئی نئی خرابی پیدا نہ ہوجائے۔''

''گیراج یہاں سے کتنی دور ہے؟'' کشور آنند نے بے بسی سے پوچھا اور وہ ایک میلے کچیلے لباس میں ملبوس دیہاتی کے سامنے کھڑا رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے کم تر لوگوں کو منہ نہیں لگایا تھا۔

''مگر آج تو یہاں سے بہت دور اور شہر کے اندر ہے۔'' اس نے سر کھجاتے ہوئے بتایا۔ ''اسے لے جانے یا وہاں سے مکینک کو لانے میں رات ہوجائے گی اور پھر مکینک تو اس وقت کسی قیمت پر بھی نہیں آئے گا۔ اور پھر وہاں نیچے تک گیراج میں بند ہوچکا ہوگا۔''

''کیا کوشش کی جائے، کیا مکینک کو یہاں نہیں لایا جاسکتا۔؟'' کشور نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''میں اسے منہ مانگا معاوضہ دوں گا، میں اپنی گاڑی کی وجہ سے اس ویرانے میں چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں کیونکہ یہ بالکل نئی گاڑی ہے اور قیمتی بھی ہے۔''

''اگر مکینک یہاں کسی طرح آ گیا تو وہ یہاں کام کس طرح کرسکے گا؟'' اس دیہاتی نے کہا۔ ''کیوں کہ اس کے یہاں پہنچتے پہنچتے شام ہوجائے گی اور پھر اندھیرا پھیلنے لگے گا..... اور پھر یہاں روشنی کا انتظام تو نہیں ہے؟ وہ کیسے کرسکیں گے؟''

''اوہ..... اب میں کیا کروں؟'' کشور آنند نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''اس گاڑی نے تو مجھے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔'' وہ اپنی بے بسی پر چڑچڑا سا ہوگیا۔

''آپ کو یہ کرنا چاہیے کہ گاڑی کو سڑک کے کنارے کردیں تاکہ میں اپنا ٹریکٹر لے جاسکوں۔ چلیے ہم دونوں مل کر گاڑی کو ایک طرف کیے دیتے ہیں۔''

''کیا آپ مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا سکتے ہیں جہاں کہیں ہوٹل وغیرہ ہو۔'' کشور آنند نے کہا۔ ''تاکہ میں رات وہاں گزار سکوں؟''

''آپ کو اتنی دور جا کر رات گزارنے کی خدمت کیا ہے؟'' وہ کہنے لگا۔ ''اگر آپ کچھ خیال نہ کریں اور مناسب کہیں تو رات گزارنے کے لیے میرا غریب خانہ حاضر ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے، آپ رات میرے ہاں گزار لیں۔ صبح ہم شہر جا کر کسی اچھے مکینک کو لے آئیں گے اور اسے گاڑی دکھا دیں گے۔ وہ اپنی گاڑی میں یہاں آ بھی جائے گا۔ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے۔''

کشور آنند نے ایک پل میں سوچا کہ اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس شخص کے ہاں رات گزارنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اسے ایک طرح سے اطمینان ہوا۔ پھر ان دونوں نے مل کر سوچا کہ اس کے سوا چارہ نہیں

ہے۔ پھر ان دونوں نے مل کر گاڑی کو سڑک سے ایک طرف ہٹایا۔ کشور آنند کی سانس ذرا سی پھول گئی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس مشقت کا عادی نہیں تھا۔ اس نے اپنی سانس پر قابو پانے کے بعد اس دیہاتی سے کہا۔

''آپ تو میرے لیے فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ میں آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں' سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ آپ نے مجھے ایک بہت بڑی اذیت اور کرب سے نجات دلا دیا۔ ورنہ کون ہے جو اس دور میں کوئی ایک اجنبی شخص کے لیے اس قدر مخلص اور سہارا دینے اور اس کی مصیبت میں کام آئے۔''

''تم سچ کہتے ہو دوست'' اچانک اس دیہاتی کا لہجہ اور انداز تخاطب بدل گیا۔ اس نے کشور آنند کے لباس کی پروا کیے بغیر اپنے دونوں ہاتھ اچانک اس کے شانے پر رکھ دیئے اور گہری نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا' کشور آنند کو سخت ناگوار لگا۔ اگر وہ اس وقت اس شخص کا محتاج نہ ہوتا تو اس کے ہاتھ بری طرح جھٹک دیتا۔ اس دیہاتی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو تم بلراج سانیاں ہو.....؟'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ویسے میں کسی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتا ہوں۔''

''کیا .....؟'' وہ اس اجنبی دیہاتی کی زبان سے اپنا نام سن کر ششدر رہ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''میرا نام کشور آنند ہے۔ بلراج نہیں ہے۔ غلطی ہوئی ہے' کسی سے معمولی مشابہت ہو تو آدمی پہچاننے میں غلطی کر جاتا ہے۔''

کشور آنند کا ذہن تیزی سے پچیس برس پیچھے چلا گیا تھا اسے خیال آیا تھا کہ شاید اس دیہاتی نے اس کی تصویر تب اخبارات میں دیکھی ہوگی۔ شاید پولیس نے اسے اشتہاری ملزم قرار دے کر اس کی تصویر اخبارات میں چھاپی ہو۔ لندن میں شاید وہ اخبار اس کی نظر سے نہ گزرا۔

''مجھے کیسے غلط فہمی ہو سکتی ہے۔'' دیہاتی کے ہونٹوں پر بدستور معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ''میں تمہیں سو برس کے بعد بڑی آسان سے پہچان سکتا ہوں۔''

''حیرت ہے بلراج؟'' اس کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔

''تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ اپنے گہرے دوست اشوک مہتا کو.....؟''

''اشوک مہتا!؟'' وہ اچھل سا پڑا۔ اس پر جیسی کوئی بجلی بھی آگری ہو۔ پھر اس پر سکتہ سا چھا گیا کہیں اس کی ساعت کا قصور نہیں ہے؟

اس نے سوچا۔ اس نے خواب و خیال میں نہیں سوچا تھا کہ اس کی اشوک مہتا سے اس ڈرامائی انداز میں ملاقات ہو جائے گی۔ وہ اس کا مجرم تھا۔ وہ قانون اور ان لوگوں کا بھی مجرم تھا۔ جن کی رقمیں ان کی کمپنی میں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے لندن جا کر دولت مند بن جانے کے باوجود اپنے دوست کی خبر نہیں لی تھی۔ آج وہی دوست اس کی مصیبت میں کام کر رہا تھا۔ جب کہ وہ اپنے دوست کو مصیبت میں ڈال کر چلا گیا تھا۔

''کیا سوچنے لگے دوست!'' اشوک مہتا نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''پرانی باتیں بھول جاؤ اور ایک اچھے دوست کی طرح گلے لگ جاؤ۔''

وہ ایک دم سے چونکا اور بڑی گرم جوشی سے اشوک مہتا سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر اشوک مہتا نے اس سے الگ ہو کر اس کی ندامت بھری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں نظروں کے سامنے دیکھ کر اور میں برسوں کے ایک طویل عرصے بعد تم سے مل کر کتنی مسرت ہو رہی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھے بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔ ایک اچھا اور پرانا دوست کسی دولت سے کم نہیں ہوتا ہے۔ تم میرے بہت اچھے دوست رہے ہو۔''

''تم مجھے جتنا چاہو ذلیل کر لو دوست!'' کشور

آنند نے اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے کہا۔
''مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں نے.....''
''نہیں دوست!'' اشوک مہتا نے بڑی تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تو اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ''نہیں دوست.....! تم اس انداز سے بھولے سے بھی نہیں سوچنا۔ یہ دوستی کی اور اس کے جذبے کی توہین ہے۔ تم نے جو کچھ بھی کیا' وہ بہت اچھا کیا تھا۔ میں ان تمام باتوں کو بھلا چکا ہوں مجھے صرف تم یاد رہے.....اور یاد بھی آتے رہے تھے۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ معلوم نہیں میرا دوست کیا ہے اور کن حالات میں ہے۔''
''میں تمہاری تلاش میں ہندوستان آیا ہوں تاکہ ماضی کی اس تلخ کلامی کی تلافی کردوں۔ تم میری وجہ سے اس حالت کو پہنچ گئے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ تم ایک مشکل ترین زندگی گزار رہے ہو اور تمہارے حالات نامساعد ہیں۔ میرے پاس آج اتنی دولت ہے کہ تمہارے دن پھیر دوں گا تاکہ تم ایک پرسکون اور خوش حال زندگی گزار سکو۔'' وہ ریاکاری سے بولا۔
''مجھے تمہاری دولت کی نہیں' بلکہ دوستی اور محبت کی ضرورت ہے۔ چلو گھر چلتے ہیں'' اشوک مہتا نے کہا۔ ''مجھے تمہاری خدمت کرکے بہت خوشی ہوگی۔''
وہ دونوں ٹریکٹر پر سوار ہوگئے۔ چند لمحے تک ان دونوں کے درمیان گہری خاموشی طاری رہی۔ آخر کشور نے خاموشی کو توڑا۔
''تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' کشور آنند بولا۔
''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی زمین دار کے پاس ملازم ہو۔''
''آج میں نہ تو بزنس کررہا ہوں اور نہ ہی کسی کی ملازمت.....؟'' اشوک مہتا نے مسکرا کے جواب دیا۔
''ایک کسان بن گیا ہوں۔ کھیتی باڑی کرتا ہوں' میرا ایک چھوٹا سا ناریل کا باغ بھی ہے۔ ایک چھوٹا سا گھر بھی ہے۔ شہر میں ایک اسکول ہے جہاں دن میں جاکر دوپہر تک پڑھاتا ہوں' میری بیوی بھی اسکول ٹیچر ہے۔ ہماری تین بچے ہیں۔ تین دن ہوئے میری بیوی بچوں کو ساتھ لے کر تعطیلات گزارنے میکے گئی ہوئی ہے۔ میں نے ایک نوکر رکھا ہوا ہے جو کھانا پکاتا ہے۔ ایک ملازمہ ہے جو صفائی وغیرہ کرجاتی ہے۔''
کشور آنند کو اس کا مکان بہت پسند آیا۔ یہ ایک منزلہ مکان تھا۔ نیچے اوپر تین کمرے تھے' وہ دونوں رات کے کھانے کے بعد بڑی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اشوک مہتا نے اسے بتایا تھا کہ اس نے جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنی ماں کے تمام زیورات بیچ کر یہ باغ اور کھیت خرید لیے۔ ایک اسکول میں جز وقتی ملازمت کرلی۔ اس کی بیوی بھی اس اسکول میں پڑھاتی تھی۔ ان دونوں نے محبت کی شادی کی ہے۔ اشوک مہتا نے اسے اپنی بیوی اور بچوں کی تصویر دکھائی اس کی بیوی ایک قبول صورت عورت تھی۔ البتہ اس کی دو جوان لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ دونوں بہت خوب صورت اور پیارے پیارے سے تھے۔
رات گیارہ بجے اشوک مہتا سونے کے لیے چلا گیا۔ اس کے لیے بالائی منزل کے ایک کمرے میں بستر لگادیا تھا۔ نیند اسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بڑی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا ہوا سونے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پر وہ بے زار سا ہوکر اٹھا اور کھڑکی میں جا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آسمان پر چاند اپنی تمام تر لطافتیں اور نرماہٹیں لیے مسکرا رہا تھا۔ چاندنی رات کا اجالا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا بڑی دیر تک چاندنی کی سندرتا دیکھتا رہا تھا۔ اس کی نظریں اس کمرے کے چھوٹے سے گھر پر تھیں جو باغ کی ایک کونے میں بنا ہوا تھا اس کے گرد خاردار تاروں کی ایک باڑ کھنچی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے نیچے جاکر اس مکان تک ٹہل کر آنا چاہیے۔ شاید اس طرح نیند آجائے۔ یہ سوچ کر وہ نیچے آیا۔ گھر سے باہر نکلا آہستہ آہستہ چلتا رہا' اس مکان کی طرف

بڑھا۔

اس مکان کے عقبی حصے میں پہنچا تھا کہ چونک کر اور ایک دم سے ٹھٹک کے رک گیا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن اسے ایسا لگا کہ وہ جیسے کوئی سندر سپنا دیکھ رہا ہو۔ لیکن یہ سپنا نہیں تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ وہ کوئی عورت تھی جو سفید براق لباس میں ملبوس تھی۔ وہ باڑھ کے پاس کھڑی چاند کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا انگ انگ اس دھلی ہوئی چادر کے دریا میں نہا رہا تھا۔ اس کے کھلے لمبے لمبے ریشمی سیاہ بالوں میں جیسے چاندنی چٹک گئی تھی۔ اس نے اچانک اپنے لمبے سیاہ بال لہرا دیئے تو کشور آنند کو ایسے لگا کہ چاندنی کا بہتا دریا منجمد ہو گیا ہو۔

اس عورت نے کشور آنند کی چاپیں سن کر اس کی طرف مڑ کے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکی اور پھر بے خوف سی ہو کر اس کی طرف بڑھی اور اس سے چند قدم پر رک گئی۔ کشور آنند نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا تو ششدر سا رہ گیا۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش بھی تھی۔ اس کے پرشباب گداز بدن میں بڑی جاذبیت اور دلکشی تھی۔ انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ اس کے حسن جہاں سوز نے اس کے دل پر بجلی گرا دی تھی۔ اس کا مہین لباس بھی شعلے کی طرح آنچ دے رہا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں اور بھرے بھرے گداز اور رسیلے ہونٹوں اور کالی آنکھوں کے بے پناہ حسن اور گہرائیوں نے اسے اسیر بنا لیا تھا۔ اس سفید لباس نے اسے بے نام تلوار کی طرح کر دیا تھا اور اس کی کمان کی طرح تنی ہوئی گردن نے اس کے دل میں ایک کھلبلی سی مچا دی تھی پھر اس نے کشور آنند کو ایسی نظروں سے دیکھا جس میں ان جانی دعوت تھی۔ جسم کے تناسب اور نشیب و فراز نے اسے ایون کی یاد دلا دی تھی۔ اسے دیکھ کر جرمن یاد آ گئی تھی وہ کسی خیال کے زیر اثر رک گیا۔ اشوک مہتا کی رشتہ دار سمجھ کر اس نے خود پر بدقت تمام قابو پایا تھا۔

''کیا آپ اشوک مہتا کے مہمان ہیں.....؟''

اس کی آواز بھی اس کی طرح رسیلی تھی۔ خاموش فضا میں جل ترنگ کی طرح۔

''جی ہاں.....'' کشور آنند نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔ ''میں آج شام ہی شہر سے ان کے ہاں آیا ہوں۔ وہ میرے دیرینہ دوست ہیں۔''

''جب آپ ان کے مہمان ہیں تو آپ میرے بھی مہمان ہیں۔'' وہ رسیلی آواز میں شوخی لہجے میں

کترنیں

دہشت

''میں نے سنا ہے کہ تمہاری بیوی بہت خطرناک ڈرائیونگ کرتی ہے۔'' ایک دوست نے دوسرے کہا۔

''درست ہے'' دوسرے نے اطمینان سے کہا۔

''جس وقت وہ ڈرائیونگ کرتی ہے چوراہے کی سرخ بتی بھی اسے دیکھ کر زرد پڑ جاتی ہے۔''

☆

آہستہ بولو

چار ڈاکو ریل کے مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔ ایک ڈاکو نے ایک مسافر سے پوچھا۔

''تمہارے پاس کیا ہے۔؟''

مسافر نے جلدی سے کہا۔ ''بھائی! آہستہ بولو میرے پاس تو ٹکٹ بھی نہیں ہے۔''

آئین قدرت

قدرت کا یہ مسلمہ آئین ہے کہ جو لوگ قدرت کے آئین کے مطابق اپنی زندگی بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبود کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ قدرت ان کے نام کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتی۔

بولی۔

''آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں تاکہ میں آپ کی کچھ سیوا کرسکوں'' اس نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاید آپ کو نیند نہیں آرہی ہے؟''

''آپ کے ساتھ کون رہتا ہے؟'' کشور آنند کو اس دعوت کی توقع نہیں تھی۔

''کوئی بھی نہیں..... میں اکیلی ہی رہتی ہوں۔''

اس نے کشور آنند کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''میں نے کسی وجہ سے شادی نہیں کی۔ ایک کنواری عورت ہوں۔'' کشور آنند کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس کی باتوں میں ہیجان خیزی تھی۔ اسے کسی وجہ سے تامل سا ہوا تھا۔

''نیند آپ کو بھی نہیں آرہی ہے اور مجھے بھی نہیں۔'' وہ اس کے قریب آکر بولی۔

''کافی بنا کر پلادوں گی۔ جب تک نیند نہیں آتی باتیں کرتے رہیں گے۔'' وہ اس کے قریب کھڑی کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہی تھی۔ اس پر کسی پرانی شراب کا سا خمار چھانے لگا۔

جب وہ اس عورت کے ساتھ اس کے مکان کی طرف بڑھا تو اس کے سارے جسم میں اس خیال سے خون کی گردش تیز اور اس کی حدت بڑھ گئی کہ یہ اس مکان میں اکیلی رہتی ہے اور غیر شادی شدہ بھی ہے۔ یہ کوئی سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی نہ تھی۔ چوبیس پچیس برس کی تھی۔ اس کے لیے یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ اور کنواری بھی تھی۔ ایسی حسین عورت نے شادی کیوں نہیں کی جو لاکھوں میں ایک ہے۔ وہ بڑے اعتماد سے اسے اپنے گھر لے جارہی تھی۔ شاید اس بات کا اندازہ تھا کہ چونکہ وہ اشوک مہتا کی جان ہے اس لیے اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

وہ ایک کمرے کا مکان تھا۔ کمرا بہت بڑا تھا۔ اس مکان کے اندر ایک چراغ جل رہا تھا۔ ایک کونے میں بستر تھا۔ کرسی وغیرہ کوئی نہیں تھی۔ اس لیے اسے بستر پر بیٹھنا پڑا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں کیروسین آئل کا چولہا تھا۔ ریک پر برتن قرینے سے رکھے ہوئے تھے کھانا پکانے کے لوازمات وغیرہ بھی تھے۔ وہ کافی بنانے لگی تو اس عورت کو دیکھتا رہا۔ اس میں پکے پھل جیسا رسیلا پن تھا۔ وہ اس سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ ایک طرح سے اس پر ریشہ خطمی ہوگیا تھا۔ پھر وہ دو کپ کافی بنا کر لے آئی۔ ایک کپ اسے اور دوسرا کپ لے کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

اس نے عورت کے ہاتھ سے کپ لینے کے بعد پوچھا۔ ''شیر یمتی جی! آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام.....؟'' وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور پھر بولی۔ ''پورنیا''

''جس طرح آپ کا نام ہے اسی طرح آپ حسین بھی ہیں۔'' اس نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے جانا چاہا تو وہ جانہ سکا۔ تنہائی میں پورنیا کے سحر نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اس میں جو خود سپردگی اور وارفتگی تھی وہ اس نے آج تک کسی عورت میں نہیں پائی تھی۔ اسے ہر طرح خوش کیا تھا۔ اس کی کسی بھی من مانی پر اف تک نہیں کیا تھا۔ جب وہ رات کے آخری پہر جانے لگا تو اس سے بولی۔

''دیکھیے گا..... مجھ سے ملاقات کا ذکر آپ بھولے سے بھی اشوک مہتا سے نہ کریں۔ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ میں کسی سے ملوں۔ آپ کل رات میں آئیں گے نا.....؟''

''ضرور آؤں گا'' وہ شوخی سے بولا۔

''بلکہ میں جب تک یہاں رہوں گا میں اشوک مہتا کے فرشتوں کو بھی ہوا لگنے نہیں دوں گا۔''

کشور آنند مختلف حیلے بہانے سے ایک ہفتہ تک اشوک مہتا کے پاس رکا۔ وہ پورنیا کے پاس رات کے وقت جاتا اور سورج نکلنے سے پہلے چلا آتا تھا۔ اشوک مہتا کو ایک روز بھی شک نہیں ہوسکا تھا کہ اس کا دوست رات کو کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ پورنیا کے یہاں سے لے جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ پورنیا نے اسے بتایا تھا کہ اشوک مہتا اور اس کی بڑی بہن نے

اسے ایک طرح سے قید کر رکھا ہے۔ اس کے گھر سے نکلنے پر سخت پابندی عائد کر رکھی ہے۔ گھر کے نوکر سارا دن اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اشوک مہتا نے قرب و جوار کے لوگوں سے یہی کہہ رکھا تھا کہ اگر اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے پکڑ کر یہاں لے آئیں۔ اس نے تنگ آ کر دو ایک مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ پکڑی گئی تھی۔ میاں بیوی نے مل کر اس کی ایسی زبردست پٹائی کی تھی کہ وہ تین دن تک بستر سے لگی رہی تھی۔ پکڑے جانے اور پٹائی کے خوف سے اس نے فرار ہونے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ اس لیے اب وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرتی ہے۔ اس پر ظلم و ستم اس لیے روا رکھا ہے کہ وہ اشوک مہتا کی بیوی کی سوتیلی بہن ہے۔ اس کی بہن اس کے حسن و شباب سے جلتی ہے۔ ایک طرح سے وہ اس سے کسی بات کا انتقام نہیں لے رہی ہے۔ اسے ناکردہ پاپ کی سزا مل رہی ہے۔ پورنیا اس کے قدموں پر گر پڑی تھی۔ گڑگڑائی تھی اور وہ اس سے منت سماجت بھی کرتی تھی وہ اسے اس جہنم سے نکال لے جائے۔

اس نے پورنیا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے یہاں سے ہر قیمت پر نکال کر لے جائے گا۔ ممبئی پہنچ کر وہ دونوں لو میرج کر لیں گے۔ اس نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اس کی زندگی میں آج تک ایسی بھرپور عورت نہیں آئی تھی۔ کسی عورت نے اسے اتنا خوش نہیں کیا تھا جتنا پورنیا نے کیا تھا۔ اب وہ اسی لاجواب عورت کی رفاقت میں زندگی گزار دینا چاہتا تھا۔ ایسے ایسی حسین اور جوان عورت اس عمر میں نہیں مل سکتی تھی۔

پھر حالات نے اسے ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کر دیا کہ جہاں وہ اشوک مہتا کو دھوکا دینے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ ہی نہیں رہا تھا کہ اپنے دوست کی آنکھوں میں دھول جھونک سکے اور پورنیا کو یہاں سے نکال کر لے جائے اس کے لیے پورنیا کو یہاں سے لے جانا ایسا مشکل ہی نہیں تھا۔

اس کی گاڑی ٹھیک ہو کر پانچ دن پہلے ہی آ گئی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ اشوک مہتا کسی کام سے شہر جائے اور وہ پورنیا کو لے اڑے۔

ایک رات' رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد اشوک مہتا اس سے بولا۔

''میں تمہیں ایک زحمت دینا چاہتا ہوں۔ جس روز تم بمبئی جاؤ اس روز پورنیا کو اپنے ساتھ.....'' اس نے درمیان میں اشوک مہتا سے انجان بن کر حیرت سے پوچھا۔

''یہ پورنیا کون ہے.....؟ کہاں رہتی ہے.....؟ اس کا نام پہلی بار سن رہا ہوں۔''

''پورنیا میری ماں ہے اور باغ میں بنے ہوئے کھرمل کے مکان میں رہتی ہے۔''

وہ کہنے لگا۔ ''وہ بے حد حسین' جوان اور پرشباب ہے۔ وہ اپنے حسن جہاں سوز سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے بمبئی گئی تاکہ فلم کی ہیروئن بن سکے۔ وہ ہیروئن نہ بن سکی۔ اس لیے کہ وہ ایک عیاش اور بدکار فلم ساز کے ہتھے چڑھ گئی۔ پھر ایک روز وہ فلمساز دردناک موت مر گیا۔ مرتے مرتے اس نے پورنیا کو ایک عذاب ناک تحفہ دے دیا۔''

''کیا تحفہ.....؟'' کشور آنند نے چونک کر پوچھا۔

''ایڈز کا.....وہ ایڈز کی مریضہ ہے۔ اس نے یہ تحفہ کئی مردوں کو دیا جو یقیناً اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ ساری دنیا کے مردوں کو یہ تحفہ دے کر ان سے انتقام لینا چاہتی ہے اور.....اور.....''

وہ اس سے آگے ایک لفظ بھی سن نہ سکا' اس کا سر چکرایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

☆

بیوی پرست

روشن آرا

"ہماری بیویاں جیون ساتھی ہیں۔ ہماری محبت اور درد کے ساتھی ہیں۔ ہم نے ان کی ہر بات مان کر اس پر عمل کر لیا تو اس میں بے عزتی اور ہتک کی کیا بات ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح ہماری ازدواجی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے....."

اس شمارے کی ایک مسکراہٹ بھری تحریر

موہن بھوپت اور رام لعل بار کے ایک کونے میں بیٹھے کسی موضوع پر زور و شور سے گفتگو کر رہے تھے۔ اس وقت رات کے ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ یہ صرف آج ہی نہیں بیٹھے تھے بلکہ برسوں سے ان کا روز کا معمول تھا۔ بار کے منیجر نے ان کے لیے یہ میز مخصوص کی ہوئی تھی۔ وہ نو بجے بار میں داخل ہوتے اور رات ایک بجے تک بیٹھے رہتے۔ پینے پلانے کا دور چلتا۔ وہ مختلف موضوعات پر بحث کرتے۔ بڑے جذباتی اور سنجیدہ ہو جاتے۔ بعض اوقات آپس میں بچوں کی طرح لڑنے لگتے لیکن کبھی کبھار چھوٹی موٹی شرطیں بھی لگاتے۔ اس کے باوجود ان کی دوستی اور اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

لیکن آج صورت حال یکسر مختلف تھی۔ ان سب پر سنجیدگی سی طاری تھی۔ وہ کسی نازک، اہم اور پیچیدہ مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ پھر وہ گفتگو میں اتنے محو ہوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ دو بج گئے، انہیں اس وقت کسی بات کی پروا تھی اور نہ گھر جانے کی فکر تھی۔ وہ آج ایک فیصلے اور نتیجے پر پہنچ کر اٹھنا چاہتے تھے۔

آج وہ تینوں اپنی ازدواجی زندگی کے ان ناآسودہ پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے تھے جنہوں نے ان کی زندگی میں تلخیاں گھول دی تھیں۔ ان کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی جس سے وہ بہت پریشان اور متفکر ہو گئے تھے۔ اس کا حل تلاش کرنا چاہتے تھے۔

"دوستو!" بھوپت نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہمارے روزانہ کے اس معمول سے ہماری بیویاں بے زار اور تنگ آ چکی ہیں۔ وہ بہت نالاں بھی ہیں جس کی وجہ سے اس سلسلے میں ہماری اپنی بیویوں سے روزانہ ہی لڑائی ہوتی جا رہی ہے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک اس طرح چلتا رہے گا۔ ہمیں اس کے مداوے کے لیے سنجیدگی سے کچھ سوچنا چاہیے۔ جتنا جلد ہو سکے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سدا کے لیے ہم سے روٹھ کر اور ہمیں چھوڑ کر چلی جائیں۔"

"ہاں..... مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے" موہن نے کہا۔

"اگر ہماری بیویاں روٹھ کر سدا کیا کچھ دنوں کے لیے میکے چلی گئیں تو بہت برا ہوگا۔ یہ بہت بے چین اور حیران ہیں۔ ان سے ایک دن ایک رات کی جدائی ہی ناقابل برداشت ہوگی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" رام لال نے سر ہلایا۔ "میں تو ایک رات بھی اپنی بیوی کے بغیر سو نہیں سکتا۔ جب

کبھی وہ دو ایک دن کے لیے میکے چلی جاتی ہے تو میں راتوں کو انگاروں پر لوٹنے لگتا ہوں۔ جب تک وہ پاس نہ ہو۔ نیند نہیں آتی۔''

''ایک تمہارا ہی نہیں ہم سب کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔'' بھوپت نے کہا۔

''اب میری بیوی دو تین دن سے دوسرے کمرے میں سونے لگی ہے۔ اندر سے دروازہ بند کر لیتی ہے۔ جب میں اس کے پاس جاتا ہوں تو مجھے بری طرح جھٹک دیتی ہے۔''

''کل رات میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا بتاؤں؟'' موہن نے کہا۔

''جب میں کل گھر میں داخل ہوا تو وہ اس وقت ٹی وی پر میرے انتظار میں ایک انگریزی جذباتی فلم دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ایک ایسا منظر دکھایا جا رہا تھا جس نے میرے جذبات میں ہل چل مچا دی۔ جب وہ ٹی وی آف کر کے اٹھی تو میں نے اسے دبوچ لیا۔ میں نے پروا نہیں کی اور میں فاتح بن کر رہا۔ جس پر اس نے مجھ سے کہا کہ..... تم ہوس پرست ہو۔ تمہیں مجھ سے نہیں صرف میرے جسم سے غرض ہے۔''

''یہ صورت حال بڑی تشویش ناک ہے۔'' رام لعل نے کہا۔

''میرے ساتھ بھی ایک دو مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔''

''میری بیوی کہتی ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں' کوئی طوائف نہیں ہوں۔ جب دل چاہا دل بہلانا شروع کر دیا۔'' بھوپت نے کہا۔

''میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے۔'' موہن نے کہا۔ ''اس پر عمل کر کے ہم اپنی بیویوں کے دل موم کر سکتے ہیں۔''

''وہ کیا.....؟'' رام لعل نے اشتیاق آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

''کیا یہ قابل عمل بھی ہے کہ نہیں؟''

''قابل عمل کیوں نہیں ہے۔'' موہن نے جواب دیا۔

''ہم آج ایسا کرتے ہیں کہ جب رات گئے گھر میں داخل ہوں گے تو ہماری بیویاں کچھ بھی کہیں گی ہم اس کی تعمیل کریں۔ ان کے حکم کی بالکل بھی سرتابی نہ کریں۔''

''تم چاہتے ہو کہ ہم جورو کے غلام بن جائیں؟'' رام لعل نے تیز لہجے میں کہا۔

''میرے دوست اس میں جورو کا غلام بننے والی کیا بات ہے؟'' موہن نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''ہماری بیویاں جیون ساتھی ہیں۔ ہماری محبت اور دکھ درد کی ساتھی ہیں۔ ہم نے ان کی ہر بات مان کر اس پر عمل کرلیا تو اس میں بے عزتی اور ہتک کی کیا بات ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح ہماری ازدواجی زندگی ہر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے اور پھر ان کی محبت خود سپردگی اور وہی نہ سہی شادی کے ابتدائی دنوں جیسی شدت پیدا ہوجائے گی۔''

''مجھے تمہاری اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے۔'' بھوپت نے خوش کن لہجے میں کہا۔

''بلکہ میں بھگوان کی سوگند کھا کر یہ عہد کرنا چاہیے کہ آج سے ہم بھی رات گئے گھر میں داخل ہوں تو ہماری بیویاں جو کچھ کہیں گی ہم اس پر عمل کریں گے۔''

''تمہاری یہ تجویز میری کھوپڑی میں آرہی ہے۔'' رام لعل نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

پھر ان تینوں دوستوں نے بار سے روانہ ہونے سے پہلے بھگوان اور بارہ کروڑ دیوتاؤں کی سوگند کھا کر یہ عہد کیا کہ آج سے وہ اس بات کو معمول بنالیں گے کہ جب وہ رات گئے اپنے گھر میں داخل ہوں گے تو اس وقت ان کی بیویاں جو کچھ بھی کہیں گی وہ اس پر آنکھیں بند کرکے عمل کریں گے۔ سرتابی نہیں کریں گے۔

اگلے روز موہن اور رام لعل حسب معمول مقررہ وقت پر پہنچ گئے تھے وہ بہت خوش اور سرشار تھے جیسے انہوں نے اس تدبیر پر عمل کرکے اپنی بیویوں کا دل جیت لیا ہے۔ بھوپت ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں اپنی رپورٹ سنانا چاہتے تھے۔ وہ دونوں بے چینی سے اس کا انتظار کررہے تھے اور اور ان کی نگاہیں بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ کل رات کی روداد سنانے کے لیے سخت بے چین تھے۔ ان کا یہ انتظار جلد ہی ختم ہوگیا۔

بھوپت بڑے پراسرار اور محتاط انداز سے بار میں داخل ہوا۔ وہ ادھر ادھر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی بات سے سخت پریشانی اور متفکر ہو۔ اس نے اپنے اوور کوٹ کے کالر اس طرح سے اونچے کرلیے تھے کہ جیسے چہرہ چھپا رہا ہو۔

''بھوپت! کیا بات ہے۔'' موہن بولا۔ ''تم نے یہاں پہنچنے میں آدھے گھنٹے کی تاخیر کردی؟''

''کوئی بات ہے'' بھوپت نے کہا۔ ''تم لوگ انہیں اپنی بپتا سناؤ۔ پھر میں سناتا ہوں۔''

''سب سے پہلے میں اپنی رپورٹ پیش کروں گا۔'' رام لعل نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''کل رات جب میں جیسے ہی انٹرلاک کھول کر گھر میں داخل ہوا تو برآمدے میں ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ اس وقت وہاں نیم اندھیرا تھا کرسی پر ٹین کا ایک خالی ڈبا رکھا ہوا تھا جو ننگے فرش پر گر گیا۔ اس کے شور سے میری بیوی بیدار ہوگئی۔ اس وقت وہ لحاف میں دبکی بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ کمرے سے برآمدے میں آئی اور اس نے لائٹ آن کی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ برافروختہ ہوگئی۔

''تمہارا انتظار کرتے کرتے ابھی تو میری آنکھ لگی تھی' اب اس طرح شور کرکے سارے محلے کو جگادو۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو موہن نے پوچھا۔ ''پھر تم نے کیا کیا.....؟ کیا بیوی سے معافی مانگی؟''

''کرتا کیا ..... بیوی کی بات ماننا بھی بہت ضروری تھا۔ کیونکہ ہم نے سوگند کھائی تھی۔ میں نے ڈنڈا اٹھایا اور باہر نکل کر بجلی کے کھمبے کو زور زور سے پیٹنا شروع کردیا۔ محلے کے ہر گھر کی بتیاں جل اٹھی اور کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ اس نے بدحواس ہوکر پوچھا کہ ''یہ تم کیا کررہے ہو؟'' میں نے اس سے کہا کہ میں تمہارے حکم کی تعمیل کررہا ہوں۔ پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان کا واسطہ دیا کہ میں ایسا نہ کروں۔ میں

نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اندر آ گیا۔ کیونکہ تم لوگوں سے کیا ہوا عہد بھی نبھانا تھا۔ میری بیوی نے بھی کہا کہ میں راتوں کو اتنی دیر سے نہ آیا کروں۔ سرد راتوں میں تمہاری بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے سہاگ کی پہلی رات کی یاد تازہ کر دی۔''

''اچھا..... اب میری بپتا سنو۔'' موہن کہنے لگا۔ ''جب میں گھر میں داخل ہوا تو میری بیوی جاگ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ تم روز رات ایک بجے گھر آ جایا کرتے تھے لیکن آج تو تم نے حد کر دی۔ جانتے ہو اس وقت کیا بجا ہے؟ اس وقت پونے تین ہو رہے ہیں۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ یوں ہی برآمدے میں سردی میں ٹھٹھرتے رہو۔ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔''

''پھر تم نے کیا کیا.....؟ کیا ساری رات سردی میں ٹھٹھرتے رہے؟'' بھوپت نے پوچھا۔

''میں بے چون و چرا وہیں برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ منت سماجت بھی نہیں کی۔ کیونکہ میں تم دونوں سے یہ عہد کر کے گیا تھا کہ بیوی کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ رات کسی قدر شدید سردی پڑ رہی تھی۔ برآمدے میں چونکہ سرد ہوائیں سنسنا رہی تھیں جس کے باعث سردی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تو دروازہ پیٹ کر اسے بھی سونے نہیں دیتا۔ میں نے جان لیا کہ میں سردی سے اکڑ کر مر جاؤں گا تھوڑی دیر بعد میری بیوی کو مجھ پر رحم آ گیا۔ وہ دروازہ کھول میرے پاس آئی۔ میرا ہاتھ تھام کر بڑے پیار سے بولی کہ اندر چلو..... جب میں اندر پہنچا تو اس نے میری کسی خواہش کو رد نہیں کیا اور ہم دونوں کیف و سرور کے جہانوں میں کھو گئے۔''

''دیکھا..... میں نہ کہتا تھا کہ بیوی کی بات ماننے میں کتنا فائدہ ہے؟'' موہن نے کہا۔

''ہاں'' رام لعل نے سر ہلایا۔ ''اب اس بات سے کیا انکار کیا جا سکتا ہے۔''

''بھوپت! تم خاموش کیوں ہو؟ اپنی بپتا نہیں سناؤ گے کیا.....؟'' موہن نے اس سے کہا۔

بھوپت کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے اوور کوٹ کے کالر اور اونچے کر لیے اور سر کو جھکا کر ان میں اسے چھپا لیا۔ پھر اس نے سرگوشی میں نہایت آہستگی سے کہا۔

''دوستو! کیا بتاؤں..... میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

''کیسی مصیبت؟'' موہن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا تم نے اپنی بیوی کے حکم سے سرتابی کی۔''

''نہیں..... یہ بات نہیں..... میں نے اس پر عمل کیا.....'' بھوپت نے جواب دیا۔

''اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر اس قدر پریشان اور ہراساں کیوں نظر آ رہے ہو؟'' رام لعل بولا۔

''جب میں گھر پہنچا تو میری بیوی لیٹا جاگ رہی تھی۔'' وہ کہنے لگا۔

''یہ کوئی وقت ہے اتنی دیر سے آنے کا' رات کے تین بج رہے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اتفاق سے پہلی بار دیر ہو گئی۔ اس نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ تم..... تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ میں جانتی ہوں تم باہر عیاشی کرتے ہو..... کیا تم چاہتے ہو کہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں..... اس سے تو بہتر ہے کہ تم مجھے مار ڈالو..... تاکہ میری وجہ سے تمہاری روز روز کی آوارہ گردی میں کوئی فرق نہ پڑے۔ ایسے جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ تم مجھے اس عمارت سے نیچے پھینک دو۔ میں نے لپک کر وہ دروازہ کھولا جو بالکنی میں کھلتا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ پھر اس نے اپنی دھان پان سی بیوی کو اٹھا کر باہر پھینک دیا..... تم لوگ جانتے ہو..... میرا فلیٹ چھٹی منزل پر ہے' دوستو! میں اس کے علاوہ کیا کر سکتا تھا کیونکہ میں نے تم سے سوگند کھائی تھی کہ اپنی بیوی کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔''

☆☆

آتش زادہ

تیمور افراسیاب

وقت بہت تبدیل ہو چکا ہے۔ زمانہ جدید میں ماورائے عقل واقعات صرف قصے کہانیوں کی حد تک محدود ہو گئے ہیں لیکن یہ حقیقت صدیوں سے تسلیم کی جاتی ہے کہ عقل و دانش سے پرے ایک پُراسرار دنیا کا وجود ہے' جس کے شواہد گاہے گاہے ملتے رہتے ہیں۔ جدید سائنس اور دنیا کے ترقی یافتہ ترین ممالک میں مافوق الفطرت حیات کو بھرپور تسلیم کیا جاتا ہے اور وہاں سے بھی لاتعداد واقعات سننے کو ملتے ہیں۔ زیرِ نظر داستان بھی ایک ایسے ہی نوجوان کی ہے' جو ننھی سی عمر میں ہی دشمنوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ پھر آتشی مخلوق نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا اور اس کے بعد اس نے وہ گل کھلائے کہ......!!!

عمران ڈائجسٹ کا حیرت انگیز و پُرتجسس سلسلہ

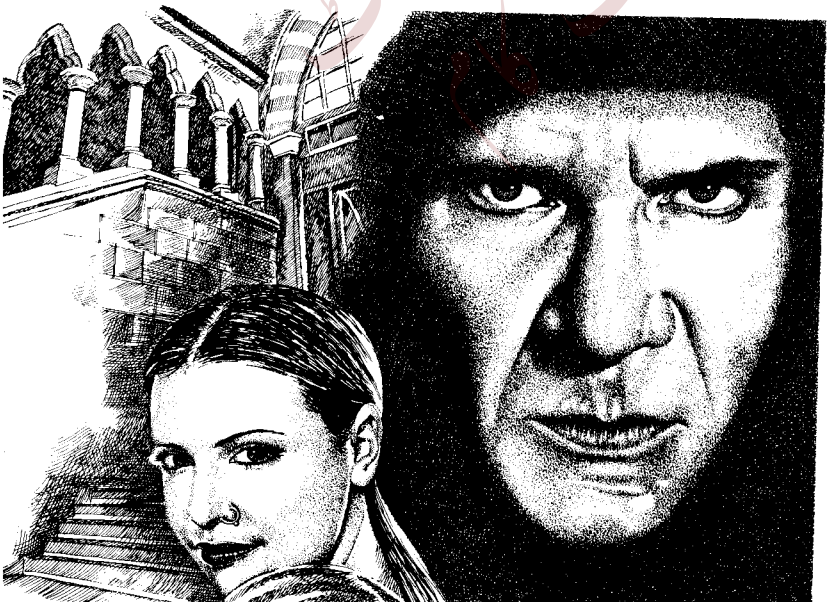

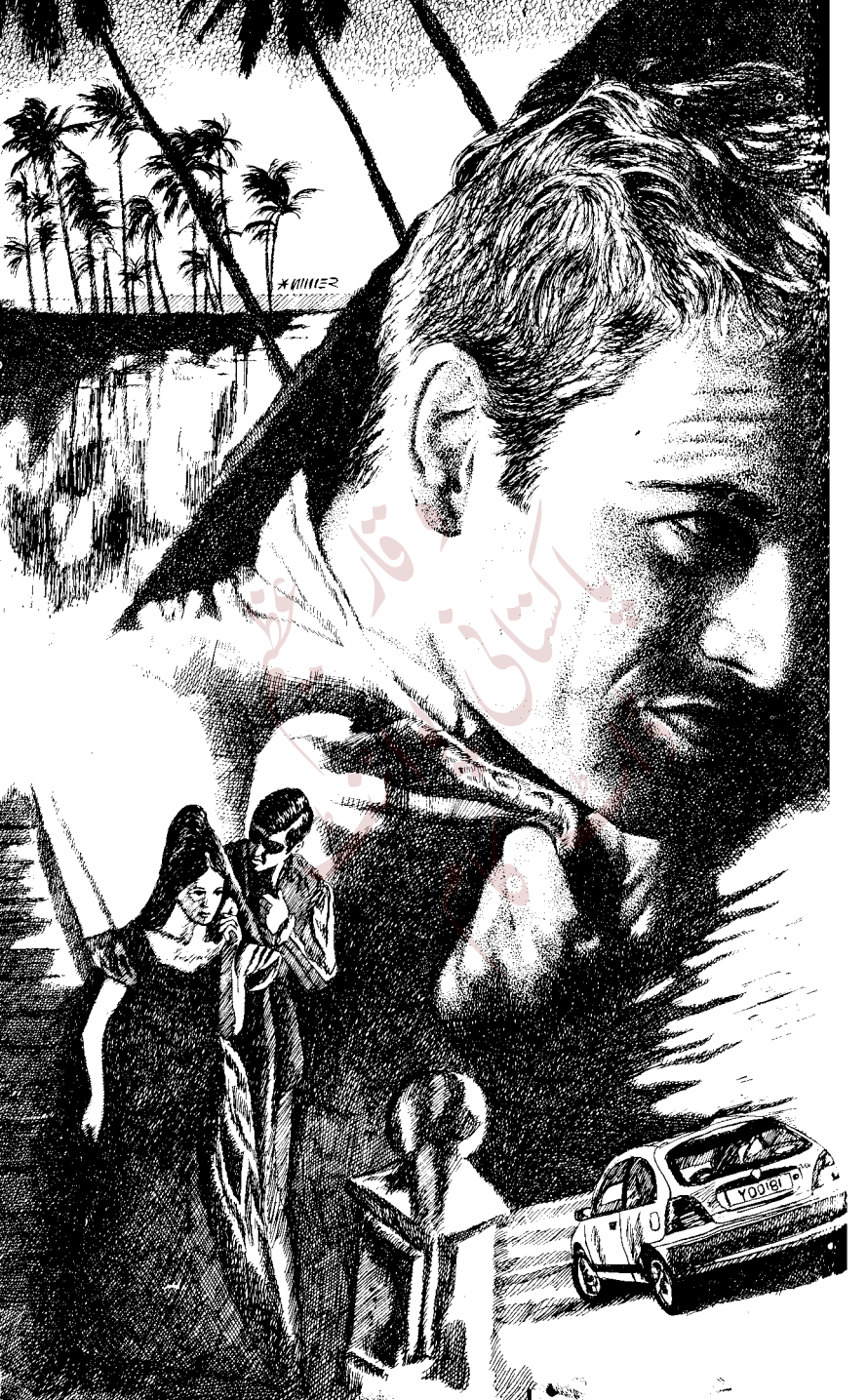

نئے پڑھنے والوں کے لیے

عظیم الدین کی موت عجیب سے حالات میں ہوئی تھی' بہت سے شبہات تھے مگر کسی نے تحقیقات نہیں کرائی تھیں۔ ان کے بیٹے ظہیر الدین کی فطرت میں نرم خوئی تھی۔ ماں سخت گیر تھی' جنھوں نے اپنی مرضی سے اپنے بھائی کی بیٹی عالیہ طاھرہ سح اس کی شادی کردی تھی۔ ظہیر الدین نے کراچی میں فرم قائم کی تو زیادہ وقت شہر میں ھی گزرنے لگا۔ عالیہ طاھرہ نے بھی شہر جانے کی بات کی تو سلطانہ ھارونہ نے منع کردیا۔ ظہیر الدین ایک رات واپس آرھے تھے کہ ان کی ملاقات دو خواتین سے ھوئی۔ ان میں ایک کوثر' دوسری اس کی والدہ..... اس کی والدہ کی طبیعت خراب تھی' وہ اسپتال پھنچ کر دم توڑ گئی تو ظہیر الدین نے کوثر کو سھارا دے دیا۔ یوں شہر میں ان کی زندگی خوشگوار گزرنے لگی۔ ان کے بیٹے ھمایوں نے ان کے گھرانے کو مکمل کردیا تھا پھر نہ جانے کیسے ان تمام معاملات کی خبر عالیہ طاھرہ کو ھوگئی۔ اس نے اپنی ساس سلطانہ ھارونہ کو بتا دیا' اس نے رحمت خان کو بلا بھیجا اور اس کے ذمے یہ کام لگایا کہ کوثر کو قتل کردے۔ ایک روز ظہیر الدین گھر پھنچا تو رحمت خان کوثر کو قتل کرچکا تھا اور واپس جارھا تھا' ظہیر الدین نے اس پر قابو پالیا تو اس نے انکشاف کیا کہ اس نے یہ قتل اس کی ماں کے کھنے پر کیا ھے اور اس کے والد کو بھی اسی نے قتل کیا تھا۔ بھرحال ظہیر الدین نے اسے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے پاس جاپھنچا۔ ھمایوں خو اس کی ماں نے اپنے پاس بلوا لیا تو عالیہ طاھرہ کے دل و دماغ میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے لاگن کو بلوایا اور ھمایوں کو قتل کرنے کا فریضہ اسے سونپ دیا۔ لاگن نے ھمایوں کو اغواء کیا اور بھت دور ایک ندی میں بھا دیا۔ ھمایوں کو جس جگہ پھینکا گیا' وہ اس جگہ سے ندی میں بھتا ھوا ایک ایسی جگہ پھنچ گیا' جھاں ایک جوڑے نے اسے بچا لیا۔ اس جوڑے کا تعلق آتشی مخلوق سے تھا۔ ایک پورا قبیلہ اس جگہ آباد تھا۔ پھلے تو اس بات کی مخالفت کی گئی کہ ایک آدم زاد اس جگہ پر پرورش پائے لیکن پھر اس بات کی رضامندی ظاھر کردی گئی۔ پھر اس کی تربیت کاسلسلہ شروع ھوگیا۔ جب وہ ذرا ھوش مند ھوا تو فیصلہ کیا گیا کہ اسے انسانی آبادی میں بھیج دیا جائے' جھاں وہ اپنے لیے زندگی گزارنے کی راہ چن سکے۔ چنانچہ اسے بھت سے علوم سے واقف کرایا گیا۔ بھت سے علوم تحفے کے طور پر دیے گئے اور پھر ایک روز وہ انسانی آبادی کے لیے چل پڑا۔ یھاں اس کی ملاقات مرزا فرحت بیگ سے ھوئی جو اسے اپنی کوٹھی میں لے آئے۔ جھاں ان کی بیٹی ایک پراسرار بیماری میں مبتلا تھی۔ انھیں اشارہ ملا کہ اس بیماری کو ھمایوں دور کرسکتا ھے۔ ھمایوں نے اس سلسلے میں اپنی کتاب سے مشورہ طلب کیا۔ اس میں لکھا تھا۔ "چلے جائو اور قدرت کی رھنمائی کا انتظار کرو' جانا ضروری ھے" ھمایوں نے مرزا فرحت بیگ کی بیٹی نوشیہ کے حالات معلوم کیے تو پتا چلا کہ اس پر ایک جن زادہ عاشق ھے جو اسے پریشان کررھا تھا۔ ھمایوں نے اس سے مقابلہ کیا اور بھگا دیا پھر وہ وھاں سے چل پڑا مگر راستے میں طوفانی بگولے نے اسے گھیر لیا اور اسے ایک انجان جگہ پر پھنچا دیا۔ یھاں جنوں کی ایک آبادی تھی جو اسے لے کر آئے تھے۔ وھاں دربار لگا اور ھمایوں کو بے قصور قرار دے دیا گیا۔ زارم جاہ کو حکم دیا گیا کہ وہ ھمایوں سے معافی مانگے اور اسے اس کی منزل تک چھوڑ کر آئے لیکن زارم جاہ کینہ پرور جن تھا۔ اس نے ھمایوں کو ایک زھریلی بوٹی گھول کر پلا دی جس سے ھمایوں کی پیاس میں اضافہ ھوگیا اور پھر..... ھمایوں ان رستوں پر چل پڑا جو اسے اندھیروں میں لے جاتا تھا۔

اب آپ آگے پڑھیں۔

''تیرا ستیاناس جو میں کہہ رہا ہوں میری بھی مان لے۔ ہے بھگوان کیا کروں ایسی پاگل عورت سے واسطہ پڑا ہے۔''

''ارے تو اب میں کیا کروں مجھے بتاؤ؟''

''کرے گی کیا۔ کرے گی کیا۔ میں تو تجھے بتلا رہا ہوں کہ یہ سپنا نہیں تھا۔ بھگوان کی قسم جھوٹ نہیں بول رہا تجھ سے..... آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سینے پر ایک کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا ہوا ہے۔ پھر اس نے مجھ سے نہ جانے کیا کیا کہا اور میں سنتا رہا..... اس کے بعد وہ میری چھاتی پر سے اتر کر دروازے کی جانب چل پڑا۔''

''ہائے رام اگر یہ سچ ہے تو کیا کریں اب' گھر میں کوئی کالا ناگ آ گھسا ہے' دیکھو کیا ہوتا ہے۔ کسے کیسے ڈستا ہے۔ سارا بھوسا جل کر راکھ ہو گیا۔ بیل الگ بھوکے مریں گے۔ اب کہاں سے لاؤ گے یہ بھوسا؟''

''بھگوان جانے مگر تھا سانپ ہی اس کا مطلب ہے کہ میں نے سپنا نہیں دیکھا مگر کچھ عجیب سی باتیں من میں آ رہی ہیں۔ اس سمے جب وہ میرے سینے پر کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔''

''اب پاگل ہونے کی کسر اور رہ گئی ہے۔ وہ بھی ہو جاؤ' مجھے نیند آ رہی ہے۔ سونے دو۔''

''تو جا جا سو جا مر..... میرا تو تو نے ساتھ دیا ہی نہیں کبھی''

''اری پگلی محنت مزدوری کرتا رہا ہوں' بول کبھی نکھٹو ہو کر بیٹھا' اب کیا کروں بھگوان نے جتنا بھاگ میں لکھ دیا ہے۔ اتنا ہی تو ملے گا۔''

''ہمارے بھاگ تو پورے ہو گئے مگر ان چاروں کا کیا ہو گا۔؟''

''ارے ہو گا کیا جو ہو گا بھگوان جانے میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ جا جا بابا جا کر سو جا۔ میرا دماغ خراب کر رہی ہے''

دکھیا رام کی بیوی بلکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ صورتحال کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ دکھیا رام ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اب اس کے بعد دوبارہ نکل کر اس کے سامنے جانا مناسب نہیں تھا۔ بیچارہ آدھی سے زیادہ رات تک وہیں بیٹھا رہا اور پاگلوں کی طرح سوچتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دماغ میں میری باتیں ہوں گی۔ پہلے تو وہ انہیں خواب سمجھا تھا اور پھر اس خواب کی تصدیق کرنے کے لیے باہر نکل آیا تھا اور اسے میرے بدن سے بننے والی لکیریں نظر آ گئی تھیں۔ شکر ہے کہ ان لکیروں کا سہارا لے کر وہ ان جھاڑیوں تک نہیں پہنچا ورنہ پھر کوئی ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے۔ البتہ جب وہ اندر چلا گیا تو میں نے سوچا کہ یہاں رُکنا مناسب نہیں ہے۔ دن کی روشنی میں یہاں سے نکل کر کھیتوں تک جانا مشکل کام ہو گا۔ ویسے بھی بستی سے سانپ سانپ کی خبر اُڑ چکی ہے۔ اس لیے بستی والے الگ اس چکر میں ہوں۔ چنانچہ اس وقت نکل جانا بہتر ہے۔ رات کی تاریکیوں میں چاندنی کے نیچے کھیتوں تک سفر کرنا بہت اچھا لگا۔ دکھیا رام کے کھیتوں کا راستہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ چنانچہ میں ان بے آب و گیاہ کھیتوں تک پہنچ گیا۔

پھر دن کی روشنی میں میں نے چند لمحات ادھر ادھر آہٹیں لیں۔ آس پاس کسی کا وجود نہیں تھا۔ اس کے بعد میں دکھیا رام کا انتظار کرنے لگا۔ دن نکلا' سورج چڑھنے لگا اور پھر سورج عروج پر پہنچ گیا۔ دکھیا رام کھیتوں پر نہیں آیا تھا' مجھے غصہ آنے لگا۔ کم بخت اپنی تقدیر کو خود دھکا دے رہا ہے تو میرا کیا ہے۔ لیکن پھر میں نے چونک کر دیکھا دور سے دکھیا رام آتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ قریب پہنچ گیا' ہونٹوں پر بڑبڑاہٹ تھی۔

''ہے بھگوان اگر دماغ میں سچ مچ خرابی ہو گئی ہے تو تیا پانچا کر دیتا کیوں سسکا سسکا کر مار رہا ہے۔ اگر وہ سپنا نہیں تھا تو پھر ہائے رام.....''

اچانک ہی وہ اچھل پڑا اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی تھی۔ میں کنڈلی مارے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ دکھیا رام چند لمحات ساکت نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ

جوڑ کر میرے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔

''ناگ مہاراج بھگوان کی سوگند میں پاگل نہیں ہوں۔ اس وقت میری آنکھیں بھی کھلی ہوئی ہیں۔ دماغ بھی ٹھیک کام کر رہا ہے تمہیں بھگوان کی سوگند مجھے بتا دو کیا رات کو میرے گھر میں تم ہی تھے اور کیا تم ہی نے یہ بات کہی تھی کہ میں کھیتوں پر پہنچ جاؤں یا پھر سچ مچ پاگل ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے بھی تم تم نہیں ہو۔ بلکہ کچھ میرا دھیان ہے۔''

میرا خیال ہے دل تو چاہا کہ اس سے کہوں کہ دکھیا رام نہ یہ تیرا دھیان ہے نہ تیرا خیال ہے۔ میرے ساتھ آ جا لیکن زبان ہی نہیں تھی کہتا کیا البتہ آنکھوں کے ذریعے پیغام رسانی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ بدبخت میری جانب دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں اپنا پھن زمین پر ڈالتے آہستہ آہستہ ایک جانب رینگنے لگا۔ دکھیا رام کو یاد آ گیا تھا کہ میں نے اس سے کیا کہا تھا چنانچہ ایک لمحے تک وہ وہیں رکا رہا پھر جب اس نے رک کر اس کی جانب دیکھا تو وہ میرے پیچھے کچھ بڑبڑاتا ہوا آنے لگا لیکن اس کی آواز مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

تاکہ وہ چلنے میں دقت نہ محسوس کرے۔ دکھیا رام اب کسی سحر زدہ شخص کی مانند میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ میں کھنڈرات میں داخل ہو گیا' دکھیا رام ایک لمحے کے لیے پریشان ہو گیا' وہ اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں سے واقعی کوئی سمجھ دار آدمی اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا لیکن میں رک کر اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بدنصیب کم بخت میری آنکھوں کی طرف دیکھ تاکہ میں تیرے ذہن کے گوشے روشن کر دوں لیکن دیکھ ہی نہیں رہا تھا وہ..... میں نے رک کر اسے دیکھا اور اس کے بعد پھر آگے بڑھا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ البتہ اس وقت اس کی بڑبڑاہٹ مجھے سنائی دے گئی وہ کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ناگ مہاراج ٹھیک ہے' اگر تم مجھے موت کی طرف لے جا رہے ہو تو تب بھی بھگوان کی سوگند تمہاری بات مانوں گا۔''

میں کلسوں کے پاس جا کر رک گیا۔ دکھیا رام نے بھی کلسے دیکھے اور اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

''ہے بھگوان یہ کیا ہے؟''

میں نے پھن اٹھا کر کلسے پر سے وہ چھوٹے چھوٹے ڈھکن گرا دیئے جس سے وہ کلسے ڈھکے ہوئے تھے۔ دکھیا رام نے تیزی سے جھانکا اور اسے گنیاں نظر آ گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی سانس ہی رک گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان گنیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر زور سے اپنے بدن کو نوچا اور اس کے بعد لرزتا ہاتھ کلسے میں ڈال دیا۔ مٹھی میں گنیاں بھریں اور انہیں چہرے کے قریب کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے اسے کسی کا خوف ہو۔ میری طرف دیکھا۔ گنیاں واپس کلسے میں ڈال دیں اور عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی لیکن میں یہی چاہتا تھا کہ وہ میری جانب دیکھے تاکہ اسے آئندہ کے لیے ہدایت کر دوں۔ میں نے فوراً ہی اپنی آنکھوں میں اس کی آنکھیں جکڑ لیں اور وہ آہستہ آہستہ ساکت ہوتا چلا گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

''دکھیا رام ان دونوں کلسوں میں گنیاں بھری ہوئی ہیں۔''

''یہ دولت میری طرف سے تیرے لیے ہے لیکن اب اسے سنبھال کر اپنے گھر تک لے جانا اور اس کے بعد اس طرح استعمال کرنا کہ بستی والوں کو تجھ پر شک نہ ہو۔ تیری ذمہ داری ہے۔ کیا سمجھا میں اس سے زیادہ تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''

میں نے دکھیا رام کا ذہن آزاد کیا اور رینگتا ہوا اس جگہ سے باہر چل پڑا جدھر سے یہاں آیا تھا۔

سچ مچ اس سے زیادہ میں اس کے لیے کر ہی کیا سکتا تھا۔ اب وہ جانے اور اس کا کام لیکن ایک خیال میرے دل میں ضرور پیدا ہوا تھا کہ دیکھوں تو سہی کہ دکھیا رام مہاراج اب اس عظیم دولت کے حصول کے

لیے کیا کرتا ہے اور یہ دلچسپ تجربہ ہے درحقیقت اس فاصلہ لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر طے کرنا آسان کام نہیں تھا۔

پھر دکھیا رام کے ہاں سانپ دیکھا جا چکا تھا۔ اس لیے بھی خطرہ تھا کہ کہیں جگہ جگہ اس کی تلاش نہ ہو۔ پھر بھی چھپنے کے لیے دو ٹھکانے موجود تھے میرے پاس..... ایک سامان کا وہ انبار جو اُلٹا سیدھا سامان بے شک تھا لیکن میرے لیے نہایت کارآمد دوسرے جھاڑ جھنکار کے درمیان وہ جگہ جہاں سب سے میں دکھیا رام کے گھر میں آ کر چھپا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ دولت سچ مچ عقل بھی دے دیتی ہے اور انسان کی تمام سادگی رخصت ہو جاتی ہے۔ دکھیا رام مہاراج نے جو کچھ کیا وہ بہت دلچسپ تھا۔ گھر آئے تو یوں لگتا تھا جیسے اس کی جوانی لوٹ آئی ہو۔ اپنے احاطے کے ایک گوشے میں زمین کھودنے لگے۔ کافی کھدائی کر ڈالی۔ مٹی کے انبار لگا دیئے۔ دھرم پتنی جی نے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم.....؟''

''چپ ہو جا جو کچھ میں کر رہا ہوں بس خاموشی سے مجھے کرنے دے' میں آج سے ناگ دیو کا داس بن گیا ہوں۔ یہاں ناگ دیو مندر بنا رہا ہوں''

''ارے آخر تمہارے اوپر یہ ناگ دیو کیوں سوار ہو گیا ہے''

''دیکھ انجانی ناگ دیوتا کی شان میں اگر ایک لفظ بھی غلط کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں ناگ دیو کا پجاری بن چکا ہوں' اور آج سے تم لوگ مجھے ناگ دیو کا پجاری کہو گے''

''بس اب یہ ہی کسر رہ گئی ہے۔ ناگ دیو کا پجاری بنا رہ گیا تھا۔ بن جاؤ اور تو کسی کام کے رہے نہیں.....''

دونوں پتی پتنی میں خوب لڑائی ہوئی اور پتنی جی منہ پھلا کر اندر جا بیٹھیں مگر دکھیا رام نے اپنا کام جاری رکھا۔ چاروں بیٹوں کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ مٹی کا دائرہ بنایا اور اس سے ایک عجیب و غریب چیز تیار کرنے لگا۔ بس کچھ ایسی ہی کارروائیاں کر رہا تھا۔ وہ جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن بعد میں سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔

اس نے ایک ایسی جگہ بنا دی جسے مندر کی قسم کا کہا جا سکتا تھا۔ لیکن بس تین چار فٹ اونچی جگہ تھی۔ اس کے آگے وہ چوڑا گڑھا جس میں سے مٹی نکالی گئی تھی۔ پھر اس گڑھے کو اس نے لکڑیوں سے پاٹ دیا۔ اس پر گھاس پھونس ڈالی اور وہاں دھونی مار کر بیٹھ گیا۔ لڑکیاں ہنس رہی تھیں اور دکھیا رام کی دھرم پتنی ملنے جلنے والوں سے کہہ رہی تھی کہ اب دماغ ہی خراب ہو گیا' لوگ افسوس بھی کر رہے تھے کہ دھن' دولت کی وجہ سے بیچارہ دکھیا رام پاگل ہی ہو گیا۔ میں خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ دکھیا رام جی نے کیا چکر چلایا ہوا ہے۔ اس ساری جگہ کو انہوں نے جس مقصد کے لیے بنایا تھا' وہ رات کو میرے علم میں آیا۔

آدھی رات کا وقت تھا اور میں اس جھاڑ جھنکار کے نیچے کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ کہ میں نے چونک کر دیکھا۔ دکھیا رام ایک کلہاڑا کاندھے پر لادے دوسرا بغل میں دبائے ڈولتے آ رہے تھے اور اس کے بعد انہوں نے اپنے لیے ایک جگہ بنائی تھی۔ وہاں اس گڑھے کے اوپر سے گھاس اور لکڑیاں ہٹائیں اور کلسے اس کے اندر چھپا دیئے۔ لکڑیاں اسی طرح برابر کیں اور پھر اس پر اس طرح دھونی مار کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور بن گئے دکھیا رام ناگ پجاری۔ مجھے بہت لطف آ رہا تھا' دکھیا رام کی اس چالاکی پر اس کے بعد میں نے خاصے دن وہاں چھپ چھپ کر گزارے۔ دکھیا رام کو کام کرتے ہوئے دیکھا۔

شہر گیا تھا اور اس کے بعد لدا پھندا گھر واپس آ گیا تھا۔ لازمی بات ہے۔ گنیاں بیچنے گیا ہوگا۔ گھر میں خوشیاں اتر آئیں البتہ اس کے کردار میں ایک خاص خوبی دیکھی میں نے کہ اپنے مریل بیلوں کے لیے بھی اس نے وہیں اسی جگہ ہر طرح کی بہتری کا انتظام کر لیا تھا۔ برے وقت کے ان ساتھیوں کو اس

نے اپنے آپ سے دور نہیں کیا تھا اور انکی دیکھ بھال بھی اسی طرح ہونے لگی تھی۔ چند روز میں نے یہاں گزارے۔ اب یہاں رکنا بے کار تھا۔ ایک اور ایسا کام ہوا تھا۔ جس سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ دکھیارام نے پہلا قدم جو اٹھایا ہے وہ ایسا ہے کہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کے جال میں نہیں پھنسے گا اور زندگی کی گاڑی کو آرام سے آگے دھکیل لے جائے گا۔

ایسے لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں جنہیں انگلی پکڑ کر چلایا جاتا ہے۔ دکھیارام کو دولت حاصل ہوگئی تھی۔ اس نے اس کا صحیح استعمال شروع کردیا۔ میرا یہاں رکنا اب بے معنی تھا۔ ایک ناگ پجاری یہاں چھوڑے جارہا تھا۔ پھر میں نے وہ آبادی چھوڑ دی اور رینگتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ زندگی کی یہ گاڑی کتنی دور تک جاسکتی ہے۔ میں اس تکلیف کے عالم میں کہاں تک اپنے آپ کو گھسیٹ سکتا ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا تھا۔ ہر چند کہ جسمانی طور پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ جب تک تھکتا نہ تھا۔ چلتا رہتا تھا۔ پھر کوئی بھی جگہ تلاش کرلیا کرتا تھا۔

پھر ایک دن میں نے ایک بیل گاڑی دیکھی جسے ایک آدمی ہانک رہا تھا۔ چھکڑے میں اوپر تک سبزیاں بھری ہوئی تھیں۔ بس یونہی دل چاہا کہ بیل گاڑی پر چڑھ جاؤں۔ تیز تیز آگے بڑھا۔ اب باقاعدہ سانپ تو تھا نہیں۔ گاڑی پر چڑھ نہ سکتا۔ ذرا ہوشیاری سے ایک ایسی جگہ سے اوپر چڑھ نہ سکتا۔ ذرا ہوشیاری سے ایک ایسی جگہ سے اوپر چڑھ گیا۔ جہاں سے مشکل نہ ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ سبزیوں کے درمیان چھپ کر بڑا سکون محسوس ہوا تھا اور اس کے بعد میں ان سبزیوں ہی میں پڑ کر سو گیا تھا۔

نہ جانے کب تک سوتا رہا۔ پھر اچانک کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی بہت سے انسانوں کی آوازیں آرہی تھیں، میں چونک کر جاگ اٹھا اور ایک جگہ سے موقع پا کر سر اٹھا کر دیکھا۔ بڑی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ غالباً بازار تھا جو شخص سبزی لے کر یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے بیل کھول کر ایک درخت سے باندھ دیئے تھے۔ زمین پر چادر بچھا رہا تھا۔ ایک لمحے میں صورت حال کا اندازہ ہوگیا۔ کوئی سبزی فروش ہے جو اپنے کھیتوں سے سبزی لے کر آیا تھا اور اب یہاں دوکان لگا کر اسے بیچے گا۔

چند ہی لمحات کے بعد وہ سبزی چھکڑے سے اتار دے گا اور اس سے پہلے کہ سبزی میں میری موجودگی کا شور مچ جائے، عقلمندی کا تقاضا یہ ہی تھا کہ میں یہاں سے رفو چکر ہوجاؤں، کچے پکے مکانات کا ایک وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور رینگ کر گاڑی کے نیچے آگیا۔ لوگوں کی نگاہیں بچا کر کوئی ایسی جگہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ جہاں وقت گزار سکوں۔ ویسے تو یہ درخت بھی تھا۔ جہاں بیل بندھے ہوئے تھے۔ میں درخت پر بھی چڑھ سکتا تھا اور اس وقت اس بھیڑ بھاڑ میں یہی سب سے مناسب موقع تھا۔ البتہ میں درخت پر چڑھا تو بیلوں نے بڑی اچھل کود مچائی تھی لیکن میں موقع پا کر خاصا اونچا چلا گیا۔

سبزی والے نے دو تین سونٹے بیلوں کے لگائے اور بیچارے بیل خاموش ہوگئے۔ وہ سانپ کی نشاندہی بھی کرنا چاہتے تھے مگر شکر تھا ان کی زبان نہیں تھی۔ ورنہ ایک بار پھر ہنگامہ شروع ہوجاتا۔ میں درخت پر کافی بلندی پر چلا گیا اور اس سے تھوڑے فاصلے پر درخت کی شاخیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ میں اس ہنگامے سے بچنے کے لیے شاخوں شاخوں ہوتا ہوا دوسرے درخت پر پہنچا۔ پھر اس درخت سے جڑے ہوئے ایک اور درخت پر، یہ دلچسپ تھا۔

یہ درختوں کا سفر، بلندیوں کا سفر کرتے ہوئے میں بازار سے کافی دور نکل آیا۔ پھر جس درخت پہنچا وہ ایک گھر کے آنگن میں تھا۔ گھر کا خاصا بڑا اور اس گھر کے مکین رہتے تھے۔ یہاں بڑا سکوت خاموشی اور سناٹا تھا۔ میں ایک مضبوط شاخ دیکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اچھی جگہ تھی اور درخت بھی کافی قدیم تھا

اس میں داڑھیاں نکلی ہوئی تھیں۔ یہ برگد کا درخت تھا اور جگہ جگہ سے کھوکھلا بھی تھا۔ میرے چھپنے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں تھی۔

چنانچہ میں یہاں آرام سے وقت گزاری کرنے لگا۔ دل ہی دل میں ہنسی بھی آ رہی تھی کہ دیکھو یہاں اب کون سی کہانی شروع ہوتی ہے۔ زندگی کا اور کوئی مقصد اب سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا اور پھر اگر کوئی کوشش بھی کرتا تو اب تو بالکل ہی راستے مسدود ہو گئے تھے۔ شری مان سنگھ نے صحیح معنوں میں جو کچھ کہا تھا۔ اسے ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ غور کیا جاتا تو صرف یہ ہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اپنا آلہ کار بنایا تھا۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے اور جب میں نے اس کی مرضی سے ذرا بھی انحراف کیا تھا تو اس نے اپنی قوتوں کا استعمال کر کے مجھ سے میری تمام زندگی چھین لی تھی۔

نہیں۔ شرمان سنگھ چیلا ہوں میں آپ کا۔ مانتا ہوں اس بات کو کہ بہت کچھ دیا ہے لیکن اب جو احساس دلایا ہے آپ نے وہ یہ ہے کہ آپ نے مجھے دیا نہیں بلکہ مجھ سے لے سب کچھ لیا ہے۔ اب بھی اگر آپ کی عزت کروں اور آپ کے لیے من میں جگہ تلاش کروں تو یہ عقل کی بات نہیں ہے۔

خیر سارا جیون تو اس طرح گزرے گا نہیں اس جیون کا کہیں نہ کہیں انت ہوگا اور جب انت ہوگا تو اس کے بعد میری سوچ کے دائرے بدل چکے ہوں گے اور اس کے بعد میں وہ کروں گا جو آپ کے خیال میں بھی نہ آئے۔ بھشم کا بدن ہے میرے پاس۔ بیاس کی عقل ہے۔ تو کیا اتنا بھی نہ سوچ پاؤں گا کہ آپ کی برائی کا بدلہ آپ کو کیسے دوں؟

دل ہی دل میں سلگتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ کچھ کر تو سکتا نہیں تھا، جب بدن پر سے کہولت زائل ہوئی تو اس مکان کے مکینوں کو دیکھا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو صحن میں کھیلتے پھر رہے تھے، مفلوک الحال گھرانہ معلوم ہوتا تھا۔ ابھی یہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ باہر سے ایک گیارہ بارہ سال کی لڑکی آئی اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ پھر ایک ادھیڑ عمر عورت ایک شخص کو سہارا دے کر باہر لائی اور اس درخت کے نیچے کھڑی ہوئی ایک چارپائی بچھا دی گئی تھی اس پر چادر ڈال دی اور اس کے بعد عورت نے لڑکی کو آواز دی۔

''جابلالا''

لڑکی باہر چلی گئی اور عورت اس اندرونی حصے میں جہاں سے وہ آئی تھی۔ اپنے ساتھ وہ کھیلنے والے بچوں کو بھی واپس لے گئی تھی۔ تین چار آدمی اندر آئے۔ ایک نوجوان لڑکے کو ساتھ لائے تھے جو شاید بیمار تھا۔ چارپائی پر بیٹھے ہوئے شخص نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک تسبیح نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ جس کے وہ دانے گھمانے لگا۔ آنے والوں نے جھک جھک کر سلام کیے تو اس شخص نے تسبیح پر پھونک ماری اور ان لوگوں کو دیکھنے لگا پھر اس کی نظر لڑکے پر پڑی اور وہ اسے گھورنے لگا۔

ان لوگوں نے لڑکے کو بٹھا دیا تھا۔ لڑکا ادھر ادھر گردن مار رہا تھا۔ تب چارپائی پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

''ہوں تو یہ بات ہے۔ یہاں آتے ہوئے بھی تمہیں یہ خیال نہیں تھا کہ مولوی فتح خان کے ہاں جا رہے ہو۔ میں کہتا ہوں۔ اس گھر میں تمہیں داخل ہونے کی جرات کیسے ہوئی۔ بولو ..... بولو..... بولو.....''

چارپائی پر بیٹھے ہوئے شخص کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ جو لوگ اسے ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے گردنیں جھکا لی تھیں۔ مولوی فتح خان نے آواز دی۔

''اری قندیل گلاس میں پانی لے آ.....'' قندیل اسی لڑکی کا نام تھا۔ جس نے باہر آ کر اطلاع دی تھی کہ کوئی آیا ہے۔ وہ لڑکی گلاس میں پانی لے آئی۔ مولوی فتح خان اس پانی پر کچھ پڑھتے رہے اور اس کے بعد انہوں نے ہاتھ میں پانی لے کر اس لڑکے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ لڑکا خاموشی سے بیٹھا رہا۔

کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد مولوی فتح خان نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لے پانی پی لے۔'' اور لڑکے نے گلاس ہاتھ سے لے کر وہ پانی پی لیا' مولوی فتح خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''ہاں' اب آئے ہو میاں راہ راست پر ہاں بھئی سومرو کیا بات ہے؟''

''اب آپ کو کیا بتائیں مولوی صاحب' آپ نے تو خود ہی دیکھ لیا۔ کیا حالت ہو جاتی ہے''

''ہوں' ٹھیک ہے۔ ایسا کرو میاں وہ حکیم سعید علی صاحب ہیں ناں' انہیں بھی دکھا ہی دو۔ دوا دارو ضروری چیز ہوتی ہے اور ہم تمہیں کچھ فلیتے دیتے ہیں' انہیں جلاؤ شفا ہو گی''

''اب تو اس کی حالت کافی بہتر نظر آ رہی ہے۔'' آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''ہاں یہاں آ کر تو شکل ہی بدل گئی ہے۔'' یہ الفاظ سومرو کے تھے۔

''مولوی صاحب آپ کا دم غنیمت ہے۔ ہماری بستی میں.....'' ایک اور نے کہا۔

''بس میاں کسی کی کوئی خدمت ہو جائے تو سمجھ لو بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ اچھا تو تم یوں کرو کچھ نذر نیاز کے لیے پیسے دے جاؤ اور کل کچھ چیزیں لے کر آ جانا۔ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔''

مولوی فتح خان نے کچھ چیزیں بتائیں جو میری سمجھ میں نہیں آ سکتی تھیں۔ ان لوگوں نے عقیدت سے گردن جھکا دی۔ مولوی صاحب نے صدری کی جیب سے کچھ نکال کر دیا اور مٹھی میں دبا کر سومرو کے حوالے کر دیا۔

پھر وہ لوگ چلے گئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہی لڑکی جس کا نام قندیل لیا گیا تھا۔ آگے بڑھی اور دروازہ بند کر آئی۔ پھر اندر سے وہ عمر رسیدہ عورت باہر نکلی جو مولوی فتح خان کو سہارا دے کر یہاں لائی تھی۔ ویسے مولوی فتح علی خان اپاہج تھا۔ اس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے کٹی ہوئی تھی اور وہ بیساکھی لگا کر چلتا تھا۔ اس وقت وہ خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ عورت اس کے پاس پہنچی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ رقم نکالی اور عورت کی جانب بڑھاتا ہوا بولا۔

''کہیں نہ کہیں سے انتظام ہو ہی جاتا ہے۔ رشیدہ اب دیکھنا تم کہہ رہی تھیں کہ آٹا دال نہیں ہے۔ کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ آج میرا خیال ہے ہفتے بھر کا بندوبست تو ہو گا۔ کل بھی کچھ نہ کچھ آئے گا۔ چلو کہیں نہ کہیں سے مولا بھیج ہی دیتا ہے۔''

عورت کا نام رشیدہ لیا گیا تھا۔ افسردہ نظر آنے لگی۔ بولی۔

''دیکھو یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ فتح خان دیکھو یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ فتح علی خان۔ کسی بیمار کو شفا نہ دے سکو تو جھوٹا دلاسا بھی نہ دو۔''

''ارے کیا فضول باتیں کر رہی ہو رشیدہ میں نے یہ بھی تو کہہ دیا ہے کہ حکیم صاحب کو دکھا دیں لیکن تم نے فوراً ہی ان لوگوں پر چھوٹی باتیں بھی تو لادنی شروع کر دیں تھیں۔ کیا پڑھا تھا تم نے اس پانی پر؟''

''دیکھو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ رشیدہ فضول باتوں سے گریز کیا کر۔ کیا کروں بول کیا کروں؟ اگر یہ سب کچھ نہ کروں تو بھوکا ماروں بچوں۔ اپاہج ہوں ارے ٹانگ کٹ گئی۔ بتاؤ اب کیا کر سکتا ہوں۔ دو کوڑی کا ہو کر رہ گیا۔ اللہ نے اولاد بھی دی تو سب سے بڑی بیٹی چار پیسے کما کر بھی نہیں لا سکتی۔ بھوکے مر جاؤ گے تم سب دیکھو رشیدہ مجبوری ہے۔ میرا دل خود دکھتا ہے۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے۔ لیکن ذرا باہر نکلو۔ چار پیسے مانگ لو کسی سے منہ ٹیڑھا کر کے پاس سے نکل جائے گا۔ میرے سگے بھائیوں کو ہی لے لو۔ ان سے زیادہ مذاق اڑانا ہے۔ ہمارا کوئی۔ ایک سے ایک کمینہ ہے۔ آدھا سیر آٹا تو کوئی دے نہیں سکتا۔ بس باتیں بنانے کے لیے سب

آ جاتے ہیں۔ دیکھو کسی نے پلٹ کر پوچھا کہ کیا حال ہے تم لوگوں کا؟''

''پیٹ بھرا ہے یا بھوکے مر گئے۔ نہیں رشیدہ بیگم مجبوری کا نام شکر یہ جو کچھ کر رہا ہوں مولا جانتا ہے کہ مجبوری کے عالم میں کر رہا ہوں۔''

''تمہیں پتا ہے کہ ایسے الٹے سیدھے چکر نقصان دہ بھی ہو سکتے ہیں؟''

''کیا نقصان دیں گے؟''

''بچوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے''

''مولا کی مرضی میں کسی کا کیا دخل..... اگر بچوں کو اس طرح نقصان پہنچتا ہے تو پہنچ جائے بھائی۔ ویسے بھی تو نقصان پہنچ رہا ہے انہیں۔ پیٹ میں روٹی نہ ہوگی تو ویسے ہی مر جائیں گے۔ بے چارے۔ رہنے دے رشیدہ بہت پچھو کے نہ لگا۔ میرے دل پر بس جو ہو رہا ہے۔ وہی ہونے دے۔ اب تو دیکھنا انسان بھائیوں پر کتنا بھروسا کرتا ہے۔ مگر اس وقت تک جب تک ماں باپ کی کمائی ہوتی ہے جہاں یہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونا شروع ہوئے۔ سب کی شان ہی نرالی ہو جاتی ہے۔ ہر ایک سینہ تان کر اپنے آپ کو تیس مار خان کہتا ہے۔ ایک دوسرے کی پرواہ نہیں کرتا۔ بیوی بچوں کے پھیر میں پڑ جاتے ہیں۔ ساری کے سارے یہ بھول جاتے ہیں کہ کبھی راتوں کو ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال کر سوتے تھے۔ اب تو بتا کون ہے میرا کون ہے۔'' مولوی صاحب کی آواز بھاری ہوگئی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کی بیوی بھی آزردہ ہوگئی تھی اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔

''اے اللہ ہماری مشکل حل کر' کیا کریں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تو نے کہا ہے۔ بھوکا اٹھائے گا' بھوکا سلائے گا نہیں۔ ہماری طرف سے کیوں آنکھیں بند کر لی ہیں؟''

''توبہ کر توبہ..... رشیدہ بیگم توبہ کر ارے آنکھیں بند کی ہیں۔ یہ دیکھ اس میں ہفتے بھر کا آٹا اور دال آ جائے گی۔ کہاں آنکھیں بند کی ہیں اس نے''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس گفتگو سے حالات کا کچھ اندازہ ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی مسلمان گھرانہ تھا۔ مولوی فتح علی خان اپاہج ہو گیا تھا اور اس کے بعد اس نے یہ جھاڑ پھونک کا دھندہ شروع کر لیا تھا۔ صاحب ضمیر لوگ تھے۔ دل سے اس کام کو برا سمجھتے تھے۔ مگر مجبوریاں آڑے آتی تھیں۔ چل بھائی پھر کوئی چکر چلا۔ اچھے ہیں۔ یہ سارے دھندے برے نہیں ہیں لیکن اب چکر کیا ہو سکتا ہے؟ کیا اس میں وقت گزرتا رہے گا اور وہ بھی ایک کیڑے مکوڑے کی حیثیت سے؟ جسم اپنا ہوتا اس میں توانائی ہوتی تو ہاتھ پیروں سے بھی بہت کچھ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب اس عالم میں اب ہر جگہ تو کھنڈرات ہیں نہیں۔ جہاں سے سونے کے کلسے نکال لیے جائیں گے۔ اب ان لوگوں کے لیے کیا کیا جائے۔

میں نے اس درخت پر بسیرا کر لیا کسی کی توجہ درخت پر نہیں جاتی تھی۔ درخت کے کھوکھلے تنے میں میرے لیے کافی جگہ موجود تھی۔ جہاں سے میں باہر کے مناظر بھی دیکھ سکتا تھا۔ بعد میں کچھ اور تفصیلات بھی معلوم ہوئیں۔

مولوی فتح خان بابا بے ساکھی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے اور بہت سے لوگوں کا علاج بھی کر چکے تھے۔ ان لوگوں نے خود اعتراف کیا تھا کہ انہیں کچھ بھی نہیں آتا بس الٹی سیدھی جھاڑ پھونک کر کے کام چلا لیا کرتے ہیں اور یہ کام وہ بحالت مجبوری کرتے ہیں۔

پھر ایک دن صبح ہی صبح ایک دلچسپ صورتحال پیش آ گئی۔ کچھ لوگوں نے اس وقت دروازہ بجایا تھا۔ جب گھر کے مکین سو رہے تھے۔ دروازہ بہت زور زور سے بجایا گیا تھا اور چونک کر دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟'' تو شاید باہر سے کچھ آواز سنائی دی۔ رشیدہ کی آواز میرے کانوں میں ابھری۔

''کیا کام ہے؟''

باہر سے جو آواز آئی اس پر میں نے خود ہی توجہ

دی تھی کہا گیا تھا۔

''مولوی صاحب سے ملنا ہے۔''

''کون ہیں آپ؟''

''ان سے کہہ دو کہ ٹھاکر بلونت رام کے ہاں سے ان کے آدمی آئے ہیں۔''

''اچھا کہے دیتی ہوں۔''

عورت واپس مڑ گئی۔ پھر کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب کو اس طرح سہارا دے کر لایا گیا۔ چارپائی جو کھڑی ہوئی تھی۔ بچھادی گئی اور مولوی صاحب اس پر بیٹھ گئے۔ پھر لڑکی قندیل نے جا کر دروازہ کھولا۔ دھوتی اور کرتے میں ملبوس چار پانچ آدمی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''مولوی صاحب میرا نام سوہنا سنگھ ہے۔ ٹھاکر بلونت رام کے ہاں سے آیا ہوں''

''حویلی والے ٹھاکر.....؟''

''ہاں..... ہاں ٹھاکر بلونت رام کو..... کوئی ایسا بھی ہے جو نہ جانتا ہو۔ پر کیا بات ہے بھیا؟ صبح ہی صبح پریشانی ہو گئی؟''

''وہ اپنے شلونت رام جی ہیں ناں..... ٹھاکر بلونت رام جی کا اکلوتا بیٹا۔''

''ہاں ہاں جانتا ہوں اسے.....'' مولوی صاحب نے کہا۔

''سانپ نے کاٹ لیا ہے اسے تین چار دن سے تھالی بج رہی ہے اور دور کے سپیرے آ گئے ہیں۔ پر کوئی بھی سانپ کو بلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کسی نے آپ کا کہا ہے۔ ٹھاکر جی سے''

''مگر بھائی ہم سے اب چلا پھرا نہیں جاتا جائیں گے کیسے''

''بیل گاڑی بھیجی ہے۔ ٹھاکر جی نے کہا ہے مولوی صاحب جس طرح بھی ہو سکے انہیں لے کر آؤ۔''

''ہاں ہاں ہم تیار ہیں۔ ذرا منہ ہاتھ دھولیں۔ اری قندیل لوٹے میں پانی لائیو'' مولوی صاحب نے ہاتھ منہ دھویا۔ میرے دل میں ایک دم سے یہ تصور جاگا تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے ذرا میں بھی مولوی صاحب کے ساتھ جاؤں۔ دیکھو ذرا کیا چکر ہے اور باہر جانے کا راستہ تو تھا ہی۔ میں درختوں کی شاخوں پر رینگتا اوپر چڑھا مولوی صاحب کے باہر نکلنے میں ابھی ذرا دیر تھی۔ بہر حال میں باہر پہنچا تو میں نے وہ بیل گاڑی دیکھی۔ جو دروازے کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ دو طاقتور بیل جتے ہوئے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں اس بیل گاڑی تک پہنچوں کیسے؟

میں چند لمحات سوچتا رہا آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے درخت کی شاخ سے بیل گاڑی پر چھلانگ لگا دی اور پھر رینگ کر اس کے نچلے حصے میں پہنچ گیا۔

جانوروں میں بڑی سمجھ بوجھ ہوتی ہے۔ بیل کنوتیاں بدلنے لگے۔ وہ اچھل کود مچا رہے تھے اور ان کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں تیزی سے بج رہی تھیں۔ تب اندر سے دو آدمی باہر نکل آئے ان میں سے ایک گاڑی بان تھا۔ اس نے بیلوں کی راسیں پکڑیں اور انہیں سنبھالنے لگا۔ پھر وہ بولا۔

''ارے پاپیو کیوں اچھل کود کر رہے ہو؟ ٹھیک سے کھڑے رہو۔ چلتے ہیں ابھی.....'' پھر ان میں سے ایک نے ان کی دمیں پکڑ رکھیں اور دوسرا اندر چلا گیا۔ مگر بیلوں کے اوسان خطا تھے۔ پتہ نہیں میری بو سونگھ رہے تھے یا انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اچھل کود ہی مچاتے رہے۔ البتہ مجھے بیل گاڑی کے نچلے حصے میں ایک بہت اچھی جگہ مل گئی تھی۔ جہاں میں آرام سے گھس کر بیٹھ سکتا تھا۔ سو میں نے اپنے بدن کو سکیڑ کر وہیں اپنے لیے جگہ بنالی۔

میں مزے سے بیل گاڑی پر سفر کر رہا تھا۔ لیکن کمبخت بیلوں کو شاید میری موجودگی کا علم تھا۔ ایسے جان توڑ کر بھاگ رہے تھے کہ میرا بدن بار بار پھسل جاتا تھا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے مجھے اپنے جسم خاصا سخت کرنا پڑا تھا۔ لیکن شکر تھا کہ سفر بہت زیادہ لمبا نہیں تھا۔

ایک بڑی سی حویلی کے احاطے میں بیل گاڑی داخل ہوئی اور جیسے ہی بیل گاڑی اندر رکھی۔ میرے کانوں نے عجیب سی بے ہنگم سی آوازیں سنیں۔ پتا نہیں کیا چیز بجائی جارہی تھی۔ لوگوں کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا تھا' بیل گاڑی ایک جانب کھڑی کردی گئی اور اس کے بعد لوگ مولوی صاحب کو اتارنے لگے۔ جو کچھ تھا سامنے ہی تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے باہر کا منظر دیکھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ ادھر سے ادھر جارہے تھے۔ اندر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں نے مولوی صاحب کے لیے راستہ چھوڑ دیا ہے۔

مجھے ان لوگوں کے درمیان ایک نوجوان لڑکا پلنگ پر لیٹا ہوا نظر آیا اور میں نے بخوبی اس کا جائزہ لیا۔ وہ سانپ کے کاٹے کا شکار تھا اور اس کا رنگ نیلا پڑا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب ان کے پاس پہنچ گئے۔

''کیا بات ہے ٹھاکر بلونت رام جی؟''

''مہاراج کی حالت تو ٹھیک نہیں ہے۔ مولوی صاحب میں بتاتا ہوں''

''ہاں..... بتاؤ بھائی''

''تین دن پہلے شلونت رام کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ مولوی صاحب یہ حالت ہے اس کی۔ سارے وید طبیب دیکھ دیکھ کر جاچکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سانپ کے کاٹے کا علاج یہ ہی ہوسکتا ہے کہ جس سانپ نے کاٹا ہے۔ وہ آئے اور اس کا زہر چوس لے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ بڑی بڑی دور سے سپیرے بلوائے گئے ہیں۔ یہ دیکھ لیجئے۔ تین دن سے تھالی بج رہی ہے۔ بہت سے سپیرے ہر طرح کی کوشش کرچکے ہیں۔''

''نجانے کیا کیا جادو منتر کیے ہیں۔ پر سانپ ہے کہ آتا ہی نہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں وہ کہنے لگے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ۔ ان سپیروں کو تو تم نے دیکھ ہی لیا۔ سارے جادو منتر بے کار ہوگئے ہیں۔ ان کے اب ایسا کرو۔ ذرا مولوی صاحب کو اور دکھادو۔ آج کل بہت نام سن رہے ہیں ان کا۔ جو کوئی بھی ان کے پاس جاتا ہے صحت مند ہوکر واپس آتا ہے۔''

''مولوی صاحب! آپ ہماری بستی کے آدمی ہیں۔ ٹھاکر بلونت رام بھی جس قسم کے آدمی ہیں' آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے کبھی ہندوؤں کو تکلیف دی ہے نہ مسلمانوں کو۔ ہم لوگ بھائی چارے سے رہ رہے ہیں اور پھر آپ بھی بال بچے والے ہیں۔ آپ کو پتا ہے ٹھاکر جی کا ایک ہی بیٹا ہے۔ شلونت رام جیون مدن کے پھیر میں ہے۔ مولوی صاحب جی۔ کچھ کرسکتے ہیں تو آپ بھی کیجئے۔ ٹھاکر صاحب بن موت مرجائیں گے۔ پورا پریوار تباہ ہوجائے گا۔ شلونت رام کے دم سے یہ سارا دھندا چل رہا ہے۔''

مولوی فتح علی خان اب کچھ پریشان سے نظر آرہے تھے۔ یہ تو میں سن ہی چکا تھا کہ وہ بنے ہوئے درویش ہیں۔ میری دلچسپیاں حد سے زیادہ ہوگئیں تھیں۔ مولوی صاحب لرزتی ہوئی آواز میں بولے۔

''اصل میں ٹھاکر جی۔ یہ بات بالکل الگ ہے یہ تو جادو منتر والوں کا کھیل ہے۔ یہ اتنے بڑے سپیرے بیٹھے ہوئے ہیں یہ کچھ نہیں کرسکے ابھی تک''

''کہا ناں تین دن سے تھالی بجارہے ہیں۔ ایک بستی کا بڑا سپیرا بڑے بڑے ناگوں سے لڑ چکا مگر اس کا کہنا کچھ اور ہی ہے۔''

میں نے چیلا رام کو دیکھا۔ کالا سیاہ رنگ۔ بڑی بڑی نوکیلی مونچھیں سرخ سرخ آنکھیں لمبا چوڑا قد' خود بھی کالا ناگ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی شیطانیت چھائی ہوئی تھی۔ غصے میں بھرا ہوا بیٹھا تھا کہنے لگا۔

''ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کوئی مان ہی نہیں رہا ہم کیا کریں؟''

''کیا کہا تم نے چیلا رام'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''جس سانپ کو شلونت رام نے کاٹا ہے۔ وہ خود

بھی جیتا نہیں مہاراج مر چکا ہے۔ ورنہ چیلا رام زمین کھود کر اسے نکال لیتا چیلا رام کو کیا سمجھتے ہیں آپ؟''

''ہم تین دن سے بین بجا رہے ہیں۔ تھالی بجا رہے ہیں۔ سانپ جیتا ہوتا ضرور آجاتا۔ وہ خود بھی کسی طرح مر چکا ہے۔ مار دیا ہوگا کسی نے اب کوئی دوسرا سانپ تو آنے رہا۔''

''تت' تو پھر اس کا کیا علاج ہوتا ہے؟''

''سارے علاج کر لیے اب ہم نے اب ہم کیا کہیں؟ صرف مہاراج کا من بہلا رہے ہیں ورنہ.....'' چیلا رام خاموش ہوگیا۔

''بھگوان نہ کرے۔ بھگوان نہ کرے۔ ایسی بات نہ کر چیلا رام میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ ورنہ ورنہ.....''

''ہمیں جان سے مارنے سے کیا ہوگا۔ ٹھاکر جی بس اب دیکھ لو۔ یہ مولوی صاحب آئے ہیں۔ ان کو پکڑو دیکھو یہ کیا کرتے ہیں۔''

ٹھاکر اپنی جگہ سے اٹھا اور مولوی صاحب کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ''مولوی صاحب ایک ہی بیٹا ہے میرا۔ ایک ہی بیٹا۔ دین دھرم کو بھول جایئے۔ جو کچھ بھی ہوسکتا ہے کیجئے۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔ آپ کو ہمارے بھگوان کا واسطہ۔''

''ٹھاکر جی! جان دے کر بھی آپ کے کام آجاتا تو اس سے اچھی بات اور کوئی نہ ہوتی۔ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پانی منگوا دیجئے ایک گلاس۔'' مولوی صاحب کے انداز میں بیچارگی تھی۔ وہ بس اپنا فرض پورا کرنا چاہتے تھے۔ جب تین سپیرے مل کر یہ سب کچھ نہ کر سکے تو مولوی صاحب بیچارے کیا کرتے۔ البتہ میری تیز نگاہیں۔ شلونت رام کا جائزہ لے رہی تھیں۔

سانپ کے کاٹے کا شکار..... میں تو اس سلسلے میں تجربہ رکھتا تھا۔ ناگ رانی نے کاٹا تھا۔ سنتا نے کاٹا تھا۔ اس آدم کو جس کا نام بھی اتفاق سے دھیارام ہی تھا اور میں نے اس کا زہر چوس کر اسے زندگی دی تھی۔ اس وقت میں انسانی شکل میں تھا۔

''ارے واہ..... یہ تو مزہ آگیا۔ اگر شلونت رام سانپ کے کاٹے کے زیر اثر ہے تو میں تو اس کا زہر آسانی سے چوس سکتا ہوں۔ دیکھو ہوسکتا ہے مولوی صاحب کی تقدیر بدل جائے۔ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ البتہ ذرا انتظار ضروری تھا۔'' سپیروں نے تھالی بجانا بند کر دی تھی۔

کچھ دیر کے بعد پیتل کے ایک کٹورے میں پانی آگیا۔ مولوی صاحب اس پر کچھ بڑبڑانے لگے۔ پھر انہوں نے پانی میں ہاتھ ڈالا اور اس کے چھینٹے لڑکے پر مارنے لگے۔

نوجوان لڑکا تھا۔ کوئی بیس اکیس سال کی عمر ہوگی۔ پانی اس کے بدن پر مارنے کے بعد مولوی صاحب نے وہی پانی لے کر ادھر ادھر چھڑکا۔ تمام لوگ ساکت ہوگئے تھے۔ اندر سے رونے کی آوازیں بھی بند کرا دی گئی تھیں۔ بس اب موقع تھا کہ میں منظر عام پر آجاؤں۔ حالانکہ بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔ میں ہوسکتا ہے بعد میں یہ ہی لوگ میرے اوپر ہی ٹوٹ پڑیں۔ لیکن اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ جان سے تو مارنے سے رہے مجھے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

مولوی صاحب اپنے عمل سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ میں خاموشی سے بیل گاڑی سے نیچے اتر آیا اور اس کے بعد رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ہی لوگوں کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکلنی شروع ہوگئیں۔ سارے کے سارے ڈر کے مارے پیچھے پیچھے ہٹ گئے تھے اور میرے لیے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ میں نے مولوی صاحب کو دیکھا' وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں پانی کا پیالہ تھا' جو لرزنے کی وجہ سے چھلک رہا تھا۔ وہ پانی خود ان کے اوپر ہی گر رہا تھا۔

ٹھاکر بلونت رام اور جوان کے حوادی تھے۔ وہ بھی پیچھے ہٹ گئے تھے میں شلونت رام کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کی ران کے پاس وہ زخم دیکھا جو

سانپ کے کاٹے کا زخم تھا اور پھر میں نے اپنا منہ اس کے زخم پر رکھ دیا۔ اس کے جسم میں زہر بھرا ہوا تھا۔ میں نے وہ سارا زہر چوس لیا اور دیکھنے والوں نے یہ ہی دیکھا کہ شلونت رام کے جسم کی نیلاہٹ سرخی میں بدلتی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ میرے منہ میں اس کے خون کے قطرے آنے لگے۔ گویا سارا زہر اس کے جسم سے ختم ہوگیا تھا۔ بس اتنا ہی کرنا تھا مجھے۔ میں پیچھے ہٹا اور ایک لمحے کے لیے وہاں رہا۔ پھر برق رفتاری سے واپس پلٹ پڑا۔

یہ سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ کیونکہ ہوسکتا تھا اس دوران کوئی میری طرف متوجہ ہوجائے اور میرا تعاقب کرنے کی کوشش کرے۔ میں شلونت رام کے پاس سے ہٹ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ شکر ہے کسی نے پیچھا نہیں کیا۔

وہ سب سکتے کے سے عالم میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ اپنے چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔ باہر لوگ موجود نہیں تھے۔ سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ ان حالات میں مجھے سفر کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

فی الحال مولوی صاحب کے گھر ہی آ گیا اور چھپتا چھپاتا برگد کے درخت پر چڑھ گیا۔ یہاں میرے لیے انتہائی بہترین جگہ موجود تھی۔ درخت میں ایسے سوراخ بھی تھے۔ جہاں سے باہر دیکھا جاسکتا تھا اور وہاں کی باتیں بھی سنی جاسکتی تھیں بہرحال جو خوشی مجھے یہ کام سرانجام دے کر محسوس ہوئی تھی۔ وہ ان خوشیوں سے مختلف نہیں تھی۔ جو دھیا رام کی مشکلات دور کرنے سے حاصل ہوئی تھی۔

مولوی صاحب بیچارے جن حالات کا شکار تھے ہوسکتا ہے ان میں کچھ تبدیلیاں ہوجائیں۔ خاصا وقت انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں نے ان کے بیوی بچوں کو بہت پریشان دیکھا تھا۔ باہر ہی سب مولوی صاحب کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فتح علی خان کی بیوی بار بار بلند آواز میں دعائیں مانگنے لگتی تھیں۔

''الٰہی خیر کرنا میں پہلے ہی منع کرتی تھی کہ جانتے وانتے کچھ نہیں ہیں بلاوجہ کے پیر بن بیٹھے ہیں۔ پکڑ لیا جس دن بھوت وغیرہ نے تو گردن مروڑ کر پھینک دے گا۔ جیسے بھی ہیں' میرے بچوں کے سر کا سائبان ہیں۔ خیر کرنا الٰہی.....'' پھر وہ بچوں پر برسنے لگی۔ ''ارے بیٹھے بیٹھے کھسر پھسر کیے جارہے ہو۔ میں کہتی ہوں ہاں اٹھا کر دعائیں مانگو۔ اللہ تمہارے ابا کو سلامت رکھے انہیں خیر سے واپس لائے۔''

بہرحال ابا خیر سے واپس آ گئے۔ باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بے ساکھی ٹیک کر چل رہے تھے۔ بیوی نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا' دیکھنا چاہتی تھیں کہ کہیں ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی۔ لیکن سب ٹھیک تھا مولوی صاحب نے آنے والے کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

''جاؤ بھائی بہت بہت شکریہ''

''مولوی صاحب آپ نے جو کیا ہے اس سے بستی کی تاریخ بدل گئی ہے۔ ہندو مسلمانوں میں ایسی دوستی ہوگی کہ مثال بن جائے گی۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو میاں! ہم نے تو جو کچھ کیا ہے' نیک نیتی سے کیا ہے۔ بس اللہ کا شکر ہے کہ بلونت کے گھر رام کا چراغ روشن ہوگیا۔ ارے اس سے زیادہ خوشی ہمیں اور کسی بات کی ہوسکتی ہے۔ اللہ ہمیشہ اس کے گھر کے چراغ روشن رکھے۔''

مولوی فتح خان کی بیوی حیرت بھری نظروں سے مولوی صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے وہ چارپائی بچھادی۔ جو مولی صاحب کی مخصوص چارپائی تھی اور وہ چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''کیا ہوا۔ کیا ہوگیا؟''

''ارے کیا ہونا تھا۔ تو سوچ بھی نہیں سکتی' رشیدہ جو ہوگیا' سو ہوگیا۔ بس سمجھ لے اللہ نے سن لی۔ جب وہ دیتا ہے ایسے ہی دیتا ہے۔ قربان جاؤں اپنے مولا کے۔ ارے زندگی بن گئی ہماری سارے دکھ دور ہوگئے۔''

''خواب دیکھ کر آئے ہو کیا مولوی صاحب؟''

''بک بک کیے جا رہی ہو۔ سنو تو سہی کیا ہوا؟''

''سناؤ..... سناؤ' ہماری تو زبانیں سوکھ گئیں تمہارے لیے دعائیں کرتے کرتے۔''

''کیوں نہیں' کیوں نہیں۔ تیری اور تیرے بچوں کی دعائیں ہی تو کام آئی ہیں رشیدہ''

''ہوا کیا؟''

''کیا ہونا تھا۔ ٹھاکر جی کے بیٹے شلونت رام کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اب تم ان لوگوں کے ٹونے ٹوٹکے تو جانتی ہی ہو۔ میت رکھی ہوئی تھی۔ مر چکا تھا بے چارہ' نیلا پڑا ہوا تھا۔ پورے بدن میں زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ جو ہوتے ہیں نا سپیرے' باگی' باگی جو کہلاتے ہیں۔ تھالی بج رہی تھی۔ بین بج رہی تھیں۔ تین دن گزر چکے تھے مگر بلونت رام کا من نہیں مانتا تھا کہ بیٹا مر چکا ہے۔ آس لگی ہوئی تھی۔ قربان جاؤں اپنے مولا کے' میرے لیے ہی یہ سربلندی لکھی تھی اس نے۔ بلونت رام قدموں میں گر پڑا کہ مولوی صاحب ہمارے گھر کا چراغ بجھنے سے بچالو۔ بس جی! مولوی صاحب' بے چارے تو میرے فلاش ہاں اللہ سے لو ضرور لگائی اور تو سچ جان' رشیدہ اس وقت دل میں کوئی لالچ نہیں تھا۔''

''یہ لالچ نہیں تھا کہ بلونت رام کا بیٹا ہماری وجہ سے ٹھیک ہو جائے گا تو کچھ انعام واکرام ملے۔ یہ لالچ بالکل نہیں تھا۔ بلکہ سچی بات تھی اس وقت دُکھی دل کا آدمی دیکھتا۔ خود بھی بال بچوں والے آدمی ہیں۔ سچے دل سے دعا نکلی تھی۔ ہمارے منہ سے الٰہی ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ لاج رکھنے والا تو ہے۔ بس پانی لیا' پڑھا' چار چھینٹے مارے۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے ادھر ادھر چھینٹے مار دیئے۔ بس پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ یہ لمبا' کئی ہاتھ لمبا اور یہ چوڑا ناگ کالا ناگ' دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور یقین کرو رشیدہ خود ہمارا دل دھڑکنا بند ہو گیا تھا۔ ہم نے سوچا بھیا ایک پھنکار بھی ماردی اس نے تو ہم پانی ہو جائیں گے۔ مگر بات وہی تھی رشیدہ دل سے نکلی تھی پوری ہو گئی۔''

''سانپ نے شلونت رام کے زخم سے منہ لگا کر جو زہر پیا تو یوں لگا جیسے رنگ ہی بدلتا جا رہا ہے۔ سر سے نیلاہٹیں اتریں تو پاؤں سے باہر تک آ گئیں سارا زہر چوس لیا اس نے اور جیسے ہی وہ زہر چوس کر باہر نکلا' بلونت رام بھیا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پانی مانگا۔''

''بس پھر کیا تھا۔ اسے پانی پلایا گیا اور وہ جو سپیرے آئے تھے۔ ایسے جل بھن کر کباب ہو گئے کہ ان کا منہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بلونت رام نے کلیجے سے لگالیا۔ سارے کے سارے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور رشیدہ تو ہوتی تو بھی رو پڑتی۔ اس وقت یہ دیکھ کر جسے دیکھو تیرے اس غریب لاچار شوہر پر دیوانہ وار نثار ہو رہا ہے۔ نہ جانے کیا کیا باتیں کر ڈالیں لوگوں نے۔ پر دیکھ ہم نے تو ان سے یہی کہا کہ مارنے سے بچانے والا بہت بڑا ہوتا ہے۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ بس دعا کی تھی کہ بلونت کے گھر کا چراغ روشن رہے۔ بس بھیا ہم نے کہا' کہ بلونت رام اب یہ بھیڑ بھاڑ ہٹاؤ اور بچے کو اندر لے جاؤ۔ ہمیں جانے دو۔''

''بلونت رام کہنے لگا کہ مولوی صاحب میرے..... میرے گھر کا چراغ..... روشن کیا ہے۔ میں آپ کے گھر میں دیوالی کروں گا۔ آپ جائیں' آرام سے جائیں اور پھر بڑے احترام سے ہمیں واپس کر دیا گیا۔''

''کچھ دیا لیا نہیں؟'' رشیدہ بیگم نے پوچھا۔

''ارے چھوڑ رشیدہ ہمیں اس سے بڑی دولت اور کیا مل سکتی ہے کہ اتنی عزت ہوئی۔ اتنا احترام کیا گیا۔ ہمارا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اتنی عزت ہوئی اتنا احترام کیا گیا۔ ہمارا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ بلونت رام کا بیٹا ٹھیک ہو گیا۔ روٹی اور دو کپڑے چاہیے ہوتے ہیں۔ یہ تو اللہ دے ہی دیتا ہے۔ مگر ایسی سچی خوشی اگر مل جائے تو سمجھ لے کہ اللہ نے سب کچھ دے دیا۔ دعا پوری ہو گئی ہماری۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔''

رشید بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں اور اس

کے بعد وہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا تھا۔ بلونت رام نے اچھا نہیں کیا۔ بے چارے مولوی صاحب کو کچھ دینا چاہیے تھا' خیر کوئی بات نہیں۔ کم از کم مولوی صاحب کے اندر انسانیت تھی۔

رات ہوگئی اور پھر رات گزر بھی گئی۔ دوسرا دن نکل آیا۔ ایک دو آدمی مولوی صاحب کے پاس دعا تعویذ کرانے آئے تھے۔ ایک صاحب ایک برتن میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے کر آئے تھے۔ جس پر رومال ڈھکا ہوا تھا۔ بس یہی مولوی صاحب کا ذریعہ معاش تھا۔ لیکن سورج چڑھا ہی تھا کہ اچانک باہر سے آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ زور سے دروازہ بجھا..... دروازہ کھولا گیا اور میں نے دیکھا کہ ٹھاکر بلونت رام اپنے بیٹے شلونت اور اپنی دھرم پتنی اور کئی دوسرے آدمیوں کے ساتھ دروازے کے اندر داخل ہوگیا۔ مولوی صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جلدی سے بے ساکھی سنبھالی تو بلونت رام دوڑتا ہوا آیا اور مولوی صاحب کے شانوں کو سہارا دے کر بولا۔

''بیٹھے رہیں مولوی صاحب بیٹھے رہیں''

''وہ آپ نے کیوں تکلیف کی..... کک..... کوئی بات ہوگئی ہم..... مجھے بلالیا ہوتا ہم..... میرے گھر میں تو ب..... بیٹھنے کے لیے..... کک..... کچھ بھی نہیں ہے۔ ارے رشیدہ' ارے قندیل چادر ہی لے آؤ۔ چادر ہی بچھا دو یہاں پر۔''

چادر لائی گئی اور ٹھاکر بلونت رام بڑے احترام کے ساتھ چادر پر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ بھی بیٹھ گئے۔ مولوی فتح علی خان نے شلونت رام کو دیکھا۔

''ادھر آؤ بیٹا۔ میں تیری پیشانی چوم لوں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں بلونت رام ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا بیمار بیٹا ٹھیک ہوگیا ہو۔''

''ہمیں تو صرف اس بات کا افسوس ہے مولوی صاحب کہ ہمارے اپنے گھر میں ہماری بستی میں اتنی بڑی شخصیت موجود ہے اور ہم اس کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ آپ اس عالم میں زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں مولوی صاحب کہ میں ایک بہت خود غرض اور مطلبی آدمی ہوں۔ جب اپنے اوپر پڑی تو دوسرے بارے میں سوچا۔ مولوی صاحب! آپ نے جو مجھ پر احسان کیا۔ بس میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں احسان کو کیسے اتاروں''

''ارے چھوڑو بلونت رام۔ اولاد' اولاد سب کی اولاد ہوتی ہے اور ہر صاحب اولاد کو دوسرے کی اولاد کے لیے اچھے ہی جذبات رکھنے چاہئیں۔''

''اللہ والے ہیں ناں آپ بھگوان نے آپ کو اتنا کچھ دیا ہے کہ آپ کو دوسری چیزوں کی چنتا نہیں ہے مگر ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔ مولوی صاحب! ایک چھوٹی سی بھینٹ دینے آئے ہیں۔ آپ کو بہت چھوٹی سی..... بھینٹ سویکار کرلیں ہمارے اوپر احسان ہوگا''

''نہیں' نہیں بلونت رام جی اس کے بدلے میں کچھ نہیں لوں گا بس میں نے کہہ دیا تم سے..... ارے کیا ہے۔ دو روٹی کی بات ہے ناں کہیں نہ کہیں سے بندوبست ہو ہی جائے گا۔ اپاہج ہوگیا ہوں' لاچار ہوگیا ہوں ورنہ محنت مزدوری کر کے ساری زندگی گزار دی۔ اب ذرا حالات خراب ہوگئے ہیں مگر کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہوجائے گا''

''یہ تو آپ کہہ رہے ہیں ناں مولوی صاحب! میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ مجھ پر بھی تو کچھ فرض بنتا ہے ناں۔ سنیں مولوی صاحب! آپ کو شلونت رام ہی کی قسم ہے جو کچھ میں بھینٹ کر دیا ہوں اس سے انکار مت کریں''

''ارے بلونت رام کیا قسم دلا دی۔ کیا دے رہے ہو۔ بتاؤ مجھے ذرا'' مولوی صاحب نے بے پروائی سے کہا۔

''مولوی صاحب وہ میرا شمال والا باغ ہے ناں' آٹھ بیگھے پر پھیلا ہوا ہے شاید آپ کو پتہ ہو سونا لگتا ہے سونا اور میں نے اپنے شلونت رام پر سے سونا ہی وار دیا ہے۔ وہ باغ میں آپ کے نام لکھ رہا ہوں۔

اس کے علاوہ مولوی صاحب آپ کے رہنے کے لیے باغ کے کنارے پر ہی ایک گھر بنا ہوا ہے' وہ بھی میں نے آپ کے نام کر دیا ہے۔ یہ میری دھرم پتنی آپ کے بیوی بچوں کے لیے کچھ گہنے لائی ہے۔ بچیاں ہیں آپ کی ان کے کام آئیں گے۔ یہ سویکار کیجیے''

ٹھاکر صاحب کی دھرم پتنی نے ایک پوٹلی مولوی صاحب کے سامنے رکھ دی۔ مولوی صاحب کو تو سکتہ ہو گیا تھا۔ سونت رام نے ایک اور رومال مولوی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور اس میں تھوڑی سی رقم ہے۔ بس یہ لائے ہیں ہم آپ کے لیے وہ باغ آپ کے لیے جیون بھر کام دے گا۔ آپ کے بچوں اور ان کے بچوں کے کام آئے گا۔ آپ کو معلوم ہی نہیں شمال والے باغ کی کیا کیفیت ہے۔ بڑا پھل اترتا ہے اس سے اور بہت بڑی آمدنی ہے اب آپ زمیندار ہو گئے ہیں' مولوی صاحب''

مولوی صاحب اس طرح منہ کھولے بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ محسوس ہوتا تھا کہ بدن کی جان نکل گئی ہے۔ بری طرح سٹپٹائے ہوئے تھے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ بلونت رام نے کہا۔

''اور آپ کو اب بالکل بھی چنتا نہیں کرنی چاہیے یہ سب دیکھ بھال ہم کریں گے۔ بھاگ دوڑ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ آپ کو چار آدمی کام کرتے ہیں اس باغ میں۔ بڑے آرام سے ان کی بگار نکل جاتی ہے۔ یوں سمجھ لیں یہ سارے کام ہمارے منشی جی ہی کرلیا کریں گے۔ آپ بس اس کی آمدنی سنبھال لیا کریں۔''

''مولوی صاحب! اچھا اب ہمیں آ گیا دیں''

مولوی صاحب کچھ نہ بولے تو بلونت رام نے اٹھ کر ان کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

''مولوی صاحب چپ کیوں ہو گئے؟''

''ہاں..... ایں کچھ بھی نہیں۔ بس ایسے ہی یہ سب' یہ سب؟''

''ہاں یہ سب آپ کا ہوا۔ آپ نے ہمارا چراغ روشن کیا ہے۔ ہم نے کل ہی آپ سے کیا کہا تھا کہ آپ کے گھر میں دیوالی کر دیں گے۔ مولوی صاحب' بھگوان کا شکر ہے کہ آپ نے اپنا قول نبھایا' اچھا اب اجازت دیں''

بمشکل تمام مولوی صاحب نے بلونت رام سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد وہ سب ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ رشیدہ بیگم بچے سارے کے سارے یوں کھڑے ہوئے تھے مولوی صاحب پر ایسا جوش طاری ہوا کہ اپنی جگہ سے بھاگنے کی کوشش کی اور دھڑام سے گر پڑے۔

''ارے ارے کیا کر رہے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ اللہ کی نیکی آپ کے کیا دوڑ پڑے تھے۔'' رشیدہ بیگم نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا اور مولوی صاحب عجیب سے انداز میں ہنس پڑے۔

''ارے رشیدہ بیگم ایک پاؤں گیا تھا۔ ہزار پاؤں لگ گئے' دیکھا کہا تھا ناں تجھ سے کہ ایک دن گھورے کی بھی پھرے گی۔ ارے پھر گئی ہماری پھر گئی۔ رشیدہ بیگم ارے بچو! آؤ میرے کلیجے سے لگ جاؤ۔ ارے سب کے وارے نیارے ہو گئے۔''

مولوی صاحب کی خوشیاں بام عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ سارا گھر یہ سب کچھ پا کر دیوانہ ہو گیا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ کہیں انہیں شادی مرگ نہ ہو جائے۔ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ بیچارے مولوی صاحب کی ایک ٹانگ نہیں تھی' ورنہ وہ بھی رقص کرتے اور درخت کے اس چوڑے تنے کے سوراخ میں بیٹھ کر میرا دل بھی رقص کر رہا تھا۔ کسی انسان کو اتنی خوشیاں میرے ذریعے مل جائیں۔ میری زندگی کا اس سے بڑا مصرف اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

لعنت ہے۔ شری مان سنگھ پر لعنت ہے۔ اس پر کہ اس نے مجھے خوشیوں سے اتنی دور کر دیا ہے لیکن بہرطور کوئی نتیجہ نکلے گا جس طرح ان لوگوں کی زندگی ٹھکانے لگ رہی ہے۔ میرے دن بھی پھر جائیں گے۔ دیکھوں گا شری مان سنگھ' دیکھوں گا۔ کرشن

بھگونت بلکہ میں اب تجھے گرشن بھگونت کیوں کہوں۔ یہ تو احترام کا نام ہے۔ شری مان ایک دن ایسا ہوگا کہ میرے ہی ہاتھوں میں تیرا انت ہوگا۔ یہ سب میرے دل میں آرزو ہے۔ دیکھوں گا' دیکھوں گا تجھے۔

مختلف کیفیات کا شکار تھا۔ مولوی صاحب کے گھر خوشیاں اتر آئی تھیں۔ اندر چلے گئے تھے۔ وہ اور اندر کا حال میں نہیں جانتا تھا۔ یہ حال جاننے کے لیے اندر جانا مناسب بھی نہیں تھا کیونکہ ان بیچاروں کو معلوم بھی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ساتھ ایک اور ہستی بھی ان کی خوشیوں میں شریک ہے۔

بہرحال میرا کام پورا ہوگیا تھا۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس طویل ترین زندگی کو گزارنے کے لیے کچھ تو چاہیے تھا اور اور شری مان سنگھ جیسے شیطان سے جو کچھ حاصل ہوا تھا۔ اسے اس کے دشمنوں کے خلاف استعمال کرنے کے بجائے اگر ایسے لوگوں کے لیے کچھ کہا جائے تو زندگی کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہوسکتا تھا۔ یہ بات دل میں ٹھان لی اور اس سے دل کو جو سکون ملا' وہ ناقابل بیان تھا۔

اصولی طور پر اب مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا لیکن انسانی خوشیوں سے بہت دور نہیں ہوا تھا۔ اس گھر کی خوشیاں دیکھنا چاہتا تھا پھر میری وجہ سے انہیں کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔ اس لیے کچھ وقت یہاں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ بڑے اچھے مناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ مولوی صاحب نے بچوں کے لیے خریداری کی تھی۔ بچے اچھے اچھے کپڑے پہننے لگے تھے۔ اچھا کھانا پکتا تھا۔ لوگ اب بھی مولوی صاحب سے جھاڑ پھونک کروانے آیا کرتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی کچھ لوگ آئے تو مولوی صاحب نے کہا۔

''دیکھو بھائیو! مجھے گنہگار نہ کرو۔ نہ میں کوئی پیر ہوں' نہ فقیر' نہ درویش۔ مجھے کچھ نہیں آتا جاتا۔ بس تم لوگ آتے ہو تو اللہ کا نام لے کر پھونک دیتا ہوں اور اس سے دعا کرتا ہوں کہ معبود کریم اے شفاء دے۔''

''تمہاری دعا ہی میں تو اثر ہے مولوی صاحب!''

''ارے نہیں بھائی! اللہ سب کی دعائیں سنتا ہے۔ میں تو بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی انسان ہی رہنے دو' اس طرح تم مجھے پیر' فقیر' درویش بنائے دے رہے ہو۔ اس سے میرے ہی گناہوں میں اضافہ ہوگا۔ جو کچھ میں نہیں ہوں' اگر وہ ظاہر کرنے کی کوشش کروں تو اس سے اللہ بھی ناراض ہوگا۔ بلاوجہ میرے گناہوں میں اضافہ نہ کرو۔''

مولوی صاحب نے ان کی خواہش پوری کردی تھی۔ جھاڑ پھونک کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے لیکن مولوی صاحب کی بیوی رشیدہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔

''فتح خان! یہ اچانک تمہاری زبان بدل گئی۔''

''کیا مطلب رشیدہ! میں سمجھا نہیں۔''

''اس سے پہلے تو تم بڑے الٹے سیدھے چکر چلاتے تھے۔ اپنے آپ کو فقیر اور درویش ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اب اچانک ہی تم نے لوگوں سے کہنا شروع کردیا کہ تم پیر فقیر نہیں ہو۔''

فتح علی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چند لمحات اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''رشیدہ! کیسی باتیں کررہی ہو' اس دل کی آگ نہیں جانتی تو۔ ارے معذور ہوگیا تھا میں۔ بتا اس سے پہلے ہیر پھیر کرکے ایک پیسہ بھی گناہ کا کھلایا تجھے۔ بول رشیدہ! زندگی تیرے ساتھ گزری ہے۔ جواب دے مجھے' کہیں کوئی ایسا موقع آیا جب میں نے محنت کی کمائی کے علاوہ کوئی اور کمائی تجھے کھلائی ہو؟''

''چلو معاف کردو' غلطی ہوگئی۔ میں تو ایسے ہی مذاق میں کہہ رہی تھی۔''

''نہیں رشیدہ! یہ مذاق بھی اچھا نہیں ہے۔ مجھے کیا خود احساس نہیں تھا۔ میں تو ہمیشہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا تھا۔ اپنے مولا کریم سے۔''

بہرحال اچھا آدمی تھا اور مجھے بڑی مسرت تھی کہ میں اس عالم میں بھی اس کے کچھ کام آسکا اور میری وجہ سے اسے یہ سب کچھ حاصل ہوگیا۔ بہرحال اب اس کے بعد یہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ آج رات یہاں سے نکل جاؤں گا۔ دنیا بہت وسیع ہے۔ دیکھوں گا میری دوسری منزل کون سی ہے لیکن میری دوسری منزل میرے اپنے بس میں نہیں تھی۔ ایک نئے کھیل کا آغاز ہوگیا تھا اور یہ نیا کھیل اس وقت شروع ہوا جب ٹھیک ٹھاک دوپہر ہورہی تھی۔ سورج آسمان کے عین درمیان میں تھا اور چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی۔ مولوی صاحب کے دروازے پر دستک ہوئی۔ حالانکہ سب لوگ اندر تھے اور دھوپ سے بچاؤ کا بندوبست کیے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود مولوی صاحب نے کسی کو نظرانداز نہیں کیا۔ مولوی صاحب کی بیگم نے دروازہ کھولا۔

میں بھی اپنی کمین گاہ سے باہر دیکھ رہا تھا لیکن آنے والے جو اندر آئے تھے' انہیں دیکھ کر میں بھی چونک پڑا اور ان کے اندر آنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے بھی سنبھلنا پڑا۔ ان میں سب سے آگے وہ کالا ناگ تھا جس کا نام چیلا رام لیا گیا تھا اور جو اس دن بلونت رام کی حویلی کے احاطے میں موجود تھا۔ جب شلونت رام کو سانپ نے کاٹا تھا اور یہ شخص تھالی بجا رہا تھا' اس کی آمد خیر کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن جس انداز میں اس نے مولوی صاحب کی بیوی کو اندر دھکیلا تھا' اس سے میں ذرا چونکا تھا۔ مولوی صاحب بھی بیساکھی ٹیکتے ہوئے باہر آگئے۔

''کون ہے رشیدہ! کیا بات ہے؟''

رشیدہ بیگم کا منہ جو حیرت اور خوف سے کھلا ہوا تھا' اسی طرح کھلا رہا۔ ان کے منہ سے ایک آواز بھی نہیں نکلی۔ وہ چیلا رام سپیرے کو دیکھ کر ہی خوفزدہ ہوگئی تھی۔ چیلا رام کے پیچھے چار اور خطرناک سپیرے اندر داخل ہوگئے لیکن یہ بالکل اجنبی چہرے تھے۔ یعنی ان دو باقی سپیروں میں سے بھی نہیں تھے جو اس دن تھالی بجا رہے تھے۔ کوئی دلچسپ ہی معاملہ شروع ہوگیا تھا۔

سپیرے نے دروازہ بند کردیا اور ان میں سے دو نے لمبے لمبے چھرے نکال لیے۔ یہ دیکھ کر تو مولوی صاحب کی بھی گھگی بندھ گئی تھی اور ان کی بیوی تو بالکل ہی ساکت ہوگئی تھی۔ کوئی جرم ہونے جا رہا تھا۔ اب اس میں میرا کیا کردار ہونا چاہیے۔ میں اس وقت بڑی بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ مولوی صاحب نے خود کو سنبھالا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

''ارے بھائی! کیا بات ہے' کون ہو تم لوگ۔ شکل وصورت سے تو سپیرے معلوم ہوتے ہو لیکن یہ چھرے' کوئی غلطی ہوگئی ہم سے بھیا! ہم تو بڑے بے ضرر لوگ ہیں۔ نہ کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ..... نہ.....'' چیلا رام آگے بڑھ آگیا اور اس نے مولوی صاحب کو گھورتے ہوئے کہا۔

''بڑے مہاتما ہو مہاراج! بڑے مہاتما ہو تم۔ پانی پڑھ کر چھینٹے مارتے ہو اور شیش ناگ کو بلا لیتے ہو۔ بہت مہاتما ہو۔ چلو ہم نے بھی تمہیں مہاتما مان لیا مگر مہاتما ہمارا بھی ایک کام کردو گے تو اسی میں تمہارا جیون ہے' ورنہ تمہیں مرنا پڑے گا۔ اپنی تمام آرزوؤں کے ساتھ جو تمہارے من میں چھپی ہوئی ہیں۔''

''کام بتاؤ بھائی..... کام بتاؤ۔ ہم نے کب منع کیا ہے۔ اگر ہمارے بس میں ہوگا تو ضرور کردیں گے۔''

''پانی پڑھو اور چھینٹے مار کر شیش ناگ کو دوبارہ بلا دو۔''

''کک..... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں سپیرا ہوں' چیلا نام ہے۔ میرا اور مجھے شیش ناگ کی ضرورت ہے۔''

''مگر شیش ناگ ہمارا غلام تو نہیں ہے بھائی! وہ..... وہ..... تمہیں شاید یقین نہ آئے' ہم تو بالکل نہیں جانتے تھے کہ وہ آجائے گا۔ بس ہم نے تو دعا مانگی تھی کہ ہماری لاج رکھ لے ہمارا مولا اور ہمارے

مولا نے ہماری لاج رکھ لی۔ ارے اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم ایک شیش ناگ کیا ناگوں کا پورا قبیلہ تمہارے حوالے کردیتے۔''

اچانک ہی ایک سپیرے نے کچھ کہا اور چیلا رام چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں اس کی گفتگو پر دھیان لگائے ہوئے تھا۔ چیلا رام نے کہا۔

''تجھے یقین ہے؟''

''ہاں مہاراج! کیا آپ مجھے اتنا کچا سمجھتے ہیں۔ آپ کا چیلا ہوں' آپ خود سونگھ لیجئے۔ بو آرہی ہے مجھے۔ باس آرہی ہے شیش ناگ مہاراج کی۔''

''مم.....مگر یہاں.....کیا وہ یہاں رہتا ہے؟''

''مہاراج! آپ غور کیجئے۔ اسے میں سنبھالے لیتا ہوں۔'' سپیرے نے کہا اور چیلا رام ناک اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر سونگھنے لگا پھر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے کہا۔

''تو ٹھیک کہتا ہے لالو! شیش ناگ مہاراج یہیں کہیں آس پاس موجود ہیں۔ شیش ناگ مہاراج! میں جیون بھر تمہاری آرزو کرتا رہا ہوں۔ جیون بھر تمہیں حاصل کرنے کی آرزو کرتا رہا ہوں۔ آج میرا یہ خواب پورا کردو۔ آجاؤ' میرے سامنے آجاؤ۔''

''سس.....سنو بھائی' کیا بات ہے۔ کیا قصور ہے ہمارا۔ کیا قصور ہے۔ ہمیں تو بتاؤ۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''دیکھو بڈھے چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ اندر اور کون کون ہے؟''

''یہاں کوئی نہیں ہیں۔ یہ ہماری اہلیہ ہیں۔ دو چار بچے ہیں اور بس۔ ہم تمہارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ میں تو ویسے بھی معذور آدمی ہوں۔ تم نے دیکھ لیا۔''

''جینا چاہتا ہے تو ادھر بیٹھ جا خاموشی سے اس کونے میں' ورنہ سب سے پہلے چھرے مار کر تجھے ختم کردوں گا' اس کے بعد تجھے اور تیرے بیوی بچوں کو۔''

''نہیں بھائی! ہاتھ جوڑتے ہیں۔ یہاں ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے' تم لے جاؤ۔ بس ہمارے بیوی بچوں کو کوئی نقصان مت پہنچانا۔ ہم وہی کریں گے جو تم کہو گے۔''

''بس تو ادھر بیٹھ جاؤ اور سن اندر سے ان لوگوں کو بھی بلا لے۔ اے عورت سن رہی ہے۔ جا اپنے بچوں کو بلا کر یہاں ہمارے سامنے بٹھالے۔ خبردار کوئی کسی طرف سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ یہاں اگر سو آدمی بھی آگئے تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ دیکھ ہمارے پاس یہ جو پٹارے ہیں نا۔ ان میں سانپ ہی سانپ بھرے ہوئے ہیں۔ اگر ہم نے یہ سانپ چھوڑ دیے تو پوری بستی خالی ہوجائے گی۔ کیا سمجھی۔'' چیلا رام غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں یہ تمام تماشا گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور کچھ کچھ اندازہ مجھے ہوتا جارہا تھا۔ چیلا رام سپیرا غالباً میرے ہی چکر میں یہاں آیا تھا۔ اس نے مجھے شیش ناگ کا نام دیا تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی اور سنتھا کی بستی میں مجھے یہ علم ہوا تھا کہ شیش ناگ سپیروں کے لیے بڑی دلکشی کا حامل ہوتا ہے۔ بہرحال میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ خیر بیچارے مولوی صاحب کو جو تکلیف ہورہی تھی' وہ اپنی جگہ تھی لیکن چیلا رام اپنی شامت خود بلا رہا تھا۔

اس کے ساتھ آئے ہوئے سپیرے ادھر ادھر پھیل گئے۔ دروازے پر کھڑے ہوگئے تاکہ جب باہر سے کوئی آئے تو اسے بھگایا جاسکے۔ چیلا رام نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے بعد اپنے کندھوں سے وہ جھولیاں اتار کر نیچے رکھ دیں جن میں نجانے کیا کیا الابلائیں بھری ہوئی تھیں۔

اور اس کے بعد اس نے ایک بین نکالی اور بین بجانے لگا۔ اس کے ساتھ باقی تین سپیروں نے بھی بین نکال کر بجانا شروع کردی تھی اور بین کی مدھر آواز فضاء میں گونجنے لگی۔ چیلا رام شاید بہت اچھی بین بجاتا تھا۔ چیلا رام میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ بین بجانے سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اچانک ہی جب میرے ذہن پر کچھ عجیب سا دباؤ پڑنے لگا تو میں چونک گیا۔

میں نے حیرت سے سوچا کہ یہ بین مجھ پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ ہاں ایسا ہی لگ رہا تھا لیکن..... لیکن یہ تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر یہ بین میرے ہوش و حواس چھین لے گی تو چیلا رام مجھے آسانی سے گرفتار کر لے گا۔ نہیں' یہ خطرناک بات ہوگی۔ میرے لیے ایک انتہائی مشکل کا باعث۔ میں بھلا کیا کر سکوں گا اس سلسلے میں لیکن بین کی آواز میرے حواس چھین رہی تھی۔ بین مدھر آواز میں بج رہی تھی اور تمام سپیرے جھوم جھوم کر بین بجا رہے تھے۔ اس آواز سے میرے حواس پر ایک نیند سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ فطری طور پر بہر طور میں سانپ جیسی سرشت ہی رکھتا ہوں اور بین کی آواز میرے حواس کو متاثر کر رہی ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں یہاں سے نکل بھاگ جاؤں۔ ہاں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس وقت مجھے خطرہ پیش آ گیا تھا۔ چیلا رام میری تلاش میں آیا تھا اور یقینی طور پر وہ سانپ کی حیثیت سے مجھے گرفتار کرے گا۔

میں نے جلدی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور درخت کے اس تنے سے اوپر نکل آیا۔ میں آہستہ آہستہ درخت کی ان شاخوں تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں سے دوسری شاخوں پر پہنچا جا سکتا تھا اور اس کے بعد یہاں سے فرار کی کوشش میرے لیے مشکل نہیں ہوگی لیکن بین کی آواز میرے حواس پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے سحر میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا اور اس کے بعد میرے ہوش و حواس بالکل ہی معطل ہونے لگے۔ میں درخت کی شاخوں میں دوسری جانب جانے کے بجائے آہستہ آہستہ درخت کے تنے سے نیچے اتر آیا اور اس کے بعد چیلا رام کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ہولے ہولے رنگ رنگ میں نشہ دوڑ رہا تھا۔ ایک ایسی عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری ہو رہی تھی' اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر بے اختیار جھوم رہا تھا اور جسم ایسا ہو گیا تھا جیسے بے جان ہو گیا ہو اور اس میں زندگی کی رمق ہی نہ رہی ہو۔ چیلا رام اور اس کے ساتھی بڑی خوف و حیرت کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ چیلا رام بڑا مست ہو کر بین بجا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میری تمام ذہنی قوتیں سو گئیں۔ میں نجانے کس عالم میں پہنچ گیا تھا۔

پھر بین بند ہو گئی اور اچانک ہی میرے ہوش و حواس جاگے تو میں نے اپنے آپ کو ایک بڑی سی مضبوط پٹاری میں بند دیکھا۔ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ چیلا رام سپیرے نے مجھ پر قابو پا لیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

پٹاری اتنی تنگ تھی کہ میرے لیے جنبش کرنا بھی محال تھا۔ بس میں اس میں بری طرح بھرا ہوا تھا لیکن مجھے اپنا جسم ہلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ چیلا رام مجھے ساتھ لیے ہوئے سفر کر رہا تھا۔ میں کافی پریشان ہو گیا تھا۔

ایک بار پھر میرے دل میں شری مانگ سنگھ کا خیال آیا۔ میں ان لوگوں کو نیست و نابود کر کے پھینک دیتا لیکن شری مان سنگھ نے میری قوتیں سلب کر لی تھیں اور میں اس تباہ حالی میں تھا' اس کی تمام تر ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی تھیں۔ کیا کروں اب' کیا کروں لیکن کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے وقت کا انتظار کرنے کے۔

چنانچہ بحالت مجبوری چیلا رام کے کندھوں پر سفر کرتا رہا۔ نجانے کمبخت مجھے کہاں لے کر جا رہا تھا پھر اس نے شاید کہیں قیام کیا۔ میں بہت سے قدموں کی آوازیں سن رہا تھا۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ میری سماعت حد سے زیادہ تیز تھی۔ حالانکہ سانپ کے بارے میں یہ بات تھی کہ میری سماعت حد سے زیادہ تیز تھی۔ حالانکہ سانپ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس کے کان نہیں ہوتے لیکن میں سانپ تھا ہی کب' میں تو انسان تھا اور انسان بھی وہ جسے عجیب و غریب قوتیں حاصل تھیں۔

خیر اب ان قوتوں کو تو میں مذاق سمجھتا تھا۔ میری

اپنی کوشش تو اس پٹاری کا ڈھکن تک نہیں کھول سکتی تھی۔ اس طرح میرے اندر طاقت نہیں رہی۔ کچھ بھی تو نہیں کرسکتا تھا' سوائے کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر رینگنے کے۔ ان حالات میں بھلا اپنے طور پر اپنے تحفظ کے لیے کیا بھی کیا جاسکتا تھا۔ میں دور دور کی آوازیں سن رہا تھا۔ پرندوں کے بولنے کی آوازیں۔ جانوروں کے دھاڑنے کی آوازیں۔ غالباً کہ چیلا رام کسی جنگل سے گزر رہا تھا۔

پھر قیام کا احساس ہوا۔ یہ احساس صرف اس طرح ہوا تھا کہ مجھے نیچے رکھ دیا گیا اور میرا جسم ساکت ہوگیا۔ یعنی وہ جنبش جو ہلنے جلنے سے ہورہی تھی' بند ہوگئی تھی۔ میں خاموشی سے دم سادھے پڑا رہا۔ کسی کی آواز سنائی دی۔

''مہاراج چیلا رام کی جے۔ اب ہمارے چیلا رام قبیلے کے سردار ہوں گے۔''

''بالکل مہاراج! بالکل۔ حالانکہ آپ نے ایسے ایسے خطرناک سانپ پکڑے تھے' جنہیں بھورا رام بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔''

''میرے مقابلے پر وہ ہے کیا اور کیا نہیں ہے' میرے پاس اس سنسار میں سوائے شیش ناگ کے میرا شریر' میری عقل' میرا مان' میرا گیان سب کو نظرانداز کردیا گیا تھا۔ بھورا رام اپنی موت کے بعد سرداری اس پاپی کو دینا چاہتا تھا۔''

''کس کو مہاراج؟''

''اس سفالی کو..... سفالی ابھی سے اپنے آپ کو مہاراج کہنے لگا تھا۔ ارے بڑے زخم ہیں میرے سینے میں۔ بڑے گھاؤ ہیں میرے من کے اندر۔ اب ایک ایک کرکے بدلہ لوں گا۔ ایک ایک سے۔''

''مگر مہاراج کو پورا پورا وشواش ہے کہ یہ شیش ناگ ہی ہے؟''

''باؤلے کے بچے' میرے گیان کو للکار رہا ہے۔''

''ارے مہاراج نہیں' بھگوان کی سوگند۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میں تو بس اس لیے یہ بات پوچھ رہا تھا کہ آپ کو قبیلے کا سردار بننا ہے۔ شیش ناگ ہی ہے نہ یہ؟''

''سو فیصد شیش ناگ ہے۔ تجھے اتنی سی بات نہیں معلوم کہ اگر اصلی سانپ مرجائے اور زہر کسی منش کے شریر میں اتر جائے تو دوسرا کوئی سانپ اس زہر کو نہیں چوس سکتا۔''

''ہاں مہاراج! یہ بات تو مجھے معلوم ہے۔''

''لیکن شیش ناگ تو..... شیش ناگ تو ہر سانپ کا زہر چوس سکتا ہے کیونکہ وہ ناگوں کا راجہ ہوتا ہے۔ ناگ راجہ کو ہر طرح کی آسانی حاصل ہوتی ہے۔''

''یہ تو ہے۔''

''کہیں میں اس لیے' اس چکر میں پڑ گیا کہ شیش ناگوں کو میرے قبضے میں آنا چاہیے۔ شیش ناگ نظر کب آتا ہے۔ پوری بستی میں تلاش کرتا رہا تھا اسے اور اگر میرے ناگ میری مدد نہ کرتے اور میرا منتر کام نہ آتا تو میں کبھی اس مولوی کے گھر نہ پہنچ پاتا۔''

''ہاں مہاراج! آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔''

''بڑی محنت سے پکڑا ہے میں نے اسے۔''

''سو تو ہے مہاراج۔''

''سو تو ہے کا بچہ۔ ابھی یہ پوچھ رہا تھا کہ یہ شیش ناگ ہے یا نہیں؟''

''تمہیں مہاراج! اس کی وجہ کچھ اور ہے؟''

''کیا وجہ تھی؟ بول کیا وجہ تھی؟''

''مہاراج! جب آپ قبیلے کے سردار بن جائیں گے تو کیا ہماری بات نہ بڑھ جائے گی۔ ہم تو آپ کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ پھر ہم فخر سے کہہ سکیں گے کہ ہم قبیلے کے سردار کے دوست ہیں۔''

''تو پھر؟''

''اس لیے میں ذرا پریشانی سے پوچھ رہا تھا کہ بھگوان کرے یہ شیش ناگ ہی ہو۔''

''سن' یہ شیش ناگ ہی ہے' سو فیصد شیش ناگ۔ اب میں اتنا کچا بھی نہیں ہوں کہ شیش ناگ کے بارے میں نہ جان سکوں۔''

''مہاراج! مزے آ گئے۔ اب تو جتنی جلدی ہو سکے قبیلے میں پہنچ جانا چاہیے۔''

''پھر کیا کریں گے مہاراج۔''

''ہاں' یہ بات کی ناں تو نے کام کی۔''

''تو پھر بتایئے نا مہاراج! ہمیں ہمارا کام بھی تو سمجھا دیجئے۔''

''ہاں..... ہاں..... سمجھاتا ہوں۔ سن شیش ناگ کو سب سے پہلے سنگارو میں بند کریں گے اور اس کے بعد میں اعلان کروں گا کہ میں نے شیش ناگ کو پکڑ لیا ہے اور اب قبیلے کی سرداری میرے حوالے کر دی جائے۔ اگر کوئی ایسا نہ کر پائے تو پھر اسے شیش ناگ پکڑ کر دکھانا ہوگا۔ بھورا رام سارا جیون قبیلے کا سردار رہا ہے' جانتے ہو کس لیے۔''

''کس لیے مہاراج؟''

''اس لیے کہ اس کا پتا سردار تھا۔ وہ سرداری اسے تحفے میں دے گیا تھا۔ حالانکہ سرداری تحفے میں ملنے والی چیز نہیں ہے۔''

''سوتو ہے۔''

''پھر وہی سوتو ہے' سوتو ہے؟ سوتو ہے کا بچہ۔''

''ارے..... ارے مہاراج! ہم تو آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔''

''تو پھر سن۔ پہلے اسے سنگارو میں بند کریں گے' اس کے بعد اسے بڑے چبوترے پر لے جا کر رکھ دیں گے' جہاں شیش ناگ کا بت بنا ہوا ہے پھر ہم پکاریں گے بھورا راج کو۔ بھورا راج آئیں گے۔ اول تو شیش ناگ دیکھ کر پہلے ہی ان کے مان مر جائیں گے اور اس کے بعد..... اس کے بعد ان کی جو حالت ہوگی' وہ دیکھنے کے قابل ہوگی۔ تجھے پتہ نہیں ہے پاپی' میرے من میں کیا کیا آگ سلگ رہی ہے۔''

''اب آپ اپنی آگ اپنے من میں ہی رہنے دیتے ہیں مہاراج! تو ہم کیا کریں۔''

''ہم کیا کریں۔ اونہہ' تم لوگوں نے میرے لیے کیا ہی کیا ہے۔ بولو کبھی کچھ کیا؟''

''ارے آپ نے ہم سے کبھی کوئی ایسا کام ہی نہیں لیا۔''

''ہاں کام تو لیا تھا۔ کہا تھا کہ جاؤ شیش ناگ کو تلاش کرو۔ چھ دن تک مارے مارے پھرتے رہے اور آ کر ہاتھ پھیلا دیے۔''

''مہاراج! یہ اتنا آسان کام تو نہیں تھا۔ شیش ناگ کو تو شیش ناگ ہی تلاش کر سکتا ہے۔'' چیلا رام کے دوست نے چیلا رام کو مکھن لگایا اور چیلا رام کو یہ بات پسند آئی' وہ ہنس پڑا۔

''یہ بڑی بڑھیا بات کہی تو نے۔ ہاں شیش ناگ ہی تلاش کر سکتا ہے۔ میں سب سے بڑا ناگ ہوں اور ناگوں کو میرے ہی قابو میں آنا چاہیے۔ ابھی تو میں نے شیش ناگ پکڑا ہے لیکن سردار بننے کے بعد میں سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ ناگ کو پکڑوں گا اور اگر شیش ناگ اور ناگ رانی میرے قبضے میں آ جائیں تو پھر سنسار میں کون ہیں جو میرا مقابلہ کرے۔''

میں وہیں بیٹھا رہا۔ شاید رات کا وقت تھا کیونکہ تا حدِ نگاہ سناٹا چھا گیا تھا۔ اب پرندوں کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ ہاں کبھی کبھی شیر کی دھاڑ سنائی دے جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جس علاقے میں چیلا رام نے قیام کیا ہے' وہاں جنگلوں میں شیر بھی موجود ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنے تحفظ کا بندوبست ضرور کر لیا ہوگا۔

پھر صبح کی روشنی ہوگئی۔ ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں اور مدھم مدھم اجالا بھی اس پٹاری تک پہنچ رہا تھا جس میں مجھے بند کر دیا گیا تھا۔ غالباً وہ لوگ اپنی ضروریات زندگی سے فارغ ہو رہے تھے اور اس کے بعد انہوں نے وہاں سے سفر شروع کر دیا۔ ایک بار پھر مجھے سفر کرنا پڑا تھا۔ پورا دن یہ سفر ہوتا رہا۔ اس پٹاری میں مجھے دن میں کافی گرمی بھی لگی تھی لیکن اب ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہو کر وقت گزرنا تھا اور دیکھنا تھا کہ تقدیر نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔

پھر شاید چیلا رام اپنے قبیلے میں پہنچ گیا۔ بے شمار لوگوں کے بات چیت کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جس وقت وہ قبیلے میں داخل ہوا' رات کا وقت تھا پھر مجھے چیلا رام کے ساتھیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

''تو پھر مہاراج! ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

''ابھی کسی کو مت بتانا کہ تم لوگ آ گئے ہو؟''

''ٹھیک ہے مہاراج! لیکن آپ کہہ رہے تھے؟''

''ہاں..... ہاں..... تم چنتا مت کرو..... میں اسے سنگارو میں بند کرلوں گا۔''

''تو پھر سنگارو کو ناگ راج کے چبوترے پر کب پہنچائیں گے۔''

''صبح کو جب روشنی پھوٹے گی تو سنگارو ناگ راج کے چبوترے پر ہوگا۔''

یہ سنگارو عجیب و غروب ایک چوکور بکس تھا جو شیشے کا بنا ہوا تھا اور اس میں ایسے ایسے باریک سوراخ کیے گئے تھے جس سے ہوا اور روشنی اندر آ سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چیلا رام اپنے کام میں ماہر تھا اور اس نے مجھے اس چالاکی سے سنگارو میں منتقل کیا تھا کہ میں خود حیران رہ گیا تھا۔ ایک چھوٹا سا خانہ کھلا تھا اور اس کے ساتھ ہی ٹوکری کا ڈھکن تھوڑا سا اٹھا۔ بس میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے پوری قوت سے پھن اٹھا کر دوڑنے کی کوشش کی اور مجھے راستہ مل گیا لیکن یہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ راستہ میرے لیے ہی بنایا گیا تھا تاکہ میں اس ڈبے میں داخل ہو جاؤں جو میرے لیے ترتیب دیا گیا ہے اور جیسے ہی میں اس ڈبے میں داخل ہوا' اس کا اگلا سرا پھر سے بند ہو گیا۔ میں نے بری طرح سے پھنکاریں ماریں لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ چیلا رام نے نہایت آسانی سے ڈبے کا مضبوط دروازہ اس طرح بند کر دیا کہ میری ساری کوششیں اسے کھولنے میں ناکام رہیں۔ تب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ سنگارو ہے۔ اب چیلا رام میرے سامنے کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اس کے بھیانک چہرے پر مسکراہٹیں دوڑ رہی تھیں اور میں اس کو خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا' وہ ہنس کر بولا۔

''جے ہو مہاراج شیش ناگ کی۔ بڑی مشکل سے پکڑا ہے آپ کو لیکن مہاراج! چنتا نہ کریں' ناگ رانی کو حاصل کرنا میرا کام ہے۔ آپ کی جوڑی بناؤں گا۔ یہ چیلا رام کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ بس مہاراج! مجھے اپنی پناہ میں رکھیں اور ہمیشہ میری سہائتا کریں۔''

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ بے ایمان تیری سہائتا تو میں ایسی کروں گا کہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔ بس ذرا موقع مل جائے۔ ویسے سنگارو نامی ایک چیز کا کچھ اور بھی معاملہ تھا کیونکہ یہ انتہائی عجیب و غریب تھی۔ میں اس کی نوعیت کو نہیں جان سکا تھا۔ اس کے اندر میں بالکل مطمئن اور کسی قسم کی تکلیف کا شکار نہیں تھا بلکہ جو تکلیف میں نے اس پٹاری میں اٹھائی تھی' اس سے میرا انگ انگ دکھ گیا تھا۔ اس میں آ کر ذرا کشادگی ملی تو میں نے اپنے بدن کو بہت سی انگڑائیاں دیں اور لہریں لینے لگا۔

رات کا وقت تھا اور میں نے اپنے آپ کو ایک

واہ بھئی!

مشورہ

کوک کے ٹن پر لکھا تھا: ''اس بات کو غلط ثابت کر دیجیے کہ آپ بے وقوف ہیں'' اس کے نیچے جلی حروف میں درج تھا ''براہ کرم ڈبے کو دوسری طرف سے کھولیے' یہ پینڈا ہے۔''

☆

ایک ماہر نفسیات کی ملاقات ایک ریستوران میں اتفاقاً ایک مریضہ سے ہوگئی تو اس عورت نے اپنے ساتھی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے وہ خاوند ہیں' جن کا میں نے آپ سے بہت ذکر کیا ہے۔'' ☆

جھونپڑی جیسی جگہ پر دیکھا۔ گول قسم کی کشادہ جھونپڑی تھی جو یقینی طور پر چیلا رام کا گھر ہی ہوگا۔

بہرحال اس نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا اور اس کے بعد چیلا رام اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا' وہ بھی ساری رات نہیں سویا تھا۔ مجھے بھی نیند نہیں آئی تھی۔ اس قید میں بڑی بے چینی ہورہی تھی لیکن بالکل مجبور ہوگیا تھا پھر چیلا رام نے تیاریاں شروع کردیں۔ سفید لباس پہنا اور پوری طرح سے تیار ہوگیا۔ صبح ہونے والی تھی۔ بالآخر اس نے سنگارو اٹھایا اور اپنے جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔ باہر مدھم مدھم اجالا پھیلا ہوا تھا۔ جھونپڑیوں میں خاموشی طاری تھی۔ چراغ بجھ چکے تھے۔ بستی نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چیلا رام مناسب رفتار سے چلتا ہوا کسی خاص سمت جارہا تھا اور میرا بدن سنگارو میں ہلا رہا تھا۔ بالآخر میں ایک وسیع وعریض میدان میں پہنچا۔

یہ میدان بستی سے ملحق تھا اور شاید خاص طور پر بنایا گیا تھا۔ چاروں سمت درخت لگے ہوئے تھے۔ درختوں کے درمیان یہ سپاٹ اور صاف ستھرا میدان تھا جس کو عبور کرنے کے بعد ایک عظیم الشان سنگی چبوترہ نظر آرہا تھا۔ اس چبوترے پر اوپر تک جانے کے لیے تقریباً چوبیس سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے شروع ہوتے ہی دونوں سمت اونچے اونچے ستون استادہ تھے جو پتھر کی چٹانوں ہی سے تراشے گئے تھے۔

سیڑھیوں کی تراش بھی اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ پہلے کوئی عظیم الشان سلسلہ ہوگا اور اس میں یہ سیڑھیاں تراش دی گئی ہیں۔ اس کے بعد وسیع چبوترے کا آغاز ہوتا تھا اور اس چبوترے کا اختتام ایک بہت بڑے چٹانی سلسلے پر جاکر ہوتا تھا۔ سیاہ رنگ کے اس چٹانی سلسلے کے سامنے سانپ کا ایک بہت بڑا مجسمہ تراشا گیا تھا جو بے پناہ بلند و بالا تھا۔ سانپ کا چورا پھن ایک چٹان کی شکل میں سائبان کی طرح پھیلا ہوا تھا اور اس کا سڈول جسم نیچے آکر کنڈلی کی شکل اختیار کرگیا تھا۔

اس کنڈلی کا دائرہ بھی بے حد وسیع تھا۔ چبوترے کے اس حصے پر جہاں سانپ موجود تھا' چھ آدمی گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ غالباً بیٹھے بیٹھے نیند میں ڈوب گئے تھے۔ چیلا رام کے قدموں کی چاپ پر بھی انہوں نے گردنیں نہیں گھمائی تھیں۔ چیلا رام آہستہ آہستہ چلتا ہوا سانپ کی مجسمے کے قریب پہنچا۔ سنگارو کو اس کنڈلی کے درمیان رکھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر گردن جھکا دی۔ چند لمحات وہ اسی طرح بیٹھا رہا اور اس کے بعد رخ بدل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنا ہاتھ سنگارو پر رکھا ہوا تھا۔ وہ کسی پتھر کے بت کی مانند ہی ساکت ہوگیا تھا اور اجالا تیزی سے پھیل رہا تھا۔

تب وہ چھ افراد جاگ گئے۔ انہوں نے انگڑائیاں لیں' چہروں پر ہاتھ پھیرے۔ ابھی تک ان کی نگاہیں چیلا رام کی جانب نہیں اٹھی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عقب میں غائب ہوگئے پھر کچھ دیر کے بعد دوبارہ نمودار ہوئے اور اب انہوں نے چیلا رام کی صورت دیکھی تھی۔ سارے کے سارے اچھل پڑے اور تیزی سے چلتے ہوئے چیلا رام کے پاس آگئے۔

''ارے چیلا رام مہاراج! آپ واپس آگئے اور اور یہ..... یہ..... یہ کیا ہے؟''

''پیروں کی اولاد ہو آنکھیں نہیں ہیں تمہاری۔ دیکھ نہیں سکتے کہ یہ کیا ہے؟''

''کک..... کیا ہے مہاراج!'' انہوں نے جھک کر سنگارو میں جھانکا اور دوسرے لمحے وہ کئی کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے منہ سے حیرت ناک آوازیں نکلیں۔

''شش..... شش..... شیش ناگ..... یہ شیش ناگ ہے۔ ناگ دیوتا کی سوگند۔ یہ شیش ناگ ہی ہے۔'' وہ سب جھک جھک کر مجھے دیکھنے لگے اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انہوں نے بھی اسی طرح ہاتھ جوڑ دیے تھے جس طرح چیلا رام نے پتھر کے مجسمے کے سامنے جوڑے تھے۔

پھر وہ سب کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے چیلا رام کو دیکھا۔ اس سی پہلے کہ وہ کچھ کہتے' بستی کی طرف سے بے شمار آدمی آتے ہوئے نظر آئے۔ ان کا رخ اسی چبوترے کی طرف تھا۔ سارے کے سارے اپنے مخصوص لباسوں میں تھے۔ ان میں عورتیں' بچے' بوڑھے سب ہی شامل تھے۔ وہ بڑی عقیدت واحترام کے ساتھ سنگی چبوترے پر پہنچ گئے اور وہ چھ آدمی جو درحقیقت ناگ دیوتا کے پجاری تھے' ان کے سامنے قطار باندھ کر آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے چند لمحات کی خاموشی اختیار کی تھی اور پھر ان کے منہ سے آوازیں نکلنے لگیں۔

وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے کوئی بھجن گا رہے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ آنے والے بے شمار افراد بھی اس بھجن کی گائیکی میں شریک ہوگئے۔ غالباً وہ عبادت کر رہے تھے لیکن چیلا رام ان کے درمیان نہیں پہنچا تھا۔ وہ بدستور سنگارو کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ کافی مغرور آدمی معلوم ہوتا تھا وہ اور اس عبادت میں اس نے حصہ نہیں لیا تھا پھر یہ بھجن ختم ہوگیا اور اس کے بعد پجاریوں نے جواب تک اپنے آپ کو بمشکل تمام سنبھالے ہوئے تھے' آگے بڑھے اور چیلا رام کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

چیلا رام کی پوجا ہونے لگی۔ وہ سب اس طرف متوجہ ہوئے تو میں موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے فرار ہوگیا۔ اب ان لوگوں کے ساتھ رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی چیلا رام کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ بہت دنوں تک میں مارا مارا پھرتا رہا پھر ایک دن پہاڑوں میں مجھے کشن بھگوان مل گیا۔ مجھے اس کے نرم رویے پر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھ کر اس کے چرنوں سے لپٹ گیا تو اس نے کہا۔

''تو سوچ رہا ہوگا کہ تو نے مجھے تلاش کر لیا جبکہ بات کچھ اور ہی ہے۔''

''بات کچھ بھی ہو بھگوت! پر مجھے میرا جیون واپس دے دو۔''

''تاکہ تو مجھے ڈسے' کتنی محنت کی ہے میں نے تجھ پر۔ خیر اب تجھے ایک کام کرنا ہے میرا۔ کماری جھرنا میری شاگرد ہے۔ اودھم پور کی رانی اور اسے ایک راجہ کی ضرورت ہے۔ غور کرے' وہ بھی ایک خون پینے والے قبیلے کی فرد ہے اور خون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر تجھے اودھم پور کا راجہ بننا منظور ہے تو ٹھیک ہے' ورنہ.....''

میری منظوری پر کرشن بھگونت نے مجھے میرا شریر واپس دے دیا اور میں اپنی اصلی شکل میں آ گیا۔

جھرنا سے تو مجھے خیر کیا دلچسپی ہوئی لیکن خون پینے والوں کی ریاست اودھم کا راجہ بن کر میں نے بڑا اچھا وقت گزارا۔ یہیں میری دوستی روہین اور کرمو سے ہوئی اور ہم گہرے دوست بن گئے۔ ریاست کے سارے خزانے ہمارے قبضے میں تھے اور میں راجہ بلیر سنگھ کے نام سے حکومت کر رہا تھا۔ پوری ریاست ایک دوسرے کے خون میں مست تھی۔ بہت دن میں نے جھرنا کے ساتھ گزارے اور پھر امیرا دل جب اس سے بھر گیا تو میں نے دوسرے جہاں تلاش کر لیے۔ کمینی جھرنا منحوس چھپکلی۔''

یہاں ڈائری کی کہانی ختم ہوگئی۔ رانا غیاث الدین نے رانا شہباز سے کہا۔

''اس منحوس ڈائری کو وہیں محفوظ کر دو' جہاں سے تم نے اسے اٹھایا تھا' ورنہ یہ ہمارے لیے تباہی کا باعث بنے گی۔''

''اور پھر چھوٹے سرکار وقت آگے بڑھ گیا۔ رانا غیاث الدین کے بعد رانا شہباز اور رانا عادل اور اب آپ..... آپ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ ہم آپ کے کتنے پرانے خادم ہیں۔''

☆

اس سنسنی خیز داستان کے بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں

☆

انجام

حسن علی

مجھے احساس ہے کہ تمہارے مجھ پر بہت رقم خرچ کی ہے۔ تم نے شادی کے بعد مجھ پر تحائف کی بھرمار کر دی تھی۔ جان واردی ایک دولت مند آدمی ہے اور میں بھی لالچی نہیں۔ اس کے علاوہ میں تمہاری دی ہوئی کوئی چیز اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی۔ اس لیے.....!!

غیر متوقع انجام کی خوبصورت کہانی

پال نے نوجوان کیبرے ڈانسر کو اپنے بازوؤں میں گھسیٹتے ہوئے ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کر کے ہونے والے حادثے کو تصوراتی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ افریقہ کی ایک سڑک پر ایک تباہ شدہ ویگن کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر اس کی بیوی کی مسخ شدہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ حادثہ پر کسی کو بھی تعجب نہیں ہوگا۔ ایسے حادثات رونما ہوتے رہتے تھے کیونکہ افریقہ کا وہ علاقہ قبائلی نفرتوں اور جنگوں کی آماجگاہ تھا۔

باہر کہیں کسی نے موٹر کا ہارن بجایا۔ مانیولا کا مچھلی جیسا چکنا جسم اس کی گرفت میں پھسلتا ہوا اچانک رک گیا۔

''تمہاری بیوی پال۔'' رقاصہ نے سرگوشی میں کہا۔

''جہنم میں ڈالو اسے۔'' پال نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ''وہ واپس آ رہی ہے۔ اسے یہاں تک آنے میں دیر لگے گی۔ تم بغلی سیڑھیوں سے اتر کر سرونٹ کوارٹر کے راستے نکل جاؤ۔''

پال نوجوان رقاصہ کے ہیجان انگیز جسم کو دیکھتا رہا۔ اس نے سیاہ رنگ کا بے حد چست لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے جسم کے ہر حصے کو دیکھ کر پال کے دل و دماغ میں جذبات کی آندھیاں چلنے لگتی تھیں۔

''تمہیں معلوم ہے مانیولا..... میری بیوی کل لمبے سفر پر جا رہی ہے۔''

''ہاں اس طرح چند ہفتے ہم ساتھ گزار سکیں گے۔ ایک ایک لمحہ.....''

''ہاں۔'' پال نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اب جانا چاہیے پال۔'' رقاصہ نے کہا اور ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

''پال۔'' نیچے سے اس کی بیوی نے آواز دی۔ ''تم گھر آ گئے پال.....''

''آ رہا ہوں۔'' پال نے چلا کر جواب دیا۔ جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا تو اس نے رک کر دروازے میں تالا لگا دیا۔ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے یہ احتیاط برت رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کی بیوی شکی مزاج تھی یا اس کی ٹوہ میں رہتی تھی۔ اس کے برعکس اس کی بیوی کا رویہ اس کے ساتھ جہنم میں

جائے والا تھا۔ اسے اپنے شوہر کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے اپنی ذات میں مگن رہتی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے نیچے اترا۔ اس کی بیوی مارتھا ڈارلنگ روم میں لگے ہوئے گلدانوں میں پھول لگا رہی تھی۔

''تو تم کل ضرور جاؤ گی۔ تم نے اپنا ارادہ ملتوی نہیں کیا'' پال نے پوچھا۔

''ہاں میں کل اپنے پروگرام کے مطابق ضرور جاؤں گی۔''

پال نے اپنی بیوی کو غور سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین تھی۔ جب وہ یورپین کلب میں داخل ہوتے تھے تو وہاں موجود مرد پلٹ پلٹ کر اس کی بیوی کے سحر انگیز حسن سے آنکھوں کی پیاس بجھاتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کی بیوی حسین تھی لیکن مانیولا کی بات اور تھی۔ مانیولا کے مقابلے میں مارتھا کو سنگ مرمر کا تراشیدہ' خوب صورت مجسمہ کہا جا سکتا تھا۔ خوب صورت لیکن بے جان جب کہ مانیولا کے حسن میں بلا کی مقناطیسیت تھی۔

مارتھا کے والد کنڈولا میں برطانوی کونسل کی حیثیت سے متعین تھے۔ کچھ عرصے سے اس علاقے میں قبائلی خانہ جنگی سے بڑی تباہی ہوئی تھی۔ مارتھا اپنے والد سے ملنے کنڈولا جا رہی تھی۔ اس نے یہ سفر گاڑی میں تنہا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پال نے کسی خیال کے زیر اثر جیب میں رکھے ہوئے خط کو تھپتھپایا۔ یہ خط مارتھا کے والد نے اس کے نام لکھا تھا جس میں اس نے پال سے درخواست کی تھی کہ چونکہ کنڈولا کے سرحدی علاقہ میں حالات بہت ہی خراب ہیں' اس لیے وہ مارتھا کو سمجھائے کہ فی الحال اپنے سفر کا ارادہ ملتوی کر دے۔ ان حالات میں اس علاقے میں سفر کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

پال نے مارتھا کو اس خط کی ہوا بھی نہیں لگنے دی' اس کے برعکس اس نے مارتھا کے اس سفر پر جانے کے لیے ہر ممکن حوصلہ افزائی کی' اس نے ان تمام خبروں کو گمراہ کن قرار دیا۔ جن میں بارودی سرنگیں' بم پھٹنے کی وارداتیں' قتل و غارت گری' لوٹ مار اور اغواء وغیرہ کے واقعات شامل ہوتے تھے۔

''سنا ہے کنڈولا میں آج کل حالات بہت پر سکون ہیں۔'' پال نے کہا۔

''ممکن ہے'' مارتھا نے کہا۔ ''مجھے اس کی پرواہ

نہیں پال..... میں صبح سویرے ہی گھر سے نکل جاؤں گی تاکہ سورج چڑھنے سے پہلے میں ٹھنڈک میں زیادہ سے زیادہ سفر طے کرسکوں۔ میں آج رات ہی گاڑی میں سامان رکھ لوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' پال نے سرسری انداز میں کہا لیکن یہ خبر سن کر اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔

''مجھے یقین ہے تمہیں مجھ سے چھٹکارا پا کر بے حد مسرت ہوگی۔'' مارتھا نے تیز لہجے میں کہا۔

''ہاں کسی حد تک یہ دوری اچھی بھی ہے۔ اس سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔'' پال نے جواب دیا۔

مارتھا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بلاشبہ اسے اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کر کے بے حد مسرت ہوگی۔ اسے سکون مل جائے گا۔ سکون کے علاوہ اچھی خاصی رقم بھی جسے خرچ کرنے کا منصوبہ وہ پہلے ہی بنائے ہوئے تھا۔ افریقہ میں آنے والے ہر یورپی باشندے کا انشورنس کرنا لازمی تھا۔ اس لیے ان دونوں کا بھی بیمہ ہوا تھا۔ مارتھا کی پالیسی پال کے نام تھی اور پال کی پالیسی مارتھا کے نام تھی۔

ظاہر ہے مارتھا کی موت کے بعد بیمے کی رقم اسی کو ملنی تھی اور مارتھا کی موت کل صبح دس بجے واقع ہونی تھی۔ ممکن ہے ایک آدھ منٹ اوپر ہو جائے لیکن اس سے زیادہ وقت لگنا ناممکن تھا۔ تو کل صبح دس بجے نہ صرف وہ چند ہزار پونڈ کا مالک ہوگا بلکہ مانیولا بھی اس کی بانہوں میں ہوگی۔

اس رات وہ کافی دیر کے بعد اپنے کمرے میں داخل ہوا مارتھا کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان دنوں وہ دونوں علیحدہ علیحدہ سو رہے تھے۔ پال نے الماری کا تالا کھول کر احتیاط کے ساتھ اندر سے ایک ڈبہ نکالا یہ ایک ٹائم بم تھا جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اب صرف اس کا ٹائم فیوز لگانا باقی تھا تاکہ صبح ٹھیک دس بجے مارتھا کو گاڑی سمیت اڑا دے۔ اس نے وقت کا تعین بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ پروگرام کے مطابق مارتھا صبح پانچ بجے اپنے سفر پر روانہ ہوگی۔ جس راستے سے وہ سفر کرے گی۔ پانچ گھنٹے بعد وہ کنڈولا کے سرحدی علاقے میں داخل ہو جائے گی جو آج کل آزاد علاقہ بنا ہوا تھا۔ جہاں آج کل کسی کی بھی حکمرانی نہیں تھی' سوائے موت کے۔ مارتھا کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ دس بجے کا وقت بالکل صحیح تھا۔ سفید چمڑے والوں سے افریقی باشندوں کی نفرت کا علم سب کو تھا اس لیے اس حادثے پر کسی کو تعجب نہ ہوگا۔

پال کو ٹائم فیوز لگانے میں کچھ وقت ضرور لگا' لیکن وہ اپنے کام سے مطمئن تھا۔ اب اس کے سامنے اس ٹائم بم کو مارتھا کے سامان کے سامان میں چھپانے کا مسئلہ تھا۔ اچانک اسے مارتھا کے زیورات کا ڈبہ یاد آیا۔ بے شک زیورات کا ڈبہ ٹائم بم چھپانے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ مارتھا کی عادت تھی کہ وہ اپنے زیورات اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اسے اپنے زیورات سے بڑی محبت تھی' جنہیں وہ ایک ڈبے میں بند کر کے تجوری کے اندر رکھتی تھی۔ ان کی تجوری نمبروں والی تھی اور مارتھا سے وہ تجوری کبھی نہیں کھل پاتی تھی۔ اس لیے پال ہی کو تجوری کھول کر زیورات نکالنے پڑتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ مارتھا اپنے زیورات ضرور اپنے ساتھ لے کر جائے گی۔ اس کے والد کنڈولا میں کونسلر تھے اور وہ کونسلر کی بیٹی تھی۔ اس لیے اگر وہاں اسے کسی تقریب میں شریک ہونا پڑا تو وہ کس طرح بغیر زیورات کے کسی تقریب میں جاسکتی ہے۔

پال نے تجوری کھولی اور زیورات کا ڈبہ باہر نکالا۔ اس نے ڈبے کا تالا کھول کر اندر سے زیورات باہر نکال لیے۔ آخر انہیں ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ اس نے وقتی طور پر تمام زیورات میلے کپڑوں کے ڈھیر میں چھپا دیے اور ٹائم بم ڈبے میں رکھ کر دوبارہ اس کا تالا لگا دیا۔ پھر اس نے زیورات کا ڈبہ تجوری میں بند کر دیا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس رات وہ کئی مرتبہ ڈراؤنے خواب دیکھ کر جاگ گیا' وہ پوری رات صحیح طور پر نہیں سو سکا۔ صبح پانچ

بجے کے قریب مارتھا نے اسے جگا دیا۔

''میں جا رہی ہوں پال۔'' مارتھا نے کہا۔

''اوہ۔ کیا تم نے سارا سامان رکھ دیا'' پال نے غنودگی کے عالم میں دریافت کیا۔

''ہاں.....''

''اچھا تو میں تمہارے زیورات کا ڈبہ نکال دیتا ہوں۔'' پال نے سر جھٹک کر نیند کا غلبہ بھگانے کی کوشش کی۔

''وہ میں نے نکال لیا ہے پال۔'' مارتھا نے کہا۔ ''تم باہر کا دروازہ بند کر لو۔''

پال غنودگی کے عالم میں جھومتا ہوا مارتھا کے پیچھے باہر نکل آیا۔ مارتھا گاڑی میں بیٹھی ہوئی گاڑی اسٹارٹ کر رہی تھی' پال نے آخری مرتبہ اپنی حسین بیوی کو غور سے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیوی کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہے۔ جب مارتھا کی گاڑی مکان کے احاطے سے باہر نکل گئی تو پال دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

جب پال کی آنکھ کھلی تو سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے کمرے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک خیال کے آتے ہی اس نے چونک کر دیوار میں لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے' اس کے چہرے پر ایک بے رحمانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ مارتھا اس وقت کنڈولا کے سرحدی علاقے میں کہیں ہوگی۔ اس نے سوچا اور اس کی زندگی دس منٹ کے بعد ختم ہو جائے گی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ باورچی خانے میں گیا۔ اس نے ریفریجریٹر میں سے لیمن اسکوائش کی بوتل نکال کر ٹھنڈے شربت کا ایک گلاس پیا۔

جب وہ واپس اپنے کمرے آیا تو اس نے اپنی الماری کھول کر اندر سے کنگھا نکالا۔ اس کی نظر ایک لفافے پر پڑی ابھی لفافے پر مارتھا کی تحریر میں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ لفافہ لے کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں آہستہ آہستہ بارہ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھیں دس بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ وہ خود کو بے حد نروس محسوس کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور وہ گھبرا کر بستر پر سے کھڑا ہو گیا۔ اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے لفافے پر پڑی۔ اس نے اپنا ذہن دوسری جانب موڑنے کے لیے لفافہ کھولا اور اندر سے نکلنے والی تحریر بستر پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ بلاشبہ وہ تحریر مارتھا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔

''ڈیئر پال.....

میں تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں لیکن واپس آنے کے لیے نہیں کنڈولا میں جان وارلی میرا انتظار کر رہا ہے۔ پاپا میری شادی اس سے کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے تم سے شادی کر کے بڑی حماقت کی اور اب میں اس کا ازالہ کرنے جا رہی ہوں۔

مجھے احساس ہے کہ تم نے مجھ پر بہت رقم خرچ کی ہے۔ تم نے شادی کے بعد مجھ پر تحائف کی بھرمار کر دی تھی۔ جان وارلی ایک دولت مند آدمی ہے اور میں بھی لالچی نہیں۔ اس کے علاوہ میں تمہاری دی ہوئی کوئی چیز اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی۔ اس لیے میں زیورات کا ڈبہ اپنے ساتھ نہیں لے جا رہی۔ وہ تجوری کے اندر موجود ہے۔''

پال نے پورا خط پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اچھل کر بستر پر سے کھڑا ہو گیا اور بجلی کی طرح دروازے کی طرف بھاگا لیکن اسے دروازے سے باہر نکلنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور پال لڑکھڑا کر گر پڑا اور اس کے ہاتھ سے مارتھا کا خط چھوٹ گیا۔

☆

یقین

عمران منظور

اسے وہ لفافہ ان کے حوالے کرنا تھا اور پھر اس کا کام ختم ہو جاتا۔ اسے اپنے کام کی اجرت مل چکی تھی۔ اس دوران میں کئی بار اس کے ذہن میں یہ خدشہ بھی آیا کہ کہیں ان لوگوں کو پولیس نے نہ پکڑ لیا ہو۔ یہ خطرہ تو بہرحال ہر وقت ان کے سر پر منڈلاتا ہی رہتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے کار کو آنے میں اتنا وقت لگ گیا تھا۔ پھر تو ..... پھر تو ..... اس کا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ یہ لفافہ اس کی اپنی ملکیت بن سکتا تھا۔

ایک معصوم فطرت شخص کا ماجرا

پانی پر ناچتی ہوئی سورج کی تیز کرنیں مینولی کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں۔

''کہاں'' اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس جھیل کے پار! جہاں پہاڑی پر چڑھتی ہوئی پگڈنڈی نظر آ رہی ہے۔ نظر آ رہی ہے نا'' پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے کسان نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''ہاں نظر آ رہی ہے۔''

''وہ ان صنوبر کے درختوں کے عقب میں ایک سفید مکان ہے' تنہا! ہے نا۔''

''ہاں۔'' مینولی نے آنکھیں سکیڑ کر بغور اس طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ نہ جانے کب سے وہ اس وقت کا منتظر تھا۔ ''کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ انگریز رہتا ہے۔ تمہیں یقین ہے نا اینڈریس! کہیں تم ہمیشہ کی طرح مذاق تو نہیں کر رہے۔؟''

''مجھے ٹرک ڈرائیور نے بتایا تھا۔'' اینڈریس نے کامل سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اس نے گاؤں کے پادری سے سنا تھا۔''

''تو پھر بہتر ہوگا کہ اب میں چل دوں۔'' مینولی بولا۔ ''ان غیر ملکیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ عقل تو ان میں نام کو نہیں ہوتی۔ بس صرف گوشت پوست کے آدمی ہوتے ہیں' بے حس! میں نے اس موقع کے انتظار میں بڑا وقت برباد کیا ہے۔''

''تمہاری بکریوں کا کیا ہوگا۔''

''ان کا۔ وہ انتظار کر سکتی ہیں۔ جب میں اس آدمی کو ڈھونڈ لوں گا اور وہ میرے کاغذ پر اپنی زبان میں لکھ دے گا تو پھر مجھے ان بکریوں کی ضرورت نہیں ہوگی میرے دوست! تم میری ساری بکریاں لے لینا۔ میں ان بکریوں کو امریکہ لے جا کر کیا کروں گا۔''

''تمہاری واپسی تک میں ان کی دیکھ بھال

کروں گا مینولی۔'' اینڈریس بولا۔ ''نہ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے! ضروری نہیں کہ جو تم سوچ رہے ہو ویسا ہی ہو۔ میرا مطلب ہے' فرض کرو کہ تمہارا کاغذ.....'' وہ چپ ہو کر بے چینی سے اپنے دوست کو دیکھنے لگا۔

''تمہیں اعتبار نہیں آ رہا!'' مینولی بولا۔ ''یہ کاغذ بے حد قیمتی ہے۔ میں نے اسے پانچ سال سے اسی دن کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''حالانکہ پہلے مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ یہ سمندر میں سے بہتا ہوا ٹھیک اسی جگہ آ گیا تھا جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں۔ میں اس وقت یہاں بیٹھا تھا اور یہ کسی سانپ کی طرح بہتا ہوا میرے قریب آ گیا تھا۔ مجھے یہ کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے اسے پانی سے نکالا اور اس چٹان پر سوکھنے کو ڈال دیا۔ پھر وہ جو آدمی ایتھنز سے آیا تھا' اس نے بتایا کہ یہ کیا چیز تھی۔''

''کیا بتایا تھا اس نے'' اینڈریس نے پوچھا حالانکہ وہ یہ داستان پہلے بھی کئی مرتبہ مینولی کی زبانی سن چکا تھا۔

''اس نے بتایا کہ یہ بہت قیمتی کاغذ ہے۔ اس نے اس قسم کے کاغذات پہلے بھی دیکھے تھے' جب وہ انگلینڈ جانے والے ایک اسٹیم شپ پر ملازمت کرتا تھا۔ اس کے کاغذات پر انگریزی میں کچھ مناسب الفاظ لکھنے پڑتے ہیں اور پھر دولت کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ ایتھنز سے آنے والا وہ آدمی میری بہن کے شوہر کا دوسرا بھتیجا تھا۔''

''ٹھیک ہے' کچھ بھی ہو' میں ابھی تمہاری بکریاں قبول نہیں کر سکتا۔'' اینڈریس بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ آؤ کیفے میں چل کر ایک ایک کپ چائے پئیں۔'' مینولی بولا۔ ''میں تمہیں اپنا کاغذ پھر دکھاتا ہوں۔''

کنارے کے ساتھ ساتھ پہاڑ میں چھوٹے بڑے غار بنے ہوئے تھے' جن میں سے ایک کے اندر کسی آدمی نے میز کرسیاں ڈال رکھی تھیں۔ غار کے باہر کھجوروں کا ایک جھنڈ تھا جس کے سائے میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ وہاں پانی کی گنگناہٹ اور اونگھتی ہوئی بکریوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھیں۔

رات کے وقت ایک لکڑی کے کھمبے کے ساتھ ایک لیمپ لٹکا دیا جاتا' جس کے گرد پروانے اڑتے رہتے۔ لوگ میزوں پر بیٹھے خوش گپیاں کرتے اور بکریاں ادھر ادھر گھومتی رہتیں' پھر دو چار مچھیرے بھی

آ جاتے اس کے بعد گٹار اور بانسری کی دھن پر رقص شروع ہو جاتا۔ یہ کیفے بڑی اہم جگہ تھی۔ مینولی کو اس جگہ اس کاغذ کی قیمت کا پتا چلا تھا۔

مینولی جب اپنے دوست کے ساتھ وہاں پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا اور کیفے خالی پڑا تھا۔ پھر بھی اپنی جیب سے اس قیمتی کاغذ کو نکالنے سے پہلے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر مطمئن ہو کر اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ یہ بڑی نفاست سے تہ کیا ہوا ایک گندا سا کاغذ تھا جو بوڑھے مینولی کے پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ باہر سے گھوڑے کے چمڑے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

''بڑا گندا ہو گیا ہے'' اینڈریس بولا۔

''یہ آدمی کی محنت کا پسینہ ہے جو اس پر لگا ہے۔'' مینولی اسے گھورتا ہوا بولا۔ ''پسینہ وہ ثمر بار برسات ہے جو آدمی کی محنت کی کھیتی کو سیراب کرتا ہے۔''

اینڈریس نے متاثر ہو کر سر ہلا دیا ''اور اگر تمہیں یہ رقم مل جائے گی تو تم کیا کرو گے۔ ہم بوڑھے آدمی تو یہ بھی بھول گئے ہیں کہ رقم کیسے خرچ کی جاتی ہے۔ اس رقم کو خرچ کرنے کے لیے تمہیں جوان ہونا چاہیے تھا۔''

''الیکٹرا کو تو بھول گئے تم!'' مینولی بولا۔

اینڈریس واقعی بوڑھے مینولی کی پوتی الیکٹرا کو بھول ہی گیا تھا۔ الیکٹرا کے بارے میں مینولی کے خیالات سن کر ہر آدمی ہنستا تھا۔ وہ انتہائی حسین لڑکی تھی۔ اس کے علاوہ کیفے کی کھردری دیواریں اس کی بنائی ہوئی تصویروں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کسانوں یا مچھیروں میں ایک بھی نوجوان ایسا نہیں تھا جو اس سے شادی کرنے کے قابل ہوتا۔

''میں جانتا ہوں' میں جانتا ہوں۔'' مینولی اپنے ساتھی کے خیالات پڑھتا ہوا بولا۔ ''ان لوگوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ وہ اس کا ساتھی بنے۔ اس کے علاوہ وہ پیدائشی مصور ہے۔ بس یہ رقم میرے ہاتھ لگ جانے دو' میں اسے لے کر امریکہ چلا جاؤں گا جہاں تیس سال پہلے میرے سارے بھائی جا بسے ہیں۔ وہ وہیں کے قابل ہے۔ یہاں تو دھوپ اور مٹی عورت کو کوئلے کی طرح سیاہ بنا دیتے ہیں۔''

اینڈریس اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے سب کچھ سمجھ کر اس کی تائید کر رہا ہو۔

الیکٹرا رات کے وقت اس کیفے میں آتی تھی اور گاہکوں کو شراب پیش کیا کرتی تھی۔ جب وہ ان میزوں کے گرد چکراتی تو لوگ نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہتے۔ شراب سے زیادہ الیکٹرا کا حسن انہیں مدہوش کر دیتا تھا۔ وہ سرد راتوں میں ایک ایسی آگ تھی جو لوگوں کی رگوں میں خون گرما دیا کرتی تھی۔

مینولی نے بڑی احتیاط سے کاغذ کھولا۔ وہ کئی تہوں میں مڑا ہوا تھا۔ اس کی پشت پر جمے ہوئے میل نے اسے سخت کر دیا تھا۔ پھر مینولی نے اسے میز پر پھیلا دیا۔ یہ کاغذ بہت پرانا تھا۔ یہ منسوخ شدہ تار کا قدیم فٹ بال پول کوپن تھا۔ دونوں افراد بڑی عقیدت سے اس پر لکھے ہوئے غیر ملکی حروف کو دیکھنے لگے۔

''تو یہ ہے۔'' اینڈریس ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

وہ خاموشی سے شراب پیتے رہے اور ساحلی ہوا یوکلپٹس کے درختوں میں سے گزر کر میدانی ریت کو اڑاتی ہوئی پہاڑیوں کی طرف لے جاتی رہی۔ مینولی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آدمی دعا کرتا رہے محنت کا پسینہ بہاتا رہے' پھر دیکھیے کہ قسمت کس طرح بدلتی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اس کے اندر ایک سرد سی لہر دوڑ رہی تھی۔ نہ جانے امریکہ کیسا ہو۔ حسین و نوخیز الیکٹرا کو بھی یہ احساس بھی نہ ہوگا کہ اس کا بوڑھا دادا کس طرح سورج کی تپش اور ریت کے طوفانوں میں سوکھتا رہا اور کس طرح اسے اس جہنم سے نکال کر بہشت ارضی میں لے آیا تھا۔

''اور اب میں چلا۔'' مینولی اچانک بولا۔ اس نے کاغذ سمیٹ کر اپنی جیب میں رکھا اور اٹھ کھڑا

ہوا۔ ''میں سڑک پر ہولیتا ہوں' یہاں تک کہ ٹرک ڈرائیور مل جائے پھر میں اس پر سوار ہوکر اس انگریز کے پاس پہنچ جاؤں گا۔

☆☆☆

پہاڑی پر سفید مکان سورج کی روشنی میں شکر کے ڈھیر کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کا واحد مکین جسے اینڈریس نے انگریز بتایا تھا' اپنی کھڑکی کے شیشے سے مینولی کو آتا دیکھ رہا تھا۔ وہ جرائم کی دنیا میں کبھی خود کو یونانی' کبھی فرانسیسی اور کبھی اطالوی ظاہر کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں بکری کی طرح زرد تھیں جن میں بڑی خوفناک چمک تھی' شیشے کے عکس کی وجہ سے اس کا جسم کسی چیتے کے جسم کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں پڑے ریوالور کے بٹ پر تھا۔

''کون ہے'' وہ انگریزی میں چلایا۔ ''قریب مت آنا۔'' پھر وہ نہ جانے کیا کیا بڑبڑانے لگا۔ شاید طویل تنہائی نے اسے نیم دیوانہ بنا دیا تھا۔

مینولی بڑی معصومیت سے اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں فٹ بال کا کوپن تھا اور دوسرے میں ایک چھوٹی سی کھسی ہوئی پینسل۔

اس شخص نے ریوالور واپس ہولسٹر میں ڈالا اور دروازہ کھول کر نکل آیا۔ وہ مینولی کے قریب آنے کا انتظار کررہا تھا۔

''تمہارا مکان بڑی خوب صورت جگہ ہے انگلش مین!'' مینولی بولا۔

''مگر یہاں تک پہنچنے کے لیے آدمی کو بڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔'' بوڑھا بہت ساری اونچی نیچی پہاڑیاں طے کرکے یہاں تک آیا تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو'' وہ غرایا اور مینولی حیرت سے اس کی صورت تکنے لگا۔ اسے اس طرح کے استقبال کی توقع نہیں تھی۔

''آپ کا مکان بہت خوب صورت ہے جناب' بہت اچھا!'' مینولی نے خلیق لہجے میں کہا۔ ''میں جھیل کے اس پار والے جزیرے سے آیا ہوں۔''

اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''بوڑھے آدمی کے لیے یہ بڑا لمبا سفر ہے مگر آپ جیسے جوانوں کے لیے تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ہاں ایک وقت تھا کہ میں.....''

''میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کیا کام ہے۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں.....؟''

''مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔'' مینولی کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں رہتا ہوں۔؟''

''پتا! ہر شخص کو پتا ہے کہ یہاں ایک انگریز رہتا ہے۔''

''اچھا! اور میرے خیال میں وہ اس بارے میں باتیں بھی کرتے ہوں گے۔''

''لوگ تو باتیں کرتے ہی ہیں۔'' مینولی سادگی سے بولا۔ ''اسی وجہ سے تو میں یہاں ایک درخواست لے کر آیا ہوں کہ آپ ذرا میری مدد کردیں۔''

انگریز آدمی خوفناک نظر سے مینولی کو کاغذ کھولتے دیکھتا رہا اور جب اس نے قدیم کوپن دیکھا تو اس کے حلق سے قہقہہ پھوٹ پڑا۔

''آپ اس کاغذ کے بارے میں جانتے ہیں جناب۔؟''

''تمہارے ہاتھ یہ کہاں سے لگ گیا بوڑھے آدمی؟''

''یہ سمندر میں بہتا ہوا آیا تھا اور میں نے اسے نکال لیا۔ اسی وقت سے میں کسی انگریز کا انتظار کررہا تھا جو اس پر کچھ لکھ دے تاکہ مجھے رقم مل جائے۔''

اس نے انگریز کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا بنتا دیکھا۔

''یہ بڑی آسان سی بات ہے۔'' مینولی نے اسے سمجھایا۔ ''بس چند حروف لکھنے ہیں اور جب مجھے اس کی رقم مل جائے گی تو میں شکریے کے طور پر آپ کو بھی ضرور کچھ نہ کچھ پیش کروں گا۔''

''کیا یہ اتنی ہی آسان بات ہے'' وہ شخص پھر ہنس پڑا مگر اس کا انداز بڑا تضحیک آمیز تھا۔ ''تمہیں

معجزے کی توقع ہے میرے بوڑھے دوست! اور مجھ سے معجزے سرزد نہیں ہوتے' میرا مشورہ ہے کہ اسے پھاڑ کر پھینک دو اور جس طرف سے آئے ہو اسی طرف چلے جاؤ اور میرے بارے میں بھول جاؤ۔ تم اپنے لوگوں سے بھی کہہ دینا کہ میرا تذکرہ اب کبھی ان کی زبان پر نہ آئے۔''

مینولی نے ایک نظر اس شخص کے چہرے پر ڈالی پھر اپنے کوپن کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ بڑی احتیاط سے اسے دوبارہ تہ کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انگریز پہلے کس بات سے اتنا محظوظ ہو کر ہنسا تھا اور اب کیوں غصہ ہو رہا تھا۔ اسے سورج کا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس ہونے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم دس سال زیادہ بڑا ہو گیا ہو۔ جب وہ مڑا تو اس کے کندھے اور بھی جھکے ہوئے تھے۔ یہ آدمی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اب نہ جانے پھر اسے کتنے سال اور انتظار کرنا پڑے۔

مینولی سر جھکائے پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ انگریز وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا' پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اسے یہاں کسی کی مخالفت مول لینا نہیں چاہیے۔ اس طرح اس کی موجودگی اور زیادہ مشتہر ہو جائے گی۔ ''ایک منٹ بوڑھے آدمی!'' وہ چلایا۔ ''ذرا واپس آنا۔''

مینولی مڑ کر پھر اس کے قریب آ گیا۔

''میں معجزے نہیں دکھا سکتا۔'' انگریز بولا اور اس کے ہاتھ سے کوپن لے کر دیکھنے لگا۔ ''اتنے گندے کاغذ پر آخر کوئی کیسے لکھ سکتا ہے۔''

''یہ گندگی نہیں ہے بیٹے' یہ پسینہ ہے۔'' مینولی ناصحانہ انداز میں بولا۔ ''آدمی کو اپنے پسینے سے شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ انسان کی مشقت کا تلخ رس ہے۔ یہ ایک ایسی ثمر بار برسات ہے جو پہاڑوں کو بھی گلزار بنا سکتی ہے۔''

''پھر تو شاید معجزہ ہو ہی جائے۔''

''مجھے پورا یقین ہے۔''

انگریز نے اپنی جیب میں سے ایک موٹا سا لفافہ نکالا اور ایک لمحے تک دیکھتا رہا' پھر مسکرا دیا۔ ''یہ کوپن اور پینسل مجھے دو' میں اس پر لکھ دیتا ہوں۔'' اس نے کوپن لفافے پر رکھا۔ ''پسینہ اور یقین! بس اس سے چپکے رہو' تمہاری صحت بحال رہے گی دوست! مگر میرا فلسفہ اس سے مختلف ہے۔ میں تیزی اور صفائی سے کام کرنے کا قائل ہوں۔''

وہ کوپن پر الٹے سیدھے حروف لکھنے لگا اور مینولی اسے عقیدت آمیز نگاہ سے دیکھتا رہا۔ انگریز نے پینسل کی نوک کو دیکھا۔

''پسینہ اور محنت! تم لوگوں کو اس سے محبت ہے نا۔ اسی لیے تمہاری پینسل بھی لوہے کی طرح سخت ہے۔ مجھے اس سے لکھنے میں ایسا لگتا ہے جیسے ہل چلا رہا ہوں۔''

''سخت چیزیں زیادہ دیرپا ہوتی ہیں۔'' مینولی بولا۔

''اب کے تم نے کام کی بات کی ہے۔ سخت چیزیں واقعی بہت دیرپا ہوتی ہیں۔ مگر تمہیں احساس نہیں ہے کہ تم نے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔'' وہ بولا۔ ''تمہارا نام کیا ہے۔ اور تم کہاں رہتے ہو'' اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

مینولی نے اسے بتا دیا۔

اس نے کاغذ کو لفافے پر کھسکایا اور اس کا نام اور پتا لکھ دیا۔ یہ لکھ کر اس نے لفافہ جیب میں رکھا۔ ''یہ تم میرے پاس چھوڑ جاؤ۔'' اس نے کوپن لہراتے ہوئے کہا۔ ''اب تم گھر جاؤ اور اپنا پسینہ بہاتے رہو! لیکن اس طرف کبھی مت آنا' سمجھے! اور لوگوں میں یہ بات پھیلا دینا کہ مجھے ملاقاتی پسند نہیں ہیں۔''

مینولی نے کمر سیدھی کی اور کوٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔ پھر اس نے گلا صاف کیا۔ ''جناب!'' وہ بولا۔ ''آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے۔''

''اب تم یہاں سے چل دو' مجھے اور بھی کام ہیں۔''

''کوئی بات نہیں جناب! ناراض نہ ہوں۔ آپ کے طریقے ہمارے طریقوں سے بہت مختلف

ہیں۔ جب رقم آ جائے گی تو میں یہاں پھر آؤں گا اور پھر ہم خوب پئیں گے اور تھوڑا سا رقص کریں گے۔ میرا ایک دوست ہے جو بڑی اچھی بنسری.....''

انگریز مڑا اور مکان میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔

کھڑکی میں کھڑے ہو کر وہ مینولی کو پہاڑی سے اترتا دیکھتا رہا۔ جب مینولی بالکل چیونٹی کی طرح دکھائی دینے لگا تو اس نے کوپن کی دو تین تہیں کیں اور اسے پھاڑ کر فرش پر اچھال دیا۔ ''پسینہ اور یقین۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''کرتے رہو زندگی بھر انتظار بوڑھے آدمی! تمہارا پسینہ تمہیں دولت کے ڈھیر کے کبھی اتنا قریب نہیں کرے گا جتنا تم آج آ گئے تھے۔'' اس نے اپنی جیب میں موٹے لفافے کی موجودگی محسوس کی جسے اس نے کوپن پر لکھنے کے لیے ایک میز کی طرح استعمال کیا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تیر گئی۔

☆☆☆

رات ہوتے ہی اس شخص نے کھڑکی کے قریب کرسی کھینچ لی اور اس پر بیٹھ کر وادی میں نیچے تک اترتی سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ یہاں دو ہفتوں سے کسی کار کا منتظر تھا جو یقیناً جلد ہی آنے والی تھی۔ وہ ایک لمحے کے نوٹس پر یہاں سے بھاگنے کے لیے تیار تھا۔ اسے صرف یہ بھورا موٹا لفافہ دینا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جیب تھپتھپا کر لفافے کی موجودگی کا یقین کیا۔ اس کے اندازے میں ذرا بھی غلطی کا امکان نہیں تھا۔ وہ ایجنٹوں کے عظیم جال کا محض ایک چھوٹا سا پرزہ تھا۔ انہوں نے اسے اس پہاڑی پر انتظار کرنے کی ہدایت کی تھی۔ جب کار آ جاتی تو اسے وہ لفافہ ان کے حوالے کرنا تھا اور پھر اس کا کام ختم ہو جاتا۔ اسے اپنے کام کی اجرت مل چکی تھی۔ اس دوران میں کئی بار اس کے ذہن میں یہ خدشہ بھی آیا کہ کہیں ان لوگوں کو پولیس نے نہ پکڑ لیا ہو۔ یہ خطرہ تو بہرحال ہر وقت ان کے سر پر منڈلاتا ہی رہتا تھا۔ ثانیاً اسی وجہ سے کار کو آنے میں اتنا وقت لگ گیا تھا۔ پھر تو..... پھر تو..... اس کا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ یہ لفافہ اس کی اپنی ملکیت بن سکتا تھا۔

برآمدے سے باہر ہوا سوکھے پتوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کو اڑا رہی تھی۔ وہ متفکر سا انہیں دیکھنے لگا۔

''یقین!'' وہ بڑبڑایا۔ ''اب بوڑھا آدمی بیٹھا رہے گا' سالوں انتظار کرتا رہے گا' یہاں تک کہ اس کی زندگی کا تار ٹوٹ جائے گا۔'' اس نے معجزوں کے منتظر لوگوں کا یہی حشر دیکھا تھا۔ آدمی کو اپنی دنیا آپ بنانی چاہیے۔ قسمت تو صرف ایسے ہی بوڑھوں کے لیے ایک دلکش لفظ تھا جن کے جسموں میں خون کی جگہ پانی دوڑ رہا ہو۔ ''میری قسمت میری بغل کے نیچے ہے۔'' وہ خود سے بولا۔ ''میں اپنے معجزے اپنی انگلیوں کی مدد سے دکھاتا ہوں۔ معجزوں سے بھرا ہوا لفافہ.....''

فضا میں تاریکی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ آسمان پر ستاروں کی محفل سجی ہوئی تھی مگر تاریکی دور کرنا جیسے ان کے بس کی بات نہ تھی۔ دور دور تک کسی کار کی ہیڈ لائٹس کے نشان نہیں تھے۔ وہ اٹھ کر اندر کے کمرے میں چلا گیا جہاں اس نے کھانا رکھا ہوا تھا۔ وہ کار اسی وقت آئی تھی۔ اس کی روشنیاں درختوں کو چمکا رہی تھیں پھر پہاڑی سڑک پر روشنی کی لکیریں تیرنے لگیں۔ وہ شخص اندر ہونے کی وجہ سے انہیں مکان کی طرف بڑھتے نہ دیکھ سکا۔ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا' نہ جانے کس وقت آ دبوچے۔

جب اس نے مکان میں کسی کے قدموں کی آواز سنی تو اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ کھڑکی میں سے یہ دیکھ کر بھی کہ کچھ کرنے کا وقت گزر چکا تھا اور آنے والے یونیفارم میں تھے' اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کا بچنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس نے مکان سے باہر چھلانگ لگاتے ہی اپنی پشت میں گرم گرم سیسہ اترتے محسوس کیا۔ اس کے منہ میں نوالہ پھنس کر رہ گیا جسے وہ نہ اگل سکتا تھا اور نہ ہی نگل سکتا تھا۔ سڑک کی طرف رینگتے ہوئے اسے دوسری گولی لگی۔ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

جب انہوں نے اس کی لاش اٹھائی تو سڑک کے قریب پتھروں پر پڑا ہوا بھورا موٹا لفافہ انہیں نظر

نہ آ سکا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑے رہے، پھر کاران کے قریب آ کر رکی۔ انہوں نے لاش اس کی عقبی سیٹ پر رکھی اور کار روانہ ہوگئی۔ اب پھر وہاں پہلے کی طرح سناٹے کا راج تھا۔ صرف مکان میں آدھ کھائی روٹی اور پتھروں کے درمیان پڑا ہوا لفافہ ہی اس بات کا مظہر تھا کہ یہاں بھی کوئی آدمی رہتا تھا۔

صبح ایک کسان اپنے گدھے پر سامان لادے اس طرف سے گزرا۔ اگر اس کا گدھا خون کے نشانات سونگھتے وہاں نہ رک جاتا تو کسان کو وہ لفافہ کبھی نظر نہ آتا۔ اس نے لفافہ اٹھا کر غور سے دیکھا۔ اس پر کسی کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ تحریر مدھم تھی مگر آسانی سے پڑھی جا سکتی تھی۔

☆☆☆

سمندر کے قریب جہاں سے سڑک گزرتی تھی، یوکلپٹس کے درختوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی ہموار جگہ تھی جو مینولی نے اپنے بیٹھنے کے لیے منتخب کی تھی۔ وہ یہاں ٹرک ڈرائیور کا انتظار کیا کرتا تھا۔ جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس کے لیے اس کا خط کے بدلے ضرور انگلینڈ سے رقم لے کر آئے گا۔ وہ یہاں بڑے اطمینان سے بیٹھا مونچھوں کو سہلاتا اور ٹھنڈی ہوا میں اپنے سینے کا پسینہ سکھاتا رہتا تھا۔ اس کی بکریاں اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی آس پاس چرتی رہتی تھیں۔ اسے اس سایہ دار کنج میں انتظار کرتے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ اینڈریس سڑک کو پار کر کے اس کنج میں آ گیا۔

''تم ابھی تک کاہلی کے مزے لے رہے ہو۔'' وہ آتے ہی بولا۔ وہ اس وقت اپنے کھیت پر محنت کر کے آیا تھا۔ اس کے چہرے اور بالوں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ جب میرا جواب آئے تو میں یہاں موجود رہوں۔'' مینولی سادگی سے بولا۔ ''مجھے اس کیفے والے بڈھے شیطان پر ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔''

پگڈنڈی پر دھویں کا ایک غبار سا اٹھا اور وہ دونوں اس طرف دیکھنے لگے۔ ٹرک کچے سے پکے پر آیا اور پھر ان کے قریب آ کر رک گیا۔

''مینولی!'' ٹرک ڈرائیور اپنی کھڑکی میں سے سر نکال کر چلایا۔

''آیا۔'' بڈھا کھڑا ہو کر بلند آواز میں بولا۔

ڈرائیور نے گھوم کر اپنے تھیلے میں سے ایک موٹا بھورا لفافہ نکالا جو اسے راستے میں گدھے والے نے دیا تھا۔ لفافہ بڑا موٹا اور بھاری تھا۔ ''مینولی! یہ اپنی امانت سنبھالو اور ڈاک کا خرچہ ادا کرو اس پر کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔'' ڈرائیور منہ بنا کر بولا۔ ''تمہارے دوست تمہیں ایک ٹکٹ کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ کیسے دوست ہیں تمہارے.....''

مینولی نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لیا اور اس کی تحریر دیکھنے لگا۔ الفاظ کاربن کاپی کی طرح کے مدھم تھے، بھورے بھورے حروف جیسے لکھنے والے نے بہت دباؤ دے کر لکھا ہو۔ اس کے کنارے پر ایک کراس کا نشان بنا ہوا تھا جو وہ نہیں دیکھ سکا۔ مینولی نے لفافہ کھول کر اندر جھانکا۔ اس میں بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے ایک طویل سانس نکل گیا۔ اینڈریس نے بھی جھک کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

''تو وہ بات سچ ہی تھی!'' وہ بڑبڑایا اور مینو نے جلدی سے سر ہلا دیا۔

''یہ صرف انتظار اور یقین کی بات تھی۔ یقین پختہ ہو تو کوئی چیز مشکل نہیں ہے۔''

''اور پسینہ!'' اینڈریس بولا۔

''اور پسینہ۔'' مینولی گردن تانتے ہوئے بولا ''پسینہ وہ برسات ہے اینڈریس جو انسان کی مشقت کے پھولوں کو شادابی بخشتا ہے۔ آدمی کی قسمت اس کے پسینے ہی سے لکھی ہوئی ہے میرے دوست.....''

اینڈریس فرمانبردار شاگرد کی طرح گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆

انعام

انجم شہزاد

آرام اس کے لیے دوزخ تھا۔ کچھ نہ کچھ ہمیشہ کرتی ہی رہتی۔ جب ہاتھ میں کچھ کام باقی نہ رہا تو وہ اندر آئی۔ دیکھا تو بچہ سو رہا ہے..... وہ کچھ دیر یوں ہی کھاٹ کے پاس کھڑی رہی۔ ماں کی ممتا پھر امڈی۔ بچے کو پیار سے دیکھا۔ کیا انو کھا بچہ ہے۔ گھر میں ہو کر بھی یتیموں سا رہتا ہے۔ میں تو ہمیشہ ہی جھڑکتی رہتی ہوں۔ لیکن انہیں کہاں دھیان ہے، اپنا یا کس کا.....!

ایک حساس و دل گداز تحریر

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔

قصبہ کے ہائی اسکول کے احاطہ میں لڑکے ادھر سے ادھر گھوم رہے ہیں۔ چہل پہل ہے، ایک ہنگامہ ہے اور یہ سب اس لیے ہے کہ بچوں کے امتحان کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ تاخیر برداشت نہیں ہو رہی ہے اور آخر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، نتیجہ نکلا..... چپراسی کو یہ مشکل پیش آئی کہ وہ کاغذ کو بورڈ پر کیسے چپکائے۔ چھین جھپٹ، کھینچ تان میں پتا بھی نہ چلا کہ کاغذ پڑھتے، آنکھیں گڑاتے، غور کرتے اور پھر لوٹ جاتے۔ پھر آہستہ آہستہ شور شرابے، ہنگامے میں کمی

آئی اور تب سب سے الگ تھلگ بیٹھا ایک لڑکا اپنی جگہ سے اٹھا، عمر مشکل سے دس برس ہوگی۔ وہ دھیمی چال سے آگے بڑھا اور پھر بورڈ کے آگے ٹھہر گیا۔ بورڈ پر لگے کاغذ کو غور سے دیکھا پھر مطمئن ہوگیا اور ویسی ہی دھیمی چال سے آگے بڑھ گیا۔

یہ لڑکا دھن جئے ہے اور سامنے بورڈ پر لگے کاغذ میں لکھا کہ وہ ساتویں درجہ میں اول آیا ہے اور اب وہ آٹھویں درجہ میں پہنچ چکا ہے۔

دھن جئے اسی طرح چلتا ہوا اپنے گھر آیا اور ماں سے بولا۔

''اماں، میں پاس ہوگیا ہوں۔''

اس کی ماں ویسے ہی کام میں لگی رہی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ بس وہ ایسی ہی تھی۔

بچے نے پھر جوش میں کہا۔ ''اماں، میں اول آیا ہوں..... پوری کلاس میں اول۔''

لیکن ماں اسی طرح کام میں مشغول رہی.....

پھر اس نے ذرا سا سر اٹھایا پھر کہا..... ''اچھا.....''

دیکھا نہیں اور ویسے ہی کام میں لگی رہی..... دھن جئے ویسے ہی کھڑا رہا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ کہے اماں، میں اول آیا ہوں۔ ساری کلاس میں اول..... مگر کہا نہیں۔

اچانک جیسے ماں کو کچھ یاد آ گیا ہو۔ ماں نے کہا۔ ''لے کھانا کھالے۔ سویرے ہی چلا گیا تھا بغیر کچھ کھائے پیے۔ سنا ہی نہیں..... ہاں..... تو اب آیا ہے..... نو بج گئے۔''

دھن جئے نے پوچھا..... ''پتا جی چلے گئے۔؟''

''میں کیا جانوں۔ گئے ہوں گے۔''

دھن جئے کو جیسے یہ سوال کچھ ٹھیک نہیں لگا۔ لیکن اول آنا کوئی چھوٹی بات نہ تھی۔ پھر بولا.....

''جلدی چلے گئے آج۔ میں تو آیا تھا کہ.....''

ماں نے کہا۔ ''ہاں..... ہاں..... نہال کر کے رکھ دیتے وہ تو..... لے بیٹھ۔''

دھن جئے کو بات سمجھ میں نہیں آئی..... سچ تو یہ ہے کہ اب وہ سمجھنے کی کوشش بھی چھوڑ چکا ہے۔ کیا فائدہ..... یوں ہی وہ کم سمجھ دار نہیں۔ ماں کی جھڑکی پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر ماں نے کھانا لگا دیا۔ ویسے ہی بجھے من سے دکھانے لگا۔ کھاتے کھاتے بار بار اس کا ذہن وہیں لوٹ آتا تھا۔ درجے میں اول آنا کوئی چھوٹی موٹی بات تو نہیں۔ وہ بھی دس سال کی نازک سی عمر میں..... اب وہ آٹھویں کلاس میں ہے..... لیکن اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اپنے باپ کے لیے اس کے دل میں تھوڑی سی ہمدردی جاگی۔ ایک خیال سا اس کے دل میں لہرایا کہ کیسے جلدی میں کوٹ پہنا ہوگا پتا جی نے، چھتری لی ہوگی اور دفتر روانہ ہوگئے ہوں گے۔ وہ کھاتا رہا اور پتا جی کو جاتے دیکھتا رہا۔ اچانک تصور کے پردے سے پتا جی اوجھل ہوگئے۔ اب سامنے ماں کی تصویر تھی۔ ماں جو کچھ کہہ رہی تھی۔

''اور لے گا.....''

''نہیں.....''

''تو اچھا..... اب بیٹھ کے پڑھ..... باہر آنا جانا کہیں نہیں۔ یہ نہیں کہ اودھم مچانے نکل گئے۔''

اس نے سن لیا۔ ایک لمحے کو یوں ہی ماں کی طرف نظر اٹھائی۔ پھر آنکھیں نیچی کرلیں۔ کھانے کے خالی برتنوں کو اٹھایا اور انہیں جوٹھن کی جگہ رکھنے بڑھ گیا۔ ماں دیکھتی رہی۔ یہ لڑکا اس کی سمجھ سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ کبھی لڑکے جیسا رہتا ہی نہیں جیسے سیانا بزرگ ہو۔ کبھی کبھی وہ ڈر بھی جاتی۔ خود پر غصہ بھی آتا ہے۔ ڈانٹتی ہے تو پچھتاوا سا ہوتا ہے۔ ماں کی ممتا اچانک شدت سے امڈتی تھی اور یہی شدت کبھی کبھی خفگی کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ ممتا کے پاس اور کوئی دوسرا راستہ تب نہیں ہوتا۔

ماں یکا یک بولی..... ''کیوں میرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں کیا۔ لاڈلے صاحب برتن اٹھا کر رکھنے چلے۔ سن لے۔ میرے یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ یہ نخرے باپ کو دکھانا۔''

وہ ویسا ہی چپ رہا۔ خاموشی اور سنجیدگی اوڑھے۔ ماں غصے میں بکتی بولتی ہوئی آگے بڑھ گئی

تیزی سے اپنے کام میں جٹ گئی۔ اس کے پاس ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لیے بس ایک ہی حل ہے۔ کام، کام اور صرف کام..... اپنی دھن میں وہ پھر مگن ہوگئی..... دھیان بٹانے کے لیے۔

کام کے درمیان اس نے سنا۔ دھن جیے کہہ رہا ہے ''میں جارہا ہوں۔'' ماں کے دل میں پھر جیسے تیز آگ بھڑک اٹھی۔ دہاڑ کر بولی..... ''نہیں''

وہ جیسے بہرا ہوگیا تھا۔ کچھ سنا ہی نہیں۔ دروازے کی طرف بڑھا۔ ماں بجلی کی طرح لپکی۔ اس کا بازو تھاما۔ کہا ''جاتا کہاں ہے، آ، آج تیری ہڈی پسلی ہی توڑ دوں۔''

بچے نے کچھ نہیں کہا۔ ویسا ہی چپ کھڑا رہا۔ ماں نے مارا نہیں۔ کھینچتے ہوئے اندر لے آئی، کھاٹ پر پٹک دیا۔ پھر بولی۔

''مجھے تو نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں گھر کی نوکرانی ہوں..... ایک بار جب کہہ دیا کہ باہر نہیں جانا ہے تو تیری ہمت کیسے ہوئی اٹھنے کی؟''

بچے نے دھیرے سے کہا۔ ''مجھے کام ہے۔''

''کام ہے۔'' ماں نے کہا ''بتاؤں، تجھے کیا کام ہے۔؟''

لیکن اپنی دھمکی سے ماں کو تسلی نہیں ہوئی۔ وجہ، بچے پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ویسا ہی شانت اور سنجیدہ۔ اس کے اندر کی آگ زوروں سے بھڑکتی رہی۔ لیکن پتا نہیں، اس نے کیسے خود پر قابو رکھا تھا۔ بچہ اچانک مسکرایا۔ معصومیت سے بولا۔

''اول آنے کی سب کو مٹھائی کھلانی ہے نا، پتا جی نے کہا تھا۔''

''پتا جی نے کہا تھا..... آئے بڑے پتا جی۔ مٹھائی کھلائیں گے۔ گھر والوں کو پہلے روٹی تو کھلالیں۔ ان کو تو بس لٹانا آتا ہے۔ یہیں کونے میں بیٹھ اور اپنا کام دیکھ.....''

بچہ کھاٹ پر چپ چاپ پیر لٹکائے بیٹھا رہا۔ ایک لمحے کو ماں کی طرف نظر اٹھائی۔ کچھ بولا نہیں۔ ماں بھی لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی۔ وہ خود کو سمجھ نہیں پارہی تھی۔ اسے اپنے بچے پر فخر تھا کیا انوکھا بچہ ہے یہ اس کا لاڈلا..... اول آیا ہے کلاس میں، آئے گا کیوں نہیں۔ اس کا بیٹا جو ہے۔

ماں پھر بولی۔ ''خبردار اپنی جگہ سے جو ہلا..... ٹانگ توڑ کر رکھ دوں گی۔ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟''

اتنا کہہ کر وہ باہر کمرے کی طرف مڑی۔ قدم اچانک پھر ٹھہر گئے۔ اس بار اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''سچ بتا، کہاں جارہا تھا۔''

بچہ چپ رہا۔ کچھ بولا نہیں۔

ماں نے ٹھنڈی سانس بھری..... ''میں سب سمجھتی ہوں۔ وہیں جارہا ہوگا۔ کہہ گئے ہوں گے چپکے سے کہ..... آنے دو انہیں.....'' بچہ پھر چپ

قابل دید

ایک دن دو چیونٹیاں خوراک تلاش کررہی تھیں اچانک راستے میں ان کو ایک ہاتھ ملا۔ ایک چیونٹی دوسری سے تیزی سے بولی۔

''وہ دیکھو سامنے سے ہاتھی چلا آرہا ہے۔ آج اس کو مار گرائیں۔''

یہ سن کر دوسری نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

''رہنے دو پھر کبھی سہی۔ آج وہ بے چارا اکیلا ہے۔ اور ہم دو ہیں۔''

☆

ایک چوہیا اپنے تین ننھے منے بچوں کے ساتھ شام کی سیر کو نکلی کہ ایک بلی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ بلی ان کی طرف جھپٹتی، چوہیا اپنی پوری طاقت سے چلائی۔

''بھوں بھوں..... بھوں بھاؤں۔''

بلی ہکا بکا رہ گئی اور اپنے قدموں واپس دوڑ گئی۔

چوہیا نے اپنے بچوں سے کہا۔

''اب تم جان گئے ہوگے کہ اپنی مادری زبان سیکھنے کے علاوہ بھی کوئی اور زبان سیکھنا کتنا ضروری ہے۔'' ☆

رہا۔

ماں نے کہا ''بولتا کیوں نہیں ہے۔ وہیں مٹھائی پہنچانے جارہا تھا نا۔''

بچے نے اس بار کچھ ڈھیٹ بنتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا..... ''ہاں وہیں جارہا تھا۔''

ماں اچانک سناٹے میں آ گئی۔ پھر جیسے اس کا خود پر بس نہ چلا..... بچے کو مارتی چلی گئی..... اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ بچہ پٹتا رہا، مگر رویا نہیں۔ ماں تھک گئی..... وہ اب تک سناٹے میں ڈوبی تھی..... پھر تھک ہار کر بچے کو کھاٹ پر ویسا ہی اوندھا پڑا چھوڑ کر لوٹ آئی۔ سوچنے لگی یہ کیسی قسمت ہے اس کی، گھر میں ایک اکیلی وہ ہے اور ایک اس کا کام..... کام ہی ایک سنگی ساتھی ہے..... ایک روز اسی طرح مر جانا ہے..... باقی سب بیری ہیں..... مجھے تو موت ہی آ جائے..... تو بھلا۔ ایک وہ ہیں۔ صبح ہوئی نہیں۔ چھاتا اٹھایا اور چل دیے۔ پھر شام کو آئے کہ کھانا بنا۔ میں کروں بھی اور مروں بھی..... مرنے کو میں، موج کرنے کو کوئی دوسری..... اور ایک یہ ہے کمبخت۔ مجھے تو گنتا ہی نہیں۔ بس ہمیشہ اس کے کہنے پر..... گھر کیا ہے جیل ہے..... اس نے سب پر جادو کر رکھا ہے..... نہیں تو جہاں ہوتی چلی جاتی۔ میں یہاں کا منہ نہ دیکھتی۔ نہ دانہ پانی لیتی اور یہ چھوکرا تو ایسا بے حیا ہے کہ.....

ماں تو سوچتی جاتی اور کام بھی کرتی جاتی۔ کچھ زیادہ ہی صفائی کر ڈالی پھر بھی تھکی نہیں۔ خالی پن اسے کاٹتا تھا۔ آرام اس کے لیے دوزخ تھا۔ کچھ نہ کچھ ہمیشہ کرتی ہی رہتی۔ جب ہاتھ میں کچھ کام باقی نہ رہا تو وہ اندر آئی۔ دیکھا تو بچہ سو رہا ہے..... وہ کچھ دیر یوں ہی کھاٹ کے پاس کھڑی رہی۔ ماں کی ممتا پھر امڈی۔ بچے کو پیار سے دیکھا۔ کیا انوکھا بچہ ہے۔ گھر میں ہو کر بھی تیموں سا رہتا ہے۔ میں تو ہمیشہ ہی جھڑکتی رہتی ہوں۔ لیکن انہیں کہاں دھیان ہے، اپنایا کس کا.....

وہ آہستہ سے اپنے لاڈلے کے پاس بیٹھ گئی۔ ہولے سے اس کے گال کے پاس ہتھیلی رکھ دی۔ پھر پچکارتے ہوئے بولی۔

''اٹھ بیٹے۔''

بچے نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ ماں کا پچکارنا اسے اچھا لگا۔ جیسے یہ محبت اس کے حصے میں برسوں بعد آئی ہے۔ اس نے پھر آنکھیں میچیں اور خود کو ممتا کے بہاؤ میں چھوڑ دیا۔ ماں نے بچے کے چہرے کو پیار سے سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''آنکھیں کھول بیٹا۔ کیا انعام لے گا ماں سے۔؟''

بیٹا بے حال ہی تو ہو گیا..... لیکن کچھ بولا نہیں۔ ماں پھر بولی۔ ''دو روپے۔ اچھا چل..... پانچ روپے لے لے..... لیکن چل اٹھ تو سہی۔''

اتنے میں اس کے کانوں میں آواز آئی۔

''اوہو، آج تو لاڈلے سے بڑا پیار جتایا جارہا ہے.....''

اس کے ساتھ ہی بچے کے پتا نے ایک کھونٹی سے چھاتا لٹکا دیا۔ کوٹ کے بٹن کھولنے شروع کر دیے۔

بچے کی ماں فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ چہرہ کھنچ گیا۔ ہونٹ غصے سے سلگ گئے۔ وہ تیزی سے باہر جانے کو ہوئی۔ بچہ تیز آواز میں بولا۔ ''پتا جی، میں کلاس میں اول آیا ہوں۔''

''اوہ، تب ہی تو میں کہوں یہ پانچ روپے کس بات کے مل رہے تھے۔''

ماں بولی۔ ''کیسے پانچ روپے۔ آسمان سے گر رہے ہیں کیا یا تم نے لا کر دیے۔ گھر میں روپے تو ہیں، لیکن کسی اور کے لیے۔''

''اچھا اچھا'' پتا جی نے بات بدلی۔ ''بول کیا انعام لے گا۔؟''

بچے نے ایک لمحے کو سوچا۔ پھر بولا۔ ''آپ دیں گے۔؟''

پتا بولے۔ ''کیسی پاگلوں سی بات کرتا ہے۔ کیوں نہیں دیں گے۔ اول آنا معمولی بات ہے کیا۔''

ماں بولی۔ ''پانچ روپے۔'' اور بچے کے ہاتھ سے پانچ کا نوٹ چھین کر رسوئی گھر میں چلی گئی۔

اسی وقت زینے پر چپلوں کی آہٹ گونجی اور پرمیلا نے قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں رومال سے ڈھکی ہوئی ایک طشتری تھی۔ بچہ اس کی طرف شدت جذبات سے لپکا۔ پرمیلا بولی ''صبر کر۔ تیرے ہی لیے لائی ہوئی۔ کیوں رے۔ کہا بھی نہیں کہ اول آیا ہے۔''

بچے کے پتا نے آہستہ سے کہا۔ ''پرمیلا.....'' اور پرمیلا آس پاس دیکھنے لگی کہ پتنی کہاں ہے لیکن وہ تو رسوئی گھر کی کھڑکی سے سب دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں تو ادھر ہی لگی تھیں۔ جیسے خود پر بس نہ ہو۔ چاہتی ہو کہ نہ دیکھے۔ کچھ بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ دیکھ رہی تھی۔ اندر کے جذبات میں جیسے ہلچل سی مچ گئی تھی۔

پرمیلا کے گلے سے لگے ہوئے بچے کو اچانک ماں کے چہرے کی جھلک نظر آئی۔

پرمیلا نے کہا۔ ''بتا کیا انعام لے گا۔؟''

''جو مانگوں گا دو گی۔؟''

''ہاں دوں گی..... لیکن تو بڑا بدمعاش ہے۔ مجھ ہی کو مت مانگ لینا۔''

''برا تو نہیں مانو گی۔؟''

''کیسی پاگلوں کی طرح باتیں کر رہا ہے۔''

بچے نے پرمیلا کو پاس ہی بٹھا لیا۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ پھر بولا۔ ''دیکھو ٹالنا مت..... میرا انعام یہ ہے کہ اب اس گھر میں تم کبھی مت آنا۔ تم مجھے پیار کرتی ہو نا.....''

پتا بولے ''یہ کیا بکواس ہے منے۔''

بچہ پھر بولا۔ ''اور آپ پتا جی۔ آپ بھی مجھے انعام دیں گے نا..... تو وعدہ کیجیے آپ ان سے کبھی نہیں ملیں گے۔''

اس سے پہلے کہ پرمیلا اور پتا کچھ سمجھ پاتے، ماں اچانک وہاں دوڑی آئی۔ بچے کو گود میں اٹھا کر بولی۔ ''ہاتھ کیوں بند کر رکھا ہے۔ دکھاتے کیوں نہیں دس کا نوٹ۔ اور پرمیلا تم تو ایک زمانے کے بعد آئی ہو۔ بیٹھو نا۔ راجہ بیٹا امتحان میں اول آیا ہے۔ کھاؤ نا مٹھائی۔''

بچے نے سب کو دیکھا..... اچانک جیسے دل کے غبار ڈھل گئے ہوں۔ ایک لمحے کو ہی سہی لیکن کیا ایک لمحہ سچ نہیں ہوتا۔

مجبوری

مچھلی کے دو شکاری جھیل میں بنسیاں ڈالے بیٹھے تھے' ایک کی قسمت خوب یاوری کر رہی تھی' اس نے بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کر ڈور نکالی تو تقریباً آٹھ کلو کی مچھلی پھڑ پھڑا رہی تھی' اس نے اس کا جائزہ لیا اور واپس جھیل میں چھوڑ دیا۔ اس نے دوبارہ ڈور ڈالی تو اس سے بھی بڑی مچھلی پھنس گئی' اس نے اسے بھی واپس پانی میں چھوڑ دیا۔

تیسری مرتبہ جو مچھلی پھنسی وہ بہ مشکل ایک بالشت کی تھی' شکاری نے تھیلے میں رکھ لیا' دوسرا شکاری پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔

''اصل میں ہمارے گھر میں بڑی دیگچی نہیں ہے۔'' پہلے شکاری نے جواب دیا۔

☆

انوکھا قدم

طارق حفیظ

ریسیور کریڈل پر رکھ کر مسز جوزف کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے یاد آیا کہ جب پچھلے مہینے جوزف کاروباری سلسلے میں شکاگو گیا تھا تو اس نے چلتے وقت اسے بتایا تھا کہ وہ شکاگو میں کسی ہوٹل میں ٹھہرے گا۔ ایک ضروری کام کے سلسلے میں اس نے جوزف کو اس ہوٹل میں ٹیلی فون کیا تھا لیکن ہوٹل کلرک نے اسے بتایا تھا کہ جوزف نام کا کوئی شخص ان کے ہوٹل میں قیام پذیر نہیں ہے۔

ایک معصوم فطرت عورت کا ماجرا

پہلا ٹیلی فون اس کے لیے پریشانی کا باعث ثابت ہوا۔ دوسرے فون نے اسے دہشت زدہ کر دیا۔ دونوں ٹیلی فون دن کے وقت آئے تھے۔ جب اس کا شوہر جوزف اپنے دفتر میں تھا اور وہ گھر پر تنہا تھی۔

''مسز جوزف'' ایک اجنبی نسوانی آواز نے دریافت کیا۔

''ہاں بول رہی ہوں۔'' مسز جوزف نے جواب دیا۔ ''آپ کون ہیں۔؟''

''ایک دوست' کیا آپ مارلین سے واقف ہیں'' آواز نے پوچھا۔

''مارلین۔ نہیں تو کیا آپ کا نام مارلین ہے'' مسز جوزف نے پوچھا۔ دوسری طرف بولنے والی آہستہ سے مسکرائی۔

''نہیں مسز جوزف' مارلین آپ کے شوہر کی سیکریٹری کا نام ہے۔ میرا فرض ہے آپ کو صحیح حالات سے آگاہ کر دوں۔''

''اوہ۔ سب بکواس ہے۔'' مسز جوزف نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''میرے شوہر اکثر اپنی سیکریٹری کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ ذاتی طور پر اپنی سیکریٹری میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ بلکہ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ مارلین پچھلے ہفتے آفس بھی نہیں آئی۔ شاید اس دل کی کوئی بیماری ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر وہ اسی طرح دفتر سے غیر حاضر رہی تو وہ اسے ملازمت سے برخاست کر دیں گے۔''

دوسری طرف وہ عورت پھر ہنسی۔ اس کی آواز سے شیطانیت ٹپک رہی تھی۔

''ہاں یہ آپ نے صحیح کہا مسز جوزف۔ مارلین کو دل کی بیماری لگ چکی ہے۔ دونوں قسم کی بیماریاں اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ میں کوئی حاسد قسم کی عورت ہوں۔ تو میرا مشورہ ہے آج ہی یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ جب آپ کے شوہر پچھلے مہینے کاروباری سلسلے میں شکاگو گئے تھے اس وقت ان کی خوب صورت سیکریٹری مارلین کہاں تھی۔؟''

''آپ بے حد بڑھتی جا رہی ہیں خاتون۔''
مسز جوزف نے سرد لہجے میں کہا۔ ''خدا حافظ.....''
ریسیور کریڈل پر رکھ کر مسز جوزف کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے یاد آیا کہ جب پچھلے مہینے جوزف کاروباری سلسلے میں شکاگو گیا تھا تو اس نے چلتے وقت اسے بتایا تھا کہ وہ شکاگو میں کسی ہوٹل میں ٹھہرے گا۔ ایک ضروری کام کے سلسلے میں اس نے جوزف کو اس ہوٹل میں ٹیلی فون کیا تھا لیکن ہوٹل کلرک نے اسے بتایا تھا کہ جوزف نام کا کوئی شخص ان کے ہوٹل میں قیام پذیر نہیں ہے۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ جوزف کسی وجہ سے اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرا جس کا اس نے نام لیا تھا لیکن اب.....!
جوزف سے اس کی شادی کسی رومانس کا نتیجہ نہیں تھی، شادی کے بعد بھی وہ دونوں محبت کے جھوٹے ڈرامے نہیں کھیلتے تھے وہ جوزف سے عمر میں زیادہ تھی۔ قد میں ایک انچ طویل تھی اور اس کے بارے میں جب وہ جوان تھی صرف ایک مرتبہ ایک مرد نے کہا تھا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ خود اسے بھی اپنے حسن کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جوزف نے اس سے شادی صرف اس لیے کی تھی کہ وہ ایک بڑی دولت اور جائداد کی وارث تھی۔ چودہ سال سے وہ جوزف کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ خود جوزف بھی فلمی اداکار نہیں تھا۔ لیکن وہ بے حد محنتی تھا۔ اس نے اس کی دولت کو اس طرح کاروبار میں لگایا تھا کہ اس کی دولت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا اور وہ دونوں خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ چودہ سال کے عرصے میں ان کی شادی کو ایک بہترین کاروباری معاہدہ کہا جا سکتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی کارکردگی سے مطمئن تھے اور وہ خود کسی قیمت پر اس بہترین کاروباری معاہدے کو توڑنے پر تیار نہیں تھا۔
شام کو جوزف کی واپسی پر مسز جوزف نے اپنے شوہر سے صبح کی پراسرار کال کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔
تقریباً ایک ہفتے بعد اسے دوسرا ٹیلی فون موصول ہوا۔ اس کال نے اسے دہشت زدہ کر دیا۔ اس مرتبہ فون کرنے والا ایک نامعلوم مرد تھا۔
''مسز جوزف'' مردانہ آواز نے پوچھا۔
''ہاں میں بول رہی ہوں۔'' مسز جوزف نے جواب دیا۔ ''آپ کون ہیں۔؟''
''اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' آواز نے کہا۔

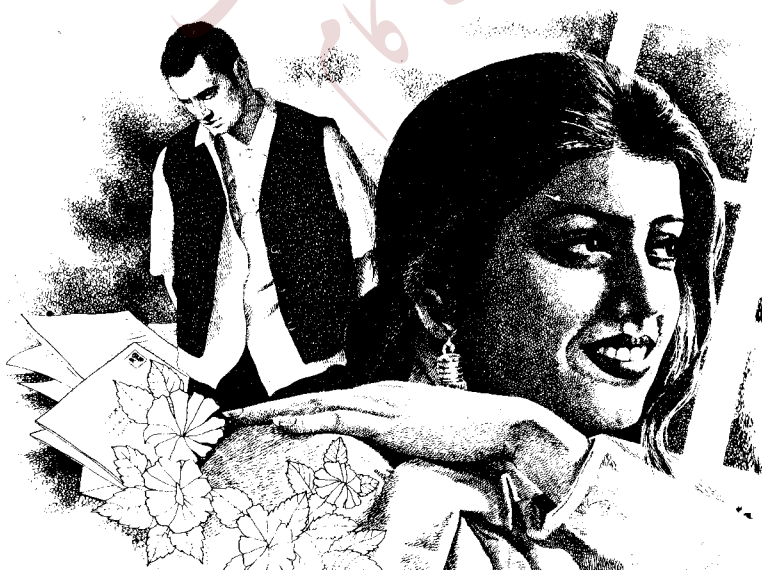

''جو میں کہہ رہا ہوں آپ اسے غور سے سنیں۔ مسز جوزف میں ایک پیشہ ور قاتل ہوں' میں معقول معاوضے پر دوسروں کے لیے قتل جیسے جرم کا ارتکاب کرتا ہوں۔''

وہ اتنی دہشت زدہ ہوگئی کہ اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

''شاید آپ یہ جاننا پسند کریں مسز جوزف کہ آپ کے شوہر نے مجھے آپ کو قتل کرنے کے لیے دس ہزار ڈالر کی پیش کش کی ہے۔'' پراسرار آواز نے کہا۔

''تم پاگل ہو' دیوانے ہو۔'' مسز جوزف نے سرگوشی میں کہا۔

''یا پھر تم کوئی مذاق کر رہے ہو۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں خاتون اور نہ میں پاگل ہوں اگر میں آپ کے شوہر کی پیشکش آپ سے رابطہ قائم کیے بغیر قبول کر لیتا تو یقیناً آپ مجھے دیوانہ کہنے پر حق بجانب ہوتیں۔''

''لیکن کیوں۔؟''

وہ مردانہ آواز آہستہ سے ہنسی۔

''خاتون میں اپنا کام ہمیشہ ایک منصوبے کے تحت کرتا ہوں۔''

مردانہ آواز نے کہا۔ ''جب مجھے کوئی پیشکش موصول ہوتی ہے۔ جیسی کہ آپ کے شوہر کی طرف سے مجھے موصول ہوئی تھی تب میں اس پیشکش کو قبول کرنے کے بعد اپنے شکار کے متعلق چھان بین کرتا ہوں تاکہ حقائق کی روشنی میں اپنا منصوبہ زیادہ سے زیادہ مکمل بنا سکوں۔ میں کوئی معمولی ٹھگ یا چور نہیں ہوں خاتون' میں اپنے میدان میں بہت کامیاب ہوں جب میں کوئی پیشکش قبول کرتا ہوں تو اپنا منصوبہ اس طرح بناتا ہوں کہ میرے شکار کی موت اس طرح واقع ہوئی ہو کہ کوئی بھی اس پر غیر قدرتی موت کا شبہ بھی نہ کر سکے اور خاتون میں آج تک اپنے اس کام میں ناکام نہیں رہا۔''

مسز ہارورڈ کو اس کی آواز میں فخر کی آمیزش نمایاں طور پر محسوس ہوئی' وہ سناٹے کے عالم میں اس پراسرار آواز کو سن رہی تھی اور وہ کسی قسم کا تبصرہ کرنے کے قابل نہیں تھی۔

''چنانچہ۔'' اس آواز نے کہا۔ ''جب میں نے آپ کے شوہر کی پیشکش قبول کرنے کے بعد آپ کی چھان بین کی تو مجھے معلوم ہوا کہ دراصل ساری دولت کی مالک تو آپ ہیں اور آپ کا شوہر آپ کو قتل کرانے کے بعد اس دولت پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ تب میرے ذہن میں ایک خیال آیا اس لیے مسز جوزف اگر آپ اپنے شوہر کے مقابلے میں مجھے دگنی رقم ادا کرنے پر رضامند ہو جائیں یعنی بیس ہزار ڈالر تو میں آپ کی جگہ آپ کے شوہر کو اس دنیا سے رخصت کرنے پر تیار ہوں۔''

''تم' تم پاگل ہو میں پولیس کو اطلاع دینے جا رہی ہوں۔''

''پولیس۔'' وہ زور سے ہنسا۔ اور آپ انہیں کیا بتائیں گی۔ اور اگر انہوں نے آپ پر یقین کر بھی لیا تو آخر وہ کس طرح مجھے تلاش کریں گے۔ نہیں خاتون آپ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کریں۔ آپ دونوں میں سے ایک بہت جلد آنجہانی ہونے والا ہے اب رہا یہ سوال کہ مرنے والا کون ہوگا۔ آپ یا آپ کے شوہر۔ اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔''

وہ خاموش رہی۔

''آپ اطمینان سے غور کر لیں۔ مجھے زیادہ جلدی نہیں ہے میں کل اسی وقت آپ کا آخری اور حتمی فیصلہ سننے کے لیے دوبارہ ٹیلی فون کروں گا۔''

دوسری جانب سے فون بند کر دیا گیا۔

شام کو جوزف گھر نہیں آیا۔ اس نے ٹیلی فون کر دیا کہ دفتر میں چونکہ کام زیادہ ہے اس لیے وہ رات کو دیر سے گھر آئے گا۔ رات گئے تک کام۔ مسز جوزف نے تلخی سے سوچا لیکن کس کے ساتھ' کیا مارلین کے ساتھ۔ جب آدھی رات کے بعد اس کا شوہر دبے پاؤں خواب گاہ میں داخل ہوا تو وہ جاگ رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔

آخر کار وہ اس فیصلے پر پہنچ گئی اس نے فیصلہ کیا

کہ صبح وہ جوزف کو ٹیلی فون کے بارے میں بتا دے گی لیکن صرف پہلے فون کے متعلق۔ وہ کہہ دے گی کہ اگر وہ کوئی داشتہ رکھنا چاہتا ہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ اس معاملے کو حتی الامکان خفیہ رکھے۔ تاکہ بدنامی نہ ہو۔ وہ آخر اسے کس طرح دوسرے ٹیلی فون کے متعلق بتا سکتی تھی۔ اگر وہ جوزف سے کہتی سنو مجھے ایک آدمی نے فون کر کے بتایا تھا کہ تم نے اسے مجھے قتل کرنے کے لیے دس ہزار ڈالر کی پیشکش کی ہے اور پھر اس آدمی نے مجھ سے کہا کہ اگر میں رقم دوگنی کر دوں تو وہ میرے بجائے تمہیں قتل کر دے گا تو جوزف بلاتوقف اسے کسی دماغی امراض کے ماہر کے پاس معائنے کے لیے لے جائے گا اور وہ ماہر یہ فیصلہ کرے گا کہ اس عورت کو کسی ذہنی اسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ اس صورت میں یا تو وہ مر جائے گی یا بیوہ ہو جائے گی۔ اسے دونوں میں سے کوئی بھی صورت قبول نہیں تھی۔

پھر اسے خیال آیا کیوں نہ وہ اس مرد کے دوسرے فون کا انتظار کرے۔ جیسا کہ اس نے وعدہ کیا ہے۔ شاید وہ آدمی گفتگو کے دوران کوئی ایسی غلطی کر جائے جس کی وجہ سے جوزف اور پولیس دونوں ہی اس کے بیان پر یقین کر لیں اور دماغی امراض کے ماہر کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

اس کے علاوہ اسے آخر جوزف کو پہلے فون کے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ اس کی کہانی سن کر خوب ہنسے گا اور اپنی سیکریٹری سے معاشقے کی فوراً تردید کر دے گا۔ لیکن پھر وہ اس بات سے آگاہ ہو جائے گا کہ اس کی بیوی اس کے معاشقے سے آگاہ ہو گئی ہے۔

جوں جوں وہ دوسرے فون کے متعلق غور کرتی ویسے ویسے اسے اس آدمی کی دیوانگی پر یقین ہوتا جاتا۔ آخر جوزف اسے کیوں قتل کروانا چاہتا ہے۔ وہ اب بوڑھا ہوتا جا رہا ہے اس کا سر گنجا ہو گیا ہے اور توند باہر نکل آئی ہے۔ آخر وہ کیوں اس عمر میں کسی معاشقے میں پھنسنے لگا۔ اسے معلوم ہے کہ وہ اسے کبھی بھی طلاق لینے نہیں دے گی اور وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ طلاق پر زور دے کر وہ ایک اچھی خاصی دولت اور جائداد سے محروم ہونے کی کوشش کرے۔

اچانک ایک خیال نے اس کا خون منجمد کر دیا۔ اگر اس نے سوچا۔ وہ آج مر جاتی ہے تو اس کی موت کے بعد جوزف ہی اس کی تمام دولت اور جائداد کا وارث ہو گا۔ اس طرح اسے اپنی بیوی سے بھی نجات مل جائے گی۔ اس کی دولت کا بھی مالک بن ہی جائے گا اور پھر وہ اپنی سیکریٹری مارلین سے شادی کرنے کے لیے آزاد بھی ہو گا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب وہی

کیا بات ہے؟

ہم زبان

فرانسیسی ناول نگار کولیٹ بلیوں کی بڑی شیدائی تھی' امریکہ کا دورہ کرتے ہوئے اسے بازار میں ایک بلی بیٹھی دکھائی دی۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے قریب چلی گئی اور دونوں ایک آدھ منٹ تک سر جوڑے میاؤں میاؤں کرتی رہیں۔

پھر کولیٹ اپنے ساتھی کی طرف مڑی اور کہنے لگی: ''آخر مجھے کوئی ایسا تو ملا جسے فرانسیسی بولنی آتی ہے۔''

مان میرا احسان

''اتنی زیادہ رقم کا بل.....؟'' آپریشن کے بعد ایک مریض نے سرجن کا بل دیکھ کر احتجاج کیا۔

''میرے دوست!'' سرجن نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں معلوم ہو جاتا کہ تمہارا کیس کتنا پیچیدہ تھا اور کس طرح میں نے تمہارے آپریشن کو پوسٹ مارٹم میں تبدیل ہونے سے روکا۔ تو تم اس سے تین گنا بل بھی خوشی سے ادا کر دیتے۔''

☆

پراسرار مردانہ آواز تھی۔

''آپ نے کیا فیصلہ کیا خاتون'' مردانہ آواز نے پوچھا۔

''میں تیار ہوں۔'' مسز جوزف نے جواب دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے اندر کوئی اور شخصیت گھس گئی ہو۔ اور وہ اسے اپنے پسند کی گفتگو کرنے پر مجبور کررہی ہو۔ ''میں تمہیں بیس ہزار ڈالر دینے پر تیار ہوں اگر تم اپنا شکار بدل لو۔''

''اوہ آپ کا مطلب اس لڑکی سے ہے۔'' مردانہ آواز نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہاں وہ میرے شوہر کی سیکریٹری ہے۔ اس کا ہم مارلین ہے۔'' مسز جوزف نے جواب دیا۔

تو یہ آدمی بھی اس کے شوہر اور مارلین کے معاشقے کے بارے میں جانتا ہے۔ مسز جوزف نے سوچا۔ شاید اس کے علاوہ دنیا کا ہر فرد اس معاشقے سے آگاہ ہے۔ چلو یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر مارلین راستے سے ہٹ گئی تو اس کا شوہر زندہ بھی رہے گا اور اسے طلاق بھی نہیں ملے گی۔ مارلین کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد شاید وہ اس کا وفادار بھی ہوجائے اور وہ شاید ساری عمر اس پر شبہ بھی کرتا رہے کہ مارلین کو قتل کروانے والی اس کی بیوی تھی۔ لیکن چونکہ خود اس نے اپنی بیوی کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی اس لیے وہ اپنی زبان بند رکھے گا اور ہمیشہ اس سے خوفزدہ رہے گا۔

اگر وہ جوزف کو یہ بتا دے کہ وہ اس کے منصوبے سے واقف ہے جو اس نے اسے قتل کرنے کے لیے بنایا تھا تو کیسا رہے گا۔ وہ یہ بھی کہہ دے گی کہ اگر اس کی موت اپنے شوہر سے پہلے واقع ہوئی تو اس کا وکیل وہ خط کھول کر پڑھ لے گا جس میں اس نے اپنے وکیل کو تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد ہدایت کی ہے اس کی موت کی مکمل تحقیقات کرائی جائے مسز جوزف نے سوچا کہ یہ خیال ہے تو عمدہ وہ بعد میں اس پر غور کرے گی۔

''کیوں نہیں۔'' مردانہ آواز نے جواب دیا۔

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میرا شکار کون ہے اور میں اپنے کاروباری میں بے حد سچا واقع ہوا ہوں۔ آپ کی پیشکش قبول کرنے کے بعد مجھ پر فرض ہوجاتا ہے کہ میں آپ کے شوہر کو فوراً اس امر سے مطلع کردوں کہ میں نے ان کی پیشکش قبول نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے جس کی چند وجوہات ہیں۔ جو میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا اور اس کے بعد خاتون جہاں تک میرا تعلق ہے آپ دونوں میرے ہاتھوں سے محفوظ ہوجائیں گے اور جب میں اپنا کام مکمل کرلوں گا تو اس کے بعد آپ کبھی میری آواز نہیں سنیں گی۔''

''شکریہ۔'' مسز جوزف کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اب میں آپ کو کچھ تفصیلات سے آگاہ کردوں۔'' مردانہ آواز نے کاروباری انداز میں کہا۔ ''میں کسی سے یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ کام ہونے سے پیشتر ہی مجھے میری فیس ادا کردے لیکن مجھے اپنے مفاد کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تو اپنا کام مکمل کرلوں لیکن میری فیس غائب ہوجائے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا خاتون۔؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔؟''

''میں آپ کو ایک پتا لکھواؤں گا۔ آپ اس پتے پر میرے نام ایک خط روانہ کریں گی۔ اس پتے پر میرے متعلق چھان بین کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ میرے متعلق کچھ نہیں جانتے اس خط میں آپ ایک تحریر لکھیں گی جس کا مضمون میں ابھی آپ کو لکھوادوں گا۔ آپ وہ تحریر اپنے ہاتھ سے لے کر اس کے نیچے دستخط کرنے کے بعد ولیم اسمتھ کے نام اس پتے پر لفافہ بند کرکے روانہ کردیں گی۔ میں اس پتے پر اسی نام سے اپنی ڈاک منگواتا ہوں۔''

''مجھے کس قسم کی تحریر لکھ کر دینی ہوگی۔؟''

''آپ کو یہ لکھ کر دینا ہوگا کہ آپ نے بیس ہزار ڈالر کے عوض میری خدمات اس لیے حاصل کی ہیں کہ میں آپ کے شوہر کی سیکریٹری مارلین گرے کو قتل کردوں۔'' مردانہ آواز نے کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' مسز جوزف نے چیختے ہوئے کہا۔ ''اس طرح تو میں قتل میں تمہارے شریک ہوجاؤں گی۔''

''بے شک۔ لیکن اس تحریر کے لکھنے کے بعد ایک تو آپ میرے متعلق چھان بین نہیں کریں گی اور دوسرے وہ تحریر میری فیس کی وصولیابی کی ضمانت ہوگا۔ جب آپ کو اس بات کا ثبوت مل جائے کہ مارلین گرے مرچکی ہے آپ دوسرے روز جب مجھے بیس ہزار ڈالر بھیجیں گی تو رقم موصول ہوتے ہی میں بذریعہ ڈاک آپ کی تحریر آپ کو واپس بھیج دوں گا لیکن ایک بات کا خیال رہے تمام رقم پچاس ڈالر کے استعمال شدہ نوٹوں کی شکل میں ہو اور نوٹوں کے نمبر سیریل میں نہ ہوں۔''

''نہیں، نہیں میں ایسا نہیں کرسکتی۔'' مسز جوزف نے چلا کر کہا۔

''مجھے بہت دکھ ہوا یہ سن کر خاتون۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کے شوہر آپ سے زیادہ دانشمند ہیں۔ انہوں نے فوراً ہی میری یہ شرط تسلیم کرلی تھی۔ اگر آپ کو یہ شرط منظور نہیں ہے تو آپ کی مرضی میں آپ کے شوہر کو آگاہ کردیتا ہوں کہ مجھے ان کی پیشکش قبول ہے۔''

مسز جوزف چند لمحے بے بسی کے عالم میں سوچتی رہی۔

''اچھا مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ مجھے اس تحریر میں کیا لکھ کر دینا ہوگا'' مسز جوزف نے پوچھا۔

''ہاں یہ سوال معقول ہے آپ کاغذ پینسل لے لیں میں آپ کو اس کا مضمون لکھوا دیتا ہوں۔''

مسز جوزف کچھ دیر تک کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس تحریر کا مضمون لکھتی رہی۔

''میں خوامخواہ وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں خاتون۔'' مضمون لکھوانے کے بعد اس آواز نے کہا۔ ''مجھے اپنا منصوبہ مکمل کرنے میں چند روز لگیں گے۔ اس کے بعد میں آپ کو فون کرکے یہ تحریر بھیجنے کی درخواست کروں گا۔ آپ کی تحریر ملنے کے دو تین روز کے اندر آپ صبح کے اخبار میں اموات کے کالم میں مارلین گرے کی موت کی خبر پڑھ لیجیے گا۔ اس کے دوسرے ہی روز میں آپ کو رقم ادا کرنے کے لیے چند ضروری ہدایات دوں گا اور پھر آپ کو اپنی تحریر واپس مل جائے گی۔''

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک ریسیور کو پکڑے کھڑی رہی۔ اسے یقین تھا کہ فون کرنے والے نے یہ کال کسی ٹیلی فون بوتھ سے کی ہوگی۔ اس روز جمعہ تھا۔ پیر کے روز اس کا فون پھر آیا اور اس نے مسز جوزف کو وہ تحریر بھیجنے کی ہدایت کی اور فون بند کردیا۔ مسز جوزف نے ایک مرتبہ اس تحریر کو پڑھا اور لفافہ بند کرکے اسے ڈاک کے حوالے کردیا۔ اس روز کے بعد وہ روزانہ صبح کے اخبارات میں اموات کا کالم غور سے پڑھنے لگی۔ جمعرات کو اسے اموات کے کالم میں ایک

حق خدمت

ایک شخص کو شہر کے سب سے بڑے شعبہ جاتی اسٹور سے قیمتی اشیاء چوری کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ ضمانت پر رہا ہوکر اس نے ایک وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب نے ایف آئی آر کا مطالعہ کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہا ''میں دو شرائط پر آپ کا دفاع کرسکتا ہوں، آپ کو مجھے یقین دلانا ہوگا کہ آپ بے گناہ ہیں اور یہ کہ مجھے دو ہزار روپے فیس کے طور پر ادا کریں گے۔''

ملزم نے چند لمحے غور کیا اور بولا:

''میں آپ کو پندرہ سو روپے اور ایک سیکوگھڑی پیش کرسکتا ہوں جو میں نے اس اسٹور سے دو ماہ پہلے اڑائی تھی۔ اب بتایئے کیا آپ میرا دفاع کریں گے۔!'' ☆

[illegible] وہ خبر مارلین گرے کی موت کے [illegible] خبر میں مختصراً بتایا گیا تھا کہ مارلین کی [illegible] قلب بند ہونے سے واقع ہوئی ہے۔

اس کا شوہر جوزف کاروباری سلسلے میں شہر سے [illegible] گیا تھا لیکن اب اسے اس کی بھی پروانہ تھی کہ اس کا شوہر کس ہوٹل میں ٹھہرا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ دوسرے روز اسی آدمی نے ٹیلیفون کر کے اسے رقم ادا کرنے کے بارے میں چند ہدایات دیں مسز جوزف نے تین مختلف بینکوں سے بیس ہزار ڈالر کی رقم نکلوائی تھی۔ تاکہ خوامخواہ کسی کو اکٹھی اتنی بڑی رقم نکلوانے پر تجسس نہ ہو پھر اس نے بڑی تابعداری سے تمام ہدایات پر عمل کیا۔

وہ پیشہ ور قاتل اپنے وعدے کا سچا نکلا۔ دوسرے ہی روز مسز جوزف کو بذریعہ ڈاک اپنی تحریر واپس مل گئی جسے اس نے فوراً ہی جلا دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس آدمی نے اس کی تحریر کی فوٹو کاپی نہیں کرائی ہوگی۔ کیونکہ اب مارلین کا قتل ہو چکا تھا اور وہ مارلین کا قاتل تھا۔ اس لیے اس کے لیے وہ تحریر بیکار تھی۔

اسی رات مسز جوزف سے کئی سو میل دور اس کا شوہر اپنی خوب صورت سیکریٹری مارلین گرے کے ساتھ ایک شاندار ہوٹل کی آرام دہ خوابگاہ میں بیٹھا ہوا اپنی کامیابی کا جشن منا رہا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا جوزف۔'' مارلین نے کہا۔ ''آخر یہ سب کس طرح ہو گیا۔ تم نے اخباروں میں آخر کس طرح میری موت کی خبر شائع کرادی۔؟''

''بہت آسان۔'' جوزف نے شیمپئن کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس خبر کی اشاعت کا مضمون اور رقم بذریعہ ڈاک اخباروں کو بھیج دی تھی اور اس کے ساتھ ایک خط لکھ دیا تھا کہ چونکہ اس شہر میں مارلین گرے کا کوئی عزیز اور رشتہ دار نہیں ہے اور چونکہ وہ میری کمپنی میں ملازم تھی۔ اس لیے میں اس کے معاملات کی دیکھ بھال کر رہا ہوں بس اخبار والوں کے لیے اتنا کافی تھا۔ انہوں نے دوسرے ہی روز تمہاری موت کی خبر شائع کر دی لیکن جان من یہ تو بتاؤ تم نے اپنا فلیٹ چھوڑتے وقت مکان مالکہ سے کیا کہا تھا؟''

''میں نے مکان مالکہ سے کہا تھا کہ چونکہ میں دل کی مریضہ ہوں اور مجھے دوبارہ دل کی شکایت محسوس ہو رہی ہے اس لیے میں اپنے شوہر واپس جا رہی ہوں تاکہ اپنے ڈاکٹر سے اس بیماری کا مکمل علاج کرا سکوں۔''

''شاباش چونکہ تمہیں نیویارک آئے ہوئے بہت کم عرصہ ہوا تھا اور تمہارا کوئی دوست نہیں تھا۔ اس لیے کوئی بھی تمہارے اس طرح غائب ہو جانے پر پریشان نہیں ہوگا۔ اس لیے اب میری جان تم نیویارک جا کر شہر کے دوسرے حصے میں ایک شاندار فلیٹ کرائے پر لے لینا لیکن اس کے لیے تمہیں دوسرا نام اختیار کرنا پڑے گا۔ تم خرچ کی فکر مت کرنا۔ میری بیوی نے اتنی رقم دے دی ہے کہ بہت عرصے تک تم ایک آرام دہ زندگی گزار سکو گی۔''

''اوہ ڈارلنگ تم کتنے اچھے ہو۔ کیا واقعی تم ساری رقم میرے نام پر بینک میں جمع کرادو گے۔؟''

''کیوں نہیں میری جان پہلی مرتبہ ٹیلیفون کرنے والی تو تم خود تھیں۔ تم نے بھی میرے منصوبے کو کامیاب بنانے میں میری مدد کی تھی۔''

''اوہ لیکن جوزف سارا منصوبہ تو تمہارا بنایا ہوا تھا اور تم نے کس کامیابی سے آواز بدل کر پیشہ ور قاتل کا کردار ادا کیا تھا۔ تمہاری آواز سن کر تو میں خود بھی دھوکا کھا جاتی تھی۔ تم واقعی بہت ذہین اور کامیاب اداکار ہو جوزف......''

''ضرورت ڈارلنگ، مجھے تم پر پورا بھروسا ہے تم پھر کوئی ایسی ہی شاندار ترکیب سوچ لو گے۔'' مارلین گرے نے جوزف کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو چلے تھے۔

☆

حادثہ

اویس احمد

ہاں اسے انرن سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ ایک سادہ سا گھریلو حادثہ ہی بہتر ہو گا۔ مگر بیچاری بیٹرس کسی طرح' غسل کے دوران میں گرنے اور ڈوب جانے والا طریقہ اب مناسب نہیں رہے گا۔ اس بار کوئی اور ہی طریقہ ہونا چاہیے۔ ان چکراتی سیڑھیوں سے گر کر گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ اگر کوئی ان کاموں کا عادی نہ ہو تو یہ سیڑھیاں' اس کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

اس شمارے کی ایک منفرد انجام کی تحریر

کارٹر وارلے پراسرار کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ جب وہ چھپ جاتیں تو انہیں اپنے ذہن سے نکال دیا کرتا۔ اس کے دوستوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی اس کی کوئی کہانی پڑھ بھی لیتے تو اس سے تذکرہ نہ کرتے شاید اس معاملے میں وہ اس سے حسد کرتے تھے۔ جہاں تک عام قاری کا تعلق ہے تو وہ تفریح طبع کے لیے اس کی کہانیاں پڑھتے تھے پھر صفحہ پلٹ دیتے اور رسالہ ختم کر کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

مگر نومبر کی اس صبح جب تیز بارش نے ومبلڈن کامن میں واقع وارلے کے مکان کی کھڑکیوں پر جلترنگ چھیڑ رکھا تھا تو وارلے اپنی ڈیسک پر بیٹھا'

امریکہ سے آنے والے ایک خط کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خط نیویارک میں چھپنے والے ایک رسالے کے توسط سے اس کے پاس آیا تھا۔ مگر لفافے پر نیویارک کی بجائے پیٹانوگا' ٹینیسی کی مہر لگی ہوئی تھی۔

خط میں لکھا تھا۔ ''آپ کی کہانی بھولنے والا' پڑھ کر حیران رہ گیا۔ آپ نے تو گویا میری ہی کہانی لکھ دی تھی۔'' خط لکھنے والے نے اپنا تعارف ولیم اسٹاک کے نام سے کرایا تھا اور وہ ایک وکیل تھا۔ اتفاق ہے کہ اس کہانی میں وارلے نے اپنے ولن کا نام اسٹاک ہی رکھا تھا اور اس کا پیشہ بھی وکالت دکھایا تھا۔

وارلے نے ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھایا اور جواب لکھنے لگا۔ اس نے اس اتفاق پر معذرت کرنے کے بعد خط لکھنے پر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر یہ بھی لکھ دیا کہ اگر کبھی اس امریکی کا لندن آنا ہو تو اس سے ضرور ملے۔

دوپہر تک بارش تھم گئی۔ وارلے باہر نکلا' کھانے پینے کا کچھ سامان خریدا اور پھر ولیم اسٹاک کے نام اپنا خط پوسٹ کر دیا۔

رات کو جب کھانا کھانے کے بعد وہ کافی پی رہا تھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اس نے امریکی کو خط میں ملاقات کی دعوت کیوں دے ڈالی تھی۔ وہ تنہائی پسند شخص تھا۔ اسے تو اپنے دوستوں کا اپنے گھر آنا بالکل پسند نہیں تھا' کجا یہ کہ وہ ایک اجنبی امریکی کو مدعو کر بیٹھا تھا جو محض ایک اتفاق کی بنا پر اس سے شناسائی کا حق جتا رہا تھا۔

کافی ختم کر کے اس نے دو انڈے کھائے اور کافی کی دوسری پیالی حلق سے انڈیل لی۔ پھر اس نے ایک جام میں شراب انڈیلی اور میز پر آ بیٹھا۔ اس نے سوچا کہ وہ تو خوامخواہ ہی پریشان ہو رہا ہے۔ اس نے تو صرف رواروی میں جواب دے دیا تھا اور گھر بلانے کی دعوت تو محض تکلف تھا جسے کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لے سکتا تھا۔ چٹیانوگا لندن سے ہزاروں میل دور تھا۔ بھلا اسے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔

کرسمس آ گیا اور وارلے کو احساس ہوا کہ وہ سال گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنی بیوی کی موت کو نہیں بھلا سکا ہے۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود بیوی کی یاد کانٹے کی طرف اس کے دل میں کھٹکتی رہتی۔ مہینوں وہ خود کو یہ دھوکا دینے کی کامیاب کوشش کرتا رہا کہ اسے کسی کی رفاقت کی ضرورت نہیں لیکن سال کے آخر میں جب وہ کام سے سر اٹھاتا' فرصت اسے میسر آتی تو خوفناک یادوں کا ایک سیلاب سا امنڈ آتا۔ نارنگیوں کی خوشبو۔ کہر آلود راتوں میں سنسان سڑک کی سیر' کھڑکی کے پردوں سے کرسمس کے موقع پر درختوں میں ٹمٹماتی روشنیوں کی جھلملاہٹ۔ پھر کرسمس ہی کے موقع پر لڑکوں کی ٹولی کا گانا گاتے ہوئے اس کے دروازے پر آنا۔ ہر چیز کے ساتھ بے شمار یادیں وابستہ تھیں اور ہر سال یہی سب کچھ ہوتا تھا۔ دل میں کانٹے چبھ جاتے تھے۔

اس برس بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ بچوں کی ٹولی کو تو اس نے پچاس سینٹ دے کر بھگا دیا تھا۔ پھر روشنیاں گل کر کے تاریکی میں اسکاچ کی بوتل لے کر ماضی کی عذابناک یادوں کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب وہ پچیس سال کا تھا اور بیٹرس کے ساتھ گرجا میں پادری کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کرسمس کی رات تھی۔ پادری دعائیں پڑھ کر انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ رہا تھا۔

بیٹرس کے ساتھ ازدواجی زندگی کے ابتدائی چند سال کس قدر حسین تھے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی محبت میں کمی آتی گئی پھر بھی وہ یہ رشتہ نبھاتے رہے مگر اب جبکہ وہ تنہا تھا' وہ صرف خوشگوار دنوں کو ہی یاد کرنا چاہتا تھا۔

کرسمس گزر گیا' سال بدل گیا۔ اب سرد جنوری کا مہینہ تھا۔ پھر بھورا فروری آ گیا۔ یہ دونوں مہینے وارلے کے لیے آرام کے مہینے تھے۔ پھر چمکیلا مارچ آ گیا۔ سورج کی روشنی وارلے میں نئی زندگی دوڑا گئی

اور وہ سر جھکا کر کام میں جت گیا۔

اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ہیلو!'' اس نے فون اٹھا کر کہا۔ ''وارلے اسپیکنگ۔''

''ہیلو۔ میں بلی اسٹاک بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی جو وارلے کے لیے اجنبی تھی۔ ''کیا آپ مسٹر کارٹر وارلے ہیں۔؟''

''ہاں! میں کارٹر وارلے ہی ہوں۔'' وہ بولا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی۔

''دخل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں۔ ہم کل ہی لندن پہنچے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آپ کے اس پر خلوص دعوت نامے کے جواب میں کم از کم آپ کو ہیلو ہی کہہ لوں۔''

''اچھا آپ ہیں! بڑی خوشی ہوئی۔'' اس نے اسٹاک کی ہنسی سنی۔ انداز بڑا بچکانہ تھا۔

''میرے خیال میں آپ نے شاید ہی کبھی اپنی کہانی کے کسی کردار کا فون ریسیور کیا ہو۔'' لہجے میں زندہ دلی تھی۔

گفتگو کے دوران میں اسٹاک نے کسی آئرن کو بھی آواز دی تھی۔ وہ تنہا نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس خیال سے وارلے نے بڑا اطمینان محسوس کیا۔

''مجھے احساس ہے کہ مصنفین کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے میری اور آئرن کی خواہش ہے کہ آپ لندن آکر ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔''

وارلے مہینوں سے ہائی اسٹریٹ سے آگے نہیں گیا تھا۔ لندن کے معنی تھے وائٹ لوٹک ٹرین کا سفر اور وہ سفر سے بہت گھبراتا تھا۔

''دراصل' ان دنوں مصروفیت بہت ہے۔ اگلے ہفتے شاید کوئی دن نکال سکوں۔'' اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔

''مگر محترم' ہم لندن میں صرف دو دن ہیں۔ ہم نے ایک کار کرائے پر لے رکھی ہے۔ ہمارا ارادہ جنوبی ساحل کی طرف جانے کا ہے۔'' اسٹاک نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر وارلے کے منہ سے از خود نکلا۔ ''پھر یہاں میرے ہاں آجاؤ۔ آج ہی رات ڈنر پر۔'' بعد میں اسے خود حیرت ہوئی کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔

امریکن نے اس دعوت پر اس قدر مسرت کا اظہار کیا کہ وارلے کا جذبہ میزبانی جوش پر آ گیا۔ اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''آپ لوگ ہوٹل کو مکمل طور پر خیر آباد کہہ دیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''میرے ہاں ایک بڑا آرامدہ گیسٹ روم ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔''

اس کے بعد اس کا لکھنے کو دل نہیں چاہا۔ اس نے مسودہ ایک طرف کھسکایا اور سادہ کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھا کر ڈنر کے لیے مینو ٹائپ کرنے لگا۔

چھ بجے تک وہ اپنے مہمانوں کے ڈنر کا اہتمام کر چکا تھا۔ ڈنر بہت معقول تھا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ وہ آتشدان میں کوئلے ڈال رہا تھا اس کے مہمان آ گئے۔ وارلے ایک لمحے تک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا رہا۔ ٹائی کی گرہ درست کر کے اس نے اپنے بھورے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کئی برس بعد پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر جذبات کی سرخی دوڑی تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی تھی۔

ولیم اسٹاک اور آئرن اس کی توقع کے مطابق بڑے دلکش ثابت ہوئے۔ اس کے دل میں جو تھوڑا بہت خوف رہ گیا تھا' وہ بھی ہوا ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ان کا لباس بچکانہ نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر امریکنوں کا لباس ہوتا ہے۔ اسٹاک کسی قدر دراز قد اور بھاری جسم کا تھا۔ چہرہ بڑا جاذب نظر تھا۔ وہ وارلے سے دس سال چھوٹا نظر آتا تھا۔

آئرن اسٹاک تیس سال سے زیادہ کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنے انداز گفتگو اور میک اپ کی بنا پر وہ کسی فلم کی اداکارہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے نقوش بڑے تیکھے اور دلاویز تھے۔ گھنے سنہرے بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ سبز آنکھوں میں بڑی گہرائی

اور دلکشی تھی۔

آتشدان کے قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھ کر جب شراب کا دور شروع ہوا تو باہر بارش شروع ہوگئی۔

''انگلینڈ کی سیر کی خواہش بڑی دیرینہ تھی مگر میں اب تک اسے ٹالتا رہا۔'' اسٹاک کہہ رہا تھا۔ ''مگر آپ کا پرخلوص دعوت نامہ پاکر پہلے ہی موقع پر چلا آیا۔''

''آپ کا گیسٹ روم بہت خوب صورت ہے۔'' آئرن بولی۔ پھر اس نے اپنی سبز آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ''مجھے آپ کا یہ مکان بے حد پسند آیا۔'' اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

ڈنر ٹیبل چھوٹی تھی۔ اس لیے وہ تینوں بہت قریب قریب دائرے میں بیٹھے تھے۔ اسٹاک کے بھاری کندھے آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران میں وارلے جب بھی آئرن کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک دوڑ جاتی۔ اس انداز میں ایک پیغام تھا۔

وارلے کو ان دونوں کے بے تکلفانہ انداز پر حیرت تھی۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی اس کے باوجود وہ دونوں انتہائی بے تکلفی اور اطمینان سے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر کافی کی میز پر ایک ممکنہ جواز اس کی سمجھ میں آ گیا۔ شراب کی ایک بڑی بوتل ان کے حلق سے اتر چکی تھی۔ اتنی شراب پینے کے بعد تو اجنبیت کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ خود اس نے کئی برس بعد اتنے خوشگوار ماحول میں شراب پی تھی اور خوب پی تھی۔

''میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا ہے۔'' وہ گردن اٹھا کر بولا۔ ''تم ہنسو گے۔''

''کیا خیال آیا ہے۔'' اسٹاک نے پوچھا۔

''یہی کہ شاید تم ولیم اسٹاک نہ ہو بلکہ محض کوئی مہم جو ہو۔ یہ کہ شاید تم استاد قسم کے لوگوں میں سے ہو اور محض اس لیے مجھے خط لکھا ہو کہ یہاں آ کر میرا اعتماد حاصل کرلو۔'' وارلے اس وقت درویشانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا ''مگر کہنا پڑتا ہے کہ تم اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہو۔''

نہ جانے یہ فریب نظر تھا یا حقیقت۔ بہرحال اسے ایسا لگا تھا کہ اسٹاک نے بڑے معنی خیز انداز سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تھا پھر اسٹاک نے گویا اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''مگر میرے لیٹر ہیڈ پر میرا نام چھپا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس پر میرے نام ولیم اسٹاک کے ساتھ اٹارنی ایٹ لا آف پٹاناگو ٹینیسی لکھا ہوا ہے۔''

''جعلی لیٹر ہیڈ چھپوانا تو دنیا کا آسان ترین کام ہے۔'' وارلے نے کہا تھا اور پھر یہ بھی سوچا تھا کہ آخر وہ اس خیال پر اتنا زور کیوں دے رہا ہے۔ کہیں اس کے مہمان برا نہ منائیں۔

مگر اسٹاک ہنس پڑا اس نے کہا۔ ''مصنف کا ذہن کام کر رہا ہے میرے خیال میں آپ کو ہر بات میں کوئی نہ کوئی چکر نظر آتا ہے مگر آپ ہی بتایئے آخر ہمیں ایسا کرنے کی کیا غرض پڑی ہے۔ کیا مقصد ہوسکتا ہے ہمارا۔؟''

وارلے تڑ سے بولا۔ ''مالی فائدہ اور کیا۔ یہاں آ کر تم مجھ سے دوستی بڑھاتے اور پتا لگا لیتے کہ میں اپنی دولت کہاں رکھتا ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم کسی طرح مجھ سے کوئی رقم نکلوا لو یا چیک ہی حاصل کرلو اور غائب ہو جاؤ۔ پولیس اس جعلی نام کے فرد کو کہاں تلاش کرتی پھرے گی۔''

پھر سب چپ ہوگئے تھے۔ یہ خاموشی وارلے کے جسم میں چھری کی طرح اترتی جا رہی تھی۔

چند لمحوں کے لیے اسے اپنے سینے میں گھٹن سی محسوس ہوئی پھر وہ بتدریج اعتدال پر آ گیا۔ اس نے اسٹاک کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اس کا انداز دھمکی آمیز تھا مگر وہ تو بیٹھا شراب کے جام سے کھیل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ یوں جڑے ہوئے تھے جیسے وہ چسکی کا لطف لے رہا ہو۔

آتشدان کے پاس بیٹھے وہ آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں میاں بیوی نیو آریسنز

اٹلانٹا اور کیلیفورنیا تک اپنے موٹر ٹرپ کے بارے میں کہانیاں سناتے رہے۔ یہ فاصلے وارلے کے لیے ایسے ہی تھے جیسے دو سیاروں کے درمیان کا فاصلہ کیونکہ وہ خود پچاس میل دور برٹین سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔

مہمانوں کی موجودگی نے وارلے پر نشہ آور دوا کا سا اثر کیا۔ اس نے بھی خلاف عادت اپنی زندگی کے سارے ہی گوشے ان کے سامنے کھول کر رکھ دیے۔ مگر شاید یہ تو اس قانون دان کے عقلمندانہ سوالات کا اثر تھا جس کا اسے بعد میں احساس ہوا تھا۔ اس وقت تو وہ خود کو اس دنیا میں قطعی تنہا سمجھ رہا تھا جس نے پہلی بار ہمدرد سامع پائے تھے۔ نہ اس کے کوئی بچہ تھا نہ کوئی عزیز، رشتہ دار۔ وہ ایسا شخص تھا جس کی موت پر بھی کوئی رونے والا نہ تھا۔

''آپ کی بیوی کیسے.....'' آئرن کہتے کہتے رک گئی۔ اسٹاک نے گلا صاف کیا۔

''نہیں کوئی بات نہیں!'' وارلے اس کا اشارہ سمجھ کر بولا۔ ''حادثے میں مر گئی تھی۔ نہاتے میں اس کا سر ٹکرایا تھا اور وہ ڈوب گئی تھی۔''

گھنٹوں بعد اپنی تاریک خوابگاہ میں لیٹے ہوئے وارلے نے سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلیپر پہنے۔ گاؤن باندھا اور دبے قدموں چلتا نیچے آ گیا۔ اس نے مہمانوں کی سہولت کے لیے باتھ روم کی بتی کھلی چھوڑ دی تھی۔ اس کی روشنی زینے کی پانچ سیڑھیوں تک پڑ رہی تھی۔ مکان پر سناٹے کا راج تھا مگر فضا میں ایک خوشبو سی رچی ہوئی تھی۔ کسی عورت کی خوشبو۔ اتنی رات گئے اپنے مکان میں کسی عورت کے وجود کو محسوس کیے اسے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔

سیڑھیاں اتر کر وہ سرد کاریڈور میں آ گیا۔ ہال کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ ہال سے گزر کر باغ کی طرف جانے والے راستے پر آ گیا۔ آئرن اسٹاک ایک روش پر کھڑی تھی۔ اس نے بڑا لمبا فرغل پہن رکھا تھا۔ اس کے طویل سنہرے بال کھلے ہوئے لہرا رہے تھے۔ وہ آئرن کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر رک گیا۔ ایک لمحے تک دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔

''مجھے افسوس ہے۔'' آئرن ہی نے پہل کی۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''کوئی بات نہیں۔''

آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی زرد روشنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ اینٹوں کی دیوار پر چڑھی ہوئی انگور کی بیل بے جان سی لگ رہی تھی۔ وارلے کے نتھنوں میں زمین کی نمی اور درختوں کی باس گھل گئی۔ وہ جیسے فضا کے اس سحر میں کھو سا گیا۔ اچانک آئرن نے پرانے دوستوں کے انداز میں اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگے جھکی اور وارلے کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ وارلے کو یوں لگا جیسے اس کے ہونٹ گلاب کی شگفتہ پھول سے مس ہو گئے ہوں۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ ''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ بڑی مشکل سے بول سکا۔

آئرن نے مڑ کر مکان کی چھت پر بنی ہوئی چمنی کے اوپر معلق چاند پر نظر گاڑ دی۔ ''مجھے یہ مکان بہت پسند ہے۔'' اس نے جیسے خواب میں کہا اور پھر عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔

ناشتے کے بعد وارلے اسٹاک کے ساتھ تھا۔ آئرن ضد کر کے بازار جا چکی تھی اور کہہ گئی تھی کہ دوپہر کے لیے کھانا بھی خود ہی لائے گی۔ اسٹاک کافی کے تیسرے کپ سے شغل کر رہا تھا۔ ''میرے خیال میں آئرن نے پچھلی رات پاگل پن کا ثبوت دیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''مجھے افسوس ہے۔''

کچھ نہ کرنے کے باوجود بھی وارلے خجل سا ہو رہا تھا۔ ''کوئی بات نہیں بہت سے لوگوں کو اجنبی جگہ نیند نہیں آتی۔'' وہ مدھم لہجے میں بولا۔

''میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ماضی کے بارے میں تمہیں کچھ پتا چلتا۔'' اسٹاک بولا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمیں تمہارے مکان میں رات گزارنی پڑے گی۔'' پھر وہ اسے بتانے لگا کہ یہ

ان کا تفریحی دورہ نہیں تھا۔ وہ ایک خطرے کے پیش نظر ہی سفر پر نکلے تھے۔ آئرن کئی سالوں سے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز سے چیزیں چرانے کی عادی تھی۔ وہ کئی مرتبہ پولیس کے ہاتھ لگ چکی تھی مگر اب وہ مقام آ گیا تھا جہاں اسٹاک کی قانونی حیثیت بھی ناکام نظر آ رہی تھی۔ پولیس اب آئرن کو اسٹاک کے اثر و رسوخ کے باوجود جیل بھیجنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

''کلپٹومینیا۔'' وارلے بولا۔ ''اسے کسی ماہر نفسیات کو کیوں نہیں دکھایا۔''

''کوشش کی تھی۔ مگر کچھ لوگ اچھے معمول نہیں ہوتے۔ آئرن انہی میں سے ایک ہے۔'' وہ بڑی تلخی سے مسکرایا۔ ''کچھ نہیں بن سکا تو میں نے تبدیلی کا سوچا۔ کسی قصبے میں یا دیہات میں منتقل ہو جانے کا ارادہ کیا جہاں اسے چوری کے کم سے کم مواقع حاصل ہوں۔''

''مگر تمہاری پریکٹس کا کیا ہوگا۔؟''

''خوش قسمتی سے میں ایک بڑا کامیاب وکیل رہا ہوں۔ اس لیے دولت کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

اسی وقت آئرن بازار سے واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اشیا سے بھری ہوئی باسکٹ تھی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں خاموش ہو گئے۔ آئرن اس معنی خیز خاموشی کو بھانپ گئی اور اس نے کہا۔

''میرے شوہر باتیں کر رہے تھے۔ ہے نا۔''

اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ ''بلی کے ساتھ یہی ایک پرابلم ہے۔ حضرت کو یہی معلوم نہیں کہ کب زبان بند رکھنی چاہیے اور کب کھولنی چاہیے۔'' پھر اس نے میز کے پاس جا کر باسکٹ سے چیزیں نکال کر میز پر رکھی شروع کر دیں۔

اسٹاک ہی کا مشورہ تھا کہ وہ ان کی کرائے کی سیڈان میں ان کے ساتھ جنوبی ساحل چلے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ مارچ کا سورج آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اسٹاک نے کہا۔ ''ہم راستے میں ایسے گاؤں بھی دیکھتے چلیں گے جہاں ہم رہائش اختیار کر سکیں۔'' اس کے بعد انہوں نے گاڑی برائٹن روڈ پر ڈال دی۔ اس سے گزر کر سسکس سے ہوتے ہوئے مشرق کی طرف نکل گئے۔ ہیسٹنگ کے قریب ساحل پر انہوں نے گاڑی روک دی اور باہر نکل آئے۔ آدھ میل ساحل پر ٹہل کر وہ پھر کار میں آ بیٹھے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں سے گزرتے ہوئے ڈوور تک آ گئے۔''

''مجھے تو اب تک کوئی بھی جگہ رہائش کے لیے پسند نہیں آئی۔'' اسٹاک بولا۔ ''بہت ہی میٹروپولیٹن قسم کے مقامات ہیں۔''

''لینڈ گیٹ چھوٹی اور بڑی اچھی جگہ ہے۔'' وارلے نے مشورہ دیا۔

''کیوں نہ کسی میدان میں ڈیرہ ڈال لیا جائے۔'' آئرن کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ ''یا اگر کہو تو کسی جنگل میں جھونپڑی بنا لیں۔''

وارلے کو اس وقت احساس ہوا کہ اسٹاک واقعی بے حد سنجیدہ ہے جب وہ ایک اسٹیٹ آفس کے سامنے یہ معلوم کرنے جا کھڑا ہوا کہ آیا اس علاقے میں فروخت کے لیے کوئی مکان موجود ہے یا نہیں۔ آئرن نے دفتر کے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وارلے اس کے ساتھ کار میں ہی بیٹھا رہا۔ چند لمحے کار میں خاموشی رہی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھا آئرن کی گردن، شانے اور سنہرے بالوں کو دیکھتا رہا۔ کار میں خوشبو ہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''تو اس نے تمہیں پوری طرح اعتماد میں لے لیا۔'' اچانک آئرن پلٹ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

''کیا مطلب۔'' وہ سٹپٹا گیا۔

''تمہیں اس کی باتوں پر یقین آ گیا ہے نا۔؟''

''میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا!'' وارلے بولا اور آئرن نے آنکھیں بند کر لیں۔

''رات تو تم تصورات کی دنیا میں تھے۔'' وہ بولی ''مگر اب تو جاگ رہے ہو۔'' اس نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے وارلے کو دیکھنے لگی۔

''یہ کیا تم نہیں دیکھ رہے۔'' وہ بولی۔ ''مصنف

کی حیثیت سے تمہارا وجدان بالکل درست تھا۔ وہ ولیم اسٹاک نہیں ہے۔ میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔ ہم دونوں میں ایک معاہدہ ہوا ہے کہ تم سے بہت بڑی رقم ہتھیا کر آپس میں بانٹ لیں گے۔''

''مگر پچھلی رات تو میں مذاق کر رہا تھا۔'' وارلے نے کہا پھر بھی وہ مشکوک سا تھا۔ کیا اس نے واقعی وہ بات مذاق میں کہی تھی۔ پھر اسے خطرے کی گھنٹی یاد آ گئی جو اس نے اپنے ذہن میں بجتی سنی تھی۔

''مذاق میں کہا تھا یا سنجیدگی سے بہرحال تمہارے منہ سے اس وقت سچی بات نکلی تھی۔ اس کا اصلی نام ٹیڈ ہے' اسی نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا ذہن ایسے معاملے میں بہت تیز تھا۔ تم اسے بالکل ٹھیک سمجھے تھے۔ یہاں تک کہ تمہارا جعلی لیٹر پیڈ والا خیال بھی صحیح تھا۔''

وارلے نے اپنی آنکھوں میں کھٹک سی محسوس کی۔ یہ شاید غصے یا اعتماد کی شکست کا اثر تھا۔ ''تو پھر جب ٹیڈ واپس آئے گا تو میں اس سے ضرور بات کروں گا۔'' وہ بولا۔ ''مگر وہ مکان کی تلاش میں سرگرداں کیوں ہے۔ کیا یہ بھی محض فراڈ ہے۔؟''

''سو فیصدی فریب۔ محض تمہیں یقین دلانے اور تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی ایک چال ہے۔''

''اور یہ تمہارے کلپٹو مینیا والی کہانی۔ کیا یہ بھی غلط ہے۔''

''ہاں یہ سب تمہیں چکر دینے والی باتیں ہیں۔ محض تمہاری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے۔'' اس نے ہاتھ پیچھے کر کے وارلے کا ہاتھ تھام لیا اور گرمجوشی سے دبا دیا۔ ''ہوشیار رہنا اسے یہ پتا نہ چلے کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اسے روحانیت میں بھی دخل ہے۔ تم واقعی خطرے میں پڑ جاؤ گے۔ بس دیکھتے رہو' آنکھیں کھلی رکھو اور زبان سے کچھ نہ کہو۔''

''تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہو۔ تمہیں مجھ سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔''

''دل چسپی کی بات نہیں۔ میرے خیال میں تم ایک اچھے آدمی ہو۔'' اس نے وارلے کا ہاتھ دبایا۔

''اپنی حفاظت کرنا۔ کل تک میں اسے لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''وہ آدمی جس نے اپنا نام ولیم اسٹاک بتایا تھا' اسٹیٹ ایجنٹ کے دفتر سے نکلا تو اس کے ہاتھوں میں ایسے مکانوں کی فہرست تھی جو اس علاقے میں برائے فروخت موجود تھے۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ مکانوں ہی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد گاڑی پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکی تھی جس کے پار سمندر پھیلا ہوا تھا۔ ''یہ منظر نظر آئے۔'' اس نے آئرن سے سوال کیا۔

آئرن جواب دیے بغیر کار سے اتری اور دوڑتی ہوئی پہاڑی کے کنارے پہنچ گئی۔ دونوں ہاتھ پشت پر جما کر وہ منظر سے لطف اندوز ہونے لگی۔

اب.....؟؟

ایک خاتون مرغی کی دکان پر پہنچیں اور ایک مرغی خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ دکاندار نے ایک کٹی ہوئی صاف ستھری سالم مرغی اٹھائی اور اسے تولنے کے بعد بولا ''اس کی قیمت چھتیس روپے ہے۔

خاتون نے تنقیدی نظروں سے مرغی کا جائزہ لیا اور بولیں: ''یہ تو بہت چھوٹی ہے کیا آپ کے پاس اس سے بڑی مرغی نہیں ہے۔؟'' اتفاق سے دکان میں وہ واحد مرغی تھی لہٰذا دکاندار نے وہی چھوٹی مرغی اُٹھائی اور عقبی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے مرغی کو کھینچا، پٹخا اس پر ایک چوٹ لگائی، مرغی کی جسامت بڑھنے پر وہ اسے لے کر واپس دکان کے اگلے حصے میں پہنچ گیا' مرغی کا وزن کر کے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ''اس مرغی کی قیمت بیالیس روپے ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' خاتون نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''آپ مجھے دونوں مرغیاں دے دیں۔'' ☆

''آگے مت جانا۔'' اسٹاک نے تنبیہہ کی۔

''بڑی اچھی جگہ ہے مگر دو قدم آگے بڑھے اور موت کے منہ میں پہنچے۔'' وہ سب کنارے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ سمندری ہوا اور سورج کی شعاعیں ان کے چہروں کو چوم رہی تھیں پھر آئرن کی نظر ہائی وے کے قریب ہی کھڑی ایک کافی ویگن پر پڑی۔ وہاں ایک رہائشی زیر تعمیر عمارت کا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ آس پاس کئی ٹیٹیں بنی ہوئی تھیں۔

''اس وقت ہمیں یقیناً گرما گرم کافی کی ضرورت ہے۔'' آئرن نے کہا۔

اسٹاک یہ سن کر پلٹا تھا مگر وارلے نے اسے نہیں جانے دیا۔ بعد میں وہ خود ہی کافی کے تین کپ لانے کے لیے نیچے اترنے لگا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا کہ وہ اس خطرناک صورت حال سے بچنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے۔ سیدھی بات تو یہ تھی کہ وہ اس معاملے میں پولیس سے مدد لیتا۔ اگر یہ جعلی اسٹاک اتنا ہی خطرناک آدمی تھا جتنا کہ آئرن نے بتایا تھا تو اسے سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے تھا۔ مگر پولیس کو وہ کیا بتا سکتا تھا۔ ابھی انہوں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ انہیں گرفتار کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن اگر امریکن کو یہ شک بھی ہو جاتا کہ وارلے اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہے تو نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے۔

گتے کی ٹرے پر کافی کے بھرے تین کپ رکھے واپس آتے وقت اس نے یہی فیصلہ کیا کہ کل تک کسی نہ کسی طرح دوستانہ رویہ اختیار کیے رہے اور پھر انہیں بڑے خلوص سے رخصت کر دے۔ ان کے جانے کے بعد وہ پولیس کو ان کے تعاقب میں لگا سکتا تھا۔

پہاڑی پگڈنڈی پر چڑھتے وقت وہ ایک ٹیلے کے عقب میں آ گیا۔ جہاں سے ذرا دیر کے لیے چوٹی پر کھڑے دونوں مہمان نظروں سے غائب ہو گئے۔ اچانک اس نے آئرن کی چیخ سنی وہ تیزی سے ٹیلے کی اوٹ سے نکل آیا۔ اوپر آئرن اور اسٹاک آپس میں گتھے ہوئے تھے۔ وہ کنارے کے بہت قریب تھے۔ اسٹاک، آئرن کا ہاتھ پکڑے گھسیٹ رہا تھا۔ وہ اسٹاک سے بری طرح الجھی ہوئی تھی اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے لاتیں بھی چلا رہی تھی۔ کسی جنگجو عورت کی طرح لڑ رہی تھی پھر اس نے اسٹاک سے اپنے ایک ہاتھ چھڑا لیا اور پوری قوت سے اس کے سر پر ہاتھ مارا ایک ہاتھ میں اس نے ایک بڑا پتھر پکڑ رکھا تھا۔ اسٹاک کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ اس کے گھٹنے زمین سے ٹکے اور وہ گھاس پر لڑھک گیا۔ وارلے دوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔

''کیا تم نے اسے بتا دیا تھا۔؟''

''نہیں اسے شک ہو گیا تھا پھر وہ مجھے مارنے لگا۔'' آئرن نے اپنے بازو پر سرخ نشانات دکھائے۔ ''اور آخر مجھے اسے سب کچھ بتانا ہی پڑا۔''

وارلے اسٹاک کے زخمی سر کو دیکھنے کے لیے اس پر جھک گیا۔ وہ کراہ رہا تھا اور کسی قدر بیہوشی کے عالم میں تھا۔ ''تم نے تو اسے مار ہی دیا ہوتا۔''

''مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔'' وہ بولی۔ ''اس نے کہا تھا کہ جیسے ہی تم کافی لے کر آؤ گے وہ تمہیں نیچے سمندر میں پھینک دے گا۔'' وارلے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ آئرن اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ پاگل ہے۔''

اسٹاک نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ ''اب ہم کیا کریں گے۔'' وارلے نے سرگوشی میں آئرن سے کہا۔

''ہمیں اسے ختم کر دینا چاہیے۔'' وہ غیر جذباتی لہجے میں بولی۔

''نہیں ایسا مت سوچو۔''

''جب وہ ہوش میں آئے گا تو غصے سے پاگل ہو جائے گا پھر ہم اسے قابو نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہم بھاگ بھی گئے تو وہ گھر آ جائے گا۔ اگر تم نے پولیس کو خبر کر دی تو وہ چھپ جائے گا اور یوں تم مستقل خطرے میں رہو گے۔ یقین کرو میں اسے اچھی طرح

جانتی ہوں۔''

''تو پھر کیا کیا جائے۔'' وارلے نے پوچھا۔

''اسے یہاں سے نیچے لڑھکا دو فوراً۔ ہم کہہ دیں گے کہ اس کا پیر پھسل گیا تھا اور سر کا زخم نیچے گرنے کی وجہ سمجھا جاسکتا ہے۔''

''میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' وارلے فیصلہ کن انداز میں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

آئرن نے جھک کر اسٹاک کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹنے لگی۔ وہ حیرت انگیز حد تک طاقت ور عورت تھی۔ ''میری بات اچھی طرح سن لو۔'' وہ غرائی۔ ''یہ اسی قابل ہے کہ مرجائے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے۔ اسے مار کر تم صرف انصاف کا تقاضا پورا کرو گے۔''

اسٹاک کا خون آلود سر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں' منہ کھلا ہوا تھا۔ بڑا خوف ناک منظر تھا۔ اچانک وارلے کا جی چاہا کہ یہ سب کچھ ختم ہوجائے۔ اس نے جھک کر دوسرا بازو پکڑا اور دونوں نے اسٹاک کے جسم کو اٹھا کر کنارے پر پہنچا دیا۔ پھر انہوں نے اس کے جسم کو عمودی چٹان سے لڑھکا دیا۔ اگلے لمحے اسٹاک سینکڑوں فٹ گہرائی میں جا گرا تھا۔

پھر پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ گھاس پر سے خون کے دھبے مٹا دیے اور دوسرا کام یہی تھا کہ وہ کار میں بیٹھ کر نزدیک ترین پولیس اسٹیشن گئے اور حادثے کی رپورٹ درج کرادی۔ سورج غروب ہونے تک ولیم اسٹاک کی موت کی تصدیق ہوگئی۔ لاش پولیس اٹھا لے گئی۔ کارٹر وارلے آئرن کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

آئرن نے ریڈیو آن کر دیا۔ ریڈیو سے کمرشیل میوزک کا پروگرام آرہا تھا مگر یہ موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وارلے نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دیا۔

''کیا بات ہے۔'' آئرن تیزی سے بولا۔

''خاموش رہو۔'' وارلے بولا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ سب کچھ گڑبڑ تھا۔ اسٹاک کے تمام کاغذات درست تھے۔ شناختی کارڈ کے اندراجات کے اعتبار سے وہ واقعی چٹیانو گا کا ولیم اسٹاک تھا۔ وہ بولا۔ ''ڈرائیونگ لائسنس' سوشل سیکوریٹی کارڈ اور دیگر کاغذات' سب کے مطابق وہ اسٹاک ہی تھا۔ اگر وہ اصلی اسٹاک نہیں تھا اور یہ محض ایک فریب تھا تو پھر اس نے اتنی دردسری کیوں مول لی تھی۔''

''یہ کوئی معمہ نہیں وارلے۔ یہ تمام دردسری اس نے اسی لیے مول لی تھی کہ وہ واقعی ولیم اسٹاک تھا۔ اس نے تم سے جو کچھ بھی کہا تھا سچ تھا۔ جھوٹ تو میں نے تم سے بولا تھا۔'' اس کا لہجہ بڑا زہریلا تھا۔

کارٹر وارلے کے تخلیقی ذہن نے اسے حیرت پر قابو پانے میں بڑی مدد دی۔ اس نے گزشتہ رات ڈنر ٹیبل پر خطرہ بڑھتا محسوس کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ

ہنسیئے

عدم تحفظ

ایک خاتون اپنے بچے کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئیں۔ بچے سے بہت سے سوالات کرنے کے بعد ماہر نفسیات نے کہا:

''بچے کی تحلیل نفسی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچہ لاشعوری طور پر عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔''

خاتون نے پریشان ہوکر کہا:

''لیکن میں تو اسے اس لیے آپ کے پاس لائی تھی کہ اس کی وجہ سے پورا محلہ ہی عدم تحفظ کا شکار ہے۔

☆.....☆

☆

انا ل ایک دم سے کیوں کھو گیا تھا۔ خطرے کی گھنٹی آ ر ن کی طرف سے بجی تھی۔ جسے وار لے اس وقت نہیں بجھ سکا تھا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا۔'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ اس نے میری زندگی جہنم بنا دی تھی۔ وہ مجھے مسلسل ماہرین نفسیات کے پاس معائنے کے لیے لے کر جاتا تھا اور اب اس نے مجھے کسی دور افتادہ اور پسماندہ علاقے میں دفن کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زندگی کی رعنائیوں اور گہما گہمی سے دور!'' وہ زبان ہونٹوں پر پھیرتی ہوئی بولی۔ ''یہ کوئی آسان بات نہیں کہ مہذب آدمی کو اس طرح ہلاک کر دیا جائے۔''

''گویا تم نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔''

''ہم دونوں نے قتل کیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''اسے مت بھولو۔ میں حکام کو ایسی کہانی سنا سکتی ہوں جو ہم دونوں ہی کو ایک لمبے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دے گی۔ مگر میرے خیال میں اس کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم عقلمند آدمی ہو۔''

وار لے غصے میں کھول کر رہ گیا۔ اسے اس عورت سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ وار لے تو اب یہ بھی بھول چکا تھا کہ عورت کے ساتھ بستر میں لیٹنے کا لطف کیا ہوتا ہے۔ مگر قتل کا تازہ واقعہ اس کے جسم کو برف کی سل بنا چکا تھا۔ اس خطرناک عورت نے جس طرح اپنے شوہر کو ٹھکانے لگایا تھا وہ منظر اس کی نگاہ کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے آئرن کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ بہر حال وہ بڑی حسین عورت تھی اور ایک اچھی رفیق ثابت ہو سکتی تھی۔ بستر کی رفیق۔

لیکن دو دن بعد ہی جب ایک اسٹور کا منیجر ایک بل لے کر اس کے پاس آیا تو وار لے سوچ میں پڑ گیا۔

''آپ کو زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔'' منیجر بولا۔ ''مسٹر وار لے وہ امریکی خاتون جو میرے خیال میں آپ کے ہاں مقیم ہے کچھ زائد چیزیں لے آئی تھی، جن کے پیسے دنیا شاید وہ بھول گئی تھی۔ بہت تھوڑی سی رقم ہے۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔''

وار لے نے بقیہ رقم ادا کی اور سوچنے لگا۔ اس کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔ پھر وہ اپنی اس ڈیسک پر بیٹھ گیا جس پر وہ کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی سے باہر کے منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ ذہن سوچ کے سمندر میں غرق تھا۔ خوب صورت موسم ختم ہو گیا تھا۔ جسم کو چھید ڈالنے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔

ہاں اسے آئرن سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ ایک سادہ سا گھریلو حادثہ ہی بہتر ہوگا۔ مگر بیچاری بیٹرس کی طرح، غسل کے دوران میں گرنے اور ڈوب جانے والا طریقہ اب مناسب نہیں رہے گا۔ اس بار کوئی اور ہی طریقہ ہونا چاہیے۔ ان چکراتی سیڑھیوں سے گر کر گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ اگر کوئی ان کاموں کا عادی نہ ہو تو یہ سیڑھیاں، اس کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور آئرن بغیر دستک دیے اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا۔ وار لے کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔

''تم یہاں تنہا بیٹھے کیا کر رہے ہو۔'' آئرن نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان اور آسودگی تھی۔

کارٹر وار لے نے قلم اٹھایا اور اپنے سامنے پڑے مسودے پر دو چار الفاظ لکھے۔ ''اوہ! میں نیا پلاٹ بنا رہا تھا۔'' وہ بولا۔

آئرن وہسکی کا یہ دوسرا گلاس پی رہی تھی۔ شاید اسی لیے وہ وار لے کے لہجے میں پوشیدہ خطرے کی گھنٹی کی آواز نہ سن سکی۔

......☆......

بدلہ

ابن سعید

نیم اندھیرے کمرے میں بھی مجھے اچانک ان کے خوف کا اندازہ ہو گیا۔ "اس لیے میرے بچو۔ جانو جا کر احساس کی روشنی پھیلاؤ اور فکر کے اجالوں میں دھوخدا سے پیار کرو اس کے بندوں سے دشمنی چھوڑو۔"

اس شمارے کی ایک منفرد انجام کی تحریر

وہ دونوں سردی میں سکڑتے ہوئے ایڈی پارکر کے تابوت کے پاس پہنچے اور ہیٹ اتار کر کھڑے ہو گئے۔ ''ایڈی میرے دوست'' موٹا والا آدمی بولا۔ ''میرے یار کتے کے بچے تو مر گیا ہمارے باہر نکل آنے کا انتظار تو کر لیا ہوتا۔''

دبلے والے آدمی نے اس کو کہنی ماری۔ ''حرامزادے اس کی موت پر بھی اس کو گالیاں دے رہا تھا۔''

''غلطی اس کی ہے۔'' موٹے نے تابوت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ ایک دن انتظار کر لیتا۔

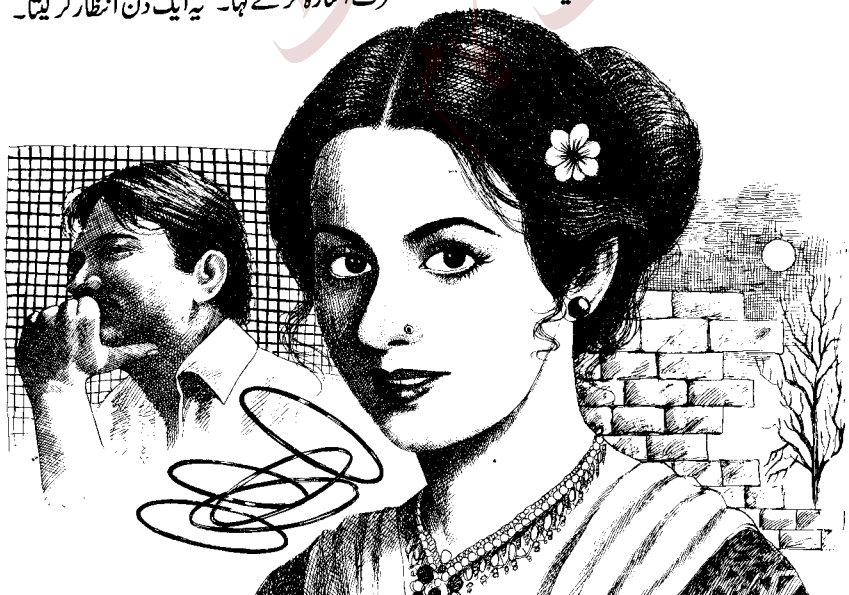

ایک دن بعد مر جاتا۔''

میں نے دروازے میں سے ان دونوں کو دیکھا اور حیرت سے تقریباً اچھل پڑا۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور دوبارہ گھڑی دیکھی' واقعی رات کے دو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گزشتہ اڑتالیس گھنٹے سے میں نے کوئی نشہ بھی نہیں کیا تھا سوائے تین سگریٹوں کے۔ نہیں میں نے اپنی آنکھوں پر لعنت بھیج کر سوچا۔ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور چند لمحے بعد یہ دونوں وجود خواب سمیت دفع ہو جائیں گے اور میری آنکھ کھل جائے گی۔ مگر خواب ختم نہیں ہوا لہٰذا مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں مکمل ہوش و حواس میں عملی زندگی کے حقیقی واقعات سے واقعی گزر رہا ہوں۔

''ایڈی۔'' موٹے والے نے تابوت دیکھ کر کہا۔ ''تمہیں یاد ہے کہ تم نے ایک دفعہ تین ڈالر مجھے ادھار لیے تھے اور میری کئی خوفناک دھمکیوں کے باوجود تم بات کو ٹالتے رہے خدا تمہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھنے کی کوشش کرے مگر میرے تین ڈالر.....''

''جم!'' دبلے والے نے اچانک حیرت سے کہا۔ ''اس کتے کی انگلی میں مجھے ایک انگوٹھی دکھائی دے رہی ہے۔''

جم اپنی پتلون توند سے اوپر کھسکاتا ہوا نیچے جھکا۔

''ہاں جیری مگر پورے کفن میں سے اس کی ایک کلائی اور ہاتھ ہی نظر آ رہا ہے۔ اس کی شکل.....''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم غلط آدمی سے فری ہونے کی کوشش کر رہے ہوں۔''

اور اس سے پہلے کہ وہ کفن اٹھا کر ایڈی پار کر کی شکل دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ اچانک مڑے اور بوکھلاہٹ میں جیری کے ہاتھ سے ہیٹ گر گیا۔

''کون ہو تم.....'' میں نے اپنے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے مقدس باپ۔'' جیری نے کہا۔ ''کہ ہم آج ہی جیل سے رہا ہو کر آئے ہیں۔ ایڈی ہمارا دوست تھا۔ بلکہ کافی گہرا دوست تھا۔ اس کتے کے میرا مطلب ہے ایڈی کو خدا نے جلد ہی اپنے پاس بلا لیا حالانکہ مجھے اندازہ ہے کہ خود خدا بھی اسے آسمانوں پر بلا کر کچھ خوش نہ ہوگا۔''

''کفر مت بکو۔'' میں نے شفقت سے کہا۔ ''خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔''

''مگر ایڈی کو اپنے پاس بلانے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے جم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مقدس باپ۔'' جیری نے احترام سے مخاطب کیا۔ ''کیا ہم ایڈی کی شکل دیکھ سکتے ہیں۔؟''

''نہیں میں نے کہا۔

''کیوں مقدس باپ۔'' جم نے پوچھا۔

''کیونکہ مذہب کی رو سے سورج ڈوبنے کے بعد اور سورج نکلنے سے پہلے تم کسی کا آخری دیدار نہیں کر سکتے۔''

جم نے مایوسی سے جیری کی طرف دیکھا۔

''مقدس باپ.....'' جیری نے ایک ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال کر درشت لہجے میں کہا۔ ''ہم اسی وقت ایڈی کی شکل دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''ویری فائن.....'' میں ہنسا ''مگر میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا کیونکہ میں اس سرکاری مردہ خانے کا پادری بھی ہوں اور انچارج بھی۔ میں قانون بھی سمجھتا ہوں اور مذہب کے اصول بھی۔ میں قانون طاقت بھی رکھتا ہوں اور روحانی طاقت بھی۔ میں تمہیں کل صبح مرحوم کے آخری دیدار کی اجازت دے دیتا۔ مگر اتفاق سے مرحوم کے ایک چچا نے تجہیز سے اس کی لاش طلب کر لی ہے اور مرحوم کو وہیں دفن کیا جائے گا۔ تجہیز کی فلائیٹ صبح چار بجے جاتی ہے۔''

''مگر اس حرام معاف فرمایئے۔ ایڈی نے کبھی کسی چچا کا ذکر نہیں کیا اور وہ بھی تجہیز میں.....''

جیری کا ہاتھ بدستور کوٹ کی جیب میں تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم لوگ اپنے اپنے گھر جاؤ۔ رات کافی گزر چکی ہے۔'' میں نے کہا۔

جیری نے اچانک پستول نکال لیا ہے۔

''مقدس باپ ہم ابھی ایڈی کی لاش کا معائنہ کریں گے۔ آپ وہاں کونے میں جا کر بیٹھ جائیں۔''

میں ہنسا ''اتنی روحانی طاقت تو میرے پاس ہے کہ میں تمہارے دل کی بات جان سکوں تم یقیناً اس انگوٹھی کے بارے میں سوچ رہے ہو جو مرحوم نے پہن رکھی ہے۔ ذرا سوچو تو صبح جب میں پولیس کو یہی بیان دوں گا کہ وہ دو افراد جن کے نام بالترتیب بمعہ حلیہ یہ ہیں اور انہوں نے ایک لاش سے انگوٹھی اتار لی اور ان میں سے ایک کے پاس پستول بھی تھا جو یقیناً بلا لائسنس تھا کیونکہ سزا یافتہ افراد کو لائسنس جاری نہیں کیا جاتا۔''

نیم اندھیرے کمرے میں بھی مجھے اچانک ان کے خوف کا اندازہ ہو گیا۔ ''اس لیے میرے بچو۔ جاؤ جا کر احساس کی روشنی پھیلاؤ اور فکر کے اجالوں میں رہو خدا سے پیار کرو اس کے بندوں سے دشمنی چھوڑو۔''

جیری نے آہستہ آہستہ پستول جیب میں رکھ لیا۔

''جاؤ'' میں نے کہا۔ ''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' جس طرح وہ آئے تھے اسی طرح دیوار پھاند کر چلے گئے۔ جاتے جاتے جم نے تین ڈالر واپس نہ کرنے پر مرحوم ایڈی پارکر کی پیدائش پر شبہ کا اظہار کیا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی تابوت میں لیٹے ہوئے پلاسٹک کے انسانی مجسمے کو جواہرات پہنانا شروع کئے چار بجے فلائیٹ روانہ ہو جاتی تھی۔ باس کو ساڑھے تین بجے آنا تھا۔ آج صبح ہی ہم نے یہ جواہرات ایک نمائش سے چرائے تھے اور ان کو ملک سے باہر بھیجنے کی یہ ترکیب یقیناً بہترین تھی۔ اصلی ایڈی پارکر کی لاش یہاں سے چالیس میل دور ایک جنگل میں پڑی ہوئی تھی۔ کفن ڈھک کر میں پیچھے ہٹ گیا۔

''ایڈی پارکر۔'' میں نے مجسمے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''خدا تمہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔''

غور و فکر

سنہری باتیں

☆ کامیابی کی ایک صورت یہ ہے کہ اچھی بات سنے اور جسے سن لے اُسے لکھ لے اور جسے لکھ لے اسے حفظ کر لے اور جسے حفظ کر لے اس پر عمل کر لے اور جس پر عمل کر لے اسے آگے بیان کر دے۔

☆ تکلیف کو خاک پر لیکن مہربانیوں کو سنگ مرمر پر لکھو۔

☆ ستارے آسمان کی زینت ہیں اور تعلیم یافتہ شخص زمین کا زیور۔

☆ سیدھی اور صاف بات کرنے سے نقصان بہت تھوڑا مگر فائدہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

☆ محفل میں اپنی خامیاں بیان مت کرو تمہارے جاتے ہی یہ کام ہو جائے گا۔

☆ غم کو برا نہ کہو کیونکہ اس کے بعد جو خوشی ملے گی اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے تمہیں کتنی خوشی دے گی۔

☆ تھوڑا سا فلسفہ انسان کو دہریت کی طرف لے جاتا ہے لیکن فلسفہ کی اتھاہ گہرائی اسے مذہبت کی طرف مائل کر دیتی ہے۔

☆

عقاب

ایم اے راحت

تجسّس انسانی سرشت میں داخل ہے۔ اگر کوئی لاوارث انسان دنیا کے ظلم و جبر سہتے ہوئے جوان ہو جائے اور اسے پتا چلے کہ وہ تو لاوارث ہے اور اس کی چند نشانیاں ایسی ہیں جو اسے اس کے اصل کا پتا بتا سکتی ہیں تو وہ کھوج میں لگ جائے گا۔

زیر نظر سلسلے وار کہانی بھی ایک ایسے ہی نوجوان کی کہانی ہے جو دنیا کے ظلم و جبر کو برداشت کرتا رہا، جب اس نے محبت کرنے والوں کے بچھڑنے کے بعد گھر چھوڑا تو اسے پتا چلا کہ اس کے ساتھ چند پراسرار نشانیاں بھی تھیں جو اسے اس کے خاندان کے متعلق بتا سکتی ہیں۔ یہ پراسرار نشانیاں حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی کھوج میں لگ گیا۔ اس دوران وہ زمانے کے سرد و گرم سے نہ صرف واقف ہو گیا تھا بلکہ ایک باکمال شخص نے اسے تمام فنون سکھا کر کندن بھی بنا دیا تھا۔ اپنی کھوج کے سلسلے میں اسے کن کن مشکلات سے گزرنا پڑا اور کیسے کیسے عجیب و غریب حالات پیش آئے۔ یہی اس کہانی کی خاصیت ہے۔

حالات کی کوکھ میں پل کر جوان ہونے والے ایک آتش صفت کی سرگزشت

اس کا نام فیروز تھا لیکن شکل کے اعتبار سے اسے کالیا کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ بچپن میں اس پر بے حد سختیاں کی گئیں، انہی کی بنا پر وہ منحوس بن گیا تھا۔ پھر ایک دن وہ اس گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرے گاؤں میں اس کی ملاقات رحیم بابا سے ہوئی جس نے بتایا کہ اسے کوئی حویلی کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا اور اس کے ساتھ تین پراسرار نشانیاں بھی تھیں جو اس نے حویلی سے بطور امانت کے طور پر رکھ لی تھیں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اسے دے دے گا۔ ان میں ایک پتھر کا تعویذ، ایک قیمتی جڑاؤ انگوٹھی اور ایک خاص انداز کی چھڑی تھی۔ یہاں کالیا کی ملاقات جہاز تباہ ہونے والے شخص جیمس پوکر سے ہوئی جو اسے اپنے ساتھ لے گیا اور فوجی انداز میں اس کی تربیت کرنے لگا۔ اس نے جنگ کے دوران دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا، جس کے نتیجے میں اسے گروپ آفیسر بنا دیا گیا۔ جیمس پوکر نے کالیا کی خدمات اور صلاحیتوں کا اعتراف کر لیا تھا نہ صرف یہ بلکہ ایئر فورس کو جب فلائٹ آفیسر کی ضرورت پڑی تو کالیا کا نام تجویز کیا گیا۔ اس وقت نازی فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں اور فرانس کے ایک بڑے علاقے پر قابض ہو چکی تھیں۔ کالیا نے بڑی مہارت سے فضا میں اپنے گرد کھانے شروع کر دیئے۔ اس نے جرمن طیاروں کے غول کے غول فضا میں تباہ کر دیئے تو اس کے ساتھیوں نے اسے گھیر لیا۔ پھر اس کو ایک خاص مشن کے لیے منتخب کیا گیا۔ مشن یہ تھا کہ فرانس کے شمالی علاقے میں جرمنی نے طیاروں کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا اور ایک ایئر پورٹ کے لیے رن وے کی تعمیر کی جا رہی تھی۔ اگر یہ رن وے بن جاتا تو فوج کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا۔ کالیا نے بڑی مہارت اور منصوبہ بندی سے نازی منصوبے کو نقصان پہنچایا۔ پھر وہ ایک قیدی بن کر کیمپ جا پہنچا۔ پھر ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ بہت ظلم ہوا تھا، اس کی بیوی کو کچھ نامعلوم لوگوں نے قتل کر دیا تھا، ان کی تلاش کے لیے اس نے چند لوگوں کا انتخاب کیا اور پہاڑی سلسلے میں جا پہنچا۔ قبیلے کے ساتھ ساتھ دیگر لوگوں کی ہمدردیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ ان لوگوں کا تعاقب کر رہے تھے، جو اس کی بیوی کے قتل تھے۔ ایک جگہ ان سے معرکہ بھی ہوا، لیکن وہ انہیں نقصان نہ پہنچا سکے۔ آخر کار ایک جگہ انہیں گھیر لیا گیا۔ خوب فائرنگ ہوئی اور وہ لوگ یا تو مر گئے یا فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن خیمے کے قریب ایک سایہ دیکھ کر وہ اس کے قریب چلا گیا۔ اندر سے کچھ عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی یادداشت ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ لوگوں نے اسے کارڈوس کا نام دیا تو اس نے قبول کر لیا۔ بس میں اس کی ملاقات ایک شخص کریم سے ہوئی۔ راستے میں چیکنگ کے دوران کریم کو بارڈر پولیس نے روک لیا۔ وہ جب ہوٹل پہنچا تو اسے اپنے لباس سے ایک تھیلی ملی۔ یہ مہنگی ترین منشیات مہاراجا تھی جو اسے کروڑ پتی بنا سکتی تھی۔ اس نے محتمل لوگوں سے رابطہ کیا اور اس تھیلی کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ جرائم پیشہ افراد اس کے تعاقب میں تھے۔ پھر اسے سینڈی ملی جو خود بھی ایک گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے مسلسل چکر دیئے جا رہے تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ پھر اسے ایک نقشے اور ہیروں کے چکر میں ڈال دیا گیا۔ یہاں اس نے اپنی حکمت عملی سے بہت ہی اچھا منصوبہ بنایا، اس سلسلے میں اس نے اپنے لیے چند ساتھیوں کا انتخاب کیا اور پھر اس منصوبے پر عمل کر ڈالا۔ قسمت اس کے ساتھ تھی، اس کا منصوبہ کامیاب ہو گیا اور وہ نقشہ اور ہیرے لے اڑا۔ اس کے پیچھے بہت سی تنظیمیں پڑ گئی تھیں، لیکن اسے ان معاملات کی خبر اس وقت ہوئی جب اچانک اس کے سامنے بہت سے لوگ اس کے دعوے دار آ گئے۔ پھر اسے ایک اور مہم سونپ دی گئی۔ اسے کہا گیا کہ تنظیم کے کام سے کاک سائٹ جانا ہے جہاں گرین سگنل سے اسے ہدایات ملیں گی۔ وہاں سے ہدایات لینے کے بعد وہ اس جزیرہ نما میں پہنچ گیا تھا جہاں مسٹر گیبل کی عالمی شان رہائش گاہ تھی۔ اس نے اس کے معمولات پر نظر رکھی تھی اور آخری ایک دن اس نے اپنے سامان سے ایک خودکار رائفل کے ٹکڑے جوڑنے کے بعد گیبل کو نشانہ بنایا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ ٹرین میں اس کی ملاقات ڈمباسٹر کی سیکریٹری سونیک سے ہوئی جو پیرس جا رہی تھی۔ وہ مسٹر ڈمباسٹر کی وجہ سے پریشان تھی۔ اس کی پریشانی کالیا نے دور کر دی۔ کالیا مسلسل مختلف مہمات میں اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اب آپ آگے ملاحظہ فرمائیں

اور یہ مکان بھی زمین دوز ہی تھا اور ایک مضبوط چٹان نے اسے انسانی پہنچ سے الگ تھلگ کر رکھا تھا۔ سو نجلران نے ایک عمل کیا اور دروازہ کھل گیا۔ اندر سے ایسے ہوا باہر آئی، جس سے احساس ہوا کہ بند مکان کو بہت عرصے کے بعد کھولا گیا ہے لیکن نیچے جاتے ہوئے کالیا کے دل میں انوکھے تاثرات تھے۔ اس ماحول میں اسے کچھ خوشبوؤں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس سے محبت کی بُو آتی تھی اور دل سے یہ احساس ابھرتا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے، جہاں اس کا باپ طورش اور اس کی ماں شردھا چلتے پھرتے ہوں گے۔ ضروریات زندگی سے گزرتے ہوں گے اور یہ احساسات کالیا کے چہرے پر دیکھے جا رہے تھے۔ سو چچا نے اپنے بھتیجے کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم جانتے ہیں کہ تیرے دل میں کیا کیا احساسات ہوں گے لیکن وہ واپس آئیں گے۔ ہمارا دل کہتا ہے اور کالیا اصولی طور پر ہمیں یہاں قیام نہیں کرنا چاہیے تاکہ تو اپنے جذبات کو نمایاں کرے اور اس وقت میں واپسی چاہتا ہوں۔''

کالیا نے ایسی نگاہوں سے انہیں دیکھا جس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ انہیں اجازت دے رہا ہے۔ نجلران اپنی بیوی کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ تب کالیا نے دروازہ بند کر لیا اور اس ٹھنڈے اور پُرسکون غار میں کھڑے ہو کر اپنے ماں باپ کے چہروں کا تصور کرنے لگا پھر اس نے اطراف میں دیکھا، مختلف اشیاء موجود تھیں۔

چونکہ یہ فضاء گرد آلود نہیں تھی، اس لیے ہر چیز ایسی لگ رہی تھی جیسے اسے ابھی ابھی کوئی چھوڑ کر باہر نکل گیا ہو۔ کالیا احساسات میں ڈوبا رہا اور پھر اس کی نگاہوں میں دو چہرے ابھرے۔ یہ چہرہ طورش یا شردھا کا نہیں تھا بلکہ لتاشہ اور عدیل بخشی کا تھا۔ دو ایسے چہرے ان چہروں میں مدغم ہونے لگے جن کی شناخت کالیا کو نہ تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ ان چہروں کی بناوٹ کیا ہے لیکن جو چہرے سامنے ابھر آئے تھے، وہ انہی دونوں کے تھے۔ بہت دیر تک کالیا عجیب وغریب احساسات میں ڈوبا رہا، فیصلے کرتا رہا، تب ہی اسے کچھ آہٹیں محسوس ہوئیں اور اس نے چونک کر ادھر دیکھا پھر جو کچھ اس نے دیکھا، اسے دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ وہی بوڑھی عورت تھی جو جہاز پر ملی تھی جو اسی گوشے میں خاموش کھڑی کالیا کو دیکھ رہی تھی۔ کالیا حیران رہ گیا پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچا۔

''ایپا۔'' اس نے کہا۔ ایپا مسکرا دی پھر بولی۔

''اگر تو مجھے مائی گوکلاں کہے تو کوئی حرج نہیں۔''

''نہیں، میں تجھے ایپا کہوں گا۔ کیونکہ میری بستی میں تو ایپا ہے۔''

''تو نے مجھے کبھی یاد نہیں کیا کالیا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کبھی تجھے میری ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔''

''کن حالات کی بات کر رہی ہے؟''

''جبانہ میں آنے کے بعد۔''

''ہاں لیکن تو جانتی ہے۔ میرا تیرا اس دنیا کا رشتہ ہے اور میں تجھے بھول نہیں سکتا لیکن میں اس دنیا میں گم ہو گیا ہوں، اس میں بھی کوئی شک نہیں اور یوں بھی یہ میری دنیا ہے۔''

''اور آج تو پہلی بار اپنے باپ کے گھر میں داخل ہوا ہے۔''

''ہاں لیکن میں تو اس دروازے سے داخل ہوا ہوں ایپا لیکن تو بتا تیرا یہاں آنا کیسے ہوا۔'' ایپا کے چہرے پر جذبات کے سائے لرزنے لگے۔ اس نے کہا۔

''تم لوگوں کے یہاں آنے سے پہلے میں یہاں موجود تھی لیکن پوشیدہ۔''

''میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔''

''ہاں، میں جانتی تھی کہ آج تو اپنے گھر میں پہلا قدم رکھ رہا ہے۔ یہ بات ایسی نہیں کہ کسی کو معلوم نہ ہو لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کالیا کہ تو نے جس دنیا میں زندگی بسر کی ہے، وہ مختلف سوچوں کی حامل ہے اور تو

کیا سمجھتا ہے' کب سے نہیں جانتی میں تجھے۔ کیا اس وقت سے نہیں جانتی میں تجھے جب سمندر کی لہریں تجھے مچھلیاں پکڑنے والوں کے ساحل تک لے آئی تھیں اور انہوں نے تجھے جمال کا بیٹا سمجھ کر اپنے درمیان جگہ دی تھی۔''

''ہاں' ایپا تو وہ لمحات بھی جانتی تھی جن سے میں خود آشنا نہیں ہوں۔'' کالیا نے کہا۔

''میں نے وہاں اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ وہاں انسانوں کا رہن سہن جانوں۔''

''جبکہ تو نکولیا کے لیے جادو لینے گئی تھی۔''

''نہیں' ایسا نہیں تھا۔''

''پھر؟''

''میرا بیٹا جالینوس میرے ساتھ آ گیا تھا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ میرا شوہر مر گیا تھا اور اس بیٹے کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔''

''اوہ..... پھر؟''

''نئی دنیا میرے بیٹے کو کھا گئی۔''

''کیسے؟'' کالیا نے دلچسپی سے پوچھا اور ایپا کے چہرے پر غم کے آثار نظر آنے لگے۔

''وہ نئی دنیا کی عورت کے جال میں گرفتار ہو گیا تھا اور اسے آتشیں ہتھیاروں سے فنا کر دیا گیا۔''

''وہ مر گیا؟''

''ہاں۔'' ایپا نے غم آلود لہجے میں کہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے۔ یہاں تو تنہا ہے؟''

''ہاں' اب میرا کوئی نہیں ہے لیکن یہ سب ہیں۔ میں ان سے جدا نہیں ہوں۔''

''مچھیروں کی بستی تو کیسے پہنچ گئی؟'' کالیا نے پوچھا۔

''میں سمندر میں بھٹکتے بھٹکتے سمندر سے اکتا گئی تو خشکی پر جا پہنچی۔ وہ معصوم لوگوں کی آبادی تھی۔ سب میری عزت کرتے تھے۔ بس ان کے درمیان رہ گئی پھر تو آ گیا۔''

''میں بھی تیرے پاس نہ رہ سکا' مجھے عدیل بخشی لے آئے تھے۔'' ایپا مسکرائی۔

''مگر میں تجھ سے دور نہ تھی کیونکہ میں تجھے پہچان چکی تھی۔''

''کہاں تھی تو؟''

''تیرے آس پاس۔''

''میں نے تو تجھے کبھی نہیں دیکھا۔''

''مگر میں تجھے دیکھتی تھی۔'' ایپا نے کہا اور کالیا اسے تعجب سے دیکھنے لگا۔

''میں جانتا ہوں یہ غلط نہیں ہوگا۔''

''یہ میری کہانی ہے کالیا! اب مجھے اپنے بارے میں بتا۔''

''کیا؟''

''جبانہ میں آ کر تو خوش ہے؟'' کالیا سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے کہا۔

''شاید نہیں۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ تو اس سے آشنا نہیں ہے' یہ دنیا تو اب مضطرب ہو گئی' ورنہ یہاں ساکن سمندر جیسا سکون تھا۔ بہت بدل گئی ہے یہ زمین' تیرا کیا ارادہ ہے۔''

''میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔''

''میں پیش گوئی کر سکتی ہوں۔''

''کیا؟''

''تیری واپسی ہوگی تو وہیں واپس جائے گا اور بانہ کو اس پر اعتراض بھی نہیں ہوگا لیکن یہ کام اتنی جلد بھی ممکن نہیں ہے۔'' کالیا عجیب سی نظر سے ایپا کو دیکھنے لگا پھر اس نے دل سے بوجھ سا ہٹتا ہوا محسوس کیا۔ یہ ایک فیصلہ جو اس کی زبان سے نہیں ہوا تھا لیکن شاید اس کے دل کی آرزو تھی۔ وہ ایپا کو دیکھتا رہا۔

''کیا ایسا ہوگا؟''

''اسی طرح جیسے چاند نکلتا ہے اور سورج ڈوبتا ہے۔'' ایپا اطمینان سے بولی۔

''اور میرے ماں باپ۔''

''وہ وہیں ہیں۔ اگر انہیں کوئی حادثہ نہیں پیش آیا تو وہ وہیں آباد ہو گئے ہیں اور ممکن ہے' انہیں تیری

تلاش ہو۔''

''تو نے میرے دل میں ایک نئی امنگ جگا دی ہے ایپا! کیا میں تجھ سے ایک درخواست کرسکتا ہوں؟''

''کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''تو مجھے اپنے بیٹے کا مقام نہیں دے سکتی۔'' کالیا نے کہا اور ایپا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کالیا اس کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے اپنا سر ایپا کے سینے سے لگا لیا۔ ''میں بھی جہانہ میں تنہا ہوں۔ بیشک میرا بھائی جبران ہے لیکن میں پھر بھی تنہا ہوں۔ مجھے یہ مقام دے دے۔ میرے ساتھ یہاں رہ۔''

ایپا نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔

طولسی کا گھر بھی خوب تھا۔ اس کا طرز تعمیر نکولیا والوں سے جدا نہیں تھا۔ زیر زمین وسعتوں میں پھیلا ہوا جس میں الگ الگ کمرے بنے ہوئے تھے۔ طولسی نے اسے اپنی بیوی شیرانہ سے ملوایا جو سادہ سے نقوش کی عورت تھی مگر اس کے چہرے پر رقابت نہیں ابھری تھی۔ شیرانہ نے اسے خوش امدید کہا تھا پھر طولسی چلا گیا' یہ کہہ کر وہ شیران کو تفصیل بتائے گا اور کچھ وقت گزارے گا اور واپس آجائے گا۔ یہاں الماس کا میزبان طولسی کا بھائی زونارہ بن گیا۔

''تو اپنے بھائی سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ ذہین ہے۔'' الماس نے کہا۔

''اور تو جہانہ میں بسنے والی ہر عورت سے حسین ہے۔'' زونارہ ترکی بہ ترکی بولا۔ الماس ہنس پڑی۔

''تو جھوٹ بولتا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔''

''کیا تو مجھے پسند کرتا ہے۔''

''مگر تو میرے بھائی کی تحویل میں ہے۔''

''طولسی کب واپس آئے گا؟''

''شاید کئی سورج کئی چاند کے بعد۔''

''تو مجھے نپولیا نہیں دکھائے گا۔''

''اگر تو قبول کرے۔''

''مجھے اعتراض.....؟''

''میں خوشی سے تیار ہوں۔'' زونارہ نے خوش ہوکر کہا پھر وہ الماس کو لے کر باہر نکل آیا اور الماس نے نپولیا کی وادیاں دیکھیں۔ زمانہ دیکھے ہوئے تھی۔ حالانکہ نکولیا میں قیدی تھی اور محدود تھی لیکن..... اس لیے کہ نپولیا والے وہاں کے لوگوں سے زیادہ مشاغل ہیں اور اپنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ سورج ڈھلے وہ جگہ جگہ جمع ہوجاتے ہیں اور طرح طرح کے ساز بجا کر محفلیں جماتے ہیں۔ وہ رنگین مزاج بھی معلوم ہوتے تھے کیونکہ بے شمار نظروں نے الماس کا سر سے پاؤں تک طواف کیا تھا۔

''تیری عورت نہیں ہے زونارہ؟''

''نہیں۔''

''مجھے کوئی عورت پسند نہیں آئی۔''

''اوہ..... ہاں شادیاں کیسے ہوتی ہیں؟''

''شادیاں؟'' زونارہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''کوئی عورت ماں کیسے بنتی ہے؟''

''ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں' اپنے بڑوں سے کہتے ہیں۔ دونوں کے بڑے سب کے سامنے پوچھتے ہیں اور وہ زندگی بھر کے ساتھی بن جاتے ہیں۔'' زونارہ نے جواب دیا۔

''بس۔''

''ہاں اور یہ ساتھ پائیدار ہوتا ہے۔''

''دوسری عورت کا کیا تصور ہے۔''

''مرد دوسری اور تیسری عورت کو بھی پسند کرسکتا ہے۔''

''اور عورت؟''

''نہیں' عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔''

''دھت تیرے کی۔ یہاں بھی عورت ہی پست ہے۔'' الماس نے ہنستے ہوئے کہا پھر اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا ہے؟''

''نوجوان خوش فعلیاں کررہے تھے۔'' زونارہ نے جواب دیا اور الماس زونارہ کا ہاتھ پکڑ کر اس طرف چل پڑی۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا تھا۔

زونارہ خوش تھا کہ اسے اتنی حسین عورت کا ساتھ حاصل ہوگیا تھا اور عورت بھی وہ جس کا تعلق جبانہ سے نہیں تھا بلکہ وہ ایک انوکھی دنیا سے آئی تھی۔ زونارہ طولسی کی نسبتاً ایک لاابالی اور ناکارہ سا نوجوان تھا اور اسے نیولیا میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ بس عیش و عشرت کی زندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ غرضیکہ نوجوانوں کے غول کے درمیان الماس زونارہ کے ساتھ پہنچ گئی۔ اس نے ان سب کو دیکھا' وہ عجیب و غریب سے ساز بجا رہے تھے۔ مقصد خوشی کا اظہار ہی تھا اور الماس محسوس کررہی تھی کہ سب کی نگاہوں میں پسندیدگی کے تاثرات ہیں۔ الماس نے ان کے بیچ دائرے میں آکر گردن ہلائی اور پھر اس نے رقص شروع کردیا۔ نوجوانوں نے حیرت اور مسرت کے ساتھ ایک عورت کو اپنے درمیان تھرکتے ہوئے دیکھا اور شاید سرزمین نکولیا میں ایسا منظر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ الماس نے ایک ایسا ہیجان خیز رقص شروع کردیا کہ نوجوانوں کے چہرے سرخ ہوگئے اور ان کی آنکھوں میں گلابی گلابی ڈورے تیرنے لگے۔ وہ سب ست ہوکر تالیاں بجا رہے تھے۔ طرح طرح کی آوازیں نکال رہے تھے اور زونارہ خوشی سے دیوانہ ہوگیا تھا۔

الماس دیر تک نوجوانوں کے ساتھ رقص کرتی رہی اور نوجوان دور دور سے آکر جمع ہوگئے۔ جب وہ بری طرح تھک گئی اور نوجوانوں کے ہاتھ سازوں پر الٹے سیدھے پڑنے لگے کہ وہ اتنی دیر تھرکنے والی رقاصہ کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے تو الماس نے یہ سلسلہ ختم کردیا۔

مگر وہ نوجوانوں کی یلغار کا نشانہ بن گئی۔ وہ سب اپنی پسندیدگی کا اظہار کررہے تھے۔ کسی نے زونارہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو زونارہ نے اسے بتایا کہ یہ حسینہ اس کی مہمان ہے اور اس پر خاص نظر رکھتی ہے۔ یوں زونارہ کو وہ مقام حاصل ہوگیا جو نوجوانوں کی نظروں میں حسرت بن جائے۔ سب نے کچھ نہ کچھ کہا اور زونارہ الماس کے ساتھ وہاں سے واپس پلٹ پڑا لیکن اپنی رہائش گاہ کی جانب نہیں بلکہ ایک اور سمت جو انتہائی حسین تھی۔ الماس بیٹھ گئی۔ زونارہ نے کہا۔

"تو نے یہاں اپنا رنگ ہی الگ جما لیا اور کیا انوکھا رنگ جما لیا تو نے کہ میرے تمام شناسا مجھے مبارکبادیں دینے لگے۔ آہ...... میں انہیں یہ کیسے بتاتا کہ مبارکباد مجھے نہیں میرے بھائی طولسی کو دینی چاہیے اور اب مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کاش طولسی کی جگہ میں اس دنیا کی سمت گیا ہوتا اور تیری شناسائی مجھ سے ہوتی۔" الماس ہنسنے لگی پھر اس نے کہا۔

"کیا تیرا دل مجھے پسند کرنے لگا ہے زونارہ؟"

"میں تو اب یہ سوچتا ہوں کہ آئندہ کیا ہوگا۔ میرے بھائی لولسی کی ملکیت ہے مگر میں شاید تجھے طولسی کے برداشت نہ کرسکوں اور مجھے طولسی پر خاش ہوجائے۔ اے عورت میں درحقیقت پریشان ہوگیا ہوں۔" الماس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر میں طولسی کی عورت نہیں ہوں۔ وہ تنہا میرا مالک نہیں ہے۔ تو بھی اس ملکیت کا دعویدار ہوسکتا ہے۔" زونارہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر الماس کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ ممکن نہیں ہوگا۔ یہ تو بہت خطرناک بات ہے اور اگر طولسی کو اس کا علم ہوگیا کہ میری نگاہ تیری جانب اس طرح اٹھی ہے تو وہ مجھے قتل کردے گا۔"

"کیا تو اس سے ڈرتا ہے؟"

"ہاں' وہ میرا بڑا بھائی ہے۔"

"یہ دوسری بات ہے اور ظاہر ہے' میں اس میں مداخلت نہیں کرسکوں گی لیکن اگر میں خود طولسی سے کہہ دوں کہ میں اس کی نہیں زونارہ کی ملکیت بننا چاہتی ہوں تو طولسی اس کے بعد کیا کرے گا۔" زونارہ نے خوشی سے دیوانہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اور اگر تو یہ کہہ دے الماس تو پھر بزرگ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ طولسی تجھ پر اپنا حق جما سکے۔ حقیقت ہے کہ یہاں دونوں کی پسندیدگی ہی یکجا

کا باعث بنتی ہے۔ آہ کاش..... تو ایسا کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی سنور جائے گی۔ تو تو بہت ہی انوکھی بہت ہی عجیب ہے۔''

''ایسا کریں گے زونارہ مگر احتیاط اور اطمینان کے بعد کہ میں تو تیری اس دنیا میں اجنبی ہوں اور نئی ہوں اور جیسا کہ تو میری محبت کا دعوے دار ہے' ذرا مجھے یہ تو بتا کہ یہاں زندگی کیا ہے اور کیا کچھ ہوتا ہے یہاں اور شبران جو تیرا سردار ہے' کس مزاج کا انسان ہے۔ اس کی عمر کیا ہے اور وہ عورت کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے؟''

''کیا شبران ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا ہے؟''

''ہاں۔ اس کی خلوت میں بہت سی حسین لڑکیاں ہوتی ہیں اور وہ تو واقعی خوش نصیب ہے جہاں کہیں دیکھا جاتا ہے' اس کی خادماؤں کا غول اس کے ساتھ ہوتا ہے لیکن کسی کی مجال نہیں کہ اس کی کسی خادمہ کی طرف نظر اٹھا جائے۔ ایسا کرنے والے کو سزا ملتی ہے۔''

''کیا سزا ہوتی ہے؟''

''اسے پتھروں کی وادیوں میں پہنچا دیا جاتا ہے' جہاں زمین کے کیڑے اسے چاٹ لیتے ہیں اور پھر اس کے سوکھے پنجر ان ہی پتھروں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں۔''

''شبران یہاں سب سے بڑی قوت ہے؟''

''نہیں' بالکل نہیں۔ سب سے بڑی قوت انقاریہ کے پاس ہوتی ہے اور انقاریہ اگر جہانہ میں یہ اعلان کر دے کہ آج سے اس نے نپولیا اور نکولیا کے نام ختم کر دیے اور جہانہ والے کہلائیں گے تو نہ نکولیا والوں کی یہ مجال کہ اس سے انکار کریں اور نہ ہی نپولیا والوں کی کیونکہ انقاریہ کا حکم' آفاقی حکم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے انکار کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔''

''لیکن انقاریہ تو صرف نپولیا کی ملکیت ہے۔''

''ہاں' یہ ہمارے جادوگروں کا کمال ہے۔ نپولیا کے جادوگر یکجا ہو گئے ہیں اور یہی نپولیا والوں کی سب سے بڑی کامیابی ہے جبکہ نکولیا کے جادوگروں میں یکجائیت نہیں ہے' وہ اپنے اپنے جادو کے ساتھ الگ الگ زندہ ہیں اور کسی کی بات نہیں مانتے۔ یہاں تک کہ نکولیا کا سردار جبران بھی اپنے جادوگروں کے زیر اثر رہتا ہے۔ جادوگروں نے انقاریہ کو اپنے ساتھ شامل کیا ہے اور انقاریہ وہی احکامات دیتی ہے جو جادوگروں کے لیے خوب پسندیدہ ہوں۔ سو یہ کیفیت ہے۔''

''خوب' بہت خوب اور شبران کہاں پایا جاتا ہے؟''

''اس کی رہائش گاہ کچھ دور ہے۔ میرا بھائی طولسی اسی کے پاس تو گیا ہوا ہے۔'' یوں الماس نے بہت سی معلومات زونارہ سے حاصل کر لیں اور غالباً یہ زونارہ طولسی اور اس کے چھوٹے خاندان کی خوش بختی تھی کہ اس طرح شبران کا نام سامنے آ گیا' ورنہ الماس نے سوچا تھا کہ اب زونارہ اور طولسی میں چپقلش کرا دی جائے اور اس کے بعد طولسی کا کھیل ختم کر دیا جائے کیونکہ طولسی اب اس کے لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اصل اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اصل اہمیت ان کے بڑوں کی تھی جو نپولیا میں اپنی آواز رکھتے تھے اور جن کے احکامات اول ہوا کرتے تھے۔ الماس نے صبر کیا اور پھر بہت دیر کے بعد وہ زونارہ کے ساتھ واپس اس کی رہائش گاہ پر آ گئی۔

ایسا نے خلوص دل سے کالیا کو اپنا بیٹا سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ چھپیروں کی اس بستی میں جہاں ایسا' مائی گوکلاں کے نام سے مشہور تھی۔ اس نے کالیا کو نگاہوں میں رکھا تھا اور کئی بار بعض امور میں اس کی مدد کی تھی۔ یہاں تک کہ جب عدیل بخشی اور لتاشہ کالیا کو لے کر چلے تو ایسا نے سمندر میں سیف کر کے ان لوگوں کو سیاہ پتھروں کی وہ تھیلی دی تھی جس کے بارے میں اس نے ہمیں بتایا تھا کہ اس میں کالیا کے ہر مرض کا علاج ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی پتھر اس تمام سفر کا باعث بنے تھے اور یہ احساس عدیل بخشی کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ سمندر میں انسانی بقاء کے لیے بہت سی چیزیں موجود ہیں اور اب جبکہ ان کا براہ

راست ساتھ ہوگیا ہے تو ایپا میں محبت کے سوتے کھل گئے تھے اور اس نے دل کالیا کو اپنا مان لیا تھا۔ چنانچہ طورش کے غار میں ایک بار پھر رونقیں پیدا ہوگئیں اور ایپا ایک ایک چیز کی صفائی اور اسے اپنی جگہ رکھنے لگی۔ اس نے پورے غار کو روشن کردیا۔

سورج اور دو چاند گزرے اور طورش کے بھائی سنجلران نے اپنی بیوی سے کہا۔

''کم از کم کالیا کے غار میں جاکر دیکھا تو جائے کہ اس نے اپنے گھر میں زندگی کا کیسے آغاز کیا ہے اور دو دن تک وہ ہم سے جدا رہ کر اپنے گھر میں کیا کرتا رہا کہ ہم انتظار ہی کرتے رہے کہ وہ آئے اور ہم سے ملے لیکن اس نے صورت نہ دکھائی میرے بھائی کا بیٹا خوش ہے یا نہیں۔'' جب وہ دونوں اس طرف چلے تو شیری نے ان کا ساتھ دیا اور چل پڑی۔

وہ تینوں کالیا کے غار میں داخل ہوئے تو شیری نے تعجب بھری نگاہوں سے پورے ماحول کا جائزہ لیا اور ہنس کر اپنی ماں سے کہنے لگی۔

''مجھے تو لگتا ہے نئی دنیا سے آنے والا میرا چچا کا بیٹا عورتوں کی صفات میں مہارت رکھتا ہے۔ ذرا دیکھو اس نے کس طرح اس گھر کو صاف ستھرا کرلیا ہے جیسا کہ عورتیں۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''ہاں اس میں کوئی شک نہیں اور افسوس کہ ہم نے اس بارے میں اس کی کوئی مدد نہیں کی لیکن وہ ہے کہاں؟''

کالیا اپنے گر کے دوسرے حصے میں ایپا کے ساتھ محو گفتگو تھا اور جب اسے احساس ہوا کہ کچھ لوگ اس کے گھر آئے ہیں تو وہ تنہا ہی وہاں سے باہر نکلا اور اپنے چچا سنجلران اور چچی کو دیکھ کر خوش ہوگیا۔ ساتھ ہی اس کی نگاہیں شیری پر بھی پڑی تھیں۔ شیری نے کہا۔

''واہ کالیا! تمہارے غار کو دیکھ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میں مردوں سے زیادہ عورتوں کی صفات پائی جاتی ہیں۔ ارے وہ کون ہے؟'' اس نے کالیا کے عقب میں ایپا کو دیکھ کر کہا اور سنجلران بول اٹھا۔

''آہا..... معزز ایپا تو کالیا کے پاس ہے؟ کالیا کے غار میں۔ کیوں نہ ہو تیرا تو اس سے قدیم رشتہ رہ چکا ہے۔''

''اور ایک اور رشتہ میرے اور اس کے درمیان پیدا ہوا ہے۔'' ایپا نے کہا۔

''بھلا وہ کون سا؟''

''کالیا کہتا ہے کہ وہ مجھے اپنی ماں کی جگہ دیتا ہے اور اپنے آپ کو میرے بیٹے کے حوالے سے متعارف کراتا ہے۔ سو ہم دونوں نے یہ نئے رشتے قبول کرلیے ہیں۔'' شیری ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔

''واہ..... چلو یہ اچھا ہوا کہ تمہارا کسی سے کوئی رشتہ قائم ہوا۔'' سنجلران نے کہا۔ کالیا نے کہا کہ وہ دو سورج اور دو چاند اس سے ملنے نہیں آیا تو کالیا کہنے لگا۔

''مجھے اعتماد کی فضاء میں سانس لینے دے میرے چچا۔ میں اپنے آپ کو نکولیا میں محسوس کرنا چاہتا ہوں۔''

''بے شک یہ تیری سرزمین ہے اور ہم تجھے خوشی سے اجازت دیتے ہیں کہ ہم سے یہ دوری سہی لیکن تو اسے اپنا سمجھے اور یہ بہت ہی اچھا ہے کہ ایپا جیسی سمجھ دار نگران کے ساتھ رہے۔ میں اس بات سے بہت خوش ہوا۔''

جب وہ چلے گئے ایپا نے مسکرائی نظروں سے کالیا کو دیکھا اور کہنے لگی۔

''کالیا کیا تو عورت کی آنکھ پہچانتا ہے؟'' کالیا نے تعجب سے ایپا کو دیکھا پھر بولا۔

''تیری حکیمانہ باتیں بڑی مشکل ہیں جو میری سمجھ میں بڑی مشکل سے آتی ہیں ایپا۔''

''عورت کی آنکھ کے بارے میں کہہ رہی ہوں میں۔ حالانکہ میں نے تجھے معصوم بچے کے طور پر دیکھا لیکن زمانے کے تجربات بہت کچھ دیتے ہیں ویسے میں سمجھتی ہوں کہ جب تو جاپان گیا تھا تو تیری آشنائی پہلی بار ایک ایسی عورت سے ہوئی جس نے تجھے اپنے مرد کے طور پر دیکھا۔'' کالیا کی آنکھ

پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بہت بڑا سچ ہے کہ جب بھی میں تیری باتیں سنتا ہوں۔ میں' میری ماں! تو مجھے شدید حیرانی ہوتی ہے۔ بھلا کیسے تجھے کیسے معلوم کہ میں جاپان گیا تھا اور وہاں مجھے کوئی ایسی لڑکی ملی تھی جس نے مجھے محبت کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔'' ایپا مسکرا دی پھر اس نے کہا۔

''میں نے تجھ سے کہا تھا ناں کہ میں تجھ سے زیادہ دور نہیں رہی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرے وہاں سے سفر کرنے کے بعد ہی تو نے بھی مچھیروں کی وہ بستی چھوڑ دی۔''

''تقریباً ایسا ہی ہے۔''

''میں شدید حیران ہوں۔ نجانے تو نے وہ سب کیسے کر ڈالا جس کے لیے وہاں لوگوں کے پاس وسائل نہیں ہوتے۔ بہرطور میں تو تیری ہر بات پر یقین رکھتا ہوں۔ بات ہو رہی تھی آنکھوں کی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جاپان میں مجھے جو لڑکی ملی تھی' اس نے مجھے اپنے مرد کی حیثیت سے دیکھا تھا۔''

''اور تو نے اسے ٹھکرا دیا۔''

''مجھے تو یوں لگتا ہے معزز ایپا! کہ اب مجھے دل کی ساری باتیں تیرے سامنے بیان کرنا پڑیں گی۔ پہلے تو یوں تھا کہ میں اپنی پرورش کنندہ' یعنی لتاشہ کے ساتھ رہتا تھا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ سو ایک وقت ایسا بھی آیا جب لتاشہ میرے دل کی ساری باتیں جان گئیں لیکن اپنے جذبات کا اظہار میں ان سے بھی نہیں کر سکا لیکن معزز ایپا تو پُراسرار قوتوں کی مالک ہے اور جو میں چھپانا چاہوں' مجھے لگ رہا ہے' میں تجھ سے نہیں چھپا سکوں گا تو بہتر یہ ہے کہ میں دل کے سارے راز تیرے سامنے کھول دوں تو بہتر رہنما ہوگی۔ میری بزرگ' میری دوست۔''

کالیا نے کہا اور ایپا مسکرانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں کالیا کے لیے مامتا کے جذبے موجزن تھے۔ کالیا چند لمحات سوچ میں ڈوبا رہا پھر اس نے کہا۔

''شاید ایسا کبھی نہ ہوا اور میں چونکہ ان لوگوں کے درمیان پروان چڑھا' جہاں محبت اندھی ہے لیکن بعد میں یہ ہوا کہ میری ذہنی کیفیت بدل گئی اور میں نے ذرا مختلف انداز میں سوچا اور اس کی بنیادی وجہ جاپان میں ہونے والا ایک واقعہ تھا۔ یعنی مجھے ایک بوڑھا شخص ملا جو سمندر کا ماہر تھا اور اس نے سمندر میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ وہاں ایک تصویر ایسی تھی جس میں زیر سمندر ایک لڑکی سمندری پودوں کے درمیان کھڑی مسکرا رہی تھی اور مجھے یوں لگا معزز ایپا! جیسے وہ لڑکی میری آشنا ہو اور سچی بات یہی ہے کہ اس وقت کے بعد وہ میرے سینے میں پیوست ہوگئی اور پھر یوں ہوا کہ جو بھی میرے سامنے آیا' وہ اس کے تصور کے سامنے ہیچ ہوگیا اور میں نے صرف اس کے بارے میں سوچا۔ سو آج بھی اس کی تصویر میرے پاس موجود ہے کہ بوڑھے نے مجھے تحفتاً پیش کر دی تھی۔ معزز ایپا! میں وہ تصویر تیرے سامنے پیش کروں گا۔''

''ہاں..... ہاں' کیوں نہیں۔ اب تو نے اپنی ساری ذمہ داریاں مجھے سونپ دی ہیں اور مجھ پر یہ لازم ہوگیا ہے کہ میں تیرے تمام مفادات کی نگرانی کروں لیکن جہاں تک مسئلہ اس لڑکی شیری کا ہے تو تجھے خوش اسلوبی سے اسے طے کرنا ہوگا کیونکہ بہرطور یہ تیرے چچا کی بیٹی ہے۔'' کالیا پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد ایپا نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

''کیا وہ تصویر تیرے پاس موجود ہے؟''

''ہاں۔''

''مجھے دکھائے گا۔''

''کیوں نہیں۔ اب تو سب کچھ تیرے سامنے پیش کر دینا ہوگا۔'' کالیا نے اپنے پاس محفوظ کی ہوئی تصویر ایپا کو دکھائی اور وہ پُرخیال نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لڑکی جبانہ کی

باشندہ ہے لیکن کون ہے۔ یہ جانتا ہوگا اور تو اطمینان رکھ اب تو اس کی تلاش میں تنہا نہیں ہے۔ میں بھی تیری ساتھی ہوں۔'' کالیا نے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔

طولسی ان تمام افراد کے ساتھ شیران کے ساتھ پیش ہوا جنہیں وہ نئی دنیا سے سمیٹ کر لایا تھا۔ طولسی کے چہرے پر خوف کے آثار تھے، وہاں تو وہ کامیاب ہو رہا تھا جہاں اس نے جہاں حاصل کیا تھا اور اس کے بعد نکولیا کے قیدیوں کو لے کر چل پڑا لیکن اختتام بہت خلاف توقع ہوا تھا۔ گو اس میں طولسی کی غلطی نہیں تھی لیکن اسے خوف تھا کہ سنجلران اس سے سوالات کرے گا اور ہوسکتا ہے، وہ سزا کا مرتکب قرار پائے۔ شبران ایک عیاش طبع انسان تھا۔ اسے جادوگروں کی حمایت حاصل تھی اور سب سے بڑی حمایت یہ تھی کہ انقاریہ اس کی سرپرست تھی۔

اور عظیم جادوگر اس پر مہربان بس یہی وجہ تھی کہ شبران بہت بڑا مقام رکھتا تھا اور اپنے طور پر آزاد زندگی گزارتا تھا۔ غرض یہ کہ طولسی شبران کے سامنے پہنچا اور شبران نے سرد نگاہوں سے اس کا استقبال کیا۔ جادوگر اس کے اردگرد موجود تھے لیکن جادوگرنیاں بھی تھیں۔ یعنی وہ لڑکیاں جو اسے ہمیشہ معتدل رکھا کرتی تھیں۔ شبران نے طولسی کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور وہ تمام لوگ بھی جو ساتھ آئے تھے اور جن کا تعلق نپولیا سے تھا۔ تب شبران نے کہا۔

''مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے طولسی کیونکہ حالات میں ہماری بھی کوتاہیاں شامل تھیں۔ یعنی ہم تیری صحیح رہنمائی نہ کر سکے اور یہ علم نہ ہوسکا ہمیں کہ تیرا سمندری جہاز کس سمت جارہا ہے۔ حالانکہ یہاں تیرے استقبال کے لیے وہی تیاریاں کی گئی تھیں جو نکولیا والوں نے کیں اور جن کی تجھے ہدایت کی گئی تھی۔'' طولسی کی جان میں جان آئی۔ اس نے مودب لہجے میں کہا۔

''معزز شبران جو ہوا سو ہوا۔ میں اس میں اپنا قصور زیادہ سمجھتا ہوں کہ آخری لمحات میں مستعد نہ رہا لیکن اس نئی دنیا میں، میں نے جو کچھ کیا وہ تیرے لیے دلکشی کا باعث ہوگا۔''

چند ایسے بزرگ بھی یہاں شامل تھے اور شبران کے دربار میں موجود تھے۔ سو یہ ہوا تھا کہ جادوگروں کے ایماء پر یہاں تھوڑی سی آزادی بخش دی گئی تھی اور راگ ورنگ کی محفلیں جم جاتی تھیں۔

پچھلے دنوں جب نکولیا کے سردار جبران کا پیغام موصول ہوا تھا اور جادوگروں کو لایا گیا تھا تو وہ اعتدال پسند بوڑھے یہ کہنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ نکولیا کا جبران بے شک نوجوان ہے لیکن بوڑھوں کی سرپرستی میں اس نے امن سے زندگی گزارنے کا طریقہ سیکھا ہے اور اس کے اندر وہ احمقانہ جوش نہیں ہے جو آنکھیں بند کر کے آگ کی دیواروں کی طرف دوڑ پڑتا ہے اور انہوں نے جبران کی بات کو بہت پسند کیا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جادوگروں نے شبران کو کیا مشورہ دیا ہے۔ جادوگروں کا فیصلہ خفیہ تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ خاموش کے ساتھ جبران کی ہر بات منظور کرلی جائے اور اس کے تمام قیدیوں کو اس کی خواہش کے مطابق اس کے حوالے کردیا جائے کیونکہ یہ بے مصرف لوگ ہیں جبکہ ان کے عوض جو لوگ واپس آرہے ہیں۔ وہ نہایت قیمتی اور آئندہ چل کر وہ نپولیا کی تقدیر بدل دیں گے اور نکولیا کا نام ونشان مٹ جائے گا۔

سو شبران نے انہیں کے حکم کے مطابق ہدایت کی تھی اور جادوگر بے حد خوش تھے کہ چالاکی سے ان کارآمد لوگوں کو یہاں بلانے میں کامیاب ہوگئے۔ سو جب طولسی نے کئی انکشافات کیے اور شبران کے انداز میں وہ تبدیلی پیدا نہ ہوئی جس کی توقع وہ لوگ کررہے تھے تو ان کے اندر بے چینی پیدا ہوئی۔ شبران نے طولسی سے کہا۔

''نکولیا کی قید میں رہ کر طولسی تو نے کیا اپنے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کیں یا تیرے ساتھ آنے والوں نے یہ سوچا کہ جب تو یہاں آئے گا تو ان تمام چیزوں کو چوپٹ کردیں گے، جنہیں وہ سیکھ کر آئے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں معزز شبران۔''

''سمجھنا بے حد ضروری ہوتا ہے کیونکہ ناسمجھی موت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور طولسی مجھے یہ بتا کہ کیا تو ان سب کا نمائندہ ہے یا میں ان سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔''

''میں نے اپنی ذمہ داری صرف اس حد تک قبول کی معزز شبران کہ ان سب کو یکجا کروں اور اس کے بعد جس طرح بھی ممکن ہوا انہیں جبانہ واپس لے آؤں اور یہ سب برابر کی حیثیت کے مالک ہیں۔ سو بہتر یہی ہوگا کہ انہیں سے سوال کر۔''

شبران کے جادوگر کے ایماء پر ان میں سے ایک ایک کو طلب کرنا شروع کر دیا اور ان سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔ وہ سب دنیا کی باتیں بتا رہے تھے اور اپنے اپنے کارنامے سنا رہے تھے۔ شبران اور جادوگر ان کی طرف متوجہ تھے۔ اس نئی دنیا کی لاتعداد کہانیاں انہیں سننے کو ملیں۔ وہ کہتے تھے کہ جانور سواری کے لیے بے مقصد ہوتے ہیں بلکہ ایسی سواریاں بنائی جاسکتی ہیں جو آگ اور پانی پی کر دوڑتی ہیں اور بے شمار انسانوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہیں۔ یوں فاصلے کم ہو جاتے ہیں اور انہوں نے جو کچھ یہاں بتایا' اسے جان کر جادوگر بھی ششدر رہ گئے اور ایک جادوگر جو آگ کا جادوگر تھا۔ حیران لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس کا جادو تو آسمانوں تک پہنچ چکا ہے۔ آہ ہم تو بالکل ہی پیچھے رہ گئے۔''

بعد میں پروفیسر جیکانہ کی باری آئی اور شبران نے جیکانہ سے کہا۔

''اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم جیکانہ ہو اور تمہارے باپ کا نام یاشیر تھا۔''

''تو نے بالکل صحیح پہچانا معزز شبران اور کیا تجھے یہ یاد نہیں کہ میں اور تو ایک ساتھ۔ جبانہ کی سرزمین پر سمندر کا سفر کیا کرتے تھے۔''

''آہ بہت عرصہ ہو گیا' بہت سی ایسی صورتیں۔ بعض اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں جن کے ساتھ بڑا وقت گزرا ہو اور جیکانہ میں نے تجھے پہچان لیا تو کیسا ہے؟ خوش ہے نا تو؟''

''ہاں۔''

''اور انوکھی دنیا سے تو یقیناً انوکھا جادو لے کر آیا ہوگا۔ تیرا جادو کیا ہے مجھے بتائے گا؟'' جیکانہ نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی اور کہنے لگا۔

''معزز شبران! میں نکولیا میں قیدی رہا اور جب تیرے اور جبران کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ ہوا اور جبران نے ہمیں مناسب شرائط پر رہا کر دیا تو میں نے سوچا کہ جو جادو میں دنیا سے لے کر آیا ہوں' وہ بڑا کارآمد رہے گا اور میں جبانہ کی سرزمین کو گلزار بنانے میں اسے استعمال کروں گا لیکن یہاں مجھے کچھ بدلے ہوئے رنگ نظر آرہے ہیں۔ میں اس دنیا سے کیا جادو لایا ہوں' وہ تو ایک الگ بات ہے لیکن معزز جادوگروں کی موجودگی میں اور ان امن پسندوں کی موجودگی میں چند باتیں تجھے بتانا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں ضرور کیونکہ تو میرا دوست ہے۔'' شبران نے کہا۔

''معزز شبران بنیادی چیز یہ ہے کہ اس دنیا کا آغاز امن پسندی پر ہوا۔ گروہ بنا کر رہنے کے گر تلاش کیے گئے اور اس کے بعد جب یہ دنیا محبت کی دولت سے مالا مال ہوگئی تو انہوں نے نفرت کا آغاز کیا اور محبت اور نفرت کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ طوالت میں نہیں جاؤں گا۔ اس دنیا نے اپنے لیے آسائشیں تلاش کر لیں لیکن ان آسائشوں نے انہیں نگل لیا اور آہستہ آہستہ نگلتی چلی جارہی ہے اور تو انتظار کر ان لمحات کا۔ جب کچھ دن کے بعد ان کے درمیان بھیانک جنگ ہوگی۔ دنیا سے آسمان تک آگ ہی آگ ہوگی اور اس آگ میں جل کر وہ بھسم ہو جائیں گے کیونکہ انہوں نے اپنی یہ آگ بڑی محنت سے خود ہی تیار کی ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے رہتے ہیں جو انہیں یاد دلاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے لیے جو خوف پیدا کیا ہے وہ حقیقی ہے اور تو یقین کر وہ لوگ خود اپنے

لیے ہتھیار بناتے ہیں اور بعض اوقات ہتھیار کے ان ذخیروں میں آگ لگ جاتی ہے۔ جو خود ہی اپنی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ پھر ماتم کرتے ہیں اور روتے پیٹتے ہیں اور دنیا ان سے ہمدردی کرتی ہے لیکن جو ہمدردی کرنے والے ہوتے ہیں انہیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایسا ہی ایک ہتھیاروں کا ذخیرہ ان کے پاس بھی موجود ہے جس میں کسی بھی دن آگ لگ سکتی ہے۔ ایسے لمحات ان پر بھی کسی نہ کسی دن نازل ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے معزز شیران وہ دنیا پاگلوں کی دنیا ہے۔ جو جان بوجھ کر ایسے گڑھوں کی جانب دوڑ لگا رہی ہیں جن کا اختتام تباہی اور بربادی ہوتا ہے اور میں تو بڑا مسرور ہوں اس بات پر کہ جبانہ تک وہ تباہی نہیں پہنچی اور میری خواہش بھی یہ ہی ہے کہ اس تباہی کو جبانہ کی تباہی نہیں بننا چاہیے اور اسے دو ہی روک دینا مناسب ہوگا۔ سو جیسا کہ جبران نے کہا کہ ہم جادوگروں کے جادو کو کسی طرح عملی شکل نہیں دیں گے اور امن پسندوں کے ساتھ ہی رہیں گے اور ایک وقت ایسا آ سکتا ہے جب جبانہ صرف جبانہ رہ جائے گا اور منکولیا اور نیپولیا کا نام و نشان نہیں رہے گا۔

سو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان جادوگروں سے کوئی کام نہ لیا جائے۔ بلکہ سارا جادو امن و محبت کا جادو بن جائے اور جبانہ میں پھول ہی پھول کھلے ہیں۔''

جادوگروں میں سے ایک ہنس پڑا۔ جو روشنی کا جادوگر تھا اس نے کہا۔

''لو یہ آیا ہے' اس دنیا سے محبت کا پیغام لے کر' احمق نہیں جانتا کہ برتری کیا شے ہے اور انسان کی عظمت کیا چیز ہوتی ہے اور جو اس چیز کو جانتا ہی نہ ہو وہ بھلا کیا مشورہ دے گا۔''

''لو! اے شخص کیا تیرا نام جیکا نہ ہے۔ یہ بتا کہ تو اس دنیا میں کون سا جادو لایا ہے۔''

''اگر میرے جادو کی بات کی جاتی ہے تو میں صرف وہاں سے محبت کا جادو لے کر آیا ہوں' اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' پروفیسر جیکا نہ نے سرد لہجے میں کہا اور روشنی کا جادوگر پھر ہنس پڑا اس نے کہا۔

''نہیں حقیقت یہ ہے کہ تو بزدلی کا جادو لے کر آیا ہے اور ایسے جادوگر پر کوئی بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔'' شبران نے کہا۔

''ہمارا مقصد جو ہے۔ اگر اس کی تکمیل نہ ہوئی تو یہ طویل ترین جدوجہد بیکار ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ اب ہمیں ان لوگوں سے گفتگو کرنے دے۔'' شبران نے کہا۔

''معزز جادوگروں کا راستہ میں نے کبھی اس سے پہلے روکا ہے اور نہ اب روکنے کا ارادہ رکھتا ہوں' جادوگر سوال کر سکتے ہیں۔'' تب وہ صحیح معنوں میں جونپولیا میں برسر اقتدار تھے۔ آگے بڑھے اور انہوں نے ایک ایک شخص سے اس کے بارے میں پوچھا ایک شخص نے کہا۔

''حقیقت یہ ہے کہ وہاں آگ اور آہن کا جادو سب سے بڑی قوت رکھتا ہے آگ کا طوفان نازل کر دیا جائے تو بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں اور اس کی ایک مثال میں اس شکل میں دیتا ہوں کہ پروفیسر جیکا نہ ہی نہیں بلکہ تمام لوگ اس کے گواہ ہیں ہمارا وہ جہاز جو ہمیں لے کر جبانہ آیا۔ ایسے لوگوں کے سامنے آ گیا۔ جو اس کی تباہی کے خواہش مند تھے۔ تبھی جہاز پر عورش کے بیٹے نے ان پر آگ اور آہن کا جادو نازل کر دیا اور کبھی ہم نے جو دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ کہ شعلے فضاء میں پرواز کر رہے تھے اور آنے والوں پر تباہی نازل ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے بچا لیا ہمارے جہاز کو ورنہ شاید ہم جبانہ تک نہ پہنچ پاتے۔

''آہ کیا شعلوں کا جادو اس قدر طاقتور ہے؟''

''یقیناً''

''تب پھر ہمیں شعلوں کا جادو حاصل کرنا ہوگا آگ کے جادوگر تیرا کیا خیال ہے؟'' روشنی کے جادوگر نے دوسرے شخص سے سوال کیا۔

''میں اپنے طور پر یہ بتا سکتا ہوں کہ آگ بہت طاقتور چیز ہوتی ہے اور اگر ہم اسے دوسری جگہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے لیکن ہمیں اس کے لیے ایک مضبوط آگ درکار ہے اور یہ شخص جو آگ کا جادو سیکھ کر آیا ہے۔ بتا سکتا ہے کہ ایسا کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے۔''

''ہاں وہ آگ اس جگہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جہاں دلدلوں سے دھواں اٹھتا ہے اور میں نے جس قدر معلومات حاصل کیں۔ ایک شے ہوتی ہے جسے وہ لوگ گندھک کہتے ہیں۔ گندھک آگ کی تکمیل کے لیے بہت اہم چیز ہے اور بھی بہت سی ایسی اشیاء ہیں جو گندھک میں شامل کر کے ایسے گولے بنائے جاتے ہیں جو بظاہر پتھروں کی شکل کے ہوتے ہیں لیکن جب وہ کسی جگہ جا کر گریں تو زمین سے رگڑیں اور اس کے بعد وہ ایسا دھماکہ پیدا کرتے ہیں کہ چٹانیں زمین بوس ہو جائیں اور آگ اتنی بلند ہو کہ اس کے دائرے میں جو چیز آئے وہ جل کر خاکستر ہو جائے۔'' سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ شبران نے کہا۔

''اس جگہ جہاں دلدلوں سے دھواں اٹھتا ہے۔ وہ شے پائی جاتی ہے جس کا نام تو نے لیا تھا۔ وہ دھواں اس کی ملاوٹ سے بلند ہوتا ہے اور یہ تمام ترکیب میں نے سیکھی ہے کہ کس طرح گندھک حاصل ہو جائے۔''

''تو ان لوگوں کے درمیان کیوں کھڑا ہے۔ ہمارے پاس آ جا۔'' جادوگروں نے کہا اور وہ شخص مسکراتا ہوا جادوگروں میں جا شامل ہوا۔ گویا جادوگر ہو گیا۔ اس کے بعد شبران کا کام باقی نہ رہا اور اس کے بعد جادوگر خود ہی اپنے کام کے لوگوں کی تلاش کرتے رہے۔ جو نئی دنیا سے آئے تھے ان میں سے کوئی نہ کوئی جادوگروں کے لیے کارآمد ہوا۔ یوں بہت سے افراد انہوں نے اپنی درمیان سمیٹ لیے اور شبران خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا۔ تو شبران نے طولی سے کہا۔

''طولی! تیری وجہ سے ہمیں کچھ دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن بعد میں جو کچھ ہوا وہ برا نہ رہا۔ اس لیے تجھ پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا۔ جا اب عالم لوگوں کی طرح ان میں شامل ہو جا اور اپنے کام میں مصروف رہ کہ تمہارے ساتھ جو لوگ آئے انہوں نے اپنی اپنی افادیت ظاہر کر دی۔'' جب آگ کے جادوگر نے واپسی کا تقاضا کیا تو شبران نے انہیں محبت سے رخصت کیا اور وہ اپنے ساتھ ان لوگوں کو لے گئے۔ جو اپنے اپنے جادو لے کر آئے تھے اور پروفیسر جیکانہ اپنی بیٹی جولیا کے ساتھ وہیں موجود رہا تو شبران نے جیکانہ سے کہا۔

''تو آ جیکانہ! میرے ساتھ کچھ وقت گزار اور تو نے جیسا کہ بتایا یہ تیری بیٹی ہے۔''

''ہاں' یہ اسی دنیا سے آئی ہے۔''

''تو یہ میرے لیے بھی بیٹی کی مانند ہوئی۔ آ میرے ساتھ آ.....''

تب شبران جو نپولیا کا سردار تھا۔ جیکانہ کو عزت سے اپنے ساتھ لے گیا اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے وہ پروفیسر جیکانہ کی خاموشی کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ تب اس نے پروفیسر جیکانہ کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تو غمزدہ ہے لیکن یہاں جبانہ میں اب یہی سب کچھ جاری ہو گیا ہے اور میں سردار اس لیے ہوں کہ جادوگروں سے تعاون کرتا ہوں لیکن تو ذرا یہ بتا کہ نکولیا میں یہ سب کچھ نہیں ہے۔''

''میں نکولیا میں چند لمحات قیدی کی حیثیت سے گزار کر آیا ہوں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں جادوگروں کا کیا مقام ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہاں بھی جادوگروں کا غلبہ ہو گا لیکن یہ دیکھا میں نے کہ نکولیا کہ سردار جبران نے ان تمام لوگوں کو عزت کے ساتھ رہائی دے دی اور یقیناً اس کے دل میں یک جذبے تھے اس نے سب کو تلقین کی تھی کہ وہ وہاں جا کر محبت کے جادو پر یقین رکھیں اور امن وامان ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ گویا اگر وہاں جادوگروں کا غلبہ بھی

ہے تو وہاں جادوگر تباہی اور بربادی پر یقین نہیں رکھتے۔ جب کہ شیران جو کچھ میں تجھے بتا رہا ہوں وہ شیری دنیا کی بنیاد پر اور اس میں میرا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔''

''حقیقت یہ ہے کہ میں نے دیکھا جہاں نفرتیں پروان چڑھ رہی ہیں۔ وہاں تباہی تحریر ہوگئی اور کبھی اس جگہ بہتری نہ ہوئی۔ میں ایک پیشن گوئی کرسکتا ہوں شبران ذرا اس بات پر غور کرلے اور میری بات کا بالکل برا نہ ماننا۔ نکولیا اگر امن کی سرزمین ہے اور وہاں سے محبت کے دھوئیں اٹھتے ہیں۔ تو پھر یہ سمجھ لے کہ وہ قائم رہے گا۔ جب کہ شبران نفرتوں کی گود میں پروان چڑھ رہا ہے۔ میری مراد نپولیا سے ہے۔ کیونکہ نپولیا شبران ہی کے نام سی منسوب کردیا گیا ہے اور یہ میرا تجربہ ہے۔ اس دنیا سے اور اس کے علاوہ عقل سے بھی کہ نفرتوں کو کبھی پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔''

شبران کے چہرے پر غم کے تاثرات ابھر آئے اس نے کہا۔

''میرے دوست جیکانہ! تو یہ جانتا ہے کہ جادوگر تو ہمیشہ ہی جبانہ پر قابض رہے اور ان کے بغیر کچھ نہ ہوا۔ اصل حکومت تو انہی کی ہوتی ہے۔ بلکہ اس انقار یہ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور وہ صرف جادوگروں کی ایک تخلیق رہ گئی ہے اور یہ جو جادوگر ہیں بالآخر کچھ نہ کچھ کرا کر ہیں گے۔''

''ہاں..... ایسا ہی لگتا ہے۔ ذہن کی تقدیر ہی میں تباہی ہے۔ وہاں بھی اور یہاں بھی اور میں تجھے ایک اور بات بتادوں شبران کہ ان لوگوں کے ساتھ میرا مطلب ہے ان جادوگروں کے ساتھ ایک عورت بھی آئی ہے۔ وہ اس دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ تم لوگ اسے اہمیت نہ دے کر بہت بڑی غلطی کررہے ہو۔ اس کا نام الماس ہے اور طوسی اسے غیر متعلق سمجھ کر اپنی بستی میں چھوڑ آیا ہے لیکن وہ عورت سب سے بڑی گندھک ہے اور اس اس سے ہر طرح کا بارود تیار ہوگا۔ یہ میری پیشن گوئی ہے۔''

''تیرا مطلب ہے کہ وہ عورت بہت خطرناک ہے۔''

''نہ صرف خطرناک بلکہ یوں سمجھو کہ وہی تمہاری تباہی تحریر کرے گی۔ یہ میری پیشن گوئی ہے۔''

''مگر طوسی نے یہ تو جرم کیا ہے کہ کسی ایسی عورت کو اپنی بستی میں چھوڑ آیا ہے۔''

''ہاں طوسی کا جرم ہے کہ وہ عورت اسی طرح ماحول پر حکمرانی کرتی ہے۔''

''میں اسے فوراً طلب کروں گا۔ تم فکر نہ کرو مجھے یہ بتا' اب میں کیا کروں۔''

''جادوگروں نے ان سب کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور یہ نہ سمجھ شبران کہ اگر یہ جادوگر اتنا کچھ سیکھ کر آئے ہیں تو وہ جو نکولیا میں کچھ نہ کرپائے ہوں گے تیرے ایک آدمی نے آگ و آہن کی تعریف کرتے ہوئے بتایا تھا کہ جب جہاز پر حملہ ہوا اور کچھ لوگوں نے اسے تباہ کرنے کی ٹھانی تو ایک نوجوان نے ان پر آگ کا جادو برسایا اور وہ تباہ ہوگئے۔ وہ نوجوان نکولیا کا باشندہ ہے اور وہاں امن وامان کی بہتری کا خواہش مند ہے لیکن اگر اسے یہ پتہ چلا کہ نپولیا والوں نے آگ کا جادو تیار کرلیا ہے اور وہ مسلسل بدارادے رکھتے ہیں تو کیا وہ خاموش بیٹھے گا اور میں تجھے یہ بتادوں شبران کہ وہ انتہائی ذہین آدمی ہے اور یہ یقینی طور پر نکولیا والوں کے لیے ایک مضبوط پہاڑی دیوار ثابت ہوگا۔ یہ بھی میری پیشن گوئی ہے۔''

''میں جانتا ہوں یقیناً ایسا ہی ہوگا لیکن جیکانہ مجھے مشورہ دے کہ کیا کروں میں کیا کرسکتا ہوں۔''

پروفیسر جیکانہ خاموش ہوگیا۔ اس سلسلے میں وہ بھی کوئی مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

''پھر میں بھی یہ کہتا ہوں کہ اگر تجھے موقع ملے تو بیڑی کی طرف قدم بڑھا۔ یہ جادوگر تو نپولیا کو برباد کرائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔''

''اپنی زبان بند رکھو پروفیسر۔ زور سے یہ بات کبھی مت کہنا' کبھی مت کہنا۔''

''میں جانتا ہوں لیکن تو میرا دوست

ہے۔شبران اس لیے میں تجھ سے یہ بات کررہا ہوں۔''

''اس عورت کے لیے میں طولسی کو حکم دوں گا کہ اسے میرے سامنے پیش کیا جائے۔'' پروفیسر جیکانہ کچھ دیر کے بعد جولیا کے ساتھ اپنی آرام گاہ کی جانب چل پڑا۔اس کے ذہن میں تشویش کے سائے تھے اور اس کی نگاہیں مستقبل میں دور تک دیکھتی رہی تھیں۔

بوڑھی ایپا نے کالیا کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور کالیا کو یہ احساس ہورہا تھا کہ یہاں آکر جو تنہائی اور بیزاری کا احساس دل میں پیدا ہورہا تھا وہ ایپا کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا۔ ایپا کی مامتا بھری نظریں اس کا طواف کرتیں تو وہ بہت سی محبتوں کو بھول جاتا تھا۔ دل کے گوشوں میں طورش اور شردھا کا خیال بے شک تھا لیکن اب وہ اتنا مضطرب نہیں تھا۔ادھر تجلران اور جیران کی محبت اسے حاصل تھی۔شیری البتہ اب کچھ کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی اور اس نے کالیا سے کوئی خاص گفتگو نہیں کی تھی۔

ایپا ہر وقت کالیا کے ساتھ رہتی اور ایپا ہی کا مشورہ تھا کہ کالیا اپنا نکولیا دیکھے۔سو کالیا نے منظور کرلیا۔واقعی اس نے اب تک نکولیا کی سرزمین نہیں دیکھی تھی۔

نکولیا کا یہ علاقہ بڑا سرسبز و شاداب تھا اور یہاں قدرتی حسن بکھرا ہوا تھا۔ اس نے نکولیا کے مختلف علاقوں میں گھومنا شروع کردیا۔ یہاں کا طرز زندگی دیکھا۔مرد عورتیں بچے سب اپنے اپنے طور پر خوش تھے۔ان کی زندگی کا ایک نظریہ تھا اور وہ اس کے مطابق جی رہے تھے اور صدیوں سے جی رہے تھے۔

اس وقت بھی کالیا انہی لوگوں کے درمیان تھا۔ جہاں محبتیں نہایت فراخدلی سے لٹائی جاتی ہیں اور ہر شخص ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی رکھتا تھا۔ کالیا ایپا کے ساتھ ایک کونے میں جا بیٹھا۔ جہاں سرسبز و شاداب درخت جھول رہے تھے۔ اس نے گہری گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''یہاں کی فضائیں کتنی خوشبودار ہیں۔ایپا اور کتنا سکون ہے ان فضاؤں میں۔کوئی آلودگی نہیں ہے اور نہ ہی ماحول دھواں دار ہے اور نہ ہواؤں میں بدبودار زہریلے جراثیم شامل ہیں۔''

''ہاں'' ایپا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے ایپا کہ کسی طرح میں یہ پیغام اس دنیا تک پہنچادوں۔کتنی سکون کی دنیا ہے ہماری۔'' ایپا کہنے لگی۔

''تو نے ان کا بغور جائزہ لیا ہوگا۔کالیا تو نے دیکھا کہ یہ لوگ کتنے صحت مند ہیں اور یہاں کہیں بیماری کا نام و نشان نہیں ہے۔ جب کہ اس دنیا میں تیرے علم میں ہوگا کہ ہر گھر میں مختلف بیماریاں ہیں۔ کہیں بھوک اور افلاس کی بیماری کہیں رشک و اقابت کی بیماری کہیں محبت اور نفرت کی بیماری۔ کیا کیا بیماریاں وہاں موجود نہیں ہیں۔ ہوس اور اس کی تکمیل کی بیماری' جو دوسروں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

مختلف بیماریوں کا شکار ہیں وہ لوگ' اور جہاں تک دنیا کی تاریخ پر میری نظر جاتی ہے۔تو انسانوں نے تو یہ چاہا تھا کہ سکون اور آرام کی زندگی بسر کریں بے شک ایک دوسرے کی قربت اور اس سے محبت ہی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور جتنے مذاہب اس کائنات میں آئے ہیں ان میں ہمیشہ یہی تلقین کی گئی کہ ایک دوسرے کا خیال رکھو اور ایک دوسرے سے محبت کرو۔ نفرت کے سوا' اور نفرت برائیوں کی جڑ ہے اور اس کا تعلق شیطان سے ہے۔سو یوں لگتا ہے کہ اب اس دنیا پر شیطان کی زبردست حکمرانی ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی ذات میں گم ہوگیا ہی اور یوں لگتا ہے جیسے وہ لوگ واپس پہاڑوں میں جانے کی تیاریاں کررہے ہوں۔'' کالیا کی آنکھیں خیالات میں ڈوب گئیں بہت دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا۔پھر اس نے کہا۔

''جب سے تو نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ مجھے واپس اس دنیا میں جانا ہے تو یوں لگا ہے جیسے مجھے میرے اضطراب کا حل مل گیا ہو۔ میں پرسکون دنیا سے بے پناہ پیار کرتا ہوں لیکن جو پیار میں وہاں

چھوڑ آیا ہوں' وہ میرے لیے اوروں سے بھی افضل ہے۔ عدیل بخشی نے سمندری معلومات کے لیے اپنی تمام زندگی وقف کردی تھی اور اب وہ ایک جزیرے پر پڑا ہوا ہے اور میڈم لتاشہ جو میرے لیے درحقیقت ماں کا درجہ رکھتی ہے وہاں بے بس ہیں۔''

''میں یہ چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی بن پڑے میں واپس جاؤں اور اس جزیرے پر ان لوگوں کو تلاش کروں اور اس کے بعد اس دنیا میں' میں محبت کا پیغام لے جاؤں۔ ان تمام اشیا کے ساتھ جو مجھے یہاں سے حاصل ہوئیں۔ ایسا کیا یہ میرے لیے ممکن ہوگا۔'' اس نے پرخیال نظروں سے کالیا کو دیکھا۔ اور کہا۔

''ہاں..... بے شک ممکن ہوگا لیکن انتظار کرنا ہوگا تجھے طویل انتظار اور کیا تو یہ جانتا ہے کالیا' کہ تیر اباپ طورش ہواؤں کا جادوگر تھا۔ ابھی تک میں نے تیری زبان سے یہ نہیں سنا کہ ہوا کا جادو کیا ہوتا ہے۔''

''ایسا تیرے ساتھ مجھے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ میری ماں میں تو تجھ سے جبانہ کے بارے میں ہر ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اور بہت سی آرزوئیں ہیں میری لیکن میری عقل یہ بھی کہتی ہے کہ اچانک ہی حد سے زیادہ سرگرمیاں شروع کردینا مناسب نہیں ہوتا اور جدل بازی ہمیشہ نقصان دہ ہی ہوتی ہے۔'' ایسا مسکرادی پھر اس نے کہا۔

''تو میں یہ کب کہتی ہوں کہ میں سب سے زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہوں۔ کالیا ایک ایسا نوجوان ہے جس نے بہت سے عظیم کارنامے سرانجام دیئے ہوں گے اور میری عقل بوڑھی ہے۔''

''نہیں میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا بلکہ میری مراد کچھ اور ہے۔ میں بہت سی باتیں تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد بہت سے عمل بھی کرنا چاہتا ہوں جو میرے ذہن میں موجود ہیں۔ تو نے میرے باپ کی بات کی اور اس بات سے مجھے خوشی ہے کہ وہ بھی جادوگروں میں شامل تھا۔''

''اس کا جادو معمولی جادو نہیں تھا اور اگر اس سے تجھے دلچسپی پیدا ہوئی تو میں مجھے بتا سکتی ہوں۔ آج ایک انکشاف کررہی ہوں۔''

''ہوا کا جادو کیا ہے؟''

''تجھے اس کے بارے میں تفصیل بتاؤں گی۔ میں مچھیروں کی اس بستی میں ساکت ہوچکی تھی اور خیال تھا کہ جب تک زندہ رہوں وہیں رہوں' لیکن یہ تو تھا کالیا۔ جس نے میرے اندر ایک نئی زندگی بیدار کی اور جب مجھے یہ علم ہوا کہ تو بھی میری طرح جبانہ کا باشندہ ہے اور یقینی طور پر کوئی ایسا عمل ہوا ہے جس کی بنیاد پر تو وہاں پہنچا ہے تو میرے اندر دوسرے خیالات پروان چڑھنے لگے اور پھر میں نے اپنے جادو کی مشق کی اور اس کے بعد تیرا تعاقب کرتی رہی۔

اس سے پہلے اس جادو کے بارے میں جو کچھ میں جانتی تھی اس سے مچھیروں کی مدد کرتی رہتی تھی تو نے یقیناً نہیں دیکھا ہوگا لیکن عدیل بخشی نے دیکھا تھا کہ میں نے جو اپنی رہائش گاہ بنائی ہوئی تھی وہاں کچھ ایسی چیزیں تیار کی تھیں جو ہواؤں کے رخ کا پتہ دیتی تھیں اور جب وہ مچھیرے ساحل پر اپنی کشتیوں کو درست کررہے ہوتے اور اس کے بعد سمندر میں جانے کی تیاریاں کرتے تو میں انہیں بتاتی کہ آج سمندر میں طوفان آئے گا یا نہیں۔ درحقیقت ہواؤں سے میری شناسائی تھی اور میں انہی ہواؤں کی شناسائی کی بنیاد پر انہیں طوفان سے بچایا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ جو کچھ بھی مجھ سے ہوسکتا تھا میں کرتی تھی۔ ان کے لیے اس لیے وہ میری عزت کیا کرتے تھے اور مجھے ایک جادوگر تصور کرتے تھے۔ ان کے ہاں جادو کا تصور ذرا مختلف ہی تھا۔ نجانے میرے چلے آنے کے بعد ان کا کیا حال ہوا ہوگا لیکن بہرطور یہ ان کی اپنی زندگی تھی۔''

''مگر ہواؤں کا جادو کیا ہوتا ہے؟ اور تو اس جادو سے میرا تعاقب کیسے کیا کرتی تھی۔''

''آج جب ہم اپنی رہائش گاہ پر واپس چلیں گے تو میں تجھے وہ ساری چیزیں دکھاؤں گی جو تیرا

باپ یقینی طور پر تیرے لیے چھوڑ گیا ہے۔''

''وہ کیا چیزیں ہیں؟''

''وہ جو ہواؤں کا علم ہے؟''

''ہاں''

''عجب ہے۔ میں اس سے ابھی تک ناواقف ہوں۔''

''میں تجھے اس سے واقفیت کرادوں گی۔''

''مجھے بہت سی باتیں' بہت دکھ بھری محسوس ہوتی ہیں۔ جب مجھے اپنی اس دنیا میں واپس جانا ہی ہے تو میں یہاں سے وہ علم لے جانا چاہتا ہوں۔ جس کے بارے میں تجھ سے کیا اور میں اسے تحریر کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہوں میں تیرا مطلب سمجھ رہی ہوں۔ مگر تو فکر نہ کر لیکن یہاں کاغذ قلم کا رواج نہیں ہے۔ مگر تو فکر نہ کر آواز کے جادو پر ہم اس سے ملاقات کریں گے۔ وہ آوازوں کی ترتیب جانتا ہے اور نجانے اس نے اپنے فن میں کہاں تک ترقی کی ہے۔ وہ یہاں سے بہت فاصلے پر وہاں پہاڑوں پر جہاں جادوگروں کا بسیرا ہے۔''

''ہم وہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں؟''

''اس لیے ابھی ہمیں طویل وقت درکار ہوگا اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اپنے باپ کا علم اچھی طرح سیکھ لے۔''

''مگر مجھے یہ علم کون سکھائے گا؟''

''میں۔'' ایپا نے جواب دیا اور کالیا حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''کیا یہ ممکن ہوسکا ہے؟''

''بالکل میں تجھے یہ علم سکھاؤں گی۔'' ایپا نے جواب دیا۔ کالیا مسرور نظر آنے لگا۔ اس کے بعد وہ بے چین ہوگیا اور اس نے کہا۔

''میں واپسی چاہتا ہوں'' اور ایپا نے آمادگی کا اظہار کردیا۔ وہ اپنی رہائش گاہ میں واپس آگئے۔ کالیا بری طرح بے چین ہوگیا تھا۔

''اور وہ گوشہ کون سا ہے۔ جس کی تو نے نشاندہی کی۔'' ایپا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''آ میں تجھے دکھاؤں'' ایپا ایک جگہ جا کر رک گئی۔ پھر اس کی پراسرار آواز ابھری ''یہ تیرے باپ طورش کی سحرگاہ ہے۔''

☆☆☆

الماس کو مقبولیت حاصل کرنے میں کمال حاصل تھا۔ مختصر ترین وقت میں اس نے نپولیا کے نوجوانوں کے دلوں میں گھر کرلیا تھا۔ زونارہ تو اس کا دیوانہ ہوگیا تھا اور کہتا تھا۔

''میں تو سوچتا ہوں طولسی کی واپسی کے بعد کیا ہوگا؟''

''کیوں؟'' الماس پوچھتی۔

''میں تو تیرے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''تو میرے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ کیا تیرے خیال میں میں تیرے سے محبت نہیں کرنے لگی۔''

''آہ..... کیا تو بھی مجھے چاہتی ہے؟''

''کیسا نوجوان ہے تو۔ محبت کی آنکھیں نہیں پہچانتا''

''مگر میں کیا کروں' تو ہی مجھے بتا۔''

''میں کیا بتا سکتی ہوں؟''

''طولسی آئے گا تو تجھ پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کرے گا اور ہوسکتا ہے وہ تجھے اپنے ساتھ رکھ بھی لے۔''

''تو میرے ساتھ کیا کرسکتا ہے۔''

''صرف ایک کام''

''وہ کیا.....؟''

''طولسی کو ہلاک کردوں۔''

الماس کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ گویا اس امن کی دنیا میں بھی اسے یہ مقام حاصل ہے کہ ایک بھائی کے ہاتھوں دوسرے بھائی کا قتل کرادے لیکن وہ اپنے نام کے ساتھ کوئی ایسی منسوبیت نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''میں تجھے ابھی اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔''

''اور اگر اس نے ایسا کر ڈالا تو پھر کیا ہوگا۔''

''تو مصلحت سے کام لینا؟''

''کیسے؟''

''اظہار نہ کرنا بلکہ انتظار کرنا۔ میں خود تجھے کوئی بہتر مشورہ دوں گی۔''

''دیکھ الماس میرا خیال رکھنا کسی بھی طور مجھ سے منحرف نہ ہونا۔ ورنہ..... ورنہ..... میں سب کچھ فنا کر دوں گا۔ میں ایسا ہی انسان ہوں'' الماس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور ایسے انسان مجھے ہمیشہ پسند رہے ہیں۔''

وہ خدشہ سامنے آ گیا جو زونارہ ظاہر کرتا رہا تھا۔ یعنی طولسی کی واپسی طولسی شبران کے پاس تمام ساتھیوں کے ساتھ گیا تھا۔ جنہیں وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور جنہوں نے قید سے رہائی حاصل کی تھی لیکن طولسی تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ آٹھ افراد اور تھے۔ یہ وہ تھے جنہیں شبران نے اس کے ساتھ الماس کو لینے بھیجا تھا اور اس وقت طولسی خود بھی بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔

''یہاں آنے کے بعد الماس مجھے بہت سی باتوں کا علم ہوا ہے۔'' طولسی نے الماس سے کہا۔

''کیا طولسی؟''

''یہی کہ نیولیا اب وہ نیولیا نہیں رہا۔ جو میں چھوڑ کر گیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں جادوگروں کی مکمل حکمرانی قائم ہو گئی ہے اور یہ بات تو خیر ہم سب جانتے ہیں کہ جادوگر ہمیشہ سے طاقتور رہے ہیں اور جو کوششیں وہ کر رہے ہیں وہ انہیں مزید طاقتوں کے حصول میں مدد دیں گیں لیکن اب تو ہر شخص اپنی سوچ کا مالک بن گیا ہے اور مجھے یہ خوف محسوس ہو رہا ہے کہ نیولیا کہیں کسی بدترین حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔''

''کوئی ایسی بات نہیں ہوئی طولسی جو تیرے لیے پریشان کن ہو۔''

''ہاں آٹھ آدمی میرے ساتھ آئے ہیں تجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔''

''کیا؟''

''شبران کے پاس.....'' الماس دل ہی دل میں اچھل پڑی تھی۔ یہ تو اس کی خواہش تھی کہ نیولیا کے سردار کے پاس پہنچ جائے لیکن یہ آرزو اس طرح بغیر محنت کے کس طرح پوری ہو جائے گی۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ تاہم اس نے پریشان چہرہ بناتے ہوئے کہا۔

''شبران میرا کیا کرے گا۔''

''یہی تو سب سے بڑا خوف ہے؟''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ وہ عورت پرست ہے اور تو اس قدر حسین کہ کوئی بھی تجھے دیکھ کر دیوانہ ہو سکتا ہے۔ شبران تجھے درحقیقت کسی بھی مقصد کے لیے بلانا چاہتا ہے لیکن یہ خدشہ لاحق ہے مجھے کہ کہیں وہ تجھے پسند نہ کر بیٹھے۔''

الماس مسکرا دی۔ پھر بولی۔

''کیا یہاں میرا مطلب ہے نیولیا میں اگر کوئی کسی کو پسند کر لے تو اس پر اس کی اجارہ داری ہو جاتی ہے؟''

''نہیں..... لیکن سردار کو یہ حق حاصل ہے' اور اگر تو اس کا ساتھ نہ دے گی اور وہ تجھے چاہے گا تو پھر کسی کی یہ مجال نہ ہو گی کہ وہ تجھے اپنے لیے سمجھ سکے۔''

''ہاں یہ ذرا تشویش کی بات ہے۔''

''لیکن تجھے جانا ہو گا۔ میں بھلا اس کے حکم سے سرتابی کیسے کر سکتا ہوں۔''

''تو فکر نہ کر طولسی' میں شبران کو ایسی پٹی پڑھاؤں گی کہ وہ مجھے واپس تیرے پاس پہنچا دے گا۔''

''یہ تجھے کرنا ہو گا الماس' میں تجھے بہت چاہنے لگا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں طولسی' کب جانا ہو گا مجھے۔''

''باہر وہ لوگ موجود ہیں جو تیرا انتظار کر رہے ہیں۔''

''گویا ابھی ٹھیک ہے تجھے فکر نہیں کرنا چاہیے۔''
الماس خوشی سے دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ البتہ جو تیاریاں اس نے کیں وہ ایسی تھیں کہ طولسی دل پکڑ کر رہ گیا اس نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔
''آہ..... تو نے یہ کیا کیا؟''
''کیوں؟''
''اس صورت میں تجھے دیکھ کر شبران تو پاگل ہوجائے گا۔ وہ..... وہ..... حسن پرست ہے۔ میں نے تجھ سے کہا لیکن تو نے میری بات پر غور نہیں کیا۔''
''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو میری فطرت کا ایک حصہ ہے۔ کیا تجھے میری دنیا کے انداز نہیں معلوم۔ ہم لوگ جب کہیں جاتی ہیں تو اسی انداز میں جاتے ہیں اور یہی ہمیں مناسب لگتا ہے لیکن آخر تو فکر مند کیوں ہے۔ میں جو کچھ تجھ سے کہہ چکی ہوں۔ اس پر یقین رکھ اور میرا اعتبار کر۔ یقیناً میں تیرے پاس ہی واپس آؤں گی۔ تجھے میرے لیے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔''
طولسی خاموش ہوگیا اور اس کے بعد الماس وہاں سے چل پڑی، طولسی اس کے ساتھ تھا۔ وہ ان آٹھوں آدمیوں کے ساتھ ایک بار پھر شبران کے پاس پہنچا تھا۔ شبران اپنی رہائش گاہ پر تھا اور عیش وعشرت میں مصروف تھا۔ کہ اسے طولسی کے آنے کی اطلاع ملی اور وہ طولسی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ الماس طولسی کے عقب میں تھی اور اس وقت چھ خوبصورت لڑکیاں شبران کے اردگرد موجود تھیں۔
شبران نے گہری نگاہوں سے طولسی کو اور پھر اس کے عقب میں دیکھا اور دوسرے لمحے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ایک ایسا شعلہ سلگتا ہوا نظر آیا تھا اسے جسے دیکھ کر آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں اور یقیناً جہانہ اور نپولیا کی عورتوں میں یہ خوبی نہیں تھی کہ وہ آپ کو اس طرح بنا سنوار سکیں اور عام عورتوں سے اتنی حسین ہوجائیں جب کہ یہ چھ نوخیز لڑکیاں جو شبران کے اردگرد بکھری ہوئی تھیں۔ الماس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دلکش تھیں لیکن دلکشی تو وہی ہوتی ہے جو دوسروں کی من کو بھا جائے اور الماس اس سلسلے میں اپنا کمال صرف کرتی تھی۔
شبران یہ بھول گیا تھا کہ آنے والی ہستی کو اس نے کس لیے طلب کیا ہے۔ یا پروفیسر جیکانہ نے اس کے بارے میں کن الفاظ میں اظہار کیا ہے۔ وہ تو پرشوق نگاہوں سے الماس کو دیکھ رہا تھا اور پھر چونک کر اس نے طولسی سے پوچھا۔
''کیا یہ وہی عورت ہے طولسی۔ جسے تو نے چھپا کر اپنے پاس رکھا ہوا تھا؟''
''چھپا کر نہیں، معزز شبران میں تجھے بتا چکا ہوں کہ اسے یہاں لانے کا مقصد کیا تھا؟''
''بہتر یہ ہے کہ تو میرے غضب کو آواز نہ دے اور یہاں سے واپس چلا جا؟''
''ٹھیک ہے میں جارہا ہوں۔'' طولسی نے کہا۔ ایک نگاہ الماس پر ڈالی اس کے بعد واپسی کے لیے مڑ گیا۔ شبران اب بھی پاگلوں کی طرح الماس کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ چھ لڑکیاں اس وقت اس کی خدمت میں مداخلت کررہی ہیں۔ چنانچہ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر نیچے گرادیے۔ تمام لڑکیاں واپس چلی گئیں اب صرف الماس رہ گئی تھی۔ شبران اس کے سامنے تصویر حیرت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ تب الماس مسکرائی اور اس نے جھک کر اپنا ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے کہا۔
''حسین نپولیا کے حسین سردار شبران کو الماس تعظیم پیش کرتی ہے۔''
''تو..... تو..... تو..... کتنی خوبصورت ہے۔ کیا تیری دنیا میں عورتیں اتنی ہی حسین ہوتی ہیں۔''
''میری دنیا کی بات نہ کر معزز سردار..... وہاں کی یادیں میں اپنے دل سے نکال چکی ہوں۔ مجھے وہ یادیں یاد نہ دلا۔''
''میں نے تجھ سے ایک سوال کیا تھا۔ کیا تیری دنیا کی عورتیں اتنی ہی حسین ہوتی ہیں جتنی کہ تو؟''
''آہ یہی لگتا ہے اور بہت پہلے کی بات ہے کہ جادوگر کہا کرتے تھے کہ ہماری اس دنیا کے اوپر ایک

اور دنیا آباد ہے وہاں حسین عورتیں رہتی ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہی جیسے دنیا کی زمین سے تیر تعلق ہی نہ ہو اور تو وہیں سے آئی ہو۔''

''اس کی ایک وجہ ہے'' الماس نے کہا۔

''کیا؟''

''شبران بہت اچھی اور تیز نظر کا مالک ہے اور کیوں نہ ہوں اس کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس سرزمین کا باشندہ ہی نہیں لگتا۔''

''تو کس طرح جواب دیتی ہے۔ خوبصورت لفظوں میں اور ایسا تو کوئی نہیں ہے جو تیرے جیسا ہو۔ آہ میرے پاس بیٹھ۔ تجھے کھڑے ہوئے دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کہیں تو تھک نہ جائے۔''

الماس ادائے دلبری سے آگے بھی اس کی چال میں ہزار فتنے جاگ رہے تھے۔ بے شک نپولیا کی عورتیں جوان تھیں۔ حسین تھیں۔ جوانی کی دولت سے مالا مال تھیں لیکن ان کے اندر وہ تمام صلاحیتیں نہیں تھیں۔ جو الماس جیسی پرستم عورت میں تھیں اور اس کی ایک ایک ادا' شبران کو دیوانہ کیے دے رہی تھی۔ ایسا تو اس نے طولی کے ساتھ بھی نہ کیا تھا اور نہ ہی نظام امری کے ساتھ کیونکہ یہ ایک کو اس نے اس کی اوقات میں رکھا ہوا تھا'

یہ ایک ایسے علاقے کا سردار تھا جس کی حکمرانی بہت بڑی بات تھی۔ چنانچہ الماس اس پر اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کررہی تھی اور اس کے خاطر خواہ نتائج پارہی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھ گئی اور شبران اس کے سامنے کھڑا رہا۔

''میں تو سب کچھ بھول گیا کہ کس لیے بلایا تھا میں نے تجھے۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح ایک آسمانی شے میری قربت میں آرہی ہے۔''

''ہاں میرا نام شبران ہے۔ ہاں میں نپولیا کا سردار ہوں۔''

''میں جانتی ہوں اور خوش ہوں کہ سردار نے مجھے عزت بخشی۔''

''میرے دوست جیکانہ نے تیرے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔''

''کیا کہا تھا اس نے میرے بارے میں؟'' الماس نے پوچھا۔

''یہ ہی تو بے خطرناک ہے۔ ذہین ہے' چالاک ہے اور شاید اس نے یہ بھی کہا تھا کہ نپولیا کے لیے بے حد خطرناک ثابت ہوگی اور میں نے تجھے اس لیے طلب کیا تھا کہ تجھے دیکھوں اور اگر ایسا پاؤں تو تیرے بارے میں کوئی مناسب فیصلہ کرسکوں۔''

الماس ہنس پڑی اور اس نے کہا۔

''تو یہ کہا تھا۔ پروفیسر جیکانہ نے میرے بارے میں حالانکہ اس کے بارے میں میں یہ کہتی ہوں کہ بہت ہی ذہین بہت ہی سمجھ دار اور بہت ہی اچھا انسان ہے یہ اپنا اپنا خیال ہے اگر وہ مجھے پسند نہیں کرتا تو میں کیا کرسکتی ہوں۔''

''وہ احمق ہے اور یہ ثابت ہوگیا ہے کہ وہ واقعی احمق ہے اور جادوگر و درست کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں کہ وہ واقعی ایک بے وقوف انسان ہے۔''

''جادوگر کیا کہتے ہیں اس کے بارے میں۔'' الماس نے پوچھا۔

''ان کا کہنا ہے کہ جیکانہ جس جادو کا ذکر کرتا ہے' جس کو وہ امن کا جادو اور محبت کا جادو کہتا ہے۔ وہ درحقیقت بزدلی کا جادو ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جیکانہ بزدل ہے اور جنگ و جدل سے خوف کھاتا ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ نپولیا کی سرزمین پر ایسے بزدل لوگوں کا رہنا۔ نپولیا کے مستقبل کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''معزز سردار میں تجھ سے درخواست کرتی ہوں کہ اگر تو اپنے نپولیا کو بچانا چاہتا ہے تو تو بہادر لوگوں کو اپنے درمیان جگہ دے اور بزدلوں کو خود سے دور رکھ۔''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''اگر تو میری بات کرتا ہے تو میری دنیا تو بالکل عجیب و غریب دنیا ہے۔ یقیناً اس کے بارے میں تیرے ساتھیوں نے تجھے بہت سی معلومات فراہم کی

ہوں گی۔ جس میں پروفیسر جیکانہ بھی شامل ہے۔ میں اس کا تذکرہ ابھی بالکل نہیں کرتی۔''

''تو سمجھے گا کہ چونکہ اس نے میرے لیے دشمنی کے الفاظ کہے اور میں نے جواب میں اس کے لیے دشمنی کے الفاظ کہہ رہی ہوں لیکن دوسرے لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ میری دنیا میں کیا ہوتا ہے اور میں تو اپنی دنیا میں بھی دوسرے لوگوں سے انتہائی منفرد ہوں۔ نپولیا کا سردار تو مجھے طلب کر کے مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔''

''میں تو نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں اور نہ کچھ کرنا۔ کہا تو میں نے یہ تھا کہ طوطی سے کہ اسے لے کر آ' جو فتنہ ساز ہے لیکن ثابت یہ ہوا کہ فتنہ ساز وہ ہیں جو تیری برائی کرتے ہیں۔ غالباً اس لیے کہ انہیں تیری نگاہ التفات حاصل نہ ہو سکی ہوگی۔''

''شاید ایسا ہی ہو۔'' الماس نے مسکرا کر کہا۔

''لیکن میں..... جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے کہہ دینے میں کمال رکھتا ہوں اور کیا میں تجھ سے یہ کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ تو میری اول پسند بن گئی ہے۔ تیرے حسن و جمال نے مجھے تیرا دیوانہ بنا دیا ہے۔''

''الماس ہنس پڑی اور یہ ہنسی بھی اتنی دلکش تھی اور اس آواز اتنی نغمہ بار کہ شبران نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی آواز کی بازگشت سے لطف اندوز ہونے لگا۔ تب الماس نے کہا۔

''تو اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ شبران تیری قربت تو شاید ہر وہ عورت چاہے جس نے اس دنیا میں آنکھ کھولی ہو۔ اگر تو کسی کو خود اس قربت کی پیش کش کر دے تو میں سمجھتی ہوں کہ اس سے بری عورت اور کوئی نہیں ہوگی۔'' شبران خوشی سے اچھل پڑا۔ پھر اس نے کہا۔

''تو کیا..... تو..... مجھے یہ مقام دے سکتی ہے''

''میں تیری غلامی کرنا فخر سمجھوں گی۔''

''تو میں سب کچھ بھول گیا۔ بلکہ میں..... میں تو اب پروفیسر جیکانہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے سامنے تجھ جیسی عورت کی نشاندہی کی۔''

الماس اس کی خوشی کا اندازہ لگانے لگی اور اس کے دل میں مسرت کے پھول کھلنے لگے۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید اسے وحشی انسان پر بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی لیکن واقعی یہ تو کمال کی چیز نکلا اور اب رہ گئی طوطی اور زوناره تو ان جیسے تو بہت سے ملتے۔ جو الماس کے لیے دل میں محبت رکھتے تھے لیکن اسے پا نہیں سکتے تھے' الماس ہمیشہ اس مقام پر ہاتھ ڈالتی تھی جس سے اس کے مستقبل کے بہت سارے راستے نکلتے ہوں اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب نپولیا کی تاریخ میں یقینی طور پر کچھ تاریک ساز تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔

ایپا کے چہرے پر پراسرار کیفیت بدستور چھائی ہوئی تھی اور کالیا اس جگہ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ جگہ تو اس نے بہت بار دیکھی تھی اور یہاں اسے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی تھی۔ بس ایک کمرہ تھا جس میں غیر ضروری چیزیں اور دیواروں پر سوراخ بنے ہوئے تھے لیکن ان سوراخوں میں انہی کے برابر پتھر ٹھونسے ہوئے تھے۔ تاکہ سوراخوں سے ہوا اور مٹی اندر نہ آ سکے۔ یا پھر روشنی۔

کالیا نے اپنے باپ کے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے کئی بار ان پتھروں کو ان کی جگہ سے ہٹا کر دیکھا تھا اور یہی اندازہ لگایا تھا کہ سوراخ قدرتی ہیں اور یقیناً اس کے باپ نے گرد اور مٹی سے محفوظ رکھنے کے لیے پتھروں کے یہ ٹکڑے ان میں نصب کیے ہیں۔ باقی اور کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی۔ جسے قابل توجہ کہا جا سکے۔ لیکن ایپا اس جگہ کو اس کے باپ کی سحر گاہ کہہ رہی تھی۔ کالیا جانتا تھا کہ ایپا ایک ذہین اور تجربہ کار عورت ہے اور جو کچھ وہ کہتی ہے۔ وہ بے مقصد نہیں ہوتا لیکن کچھ سمجھ میں بھی تو آئے تاہم وہ خاموشی سے ایپا کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

ایپا نے اپنے لباس سے دو پتے نکالے۔ جو غالباً درختوں سے توڑے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں پتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا اور

انہیں کمرے کے وسط میں زمین پر ڈال دیا۔ کالیا اس کی تمام حرکتوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر ایپا نے آگے بڑھ کر ایک سوراخ سے پتھر کا وہ ٹکڑا نکال لیا جو سوراخ سے آنے والی ہوا اور روشنی کو روک رہا تھا۔ روشنی کی ایک کرن سیدھی اس جگہ آ کر پڑی جہاں وہ دونوں پتے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

کالیا اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ایپا آہستہ آہستہ دوسرے سوراخ کی جانب بڑھی اور اس نے اس سوراخ سے بھی پتھر ہٹا دیا۔ روشنیاں ایک دوسرے کو کراس کرنے لگیں۔

ساتھ ہی ساتھ ہوا بھی آ رہی تھی۔ چنانچہ پتہ ہلکے ہلکے لرزنے لگا تھا اور پھر ایپا نے ان دونوں کے درمیان میں ذرا بلند پر ایک اور سوراخ پتھر سے ہٹا دیا۔ ہوا بظاہر بہت تیز نہیں تھی لیکن آ رہی تھی۔ پتہ فضاء میں بلند ہوا اور اڑتا ہوا دور تک چلا گیا۔ پھر وہ نیچے گر پڑا۔

ایپا نے اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر پھر واپس اسی جگہ پر رکھ دیا اور اس کے بعد اس نے مخالف سمت سے دو ایسے سوراخ اور کھول دیئے جو نہی پتھر اوپر رکھا گیا۔ دفعتاً وہ فضاء میں بلند ہوا اور اسی سمت بڑھا جدھر وہ پہلے جا کر نیچے گر گیا تھا لیکن اچانک ہی ان دونوں سوراخوں سے آنے والی روشنی اور ہوا نے اسے پھر اس کی جگہ سے بلند کیا اور پتہ فضا میں تقریباً سات یا آٹھ فٹ کی بلندی پر معلق ہو گیا۔ گویا ہواؤں کا تناسب اس پر حاوی ہو گیا اور پتہ فضاء میں ایک جگہ رک گیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ لرز رہا تھا اور اس کی لرزشیں کالیا کو بہت عجیب محسوس ہو رہی تھیں۔ دوسری بات اس کے ایک جگہ رک جانے کی تھی۔ گویا مختلف سمت سے آنے والی ہواؤں نے اسے بیلنس کر دیا تھا اور وہ اپنی جگہ رک گیا تھا۔

کالیا کی سمجھ میں اب بہت سی باتیں آنے لگیں۔ ایپا نے ان ہواؤں کو کاٹنے کی کوشش نہیں کی اور کالیا سے بھی کہا کہ پتے پر جس جس سمت سے ہوا اور روشنی پڑ رہی ہے اسے کاٹنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ اگر اسے رخ تبدیل کرنا ہو تو ان سے بچ کر نکلے۔ مگر کالیا اپنی جگہ ساکت تھا۔ البتہ ایپا خود ہی ان سے بچتی ہوئی جھکتی ہوئی دیوار کے ایک اور حصے کی جانب پہنچ گئی۔

یہاں سے اس نے ایک اور سوراخ سے پتھر نکالا اور وہاں سے بھی روشنی اور ہوا اندر آنے لگی۔ تب کالیا نے پتے کو مناسب رفتار سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ یہ سوراخ کچھ اس قسم کا تھا کہ اس کی روشنی کمرے کی ایک دیوار سے نکل کر دوسری دیوار تک پہنچتی تھی اور کالیا دیکھ رہا تھا کہ وہ پتے جسے اصولی طور پر زمین پر گر پڑنا چاہیے تھا' آٹھ فٹ کی بلندی پر اس دیوار کی جانب آہستہ آہستہ سفر کر رہا تھا۔ کالیا حیران نگاہوں سے اس انوکھے جادو کو دیکھنے لگا اور اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیلتی رہیں۔ یہاں تک کہ پتہ دیوار تک پہنچا۔ پھر وہاں ساکت ہو گیا۔ ایپا نے ایک اور عمل کیا اور ایک اور سوراخ کھولا۔ جس کی بنیاد پر پتہ واپس ہوا اور روشنی کے اسی دائرے میں اپنی جگہ جانے لگا اور وہاں سے دیوار تک پہنچ گیا جو سامنے نظر آ رہی تھی۔

اب یہ دلچسپ اور انوکھا جادو تھا۔ بلاشبہ جدید دنیا کی سائنس میں اس کا تصور موجود تھا۔

لیکن جس انداز میں ہواؤں کو اس کمرے میں قید کیا گیا تھا پتہ نہیں جدید دنیا میں اس پر تحقیق ہوئی تھی یا نہیں۔ ایپا نے مزید تبدیلیاں کیں اور پتہ زمین پر آ رہا پھر اس نے وہ سوراخ بند کرنا شروع کر دیئے اور اس کے بعد مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے کالیا کے سامنے آ گئی۔

''میں نے غلط تو نہیں کیا تھا۔ تو نے اپنے باپ کی سحر گاہ دیکھی۔''

''ایپا تو نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔''

''نہیں' یہ تیرے باپ کی حیران گاہ ہے' کیا سمجھا ہے اور اس سے تو نے کیا اندازہ لگایا ہے۔ مجھے جواب دے۔''

''پتہ ہواؤں کے دوش پر اپنی رخ تبدیل کر

تھا اور ہوائیں اپنے مخصوص زاویوں سے فضا میں بلند کر کے آگے بڑھا رہی تھیں۔''

''ہاں بالکل ٹھیک۔ یہ ایک بڑا کمرہ ہے اور ان چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے جو ہوائیں آتی ہیں' ان کی طاقت بہت معمولی ہوتی ہے لیکن کھلی فضاؤں میں ہواؤں کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اب یہاں تو یہ دیکھ کہ یہ پتہ زمین پر پڑا ہوا تھا اصل میں اسے ایسے رخ تیار کرنے تھے جہاں ہوا کی عافیت اس کے وزن پر حاوی ہو جائے حالانکہ یہ مزدوری نہیں ہے کہ ہوائیں تیز ہوں۔

بس مشتر کہ سمتوں سے آنے والی ہواؤں کا ایک جگہ جمع ہونا وہ طاقت بن جاتا ہے جو کسی بھی وزنی شے کو بے حقیقت کر دے اور اس کا وزن ختم کر دے۔ تجھے ہوا کا رخ پہچاننا ہے اور یہی ہواؤں کا جادو ہے۔ ہواؤں کا رخ پہچاننے کے لیے بہت آسان طریقے ہیں جو میں تجھے کھلی فضاؤں میں لے جا کر بتاؤں گی اور جب تو ہوا کا رخ اختیار کرے گا۔ تو تیرا جسم بے وزن ہو جائے گا اور اس کے بعد ہواؤں کی ترتیب سے تو بندیوں تعین کر سکے گا اور سمتوں کا بھی۔ یہ ہی ہوا کا جادو کہلاتا ہے۔''

کالیا بدستور حیران تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جدید دنیا کی بھرپور سائنس تھی لیکن اصل مسئلہ اس پر قابو پانے کا تھا اور یہ کام آسان نہیں ہو سکتا ایسے اپنی دنیا کے وہ ہوائی جہاز نظر آئے یا پھر وہ پتنگیں جو ایک دھاگے میں باندھ کر اپنی مرضی سے اڑائی جاتی ہیں۔

''خوب سوچ چکا تو..... تو نے خوب سوچا اور کیا تو نے وہ سمجھ''

''میں دعویٰ نہیں کرتا عظیم ایپا! لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہوا کا جادو اپنے طور پر ایک بڑی قوت رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں ہوائی جہاز اڑائے جاتے ہیں۔ راکٹ اڑائے جاتے ہیں۔ راکٹ کو فضا میں پہنچانے کے لیے بازو کی قوت درکار ہوتی ہے لیکن ہوائی جہاز جو انسان کو لے کر فضا میں بلند ہوتا ہے۔ اس میں سو فیصد یہی ہواؤں کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا سائنسی طریقہ کار کیا ہے لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں ہواؤں کی قوتوں کو یقینی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔''

''بالکل کیا گیا ہوگا۔ ہواؤں سے تعاون بغیر کسی چیز کا فضا میں رہنا ممکن نہیں رہتا۔''

''آہ..... معزز ایپا میں تو اس فن کو سیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا ہوں۔ میں نے پتے کی پرواز اس کمرے میں دیکھی لیکن کیا میرا جسم بھی اس پتے کی مانند فضاء میں بلند ہو سکتا ہے۔'' ایپا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

''ہاں..... آغاز تو یہیں سے ہونا ہے اور بھلا باہر کی فضاؤں میں سارے کام سمجھ لینا کیسے ممکن ہے۔''

''تت..... تو..... تت' کیا لیکن ہوائیں تو اتنی تیز نہیں ہیں کہ مجھ جیسے شخص کو فضاء میں بلند کر دیں؟''

''ہوائیں تو ہر وقت بھی تیز نہیں ہوتیں لیکن فضاؤں میں جس قدر بھی ہوائیں موجود ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے کارآمد ہیں ورنہ کیا ہم آندھیوں کے چلنے کا انتظار کریں تاکہ یہاں سے کہیں اور منتقل ہو سکیں۔ نہیں میرے بچے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہی ہوائیں یہی ماحول ہمارے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔''

کالیا اس بات سے اتفاق نہیں کر رہا تھا لیکن بوڑھی ایپا نے اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک جگہ لا کر کھڑا کر دیا اور پھر سوراخوں کا عمل دہرانے لگی۔ کالیا کو محسوس ہوا کہ پہلے جب وہ کمرے میں کھڑا ہوا تھا تو ہوائیں اس شدت سے اپنی قوت اندر داخل نہیں کر رہی تھیں لیکن اب جب کہ ایک زاویہ منتخب کیا گیا تھا تو ہوائیں محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر ایپا نے کچھ نئے عمل کیے۔ یعنی کمرے کے بالکل نچلے حصے میں جو سوراخ تھے انہیں کھولنے لگی اور اچانک ہی کالیا کو محسوس ہوا کہ اس کے قدم لرز رہے تھے۔ اس ہواؤں کا تیز شور بھی سنائی نہیں دیا تھا لیکن اس کے پیروں میں پڑنے والی ہوائیں اس کے پیروں کو زمین سے اکھاڑے دے رہی

تھی اور اچانک ہی جب ایپا نے بائیں سمت کے نچلے حصے سے دو پتھر نکالے تو کالیا ایک دم فضا میں اچھل گیا اور تھوڑے فاصلے پر زمین پر جا گرا۔ ایپا کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے فوراً ہی کہا۔

''میرے بچے یہ تو ایک تجربہ ہے۔ بلکہ یوں سمجھ کہ ایک نصیحت ہے تیرے لیے بے جان چیزوں کو قابو میں کرنا پڑتا ہے اور ان کے لیے زاویے خود منتخب کرنے پڑتے ہیں' لیکن جانداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم کا توازن قائم کرلے۔ تمہیں ان ہواؤں میں اپنے جسم کا توازن قائم کرنا ہوگا۔ درمیان میں اسی جگہ پہنچ جاؤ' میں یہ سوراخ بند کرتی ہوں۔ پھر جب میں یہ سوراخ دوبارہ کھولوں گی اور ہوائیں تمہارے قدموں کو اپنی طاقت سے دھکیلیں گی تو تمہیں فوراً ہی نئے نئے رخ تبدیل کرنا ہوں گے اور یہ تمہاری برق رفتاری پر منحصر ہے سمجھ رہے ہو نا۔ دیکھو میں تمہیں عمل کر کے بتاؤں' تم یہاں ان دو پتھروں کے پاس آجاؤ اور جب میں وسط میں اس جگہ کھڑی ہو جاؤں تو تم اچانک ہی انہیں کھول دینا۔''

کالیا نے گردن ہلادی اور اس کے بعد وہ عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا' ایپا نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے تھے اور کالیا کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ہی کالیا نے پھر ہٹائے ہوا کے تیز جھونکے اندر داخل ہوئے اور ایپا نے فوراً ہی اپنے جسم کو تین جنبش دیں اور اس کے بعد سیدھی فضا میں بلند ہوتی چلی گئی۔

یہاں تک کہ چھت سے جا لگی' اب صورت حال یہ تھی کہ ایپا کا سر چھت سے لگا ہوا تھا اور اس کا بدن فضا میں معلق تھا۔ دونوں پتھر ایک سمت پڑے ہوئے تھے اور کالیا پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایپا کو دیکھ رہا تھا۔ ایپا نے وہیں سے کہا۔

''ابھی اور ایسے سوراخ ہیں جنہیں اگر اپنی جگہ سے ہٹایا جائے تو میں اس کمرے کی فضا میں ٹھہر بھی سکتی ہوں لیکن ایسا نہیں کرنا' بوڑھی عورت ہوں اگر غلط سمت سے ہوا آ گئی تو گر پڑوں گی اور چوٹ لگ جائے گی۔ تم نے اتنا دیکھا' اسی پر عمل کرو'' کالیا نے گردن ہلادی۔

ایپا آہستہ آہستہ خود ہی نیچے اتر آئی۔ کالیا اس بارے میں پوچھا تو وہ اسے تفصیل سمجھانے لگی یہ اتنا دلچسپ مشغلہ تھا کہ کالیا کو انتہائی لطف محسوس ہوا۔ پرندوں کی طرح فضا میں پرواز کرنے کا تصور بڑا عجیب تھا۔

ایپا نے اسے کافی سمجھا بجھا کر فضا میں بلند ہونے کے طریقے سکھائے اور جب ہواؤں کے رخ پر تبدیلیاں کی گئیں تو کالیا کو احساس ہوا کہ اس کا بدن بہ آسانی فضا میں ابھر سکتا ہے اور نیچے اتر سکتا ہے اور نجانے یہ عمل وہ کتنی دیر تک رکتا رہا کہ اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔

پروفیسر جیکانہ کا ایک چھوٹا خوبصورت سا گھر تھا' بے شمار شناسا تھے اور ان شناساؤں میں اس کا جی لگتا تھا لیکن نجانے کیوں ایک اضطراب اس کے سینے میں رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اپنا مطمئن نہیں پاتا تھا جتنا اسے اپنی سرزمین پر آنے کے بعد ہو جانا چاہیے تھا اپنے طور پر وہ اس اضطراب کی وجہ جاننے میں کوشاں تھا۔ ادھر جولیا نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے گھر میں مصروف کرنے کے لیے عمل کرنے شروع کر دیئے تھے۔

پروفیسر اور جولیا باتیں کرتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔ تبھی ان کی نگاہیں کچھ فاصلے پر گئیں۔ پروفیسر جیکانہ نے بھی وہ منظر دیکھا اور جولیا نے بھی۔ جولیا نے تو باپ کی موجودگی کی بنا پر فوراً ہی رخ تبدیل کر لیا تھا لیکن پروفیسر کی تشویشناک نگاہیں ادھر ادھر دیکھتی رہی تھیں۔

شبران تھا جو اس پرسکون علاقے میں رنگ رلیاں منا رہا تھا' نپولیا کا سردار دوسری دنیا سے آنے والی عورت الماس کے ساتھ تھا اور الماس شاہانہ انداز میں اسے اپنا غلام بنائے ہوئے تھے اور شبران اس وقت بالکل بے بس نظر آرہا تھا اس منظر نے پروفیسر کو خوفزدہ کر دیا۔ اس نے جولیا کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا۔

''آؤ وہ درختوں کے جو کنج نظر آرہے ہیں ان کی آڑ میں چلے جانا بہتر ہے کہیں یہ لوگ ہمیں دیکھ نہ لیں۔'' جولیا نے خاموشی سے باپ کی ہدایت پر عمل کیا تھا وہ دونوں درختوں کے کنج میں چلے گئے اور پروفیسر جیکانہ نے پرخیال انداز میں کہا۔

''میں نے کہا تھا کہ وہ اس عورت سے ہوشیار رہے وہ عورت سرزمین جبانہ پر فساد بن سکتی ہے لیکن میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ شبران اس کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جولیا کہ یہ بہت خطرناک عورت ہے اسے ماحول پر حکمرانی کا طریقہ آتا ہے اور وہ حالات کو اپنے بس میں کرنے کا گر جانتی ہے اور یہ ہی محسوس ہو رہا ہے شبران اپنا منصب کھو بیٹھا ہے۔ مجھے اس سے بات کرنی پڑے گی۔''

جولیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پروفیسر جیکانہ کے چہرے کی تشویش کو وہ بھی تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

رنگ و بو کی مہذب دنیا سے دور وہ نا قابل دور سمندروں سے پرے جہاں جہازوں کا گزر بھی نہیں ہوتا تھا اور جہاں سے فضائی پروازوں کا تصور بھی نہیں کی جاسکتا تھا ایک نا قابل یقین انوکھی دنیا سے الگ اگر کسی سیاح کا گزر ہوتا تو وہ ایک ایسی مخلوق کی کہانی ضرور سناتا جو اسی دنیا میں رہنے والوں کی مانند تھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ وہ فضاؤں میں پرواز کرتی تھی۔ اگر وہ یہ نہ کہتا کہ اس نے وہاں لاتعداد انسانوں کو فضاء میں پرندوں کی مانند اڑتے دیکھا ہے تو کم از کم یہ ضرور کہتا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دو افراد کو اس طرح فضاء میں پرواز کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جیسے تیز رفتار پرزور فضاؤں کے حکمران ہوتے ہیں اور اس کے لیے وہ قسمیں کھا لیتا ہے کیونکہ یہ ایک سچ تھا۔ جبانہ کے اس حصے پر جو کولیا کہلاتا تھا۔ فضاؤں میں عموماً کالیا کو دیکھا جاسکتا تھا۔ جو پہلے سمندروں کا رسیا تھا اور اب ہواؤں کا۔

ایپا کی رہنمائی میں اس نے ہواؤں میں اپنے آپ کو منوالیا تھا۔ ہوا کا ذرہ بھی شائبہ نہ ہوتا لیکن وہ ایسے زاویوں کو سمجھ چکا تھا۔ جہاں سے فضا میں موجود ہلکی ہلکی ہوائیں بھی جو کائنات پر مسلط رہتی ہیں اس کے خوبصورت بدن کو سنبھال کر اتنی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہیں کہ پرندوں کا گزر بھی وہاں سے نہ ہو۔ بوڑھی ایپا کی جسمانی قوتیں اب اس کا ساتھ نہ دے پاتی تھیں اور وہ اتنی بلندیوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ جہاں انسانی آنکھ ناکام رہے اور جہاں آکسیجن بے پناہ بھاری ہو جائے۔

یہ کالیا کی جوان قوتیں تھیں جو آکسیجن کی کمی کو بھی برداشت کر لیتی تھیں اور وہ فضاؤں میں اٹھکیلیاں کرتا پھر رہا تھا۔ اور یہ تو اس کی فطرت کا ایک حصہ تھا کہ جس کام کو وہ سیکھنا چاہتا ہے اسے سیکھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ بس طریقہ کار دریافت ہو جائے اور یہی ہوا۔

ایپا اور وہ اب اکثر وادیوں میں دیکھے جاتے تھے اور یہاں کالیا ہوا کے جادو کی مشقیں کرتا تھا اور دیکھنے والے اگر اس عجوبے کو دیکھتے تو ناقابل یقین طور پر آنکھیں پھاڑ کر رہ جاتے۔ ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک پہنچنا چشم زدن کا کام تھا۔

پلکیں جھپکیں اور فاصلے طے ہوئے خود ایپا بھی اعتراف کرتی تھی کہ کالیا کا باپ طورش بھی اپنے فن میں اتنی مہارت حاصل نہیں کر سکا تھا۔ جس نے یہ فن ایجاد کیا تھا جتنی اس وقت کالیا کو حاصل ہے۔ وہ کہتی تھی کہ کالیا کے اندر جبانہ کا سب سے بڑا جادوگر بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

☆

اس سنسنی خیز داستان کے
بقیہ واقعات آئندہ
ماہ ملاحظہ کریں

☆

توتا کھانی

ڈاکٹر سلیم اختر

ہم اپنے آپ سے..... اپنی ذات اور اردگرد کی بہت سی چیزوں سے فرار چاہتے ہیں..... اپنے متعلق بہت سی خوش فہمیوں میں بھی مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا ہم اس طرح اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے رہے؟ ایک حسینہ کا قصہ، وہ آئینے سے مطمئن نہ تھی..... اس کو مطمئن کرنے کے لیے ایک پرندے نے اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا.....!

ہمارے اردگرد کا فسانہ.....ہمارے اندر کا قصہ

بیگم جمال بڑی دیر سے آئینہ کے مقابل تھی۔

جب آئینہ نے پرم کئے ہوئے بالوں، گرین آئی شیڈ، ٹویزر سے تراشیدہ بھنوؤں، امپورٹڈ آئی لیشز، بلش آن والے گال پر مصنوعی تل اور جسم کے ساتھ لپٹے ہوئے پیرٹ سوٹ کے ساتھ میچ کرتی لپ اسٹک کے بارے میں پہلے اظہار خیال اور پھر اظہار اطمینان کر دیا تب کہیں بیگم جمال نے اطمینان کی طویل سانس لی، یوں کہ شرٹ اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی گئی۔ تب آئینہ نے آنکھ ماری۔

''یو ڈرٹی!'' وہ اٹھلا کر بولی۔

آئینہ بھی جواب میں خوشی سے کھل اٹھا۔ ''سیم ٹو یو!''

بیگم جمال نے قہقہہ لگایا۔

''اے جان فیس..... تیرے ارادے کدھر کے ہیں۔'' آئینہ نے پوچھا۔

''پھر شعر و شاعری شروع کر دی۔'' وہ مصنوعی غصہ سے بولی۔

''کیوں..... شعر و شاعری میں کیا خرابی ہے؟''

''یو نو! میں ایک پریکٹیکل عورت ہوں اور شاعری کی باتوں میں کیا رکھا ہے بھلا؟''

''آئی نو! آئی نو!''

''شٹ اپ! یو ڈونٹ نو ون تھنگ فرام دی اور۔''

''بٹ..... آئی سی..... دی سینگ آئی۔''

''اونہہ! سینگ آئی۔ مائی فٹ''

''اچھا ڈیئر، برا نہ مناؤ یہ بتاؤ کہاں جا رہی ہو؟''

''کہیں بھی نہیں۔''

''تو پھر یہ چلتا پھرتا اسلحہ خانہ کیوں؟''

''میں بہت بور ہو رہی ہوں۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں بس..... کچھ عجیب سی حالت ہے ان دنوں میری۔''

''سہیلیوں سے گپ شپ کر لی ہوتی۔''

''اونو! اسٹوپڈ بچز، سب کی سب اسکینڈلز مونگر۔ اور یو نو، مجھے فضول کے اسکینڈلز سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''تو؟''

''سوچتی ہوں کہیں گھوم آؤں..... کچھ شاپنگ ہی کرلوں۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا..... ویسے بھی کوکنگ آئل اور واشنگ پوڈر ختم ہو چکے ہیں۔''

اس نے برا مان کر آئینہ کو گھورا۔

''پھر بے تکی ہانکنے لگے۔''

''اچھا بے تکی نہیں ہانکتا، چلو تک کی.....''

''یو ایڈیٹ مرر! تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''کیوں نہیں سمجھ سکتا۔'' اس مرتبہ آئینہ نے برا منایا۔ ''میں تمہارا رازدار بھی ہوں اور چاہنے والا بھی.....''

''ویٹ آئی نو!''

''تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں تمہاری اولین محبت ہوں، سوچو آج سے.....''

وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔

''مجھے یاد ہے اب اس بہانے میری عمر کا حساب لگانا نہ شروع کردینا۔''

''نہیں'' وہ ہنسا۔ ''میں تمہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا..... سنو!''

''ہوں۔''

''کبھی کبھی میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کسی چھومنتر سے میں مرد بن جاؤں۔''

وہ اسے مخمور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''اچھا؟''

''محض مرد نہیں..... بلکہ صرف تمہارا مرد بن جاؤں۔''

''پھر؟'' وہ اب شرما رہی تھی۔

''پھر؟'' وہ جیسے سوچتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں شائد تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ میں ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔''

وہ نیم وا آنکھوں سے آئینہ دیکھے جارہی تھی، وہ پھر بولا۔ ''ویسے ایک بات تو تمہاری درست ہے۔''

''کیا؟''

''یہ شعروشاعری واقعی فضول شے ہے۔''

''اچھا؟ اچانک انکشاف کیسے؟''

''اب دیکھو نا..... میرے جذبات کیا ہیں جب کہ شاعر یوں کہتا ہے۔

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھا

آئینہ کو پس کا ہے پریشاں نظری کا

''واہ کیا شعر ہے۔'' وہ خوش ہوکر بولی۔ پھر چپ ہوکر دیکھتی رہی اور اب جو بولی تو آواز مہین، ملائم ریشمی رومال میں تبدیل ہوچکی تھی۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

''سچ بتاؤ گے ناں؟''

''تم جانتی ہو، میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔''

''کیا میں واقعی خوب صورت ہوں؟''

''یقیناً......''

''سب سے زیادہ خوب صورت؟''

اور جواب میں آئینہ کرچی کرچی ہوگیا' وہ ہنسی۔

''اچھا! اب یہ ایکٹنگ بند کرو۔ اب میں چلتی ہوں۔'' پھر گردن کو ذرا سا خم دے کر بولی۔ ''بائی۔''

''اوکے سی یو۔'' لہجہ بچھڑنے والے عاشق جیسا تھا۔

وہ میچنگ پرس ہلاتی کمرہ سے باہر تو نکل آئی لیکن وسیع کوٹھی کے عریض لان میں گومگو کے عالم میں کھڑی سوچتی رہی کہ جائے کہاں؟ کیا کرے؟ گاڑی نکال لے؟ اعصابی تناؤ کے باعث خود کو کسی گمان میں محسوس کر رہی تھی۔ لہٰذا گاڑی چلانے میں خطرہ تھا یوں بھی شہد کی بھنبھناتی مکھیوں کا چھتا بنا ہوا تھا اور کبھی کبھی یوں بلاوجہ جسم میں جیسے لرزش سی دوڑ جاتی! تو اب؟

بیگم جمال کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا' سوائے جمال صاحب کے جو اس سے بالعموم دور ایک دوسرے ملک کاروبار کرتے، کاروبار کیا، سونے کی کان تھا، لہٰذا بیگم جمال کی خوش قسمتی کی طویل فہرست کا آغاز تابعدار امیر جمال صاحب سے ہوتا تھا۔ سال دو سال بعد آتا تو محبت تحائف سے لدا پھندا، البتہ چیک باقاعدگی سے آتے' لہٰذا خوش قسمتی کی بقیہ فہرست ان چیکوں کا ضمیمہ تھی۔ ہاں ایک بات تھی کہ خوش قسمتی کی اس فہرست میں بچوں کے نام نہ دیکھے جاسکتے تھے' لہٰذا کئی امور کے لحاظ سے وہ فارغ تھی اتنی فارغ کہ اب یہ فراغت وبال بن رہی تھی۔ چنانچہ ایسی امیر فارغ عورتوں کی سرپرستی اور صدارتوں کی متلاشی سوشل ورکر قسم کی بیگمات نے اسے بھی دریافت کرلیا اور یوں برج پارٹیوں' چیریٹی شوز اور کلچرل فنکشنز کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مگر بیگم جمال طبعاً سوشل اینمل نہ تھی' اس لئے اسے چندہ میں بھی بھاری رقوم کے چیک دے کر دکھی انسانیت کی خدمت میں کوئی خاصا مزا نہ ملتا، لہٰذا ان سب سے بے زار ہوگئی۔ کچھ عرصہ تک مطالعے سے خود کو بہلایا اور ہیرلڈ روبنز سے لے کر جیکی کولنز تک تمام بیسٹ سیلرز پڑھ ڈالے، ویڈیو دیکھے کیسٹس سنیں، طرح طرح کے کھلونے تلاش کئے۔ مگر بے کلی اور اس سے جنم لینی والی بدمزگی برقرار رہی' کبھی کبھی تو بوریت جیسے ایک دورہ کی شکل اختیار کرلیتی' تب وہ بے تحاشا شاپنگ کرتی' ایسی افراتفری شاپنگ کہ بیشتر ایسی چیزیں خرید لی جاتیں جن کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن یوں بے معنی خرچ سے بھی خاص قسم کا سکون ملتا اور یک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا' ہرچند کہ عمر اس کی بھی طویل نہ ہوتی۔

آج بھی بے کلی سے وہ جلے پاؤں کی بلی بن رہی تھی۔ آئینہ نے کچھ بوریت کم کردی تھی۔ ویسے آئینہ کی ایک بات تو درست تھی، اب وہی اس کا دوست رہ گیا تھا اور اس سے کلام میں خوش تھا۔ کم بخت کیا مزے مزے کی باتیں کرتا ہے۔ گویا سچ مچ کا مرد ہو۔ باتیں کم اور گدگدی زیادہ!

وہ پرس جھلاتی' فٹ پاتھ پر چلی جارہی تھی، کبھی کبھی کوئی راہ گیر اسے دیکھ کر ٹھٹھک سا جاتا تو اطمینان بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیل جاتی کہ اسے دیکھ کر یوں ٹھٹکنا آنکھ کا پھیلنا، کھلے منہ کا بند ہونا اور پرمعنی مسکراہٹیں، ہی اب تو من بھاتا کھاجا تھیں۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتی جارہی تھی کہ اچانک نگاہ فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے قسمت کا حال بتانے والے کی جانب اُٹھ گئی' جس کے گرد بدقسمت لوگوں کا دائرہ بنا تھا اور توتا قسمت کا حال بتانے والا لفافہ

نکال رہا تھا۔ اس کا بھی جی مچلا کہ رُک کر توتے سے قسمت کا حال معلوم کرے اور عین اس لمحہ گویا توتے نے اس کے دل کی بات سمجھ کر گردن گھمائی اور بیگم جمال نے خود کو توتے کی گول آنکھوں میں جھانکتے پایا۔ توتا معنی خیز انداز سے آنکھیں نچا کر بولا۔

''ان لفافوں میں بھلا تمہاری قسمت کا حال سما سکتا ہے کہیں۔''

وہ بھونچکی سی ایک لمحہ کو ٹھٹک کر رہ گئی۔ دوسرے لمحہ نگاہ اٹھائیں تو دیکھا کہ لفافہ نکال لینے کے بعد توتا اپنے مقام پر بیٹھا مالک کے ہاتھ سے دانہ کھانا کھا رہا ہے اور پوچھنے والا قسمت کا حال سن کر خوش ہو رہا تھا۔

گھبرا کر رفتار تیز کر دی۔ سامنے ریستوران نظر آیا تو پھولی سانسیں مرتب کرنے کو وہاں جا گھسی اور بلیک کافی پیتے ہوئے سوچنے لگی غالباً میں ابنارمل ہوتی جا رہی ہوں کہ اب تو توتا بھی باتیں کرتا محسوس ہوتا ہے۔ کافی سے خود میں نئی توانائی محسوس کی۔ جی تو چاہا کہ اب گھر واپس چلی جائے مگر پھر سوچا نہیں، آج اتنا پیدل چلو کہ تھکن سے پاؤں دُکھنے لگیں، تاکہ اس تھکن کی وجہ سے رات کو آرام سے نیند آ جائے۔ یہ بے خوابی تازہ الجھن تھی!

یوں ہی چلتی رہی، بے قراری، کبھی کبھی کسی شوکیس میں جھانک لیتی مگر شاپنگ کا موڈ نہ بنا پائی اور پھر وہ چلتی چلتی ٹھٹک گئی۔

اسے دیکھ کر توتے نے سیٹی بجائی تھی۔

یہ اس کا وہم نہ تھا' سامنے پالتو پرندے کی دکان تھی۔ رنگ برنگے توتے، کبوتر' پیاری پیاری چڑیاں دروازے کے قریب پنجرہ میں بند توتے نے اسے دیکھ کر سیٹی بجائی تھی۔ بالکل ان امریکن سیلرز کی مانند جو بندرگاہ پر اترتے ہی پہلی نظر آنے والی لڑکی کو دیکھ کر بے اختیار ہو کر سیٹی بجا دیتے ہیں۔

آنکھیں چار ہونے پر توتا دیدے نچا کر بولا۔

''اندر آ جاؤ۔''

''ہائیں تم بولتے بھی ہو۔''

''کیوں..... میں کیوں نہیں بول سکتا؟'' وہ برا مان کر بولا۔

''تعجب ہے۔''

''تعجب کی کوئی بات نہیں۔'' وہ بولا۔ ''بس اندر آ کر مجھے خرید لو۔''

''کیوں؟''

''بس میری خواہش ہے' تم مجھے خرید لو۔''

''مگر مجھے تو طوطوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''مگر مجھے تو عورتوں سے دلچسپی ہے۔ پلیز۔''

لاجواب ہو کر وہ دکان میں داخل ہو گئی اور مالک سے پوچھا۔

''یہ بولتا ہے؟''

''کاٹھا ہے جی۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے توتے کی طرف دیکھا جو اس گفتگو سے لاتعلق اب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دکاندار وضاحت کر رہا تھا۔ ''یہ ان طوطوں میں سے نہیں جو بول سکتے ہیں.....''

''کبھی بھی نہیں؟'' اس نے پھر توتے کو دیکھا۔

''شائد بعد میں..... بادام وغیرہ کھانے کے بعد بول پڑے تو اور بات ہے فی الحال تو نہیں۔''

''اچھا؟'' وہ تذبذب میں تھی۔

''بیگم صاحبہ میں غلط بات نہیں کرتا ویسے اور توتے ہیں اور بہت اچھے اور سستے بھی.....''

''نہیں۔'' اس نے فیصلہ کر لیا۔ ''مجھے یہی لینا ہے۔''

اس نے کبھی توتے نہ خریدے تھے' اس لئے یہ فیصلہ نہ کر پائی کہ قیمت کم ہے یا زیادہ۔ توتا تو اب خرید ہی لیا تھا' لہٰذا قیمت کا کیا تردد؟

گھر آ کر بولی۔ ''تمہارا مالک تو کچھ اور کہہ رہا تھا؟''

''وہ بھی جھوٹ نہ کہہ رہا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''عام حالات میں تو میں واقعی گونگا ہوں لیکن ایک خوب صورت عورت دیکھ کر میری زبان خود بخود

چلنے لگتی ہے۔''

آئینہ نے طنزاً قہقہہ لگایا۔ وہ پنجرہ اٹھا کر بیڈروم میں لے گئی۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' وہ پریشان ہو کر بولی۔

''کوئی چکر نہیں بیگم جمال۔''

''ہائیں! تم میرے نام سے بھی واقف ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

''مگر کیسے.....؟''

''اسے چھوڑو! میں تو اور بھی بہت سی باتوں سے واقف ہوں۔''

''کیا کہا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ گردن ٹیڑھی کر کے گویا مسکرایا۔

''تم کیا جانتے ہو۔''

''کچھ بھی نہیں..... بھلا میں نے کیا جاننا تھا۔ یہ تو میں نے ویسے ہی سسپنس پیدا کرنے کو کہا تھا۔''

''اچھا یہ بتاؤ تم انسانوں جیسی باتیں کیسے کر لیتے ہو؟''

''انسانوں جیسی نہیں صرف مردوں جیسی.....''

''مردوں جیسی..... کیا مطلب؟''

''نہیں سمجھیں؟''

''نہیں۔''

''چلو! بعد میں سمجھ لیں گے۔''

''نہیں ابھی بتاؤ۔''

''دیکھو! میں مرد ہوتا تھا۔''

''ہائے اللہ!''

''سنو میری دکھ بھری داستان۔'' توتا بولا۔ ''میں ایک ملک کا شہزادہ تھا' حسین و جمیل ایک پری کی محبت میں گرفتار، مگر ایک دیو پلید بھی اس پری کا خواستگار تھا چنانچہ ایک دن اس نے جادو کی ایک انگوٹھی سے مجھ پر غلبہ پا کر مجھے توتا بنا دیا۔''

وہ منہ کھولے سن رہی تھی۔ ''اور اس پری کا نام؟''

''سبز پری۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''آخر توتے ہی رہے نا۔ عشق بھی کیا تو سبز پری سے۔''

''تم نے بھی تو یہی لباس پہن رکھا ہے۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''ہائے میں مری۔''

''سنو! کیا یہ ممکن نہیں کہ تم وہی سبز پری ہو جو مجھ سے زبردستی چھن لی گئی تھی۔''

وہ جھینپ سی گئی۔ ''واٹ نان سینس۔''

''خیر چھوڑو اس قصہ کو..... تمہیں ایک شعر سناؤں؟''

''مجھے شعر و شاعری پسند تو نہیں لیکن سناؤ۔''

''دراصل یہ شعر ابھی ابھی کہا ہے تمہیں دیکھ کر۔''

''ارشاد۔''

تب توتے نے لہک لہک کر یہ شعر پڑھا۔

آتی نئی انداز سے اب سبز پری ہے
پر سبز ہیں لب سرخ ہیں پوشاک ہری ہے

توتا اس طرح سے کچھے دار باتوں سے بیگم جمال کا جی پرچاتا رہتا اور وہ ان باتوں کی اتنی عادی ہو گئی کہ آئینہ حاسد بن گیا۔

''اس مردار توتے نے تمہیں تو تا چشمی سکھا دی ہے۔''

''ہی از اے برڈ! مجھے چھوڑ کر اس سے پیار کرنے لگی ہو۔''

''ڈونٹ بی سلی۔''

ایک دن سے شرارت سوجھی اور توتے کو آئینے کے مقابل کر دیا' خیال تھا کہ دونوں خوب لڑیں گے مگر ہوا اُلٹ یعنی دونوں کی سٹی گم ہو گئی۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم والی کیفیت..... توتا آئینہ میں سراپا دیکھ رہا تھا یا آئینہ توتے کی چشم کے دریچے سے خود کو جھانک رہا تھا اب دونوں اسی طرح خاموش رہے اور ایک دوسرے کو جلی کٹی نہ سنائیں تو بور ہو کر واپس بیڈ روم میں رکھ دیا لیکن ایک دن وہاں سے بھی اٹھا دیا کہ کپڑے بدلتی دیکھ کر توتے نے خاص انداز سے

یوں سیٹی بجائی کہ وہ شرما گئی مگر جب یوں جلاوطنی پر تو تا روٹھ گیا تو واپس لے آئی۔ تو تے نے اس کا دل لگا دیا تھا اور خود تو تے میں بھی ایسی مزاج شناسی پیدا ہو چکی تھی، جس سے اس کا خاوند اب تک محروم تھا۔

وہ باہر جانے سے پہلے پوچھتی۔

''یہ شرٹ کیسی رہے گی۔''

''ٹھیک نہیں۔''

''کیوں؟''

''گلے کی وی لمبی نہیں۔''

''مگر آئینہ کو تو پسند ہے۔''

''اسی لئے تو یہ ٹھیک نہیں۔ اسے کیا پتا ان باتوں کا۔''

وہ مسکرا دی۔ ''واقعی اسے کیا پتا ان باتوں کا۔''

ایک دن تو تا آہ بھر کر بولا۔ ''نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل؟''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''کچھ نہیں۔''

ان ہی باتوں سے جی بہلا رہتا۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مطمئن اور مسرور تھی۔ اس نے بعض رازدار سہیلیوں سے جب بات کی تو وہ مارے اشتیاق کے توتے کی باتیں سننے چلی آئیں مگر یہ ان کے سامنے بالکل کاٹھ کا مادھو بن گیا۔ باتیں اور اشعار کی تو کجا، ٹیں بھی نہ کی۔ تب فخر سے سوچا یہ صرف مجھ ہی سے محو کلام ہونا چاہتا ہے۔ کسی دوسری عورت کو اس قابل نہیں سمجھتا اور یوں توتے کی دل جوئی میں مزید محو ہو گئی۔

آج شام سے ہی ہلکی مگر مسلسل بارش ہو رہی تھی اور خنکی کے ساتھ ساتھ بیگم جمال کے ڈپریشن میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بیزار ہو کر ٹی وی بند کر دیا۔ ویڈیو سے بھی افاقہ نہ ہوا۔ ناول کھولا مگر یوں ہی بے خیالی سے صفحات اُلٹتی چلی گئی۔ عجیب ذہنی انتشار تھا اور جسم جیسے شکنجے میں کسا جا رہا تھا۔ انگلیاں کھولیں اور بند کیں تو ان کے چٹخنے سے گویا بیڈروم گونج اُٹھا' ورزش کرنے کے انداز میں بازو پھیلا دیئے تو یوں لگا یہ دیواروں سے جا لگیں گے۔ پنڈلیوں پر زور زور سے مکے مارے تو محسوس ہوا کہ ان کی پنڈلیاں پتھرا چکی ہیں۔ ایسی حالت ہو رہی تھی کہ توتا بھی یاد نہ رہا جو گردن ٹیڑھی کئے اسے بڑے اطمینان سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''جی! میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔''

''کیوں؟''

''ویسے ہی.....''

''ویسے ہی نہیں..... کوئی بات ہے۔ ہے ناں۔''

''ہاں۔''

''کیا؟''

''تم بہت بے چین ہو۔''

''وہ تو ہوں۔''

''مگر یہ بھی سوچا..... کیوں؟''

''سوچنا کیا..... بس ہوں۔''

''کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے؟''

''پتا نہیں وہ شائد.....''

''میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری بے چینی کی وجہ کا علم ہے۔''

''اچھا؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''کیا تمہیں جمال صاحب یاد نہیں آ رہے؟''

''کون؟..... ہاں..... شائد..... غالباً وہی۔''

''غالباً نہیں یقیناً۔''

''چلو یقیناً تو پھر؟''

''تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کے بارے میں کسی سے باتیں کر لو۔''

''ان کے میں کس سے باتیں کر لوں۔''

''دلدار مرزا سے.....!''

''دلدار مرزا سے.....؟''

''ہاں ہاں وہ جو سامنے والی کوٹھی میں رہتا ہے۔''

''وہ..... اس کی ریپوٹیشن تو کچھ اچھی نہیں

ہے۔''

''تو تم کون سے اس سے ووٹ مانگنا ہے۔ چند باتیں ہی تو کرنی ہیں اور وہ بھی جمال صاحب کے بارے میں۔''

''مگر وہ تو جمال کو نہیں جانتا۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے بلکہ یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ یوں آزادی سے جس طرح کی باتیں چاہو اس سے کرسکتی ہو۔''

''جس طرح باتیں چاہوں' اس سے کرسکتی ہوں..... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب وطلب کچھ نہیں' بس یہی جمال صاحب کے بارے میں باتیں۔''

''مگر کیسی باتیں؟''

''یہی کہ وہ کتنے اچھے ہیں' تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔''

''ہاں۔''

''ان کے بارے میں خوب صورت باتیں۔''

''ہاں۔''

''ان کی خوبیوں کی باتیں۔''

''ہاں۔''

''ان کی خامیوں کا تذکرہ۔''

''خامیاں۔ مگر وہ تو بے حد شریف شوہر ہیں۔''

''چلو نہ سہی۔''

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے توتے کو گھورتی رہی پھر بولی۔ ''نا بابا.....''

''کیوں؟''

''ڈر لگتا ہے؟''

''ڈر کس بات کا؟ تمہاری نیت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''وہ تو ٹھیک ہے۔''

''تو پھر کس بات کا ڈر؟''

''کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''مگر تم کوئی غلط کام کرنے تو نہیں جارہیں..... ہے ناں؟''

''ہاں! یہ تو ہے۔''

''تو پھر گھبراؤ مت۔ اطمینان سے چلی جاؤ۔''

''مگر میں وہاں جاکر کیا کروں گی؟''

''بھئی تم بھلا کیا کرنا ہے، ظاہر ہے باتیں کرنی ہیں۔''

''ہاں.....'' پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''مگر کیا بہانہ کروں وہاں جانے کا۔''

''عجب عورت ہو۔'' توتا غصے سے بولا۔ ''عورت ہوکر جھوٹ بولنا نہیں آتا؟ بیوی ہو کر بہانے کرنے نہیں جانتی؟'' سنو کوئی کہانی گھڑنے کی ضرورت نہیں سب چلے گا۔ مثلاً باتھ روم میں کاکروچ ہے، کچن میں چوہا نظر آیا ہے اور بیڈ روم کی چھت پر ایک چھپکلی رینگ رہی ہے..... بہانوں کی کیا کمی ہے زرخیز ذہن والیوں کے لئے۔''

''یو ڈرٹی اولڈ اینڈ لیچرش.....''

وہ اب پہلی مرتبہ کھلکھلا کر ہنسی پھر جسم پر ہاتھ پھیر کر بے شکن لباس کی شکنیں دور کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا پہنوں؟''

''جو چاہو پہن لو..... کچھ فرق نہ پڑے گا۔''

''پھر بھی.....؟''

''میں کہتا ہوں' اسی طرح چلی جاؤ..... بغیر میک کے زیادہ پیاری لگ رہی ہو۔ فطری سی.....''

''بنا تو نہیں رہے ہو؟''

''ہرگز نہیں۔''

''اچھا تو پھر میں چلتی ہوں۔''

''گڈ لک!''

بیڈ روم سے نکلی تو ڈریسنگ روم میں آئینہ دیکھ کر سراپا جائزہ لینے کا سوچا مگر اس وہ آئینہ کی جلی کٹی سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ لہٰذا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆

تکیہ اور غلاف

نسیم ستر کھی

میں تاریخ انسان اور تاریخ کائنات پڑھاتی ہوں۔ جب ان موضوعات پر لیکچر دیتی ہوں تو مہینوں اور سال لگ جاتے ہیں اور جب دیگر مخلوقات سے انسان کا تقابلی جائزہ لے کر لکھتی ہوں تو لاتعداد صفحات کے بعد بڑی مشکل سے مفہوم ادا کرپاتی ہوں۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ نہ تم پاگل اور نہ ہی تمہاری باتیں اوٹ پٹانگ بلکہ چند جملوں اور چند اشاروں میں وہ سب کچھ بیان کردیا جو میں ایک طویل دورانیہ میں پیش کرتی ہوں۔

ادب سے انتخاب.....ایک فکرانگیز تحریر

''**چاند**'' نغمہ' پھول' کچھ نہیں..... کچھ نہیں بلکہ اس کے پس پردہ کچھ اور تھا۔''

اس نے بے تابی سے پوچھا۔''اور کیا تھا۔''

''یوں سمجھو۔ میں..... میں..... کچھ نہیں.....

تم..... تم..... کچھ نہیں۔ ہم دونوں جھوٹے' منافق' خودفریبی' سچ بولنا پسند نہیں کرتے' اس لیے تاویلات اور دلائل کا پلندہ ساتھ رکھتے ہیں۔''

''میں تمہارے اس مفہوم کو سمجھ نہیں سکی۔''

''اچھا..... اب میں تمہیں اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ غور سے سنو۔ کوٹھری..... پردہ.....

بند کمرے..... یہ سب ایک جانب دوسری جانب کھلے عام..... آبادیاں ہوں یا ویرانے سچ یہ ہے کہ عمل ایک ہے' طریقہ کار مختلف ہے۔ میرے خیال میں اب تم سمجھ گئی ہوگی.....''

''یہ پہیلیاں بجھانے مت آیا کرو' مجھے تمہاری ان بے ربط باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر تم میرے پاس آتے ہو تو اچھی باتیں کیا کرو جس سے مجھے سکون ملے' میں بہت پریشان رہتی ہوں۔''

''محترمہ..... ان باتوں میں بڑا سکون ہے اور ان ہی باتوں میں ہم تم بلکہ سب ان سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسی باتیں بار بار دہرائی جائیں۔ اب میں کلی طور پر سمجھ چکی ہوں کہ تم اچھے خاصے پاگل ہو۔ وہ اس طرح کہ اس دن حسب وعدہ میں تم کو لینے کے لیے اس جگہ پر پہنچی۔ گاڑی کو ایک کونے میں پارک کیا۔ ادھر ادھر دیکھا تو نظر یہ آیا کہ تم درخت پر بیٹھے ہو۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔''

''تمہیں پورا حق ہے کہ جس انداز سے تم مجھے دیکھنا چاہتی ہو دیکھو۔ اور کہو۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دھوپ بھی گرمی تھی' تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ پہلے اس جگہ پر کھڑا رہا پھر بیٹھ گیا اور آخر میں درخت کے اوپر چڑھ گیا۔ شاخوں کے پتے ہرے تھے اور میری شاخوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ تھی۔ میری آنکھوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی چڑیا ایک شاخ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی چونچ کو دو تین مرتبہ شاخ پر مارا پھر اپنے پیروں کو صاف کیا' اتنے میں ایک دوسری چڑیا بھی آ گئی۔ اب پہلی چڑیا نیچے تھی' دوسری چڑیا اوپر آ گئی۔ نہ چاند نہ نغمہ نہ پھول جو ہونا تھا ہو گیا۔''

یہ سن کر وہ مسکرانے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم مسکراتی کیوں' ایسا لگتا ہے کہ تمہاری آدھی پریشانی دور ہو گئی۔''

''نہیں نہیں' ہرگز نہیں۔ میں تمہاری باتیں سن کر قطعاً لطف اندوز نہیں ہوئی بلکہ مجھے کچھ یاد آیا' اس لیے مسکرانے لگی۔ تمہاری ان اوٹ پٹانگ باتوں سے کوئی باشعور انسان کیسے مسکرائے گا۔ اگر مسکرائے گا بھی تو وہ تمہیں بیوقوف سمجھے گا۔ میں حقیقت میں تمہارے ساتھ اس وقت بیٹھ کر اپنا قیمتی وقت برباد کر رہی ہوں۔ کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ ناپسندیدہ باتیں بھی برداشت کر لی جاتی ہیں۔ کہو آگے کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''مائی ڈیئر لیکچرر..... تمہارا شکریہ۔ ابھی حالیہ دنوں کی بات ہے۔ ایک اتوار کو انگریزی فلم دیکھنے چلا گیا۔ جب فلم ختم ہوئی تو ایک نوجوان لڑکا باہر اپنی اسکوٹر کے قریب کھڑا ہوا لڑکی سے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے ہوٹل میں کمرہ بک کرا لیا ہے۔'' یہ دونوں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے قریب کھڑا دیکھ کر چونک پڑے۔ لڑکے نے اسکوٹر اسٹارٹ کی۔ لڑکی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی پھر اسکوٹر چلی گئی۔''

وہ بولی۔ ''تمہارے ابتدائی بیان اور اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

اس نے سر جھکائے آہستہ سے کہا۔ ''بات ابھی ادھوری ہے' اس کو پورا ہونے کے لیے تمہیں کچھ اور سننا پڑے گا جس کے لیے کیا تم تیار ہو۔''

''تیار تو نہیں ہوں لیکن مہمان کی خاطر مجھے یہ بھی گوارا کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں آگے بڑھنے سے پہلے میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ پہلے چائے پی لی جائے۔''

وہ اپنے صاف ستھرے کچن میں چلی گئی۔ وہ سرسبز لان میں بیٹھا ہوا اس کے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ شہر سے بہت دور اونچی پہاڑیوں کو کاٹ کر یہ خوبصورت علاقہ بنایا گیا تھا۔ اس علاقے میں خوشحال کھاتے پیتے افراد رہتے تھے۔ یہاں کا ہر ایک بنگلہ ایک ہزار اور اس سے زائد مربع گز پر بنا ہوا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے سوچا کہ میرے ایسے پیدل چلنے والوں کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ میں اس لیکچرر کی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں کیوں آ جاتا ہوں۔ اب وہ چائے کی ٹرالی کھینچتی ہوئی برآمد ہوئی۔ ٹرالی پر چائے کی کیتلی

پلیٹوں میں مٹھائی' کیک اور سموسے تھے۔ اس نے کھڑے کھڑے چائے بنائی۔ اب وہ دونوں چائے پینے لگے۔ اسی دوران اس نے دریافت کیا۔

''تمہارا بنگلہ بڑا خوبصورت ہے' علاقہ بھی بہت مہذب ہے۔ کیا یہ بتانا پسند کروگی کہ اس علاقہ میں کب سے قیام پذیر ہو اور اس سے پہلے کہاں رہتی تھیں۔''

اس نے چائے کا گھونٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ''ان باتوں کو پوچھ کر کیا کروگے۔ بہتر یہ ہے کہ نہ پوچھو۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ یونیورسٹی میں کون سا سبجیکٹ پڑھاتی ہو۔''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تمہارا سوال اضافی ہے۔ اچھا ہی ہوگا کہ جہاں سے تم نے اپنی بات چھوڑی تھی' اس کو پورا کرو۔''

''لیکچرر..... میں تمہارے حکم کی تعمیل کررہا ہوں۔ میں جہاں رہتا ہوں' اس کے آس پاس جھونپڑیاں' کچے گھر' گندی نالیاں' ابلتے گٹر موجود ہیں۔ گزشتہ دنوں میرے ایک پڑوسی کے گھر میں شادی تھی۔ کوٹھری نما گھر میں مہمان جمع تھے۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ دلہن میکے سے رخصت ہوکر اپنی سسرال میں آ گئی تھی۔ بوڑھے ساس سسر اور تمام عزیز و اقارب سب کے سب کپکپاتی سرد رات میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کھلے آنگن میں پڑے تھے اور جوان بیٹا اور اس کی دلہن کوٹھری کے دروازے بند کیے ہوئے۔ دولہا دلہن سے کہہ رہا تھا۔

''تم چاند' تم نغمہ' تم پھول ہو۔''

یہ کہانی سن کر وہ بولی۔ ''اب میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں تاریخ انسان اور تاریخ کائنات پڑھاتی ہوں۔ جب ان موضوعات پر لیکچر دیتی ہوں تو مہینوں اور سال لگ جاتے ہیں اور جب دیگر مخلوقات سے انسان کا تقابلی جائزہ لے کر لکھتی ہوں تو لاتعداد صفحات کے بعد بڑی مشکل سے مفہوم ادا کرپاتی ہوں۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ نہ تم پاگل اور نہ ہی تمہاری باتیں اوٹ پٹانگ بلکہ چند جملوں اور چند اشاروں میں وہ سب کچھ بیان کردیا جو میں ایک طویل دورانیہ میں پیش کرتی ہوں۔ کیا تم یہ بتانا پسند کروگے کہ تم کرتے کیا ہو؟''

''میری اچھی لیکچرر..... میں کرتا کچھ نہیں ہوں' صرف کہانیاں لکھتا ہوں۔''

.....☆☆☆.....

غور و فکر

☆ میں نے اللہ تعالیٰ سے طاقت مانگی تاکہ کارنامے انجام دے سکوں۔ اس نے مجھے کمزوری عطا کی تاکہ فرمانبرداری سیکھ سکوں۔

☆ میں نے دولت مانگی تاکہ خوشی میسر ہو۔ اس نے غربت دی تاکہ غریبوں کا دکھ درد سمجھ سکوں۔

☆ میں نے سب چیزیں مانگیں تاکہ زندگی کا لطف اُٹھا سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا کی تاکہ سب چیزوں کو حاصل کرسکوں۔ جو چیزیں مانگیں وہ نہ ملیں لیکن وہ سب چیزیں مل گئیں جو ان سے بہتر ہیں۔ میں کتنا بڑا خوش نصیب ہوں۔

☆

زندگی کے طویل سفر میں نہ جانے کتنے لوگ ملتے ہیں اور پھر بچھڑ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ چند لمحوں کے ہم سفر ہوتے ہیں اور کچھ شاہراہ حیات پر تھوڑی دور تک ساتھ دیتے ہیں ان میں سے اکثر نام اور صورتیں ہم بھول جاتے ہیں لیکن چند شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہم کوشش کے باوجود بھی انہیں نہیں بھلا سکتے۔ ان کی یاد دن رات ہمارے دل میں خنجر کی طرح چبھتی ہے اور ہر وقت پریشان رکھتی ہے' کاش! ایسے لوگ جب اپنا سب کچھ چھین کر لے جاتے ہیں تو اپنی یادیں بھی ساتھ لے جایا کریں۔

چوہے

احمد جاوید

آج سائنس دان کو پہلی بار تاسف ہوا اور اس نے خیال کیا تھا کہ سیکھنے والے چوہے جو کچھ سیکھتے ہیں' اپنے اوپر تجربہ کرنے والوں کے لیے سیکھتے ہیں' اپنے لیے کچھ بھی نہیں اور اس نے یہ بھی خیال کیا کہ چوہے کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہو گا۔ اسے معلوم ہوتا تو شاید وہ آہستہ آہستہ سیکھتا اور کبھی اپنے علم کو مکمل نہ ہونے دیتا.....!

اس ماہ کی ایک فکر انگیز تحریر

وہ چوہے جو اپنے بل سے پنیر کی بُو پا کر نکلے تھے اور ادھر ادھر منڈلاتے پھرتے تھے۔ اس چوہے سے بے خبر تھے جو لیبارٹری کی میز پر ایک آہنی پنجرے میں سائنسدان کے تجربے کا منتظر تھا۔

وہ بلی جو غراتی پھرتی تھی' کمرے کے اندر داخل ہونے میں ناکام تھی۔ وہ ایک سوراخ سے بار بار اندر جھانکتی اور بار بار پلٹتی اور چوہے جو تجربہ گاہ کے اکھڑے ہوئے فرش کے ایک بل میں آباد تھے چوروں کی طرح باہر نکلتے' زمین سونگھتے اور ڈر کر پلٹ جاتے۔

بل سے نکلنے والے چوہوں کے لیے کمرے کی زمین ایک دور تک پھیلی ہوئی وسیع کائنات تھی مگر خطروں سے بھری ہوئی..... بلی کی خشمگیں نگاہیں ہی ایک عتاب نہیں ہوتا اور بھی کئی ان دیکھے اندیشے ہیں جو چوہوں کو اپنے سوراخوں سے زیادہ دور نہیں جانے دیتے مگر کیا کیجئے کہ پنیر کی خوشبو بھی ایسی ظالم تھی کہ وہ بھی تو کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی۔ کشش کرتی تھی' بلاتی تھی۔ ایسی خوشبو کہ جس کے آگے ایک مرتبہ تو خود زندگی بھی بے معنی تھی' بے کیف تھی مگر ان چوہوں کی ایسی صلاحیت کہاں تھی کہ وہ یہ بھید پا سکتے کہ لذت کا محور وہ تازہ پنیر کہاں تھا؟ وہ تو اک خواب تھا۔ ایک ان دیکھی' دنیا جہاں تک پہنچنا محال تھا۔ ان کے حساب میں تو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے اگر میسر ہو اور ان دیکھے خطروں سے بچنا۔ میز کے اوپر کی دنیا تو ایک تصوراتی ہیولا تھی اور ان کا وہ مقدر نہ تھا جو تجربے کے لیے رکھے ہوئے چوہے کو حاصل تھا۔

سائنسدان نے لیبارٹری کی میز پر جو پنجرہ رکھا تھا' وہ ان پنجروں سے مختلف تھا جو اناج کے دشمن چوہوں کو پھانسنے کے لیے گھروں میں رکھے جاتے ہیں اور جن میں بلوں میں چھپے گندے غلیظ چوہے' رزق کے لالچ میں اپنی بے خبری کے ہاتھوں پھنس جاتے ہیں اور ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ صاف ستھرا پنجرہ' صاف ستھرے چوہوں کے لیے بالخصوص بنوایا جاتا ہے اور صاف ستھرے ماحول میں رکھا جاتا ہے۔ لیبارٹری کی میز پر رکھے پنجرے میں بند چوہے کو پھانس کر ہلاک کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

اس کی بھوک اور اس کی لالچ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے رزق تلاش کرنے کے آداب سے آگاہ کرنا اور سیکھنے کی صلاحیت کو جانچنا اور بڑھانا مقصود ہوتا ہے۔ بلوں میں چھپے چوہوں کی نسبت اسے یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھ سکے۔ اس مقصد کے لیے اسے وقت اور موقع بھی دیا جاتا ہے اور احساس تحفظ بھی۔

بلوں میں چھپے چوہے کسی کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوتے' البتہ ان کے سروں پر بلی غرانی رہتی ہے۔ ہلاک کرنے والا پنجرہ پڑا رہتا ہے یا ان کے بلوں میں چوہے مار گولیاں ڈالی جاتی ہیں یا ہلاکت آفریں چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی موت آپ مر جاتے ہیں یا مختلف ذریعوں سے مار دیئے جاتے ہیں۔ انہیں غلطیوں سے سیکھنے کا موقع نہیں دیا جاتا یا پھر وہ اپنی غلطیوں سے سیکھتے نہیں تو حیف..... دُنیا کے نقشے پر چوہوں کے لیے بہت سی دشواریاں ہیں۔

ہر چند کہ چوہوں کے لیے بہت سی دشواریاں ہیں مگر لیبارٹری کی میز پر پڑا پنجرے میں بند چوہا اپنے تجربے سے سیکھتا تھا اور اس طرح صرف اپنی استعداد اور سائنسدان کے علم میں اضافہ ہی نہیں کرتا تھا' خود کو دوسروں میں ممتاز بنانے کی صلاحیت حاصل کرنے کے جتن میں بھی تھا۔

چوہوں کے لیے تربیت کا مرحلہ زیادہ سہل نہیں۔ انہیں ٹامک ٹوئیاں مار کر سیکھنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے گندے غلیظ چوہوں سے انتخاب نہیں کیا جاتا۔ اچھی نسلوں کے صاف ستھرے چوہے ہی کارآمد ہوتے ہیں۔ ایسے جوڑ اور خوف پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جنہیں رزق کا لالچ اطاعت کرنا سکھائے اور جو فطرت کو فراموش کرنے کا مظاہرہ کریں کہ اطاعت سیکھنے کے لیے اپنی اصل کو فراموش کرنا بنیادی شرط ہے۔

تو وہ چوہا دوسروں میں ممتاز تھا۔ اس پر تجربے کا آخری دن تھا۔ میز پر رکھے پنجرے کے وسط میں ایک تازہ پنیر کا صاف ستھرا ٹکڑا رکھا گیا۔ پنجرے میں چاروں طرف زگ زیگ جالی دار راستوں کا جال بچھا تھا۔ سائنس دان نے روز کی طرح آج بھی سیکھنے والے چوہے کو اس بڑے پنجرے سے نکالا تھا' جہاں اس جیسے دوسرے بھی تھے۔ ہتھیلی پہ بٹھایا' پیار سے پچکارا۔ کوئی کراہت محسوس نہیں کی اور تجربے والے پنجرے کے دروازے پہ بٹھا دیا تھا۔ پہروں کا بھوکا چوہا پنیر کی خوشبو کی لپٹوں میں آ کر جھوم گیا تھا مگر قدم آگے نہیں بڑھائے تھے۔ اس نے ایک عرصے میں

تعمیل کرنے کا فن سیکھا تھا' وہ اس سے منحرف ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ محض اس پنیر کے لیے جو اسی کے لیے تھا۔ سو اس نے انتظار کیا۔ انتظار کیا جب تک کہ سائنسدان کے ہاتھوں میں پکڑی ٹائم واچ کی ٹک ٹک نہ گونجی۔ ٹک ٹک گونجی تو وہ جست بھر کے اندر داخل ہوا کہ اس آواز میں جادو کی کشش تھی۔ یہ امانت تھی اور عنایت تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تھا اور پنیر کی خوشبو نے اسے راستہ دکھایا تھا' وہ جھومتا چلا اور جھومتا چلا۔ اس طرح کہ کسی رکاوٹ نے اسے راستے میں نہیں ٹوکا تو وہ راہداریوں میں سے بل کھاتا خلاف معمول کسی رکاوٹ سے ٹکرائے بغیر پنیر تک پہنچ گیا تھا۔

سائنس دان نے تجربے میں استعمال ہونے والے چوہے کو پچکار کر نکالا تھا' پیار سے اس کی پشت سہلائی تھی اور اسے ایک دوسرے میز پر اپنے سامنے بٹھا دیا تھا۔ کچھ دیر اسے محبت سے دیکھتا رہا تھا اور پھر کاغذ پنسل سنبھال کر بیٹھ گیا تھا۔

یہ دن کچھ دنوں کے بعد آیا تھا' کچھ دن۔ کبھی کل کی بات لگتی ہے' کبھی صدیوں پہلے کا قصہ..... تجربے کا پہلا دن اس چوہے پر کتنا مشکل تھا۔ پہلی گھڑی ہمیشہ مشکل ہوتی ہے۔ پہلے روز اسے دروازہ کھول کر جب اندر رکھا گیا تو جہاں رکھا گیا تھا' وہ وہیں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ کوئی ڈر جالیوں کے اندر سے جھانکتا تھا۔ وہ دیر تک وہیں بیٹھا رہا تھا مگر پھر اچانک بھول گیا تھا۔ فضا پنیر کی خوشبو سے معطر تھی' جس نے مدہوش کیا تھا۔ مدہوش ہوا تو اچھل کر چلا تھا مگر پھر اپنی فطرت کیسے بدلتا کہ آخر چوہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر عدم تحفظ کا شکار ہوا تھا۔ رُکا تو رُکا رہا تھا۔ خطرے کو سونگھتا رہا تھا۔ خطرے کی بُو کہیں سے آتی تھی۔ حالانکہ وہ پنیر کی بُو تھی۔ پنیر کی تھی یا خطرے کی پہلی مرتبہ کسی احساس کسی ہوشیاری نے اس کے اندر جنم لیا تھا اور اس نے حرکت کی تھی۔ آہنی فرش کو سونگھتا' کبھی دبک کر' کبھی اچھل کر' کبھی جست بھرتے ہوئے' کبھی بدحواسی تھی' کبھی احتیاط تھی جو بھوک اور ڈر نے طاری کی تھی' بھوک اسے بہکاتی تھی اور ڈر اسے دھمکاتا تھا۔ ہوشیار اور منصوبہ سازی تھی مگر وہ کب آگاہ تھا کہ اس کی زندگی اس کے اوقات اس کی اپنی منصوبہ بندی اور ہوشیاری کے تابع نہیں ہے۔ وہ اپنے اوپر جھکے سائنسدان کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا' جس کے ہاتھوں میں اس کے اناج کی ڈور تھی۔ وہ بے خبر اپنی ہی بے خبری کے جتن میں مصروف تھا۔ ایک سمت کو چلتا رہا۔ حتیٰ کہ پہلی رکاوٹ نے اسے روکا..... وہ ڈر گیا..... ڈر کر دبک گیا..... پھر کچھ ساعت بعد حوصلہ پا کر پلٹا..... پھر رکاوٹ..... پھر حوصلہ پھر رکاوٹ..... پھر کئی پہر کا بھوکا جھنجلاہٹ میں آکر زگ زیگ رستوں پر بھٹکتا پھرا تھا۔ منزل پر پہنچ جانے کی آس میں وہ بار بار راستہ بھولتا رہا تھا۔ رکاوٹوں سے ٹکراتا رہا تھا۔ کبھی صحیح راستے پر آجاتا' کبھی غلط پر نکل کھڑا ہوتا تو اس نے رزق تک پہنچنے میں گویا شام کر دی تھی۔ شام تو کر دی تھی مگر صد اطمینان پھل بھی تو پایا تھا۔

یہ طمانیت کی بات تو تھی کہ وہ پہنچ گیا تھا مگر پہنچنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ بھوک کا کیا چارہ ہے۔ اگر چوہا ہشیار نہیں' بے خبری کام آئی تھی مگر یہ ایک بات تو سیکھی تھی کہ کچھ بھی کام میں لایا جاسکتا ہے' چاہے وہ بے خبری ہی کیوں نہ ہو۔

بے خبری سے خبر نہ پاسکنے والے چوہے بھی پنیر کی بُو پا کر ضرور نکلتے رہے مگر بے خبر ہی رہے اور ادھر ادھر بے کار منہ مارا۔ کتر کتر کیا اور پلٹ گئے اور اس سے لاعلم ہی رہے کہ ایک ان میں ایسا بھی تھا جو ممتا ہونے کی تربیت میں تھا۔

تو دن بہ دن' گھڑی بہ گھڑی تربیت پانے والا چوہے کے اندر حوصلے نے جگہ بنانا شروع کر دی تھی۔ وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے جس آدمی کو دشمن سمجھتا تھا اس میں دوستی کی خوشبو۔ اب احتیاط لازم نہ تھی۔ ڈر کی چادر دھوئیں کے غبار کی طرح اترتی گئی۔ شفقت اور محبت کا سائبان پھیلتا گیا۔ پنیر کی خوشبو ہر جذبے پر غالب آتی چلی گئی اور وہ سیکھتا گیا۔ سیکھتا گیا۔

سمت اسے چلنا تھا اور کس سمت اسے نہیں چلنا تھا اور آج وہ ہر رُکاوٹ پر قادر تھا کہ رُکاوٹ تو خوف اور بے خبری کا نام ہے۔

''چوہوں میں سیکھنے کی استعداد ہوتی ہے۔''

سائنس دان نے اپنی یادداشتوں میں یہ لکھا اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ ایک تخلیقی مسرت اس کے سارے وجود پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ ایک کام سے گزرا تھا۔ تجربے کے آغاز سے آج تک وہ اس کی سیکھنے کی صلاحیتوں کو تجسس اور بے چینی سے دیکھتا آیا تھا۔ وہ اس کے منزل مقصود پر پہنچنے کے وقت کو بھی نوٹ کرتا اور ان رُکاوٹوں کو بھی، جن کو وہ عبور کرنے کی کوشش میں تھا۔ تو یوں رفتہ رفتہ وقت بھی کم ہوتا گیا تھا اور رکاوٹیں بھی اور آج بالآخر آسودگی کا مرحلہ تھا۔

مگر وہ کچھ ہی دیر آسودہ رہا تھا پھر اس کا چہرہ تفکر میں ڈوب گیا تھا اور پھر اس نے یہ بھی لکھا۔ ''یہ سب کچھ ایک حد تک ہوتا ہے۔ ایک چوہا ایک خاص حد تک سیکھنے کی صلاحیت کا اظہار کرتا ہے اور پھر اس کے بعد تجربے کے لیے بے کار ہو جاتا ہے۔''

چوہوں کو بے کار اکٹھا کرنے کے عمل میں سائنسدان مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ انہیں کام میں لاتے ہیں، اس سائنسدان نے بھی یہی کیا تھا اور اب کسی دوسرے چوہے کا انتخاب کرنا تھا جو اس سے بھی کم وقت میں رکاوٹوں کو عبور کرتا اور اس کے علم میں اضافے کا باعث بنتا۔ یہی سب تھا کہ اس نے اپنے نتائج میں سیکھ جانے والے چوہے کو اب ناکارہ قرار دے دیا تھا۔

ناکارہ چوہے کا کیا ٹھکانہ تھا۔ یہی کہ نتائج لکھنے کے بعد سائنسدان اٹھا تھا۔ ایک سرنج میں کوئی محلول بھرا تھا اور سوئی سیکھنے والے چوہے کے جسم میں پیوست کر دی تھی تو یوں ناگہانی وہ کہ جو سب میں ممتاز ہو گیا تھا، اب نہیں تھا۔ اجل اسے لے گئی تھی۔

اجل اسے لے جاتی ہے جو سیکھتا ہے اور اجل سے بھی لے جاتی ہے جو نہیں سیکھتا۔ یہ اور بات کہ کچھ تو اپنی موت مرتے ہیں اور کچھ چوہے کی موت مر جاتے ہیں۔ ان پر کوئی دوسری مثال صادق نہیں آتی، وہ بلوں میں چھپے ہوئے غلیظ چوہے ہوں یا صاف ستھرے پنجروں میں بند صاف ستھرے ممتاز چوہے ہوں۔

میز سے سیکھنے والے چوہے کی لاش اٹھاتے اور اسے کوڑا کرکٹ کے ڈرم میں پھینکتے ہوئے معلوم نہیں کیوں آج سائنس دان کو پہلی بار تاسف ہوا اور اس نے خیال کیا تھا کہ سیکھنے والے چوہے جو کچھ سیکھتے ہیں، اپنے اوپر تجربہ کرنے والوں کے لیے سیکھتے ہیں، اپنے لیے کچھ بھی نہیں اور اس نے یہ بھی خیال کیا کہ چوہے کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔ اسے معلوم ہوتا تو شاید وہ آہستہ آہستہ سیکھتا اور کبھی اپنے علم کو مکمل نہ ہونے دیتا۔ ہلاکت تو ہر چوہے کا مقدر ہے مگر ہلاکت تک پہنچنے میں کچھ عرصہ تو صرف ہوتا اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تھا تو دوسرے چوہوں کے ساتھ مل کر بغاوت کر دیتا یا کم از کم غیرت میں آ کر پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جانا اس کے کسی کام نہ آتا۔

یہ باتیں ہر چند کہ اس کے سوچنے کی نہیں تھیں مگر اس وقت تک جب تک کہ وہ کسی دوسرے چوہے پر تجربے کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ ہو جاتا، یوں ہی تفنن طبع کے لیے سوچتا رہا مگر اس نے جتنی بھی باتیں سوچیں، وہ آدمیوں سے تو ممکن تھیں، چوہوں سے نہیں، اسی لیے وہ ہنس پڑا اور ہنستا رہا اور یوں ہی ہنستے ہنستے خیال کیا۔ کیا بعید ہے، کبھی کوئی ایسا سائنسدان بھی آئے جو چوہوں کو آدمی بننا سکھا دے۔ بات عقل و دانش کی نہیں تھی، تمسخر کی تھی مگر ایک کام آنے والے چوہے کی موت کے احترام میں ایک فضول سی خواہش کرنے اور امید رکھنے میں کیا مضائقہ تھا۔

.....☆☆☆.....

شہ زور

آغا دلاور

وہ شروع گرمیوں کی ایک ناخوشگوار سی رات تھی' اپنے گھر کے آنگن میں چارپائی پر لیٹے لیٹے خدابخش کا جسم اینٹھنے لگا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی۔ اتنی خفیف کہ پہلے تو خدابخش نے اسے واہمہ سمجھا جب دوبارہ کسی نے انگلی سے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ اٹھا اور.....!!

اس شمارے کی ایک فکر انگیز تحریر

اونچی فضاؤں میں اڑنے والے دھڑام سے زمین پر آگرتے ہیں' وہ جیتی ہوئی بازی ہار جاتے ہیں۔

سگریٹ کا تیسرا کش بھی جب زیادہ ہی تلخ محسوس ہوا تو خدابخش نے دل ہی دل میں ایک موٹی سی گالی دے کر اسے خالی کپ میں مسل دیا۔ اس کے اعصاب پر ابھی تک تناؤ تھا۔ اردگرد لکڑی کی بھدی کرسیوں پر اس کی شفٹ کے ساتھی بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی پوٹلی میں :ندھی روٹی نکال کر کھا رہا تھا اور کوئی چائے پینے کے بعد کرسی پر ہی پاؤں رکھے سستا رہا تھا۔ گھٹیا سے اس چائے خانے کے اندر کی فضا تیل کے چولہے اور سگریٹوں کے دھوئیں سے کثیف ہو رہی تھی۔

''آج پھر جھگڑا ہو گیا سپروائزر سے؟'' دائیں طرف بیٹھے محمد نواز نے خدابخش کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ خدابخش کی مٹھیاں بار بار بند ہوتی تھیں اور کھل جاتی تھیں۔

اس نے دانت کچکچا کر جواب دیا۔ ''کسی دن ایں چوہے کے بچے کی گردن توڑے گی میرے ہاتھوں۔''

محمد نواز ہنس پڑا' وہ جانتا تھا ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ خدابخش سپروائزر سے جھگڑنے کے ب ہمیشہ یہی پیشن گوئی کرتا تھا' بہرحال پیشن گوئی کر اور بات ہے گردن توڑنا اور بات نوکری چھوڑنے ا عمر بھر جیل میں سڑنے کا تصور بھی خدابخش کے ل محال تھا۔ وہ غور کرنے لگا کہ آخر سپروائزر سے اس جھگڑا کیوں ہوتا ہے؟ بڑی چھان بین کے بعد اپنے دل میں چھپے ہوئے اس چور کو پکڑنے م کامیاب ہو گیا کہ صرف اسی دن سپروائزر سے اس جھگڑا ہوتا ہے' جس دن صبح ہی صبح ڈیوٹی پر آتے وقت اسے سکینہ نظر آجاتی ہے۔ سکینہ کو دیکھ کر خدابخش کے اعصاب کے فلیتے میں آگ لگ جاتی ہے۔ یہ آگ اس کے روئیں روئیں سے ہوتی ہوئی یوں دماغ تک پہنچ جاتی ہے کہ ادھر سپروائزر نے اسے کسی غلطی ڈانٹا اور ادھر وہ بھک سے اڑا۔ یہی سوچتے ہوئے خالی خالی نظروں سے چائے خانے کے سامنے چوڑ چکلی سڑک کو گھورنے لگا۔

چائے خانے سے باہر چھپر کے نیچے سوڈا کی بوتلوں کے کریٹ چنے ہوئے تھے۔ دفعتاً ایک سی کار چھپر کے قریب پیپل کی چھاؤں میں آکر اور اس میں سے دو نوجوان لڑکیاں اور ایک لڑکا پر ہوا ان کے چہروں پر سفیدی اور سفر کی تھکن کا

چائے خانے کے اکلوتے بیرے کو بلا کر نوجوان نے کچھ کہا اور کچھ دیر بعد کار سے ٹیک لگا کر وہ تینوں کوکا کولا کی بوتلیں سنبھالے کھڑے تھے۔ ایک لڑکی جس نے نارنجی فلیپر پہن رکھا تھا' بڑی صحت منداور گدرائے جسم کی تھی۔

بوتلیں پینے کے بعد نوجوان نے بیرے کو بلا کر پانچ کا نوٹ دیا' چند لمحے وہ تینوں سرسری نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتے رہے پھر کار میں بیٹھ کر چل دیئے۔

''کیوں نواز خان کیسی قیامت کی نشانیاں تھیں؟ احمد خان نے بائیں آنکھ دبا کر لڑکیوں کے بارے میں رائے طلب کی' نواز کے بولنے سے پہلے شفیق گجر بول اٹھا۔

''ہائے ہائے کیا ظالم چیز تھی۔ بالکل مدھوبالا لگ رہی تھی'' وہ مدھوبالا کا عاشق تھا اور اسے ہر دلکش لڑکی مدھوبالا لگتی تھی۔

''ارے پاگل اسی جوانی تو مدھوبالا پر کبھی آئی ہی نہیں ہوگی۔'' کونے میں بیٹھے بالے نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

نواز نے بڑے مدبّرانے انداز میں کھنکار کر گلا صاف کیا اور پیر اٹھا کر کرسی پر رکھتے ہوئے بولا۔

''ارے ان نئی لڑکیوں کی جوانیاں کیا خاک جوانیاں ہیں۔ یہ تو مُرمُرے کی تھیلیاں ہوتی ہیں۔'' اس نے اپنی سفید بالوں والی کھوپڑی میں بند کیا ہوا تجربہ ایک جملے میں اگل دیا۔

تب ایک طرف بیٹھے خدا بخش کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال لپک آیا۔ سکینہ تو مُرمُرے کی تھیلی نہیں ہے۔ دور ہی سے اس کے وجود کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ٹھوس ربڑ کا ایک مجسمہ ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود جسم یوں تنا تنایا نہ رہتا۔ بلاشبہ وہ خدا بخش کے غلیظ سے محلے کی چلتی پھرتی قیامت تھی۔ خدا بخش کے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر اس کا گھر تھا۔ اس کا ایک شوہر بھی تھا جو دو سال سے بیمار تھا' صحیح طور پر پتا نہیں چلتا تھا کہ اسے کیا مرض ہے۔ شاید وہ مرض نہیں ایک کنواں تھا جسے سکینہ محنت مزدوری کر کے بانٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

خدا بخش کا ڈھائی کمروں کا ایک کچا مکان تھا جس میں ماں باپ کے مرنے کے بعد سے وہ تنہا رہ رہا تھا اور اب اس کی عمر ستائیس سے اوپر تھی لیکن اسے حالات سے یہ شکوہ نہیں تھا کہ اس کی عمر ستائیس سال تھی اور وہ تنہا تھا بلکہ اس کے نزدیک قدرت کی ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کے مکان کے عین قریب میونسپلٹی والوں نے ایک نلکا نصب کر دیا تھا اور گلی بھر کی عورتیں اس سے پانی بھرنے آتی تھیں ان عورتوں میں سکینہ بھی

ہوتی تھی۔ کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ سب سے آخر میں آتی اور نل پر اکیلی ہوتی۔ خدا بخش چھپ چھپ کر ایسے موقعوں کا انتظار کیا کرتا تھا۔ سکینہ کو یوں بھی کبھی کبھار گلی میں ٹکراؤ ہونے پر گہری گہری نظروں سے دیکھتا اور اپنی مونچھیں پھڑپھڑاتے ہوئے مسکراتا' خدا بخش کا معمول تھا لیکن اس ہرجائی سکینہ نے کبھی اتنا بھی نہ کیا کہ ایک اچٹتی نظر اس کی چوڑی چھاتی' لمبے قد اور توانا بازوؤں پر ہی ڈال لے۔

نل پر ایک بار اسے اکیلی دیکھ کر خدا بخش نے بڑے اشتیاق سے کواڑ کھولا اور بڑے میٹھے لہجے میں بولا۔ ''سرکار! کبھی ہم پر بھی نظر ڈال لیا کرو' غلام ہیں تمہارے۔''

سکینہ نے اپنی کٹورہ سی آنکھوں سے پلکوں کی جھالر اٹھائی اور کرختگی سے بولی۔ ''غلامی کر جا کے اپنی کسی ہوتی سوتی کی' میرے سے زیادہ بکواس کی تو ناک مُنہ برابر کردوں گی۔''

خدا بخش کا عشق ایک دن میں ٹھنڈا ہونے والا نہیں تھا۔ اس کی عمر ستائیس سال تھی اور وہ راتوں کو اٹھ کر پانی پیتا تھا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور موقع ملنے پر ایک آدھ فقرہ جڑ دینا اپنا معمول بنائے رکھا مگر سکینہ رام نہ ہوئی۔

وہ شروع گرمیوں کی ایک ناخوشگوار سی رات تھی' اپنے گھر کے آنگن میں چارپائی پر لیٹے لیٹے خدا بخش کا جسم اینٹھنے لگا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی۔ اتنی خفیف کہ پہلے تو خدا بخش نے اسے واہمہ سمجھا جب دوبارہ کسی نے انگلی سے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ اٹھا۔

''کون ہے''؟ دروازے کے قریب جا کر اس نے پوچھا۔

''کھولو۔'' مدھم سی سرگوشی ابھری' خدا بخش کا دل یک لخت کنپٹی میں آکر دھڑکنے لگا۔ اس نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا اور سہمی سہمی سی سکینہ اس کی چھاتی سے آلگی۔ خدا بخش سے اسے بازوؤں میں جکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ دھندلی سی چاندنی میں اسے سکینہ کی آنکھوں کے کنول' کاجل کے ڈورے سے سجے نظر آئے۔ اس کا گورا چہرہ ستا ہوا سا تھا۔

وہ آنگن میں بچھی چارپائی پر ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ خدا بخش گلے شکوے کرتا رہا اور وہ ہونٹوں پر بے عنوان مسکراہٹ لئے سنتی رہی۔ خدا بخش وقفے وقفے سے مسکراہٹ کا یہ رس بھی چراتا رہا پھر وہ دونوں اٹھ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔ دو گھنٹے بعد جب دونوں کمرے میں سے نکلے تو دونوں پسینے میں شرابور تھے۔ سکینہ کا لباس اس کے جسم سے چپکا جا رہا تھا اور نگاہیں ایک انجانے بوجھ سے جھکی پڑ رہی تھیں۔ خدا بخش گویا ہواؤں میں تیر رہا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے کندھے ملائے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ وہاں سکینہ اپنی انگلی پر آنچل لپیٹتے ہوئے بولی۔ ''خدا بخش..... مجھے..... بیس روپے چاہئیں۔''

''میری جان تیرے لئے تو پوری تنخواہ حاضر ہے۔'' خدا بخش فدا ہوتے ہوئے بولا اسے برسوں ہی تنخواہ ملی تھی۔ وہ جلدی سے بیس روپے نکال لایا اور سکینہ سے دانت بھینچ کر بولا۔ ''پھر کب ملوگی۔؟''

''ہاں وہ مریل مردود کب تمہاری جان چھوڑتا ہے۔'' خدا بخش نفرت سے بولا سکینہ نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ خدا بخش نے دبے دبے لہجے سے پوچھا ''ویسے اب کیا حال ہے اس کا؟''

''بہت بیمار ہے اس کی دوائی کے لئے پیسہ نہیں تھا' تبھی تو آئی تھی تیرے پاس۔'' سکینہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور دروازہ کھول کر آہستگی سے باہر نکل گئی۔

خدا بخش کے گھٹنوں میں گویا جان نہ رہی اور اونچی فضاؤں سے وہ دھڑام سے زمین پر آگرا۔ وہ ایک بار پھر سو نمبر ہار گیا تھا!!

☆☆☆

سچی داستانیں

قارئین سے موصولہ سچی کہانیاں
آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، دلگداز داستانیں

درد کے بعد صائمہ کاردار 206
میں اُلجھی گھر واپس آئی، اور آتے ہی میں نے کیسٹ ریکاڈر میں کیسٹ لگایا کہ سنوں اس میں کیا ہے کہ.....!!! اس شمارے کی ایک حساس، سچی کہانی

احساس کی زنجیر نوازش شاہین 219
خط پڑھ کر میں تڑپ اٹھی۔ فرحان نے کس انداز میں مجھے جھنجھوڑا تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ مجھے اپنا فرض یاد تھا۔ اس شمارے کی ایک حساس و دل گداز سچی کہانی

انتظار کبیر احمد صدیقی 238
صبا کی پلکیں ایک انجانے سے بوجھ سے بند ہو گئیں پھر اس کی بند آنکھوں کے اندر طاہر حسین کا لمبا چوڑا اور صحت مند جسم آ کر کھڑا ہو گیا.....! اس شمارے کی ایک حساس و جذباتی کہانی

قارئین!

☆ ''سچی داستانیں'' کا سلسلہ آپ کی جانب سے موصولہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔

☆ قارئین ہمیں جو تحریریں ارسال کرتے ہیں، ہم ان کی نوک پلک سنوار کر نام و مقامات تبدیل کرنے کے بعد اسے آپ کے نام سے شائع کرتے ہیں۔

☆ آپ سے گذارش ہے کہ ہمیں اپنی تحریریں کاغذ کے ایک طرف، ایک لائن چھوڑ کر لکھ کر بھیج دیں۔ اپنی تحریریں اس پتے پر ارسال کریں۔

انچارج ''سچی داستانیں''..... ماہنامہ عمران ڈائجسٹ، ۳۷۔ اردو بازار، کراچی

درد کے بعد

صائمہ کاردار

میں اُلجھی گھر واپس آئی اور آتے ہی میں نے کیسٹ ریکارڈر میں کیسٹ لگایا کہ سنوں اس میں کیا ہے کہ احتشام کی آواز اُبھری۔ ”مجھے زون جیسی لڑکی سے شادی کرنی ہوتی تو میں اپنی ممی کی پسند سے شادی نہ کرلوں؟ ویسے بھی یار یہ امیر گھرانوں کی ماڈرن لڑکیاں کچھ میرے حلق سے نہیں اُترتیں۔ ہر کوئی تو ان کا ہاتھ تھام سکتا ہے۔ روپے کے نام پر گلے میں مفلر جھول رہا ہوتا ہے اور شرم و حیا کا نام لیا جاتا ہے“

اس شمارے کی ایک حساس، سچی کہانی

شیشے کی دیوار کے پار سے وہ خلاؤں میں کسی بے نام سی شے کو گھورنے لگتی۔ نازک سی زون مجھے بے حد عزیز تھی اور اب بھی میں اسے بلانے کے لیے آئی تھی کہ کمرے کا دروازہ لاک تھا تو میں گھوم کر ٹیرس کی جانب چلی آئی۔ وہ میرے وجود سے بے خبر آنسو بہا رہی تھی اور ڈیک فل آواز میں بج رہا تھا۔ پہلے تو میں نے چاہا کہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوجاؤں لیکن پھر اس کو احساسِ شرمندگی سے بچانے کے لیے میں نے واپس جانا مناسب سمجھا۔ ”کیا بات ہے فرح! اکیلی کیوں آرہی ہو؟“ علی نے پوچھا۔

”وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا ارادہ مجھے نہیں لگتا۔“ میں نے بات بنائی اور چائے بنانے کے لیے کچن میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں چائے لے کر زون کے کمرے کی طرف آگئی۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور چشمِ تصور سے اس کی بوکھلاہٹ دیکھنے لگی۔ اس نے چونک کر آنسو صاف کیے، کیسٹ آف کر کے دوسرا لگایا اور جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ”ہیلو سویٹ گرل!“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اوہ، تو آپ ہیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے کمرے میں داخل ہوکر کہا۔ ”علی تمھیں بلا رہے تھے تاکہ تمھیں عابدہ پروین کا ویڈیو کیسٹ دکھائیں جو تمھارے لیے لے کر آئے ہیں مگر تم شام کی چائے پر بھی نیچے نہیں آئیں۔“

میں نے چائے کی پیالی اس کی جانب بڑھائی۔ ”دراصل ہم دونوں کی تنہائی میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھی، ویسے بھی علی بھائی دنوں بعد گھر واپس آئے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔“ اس نے کہا اور بے تحاشا ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے ہنسنے کے ساتھ پانی بہنا شروع ہوگیا۔ ”زون! اُسے بھول کیوں نہیں جاتیں!“

میں نے خلوصِ دل کے ساتھ مشورہ دیا۔ وہ

ایک دم چپ ہوگئی۔ ''میں تو اسے بھول چکی ہوں لیکن ہر بار ٹکرائے جانے کا درد میری راہ روک لیتا ہے' یوں وہ پھر ایک نئے سرے سے یاد آنے لگتا ہے۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا تو میں اس کا ہاتھ تھامے خاموش رہ گئی کہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گاڑی کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اس کے چہرے پر دھند سی چھا گئی۔

احتشام ایک بہت ہی پیاری لڑکی کے ساتھ بیٹھا آئس کریم کھانے میں مصروف تھا۔ وہ دیکھ ہی رہی تھی کہ میں اس کے قریب آ گئی۔ ''زون! تم ٹھیک ہو نا۔''

''ہاں میں صحیح ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گھر آ کے وہ اپنے کمرے میں بند ہوگئی اور میں جلتی کڑھتی ہوئی بڑی ممانی کے ساتھ کام میں لگ گئی۔ میں علی کی منگیتر ہونے کے علاوہ زون کی سگی پھوپی زاد بھی جو اکلوتی ہونے کے باعث اپنی چھٹیاں ہمیشہ لاہور کے بجائے حیدرآباد میں گزارا کرتی تھی' پچھلے سال کی تو بات ہے' جب میں حیدرآباد آئی تو زون بہت خوش دکھائی دی۔

''خیر تو ہے، کیا کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''ہاں، محبت کا خزانہ۔'' اس نے چونک کر جواب دیا۔

''مگر کس سے؟'' میں اُچھل ہی تو پڑی تھی۔

''احتشام ہے نام اس کا۔'' وہ مسکرائی۔

''مگر یہ ذات شریف ہیں کون؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ پاپا کے دوست کا بیٹا ہے۔ ڈاکٹر بننے والا ہے اور بہت ہی اچھا ہے۔'' زون نے تمام تر شدتوں کے ساتھ کہا تو میں ہنسنے لگی۔

''اچھا بھئی دیکھیں گے کہ کتنا اچھا ہے وہ؟'' وہ تکیے اُٹھا کر مجھے مارنے لگی۔ ''ارے بھئی پیار کیا ہے تو شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

مجھے اور ہنسی آگئی۔ ''ہاں خود بھی تو اسی میدان کی کھلاڑی ہیں ویسے آج کل علی بھائی سے بہت راز و نیاز ہو رہے ہیں، خیر تو ہے.....؟''

''کیا اپنے گھر میں دل نہیں لگ رہا ہے؟'' اس نے مجھ پر چوٹ کی اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو پریشان کرتے رہے۔

شام گہری ہوتی جارہی تھی احتشام بھی نہیں آیا تھا، زون بے قرار پھر رہی تھی۔

''سکون سے بیٹھ جاؤ، ایسے چکر لگانے سے کیا مل جائے گا۔''

میں نے چھیڑا تو وہ مجھے مارنے کو لپکی۔ تب ہی گیٹ کھلا اور اس کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ اس میں سے برآمد ہونے والا شخص بے حد وجیہہ تھا۔ میں نے گھوم کر زون کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر توس وقزح کے سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

''احتشام! یہ فرح ہے، کل ہی لاہور سے آئی ہے۔'' زون نے تعارف کرایا۔

''میں.....''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ علی نے بات کاٹ دی۔

''آپ احتشام ہیں، میڈیکل کا فائنل ایئر ہے، باتیں بہت اچھی کرتے ہیں اور بذات خود بھی بہت امپریس کردینے والی شخصیت رکھتے ہیں۔'' اس کے بولنے پر احتشام بڑی طرح ہنس دیا۔

''تو گویا غائبانہ تعارف ہو چکا ہے۔''

''چوبیس گھنٹے ایک ہی موضوع پر سنا جائے تو لازمی بات ہے تعارف یاد تو ہو ہی جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''بہت خوب!'' اس نے مسکرا کر زون کی جانب دیکھا جو کھسیانی ہوئی جارہی تھی۔

احتشام کے آتے ہی بڑی ممانی یعنی زون کی امی اور علی بھی باہر لان میں آگئے۔ یوں گفتگو کا دائرہ کافی مہذب ہوگیا۔

احتشام کے جانے کے بعد ہم دونوں کمرے میں چلے آئے۔

یہاں آتے ہی اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا۔

''ارے کوئی ہے جو مجھے بچائے۔'' علی نے دروازہ کھول کر مجھے اپنی پناہ میں لیتے ہوئے پوچھا تو میں شرمندہ سی کھڑی رہ گئی۔

''علی بھائی! اسے لے جائیں یہاں سے ورنہ آج یہ میرے ہاتھوں سے ضائع ہوجائے گی۔'' زون نے چیخ کر کہا۔

''ارے ایسا ظلم مت کرنا ایک میری کلوتی منگیتر ہے، اسے بھی مار دو گی تو تمھارا بھائی کیا کرے گا!'' علی نے مسخرے پن سے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر باہر چلا آیا۔

''علی! یہ کیا بدتمیزی ہے۔ زون کیا سوچ رہی ہوگی۔'' میں نے جھلا کر اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔

''کچھ نہیں سوچے گی وہ!'' علی نے اور مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا میں ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد میں اس سے اجازت لے کر واپس زون کے کمرے کی طرف آگئی۔ آہستگی سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں چلتی بیڈ کے قریب آگئی۔ میرا خیال تھا وہ سو رہی ہوگی لیکن بیڈ خالی دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا۔ جلدی سے میں دروازہ کھول کر ٹیرس پر آئی تو زون وہاں کھڑی مجھے دکھائی دے گئی۔

''تم سوئی نہیں ابھی تک؟'' میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بُری طرح سے چونک گئی۔

''نیند نہیں آرہی تھی۔'' اس نے کہا۔

''خیریت!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''پتا نہیں فرح مجھے کیا ہوگیا ہے، شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔ ہر لمحہ کھوئے جانے کا، ٹھکرائے جانے کا خوف سوار رہتا ہے۔ فرح! اگر اس نے مجھے قبول نہ کیا تو میں کیا کروں گی؟'' زون کے لہجے میں اداسیاں بول رہی تھیں۔

''ارے کیوں ٹھکرائے گا میری زون کو، اتنی پیاری لڑکی اسے کہیں اور ملے گی؟ اور پھر تم کوئی معمولی چیز تو نہیں، مشہور ڈراما نگار اور آرٹسٹ ہو، یہ حوالہ کوئی کم ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی اور کمرے میں لے آئی۔

''خدا کرے فرح ایسا ہی ہو جیسا تم کہہ رہی ہو۔'' اس نے بے چینی سے کہا۔

''بیکار وہموں میں اپنا آپ مت اُلجھاؤ۔'' میں نے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر میں دونوں سو چکے تھے۔

کچھ دنوں بعد میں بھی واپس لوٹ گئی' میرے ایم ایس سی کے امتحان ہونے والے تھے۔ زون خط لکھتی تو زیادہ تر ذکر احتشام ہی کا ہوتا' اس کی محبت جنون کی حدوں کو چھو رہی تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' ویسے ہی مجھے خوف سوار ہوتا جاتا تو وہ دیوانی لڑکی پتا نہیں کیا کر بیٹھتی۔

ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔

میں حیدآباد جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ علی کا ٹیلی فون آیا کہ زون شدید بیمار ہے، میں پہلی فلائیٹ سے کراچی آجاؤں' جہاں ائیرپورٹ پر وہ مجھے لینے آجائے گا۔ میں تو یہ سنتے ہی حواس باختہ ہوگئی۔ حیدآباد پہنچنے تک روتی رہی اور جب میں نے زون کو دیکھا تو تڑپ کے رہ گئی۔ یہ میری زون تو نہ تھی۔ کمزور، پیلی رنگت لیے وہ کتنی ویران دکھائی دے رہی تھی۔ ''یہ کیا حال بنالیا تم نے؟'' میں روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

''محبتوں میں جو لوگ ہار جاتے ہیں' لُٹ جاتے ہیں اُن کا یہی حال ہوتا ہے۔'' وہ اتنا سا جملہ کہہ کے بُری طرح سے ہانپ گئی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟'' میں نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے سامنے کیا۔

''صحیح تو کہہ رہی ہوں فرح کہ میں اپنی زندگی ہار چکی ہوں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''لیکن کیوں؟''

''مجھے یقین نہ تھا کہ آدمی کی نگاہ صنف بدن پر تھی۔'' وہ عجیب خواب ناک انداز میں بولی۔ میرے تو جیسے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔

''یہ کیا پہیلیوں میں بات کر رہی ہو، صاف بات کیوں نہیں کرتیں؟''

وہ بے تحاشا رو اُٹھی' میں نے بھی اسے چُپ نہیں کرایا، خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد اس نے آنسو صاف کیے اور کہنے لگی۔ ''میں سمجھتی تھی کہ احتشام مجھ سے محبت کرتا ہے، میری عزت کرتا ہے، لیکن وہ تو انسان کے بھیس میں ایک درندہ تھا' جیسے میں اس کے ساتھ گھومنے چلی جاتی ہوں' بالکل اسی طرح کسی اور کے ساتھ بھی جاسکتی ہوں جیسے وہ میرا ہاتھ تھام لیتا ہے ایسے ہی کوئی بھی میرا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔ وہ مجھے اپنی محبت بلکہ ایک لڑکی سمجھتا تھا۔ اس کی ذہنیت کے بارے میں نعمان صدیقی نے بارہا بتایا لیکن میں ہر بار تمسخر سے ہنس آگے بڑھ جایا کرتی تھی ..... لیکن اس دن مجھے بچانے والا بھی وہی تھا۔ میں احتشام کے ساتھ بیٹھی تھی کہ وہ میرے پاس آگیا' اس وقت احتشام کسی کام سے اندر چلا گیا۔

''زون! تم کل احتشام کے ساتھ نہیں مت جانا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے پوچھا تو اس نے جواب میں ایک کیسٹ میرے ہاتھ میں تھمایا اور خود واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ میں اُلجھی گھر واپس آئی، اور آتے ہی میں نے کیسٹ ریکارڈر میں کیسٹ لگایا کہ سنوں اس میں کیا ہے کہ احتشام کی آواز اُبھری۔

''مجھے زون جیسی لڑکی سے شادی کرنی ہوتی تو میں اپنی ممی کی پسند سے شادی نہ کرلوں؟ ویسے بھی یار، یہ امیر گھرانوں کی ماڈرن لڑکیاں کچھ میرے حلق سے نہیں اُترتیں۔ ہر کوئی تو ان کا ہاتھ تھام سکتا ہے۔ روپے کے نام پر گلے میں مفلر جھول رہا ہوتا ہے اور شرم وحیا کا نام لیا جاتا ہے۔''

''لیکن یار' ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تم زون سے

محبت کرنے لگے ہو؟'' یہ اس کے دوست ہاشم کی آواز تھی۔

''محبت اور زون سے! نہیں بھئی، محبت ان جیسی لڑکیوں سے نہیں ہوتی بلکہ وہ تو اور ہی ہوتی ہیں جن کو دیکھتے ہی دل محبت کی تسبیح پڑھنے لگتا ہے۔'' احتشام کی آواز میں تمسخر تھا۔ ''تو پھر کل کا پروگرام سیٹ ہے؟'' اس کے دوست نے پوچھا۔

''ہاں کل میں زون سے مل کر اپنے آبائی گاؤں جاؤں گا، پھر.....'' آگے جو کچھ تھا وہ سب میرے لیے انتہائی ناقابل برداشت تھا۔

میں سکتے کے عالم میں تھی کہ نعمان کا ٹیلی فون آ گیا۔ ''مجھے اُمید ہے آپ نے وہ سب سُن لیا ہوگا؟''

اس نے کہا ''ہاں..... میں سن چکی ہوں۔'' میں نے بہ مشکل کہا اور اپنے سامنے رکھی نیند کی گولیاں گننا شروع کر دیں۔

''دیکھیں زون! آدمی کسی کے بُرا کہہ دینے سے بُرا نہیں ہو جاتا۔ آپ ایک اچھی لڑکی ہیں۔ اسے بھول کر اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کریں۔ بہت سے لوگ آپ کو ملیں گے جو آپ سے محبت بھی کریں گے۔ آپ سن رہی ہیں نا؟'' اس نے پوچھا تو میں نیند سے بوجھل آنکھیں کھولنے لگی ''زون! کیا ہوا ہے آپ کو..... جواب کیوں نہیں دے رہی ہیں۔'' وہ چلایا مگر میں اپنے ہوش وحواس کھو چکی تھی۔

پھر ہوش میں آئی تو اپنے آپ کو ہاسپٹل میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ''زون! کیا ہو گیا تھا تمھیں؟'' علی بھائی پریشان کھڑے تھے۔

''کچھ نہیں بھائی!'' میں نقاہت سے بولی۔

''وہ تو خدا کا شکر ہے بیٹا جو عالیہ آ گئی، اسے شاید تم سے کوئی کام تھا۔ وہ تمہارے کمرے میں آئی تو تم بے سُدھ پڑی تھیں تب گھبرا کر ہم تمھیں ہاسپٹل لے آئے۔'' امی نے مجھے پیار کرتے ہوئے تفصیل بتائی تو میں نے کروٹ بدل لی۔

تھوڑی دیر میں سب چلے گئے۔ میرے پاس کسی کو بھی رہنے دیا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھی تھی کہ نعمان اندر چلا آیا۔ ''یہ کیا حماقت کی آپ نے؟'' اس نے مجھے گھورا۔

''بس آج مجھے معلوم ہو گیا کہ ٹوٹتے ہیں تو لوگ نیند کی گولیاں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سو میں نے بھی یہی عمل اختیار کیا۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''مجھے آپ کی آواز سُن کر اندازہ ہو گیا تھا اس لیے میں نے عالیہ کو فون کر کے ساری صورت حال سمجھائی، یوں عالیہ آپ کو لے کر ہاسپٹل آئی ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔'' نعمان نے فکرمندی سے مجھے دیکھا۔

''کیا ہوتا مر جاتی میں اور بس!'' میں بے دلی سے بولی۔ ''اچھا بس زیادہ بکواس مت کرو اس۔ لیے تم نے میڈیکل لائن اختیار نہیں کی کہ تمہارا یہ ڈرامائی انداز جو ختم ہو جاتا'' عالیہ نے میری بات کاٹی جو میری دوست ہونے کے علاوہ احتشام اور منان کے ساتھ ہی ہاؤس جاب بھی کر رہی تھی اور یوں میں موت سے بھی ٹھکرا دی گئی، تب سے میرے اندر جینے کی اُمنگ ہے اور نہ آگے بڑھنے کی تمنا، بس میں مرنا چاہتی ہوں۔'' زون نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے میری جانب دیکھا تو میں اپنے آنسو نہ روک سکی۔

''زون! تُو اتنے دُکھ جھیل گئی اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔'' میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ وہ خوف زدہ چڑیا کی مانند میرے بازوؤں میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ روتے ہوئے میری گود میں سر رکھے سو چکی تھی۔ میں نے آہستگی سے اسے بیڈ پر لٹایا اور کمبل اوڑھا کے باہر جانے لگی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے ریسیور اُٹھایا تو دوسری جانب نعمان صدیقی تھا۔ ''مجھے زون سے بات کرنا ہے۔''

''وہ سو چکی ہے۔'' جواب دیا۔

''آپ کون ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں فرح ہوں..... شاید آپ مجھے نہ جانتے

ہوں لیکن میں آپ کو جانتی ہوں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جی میں سمجھا نہیں.....'' وہ اُلجھ سا گیا۔

''نعمان آپ نے میری پھول جیسی زون کو اس درندے کی بھینٹ چڑھنے سے بچالیا، احسان مانوں وہ کم ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''احسان نہ کہیں پلیز کہ اس میں میری غرض بھی شامل تھی۔'' اس نے کہا

''غرض کیسی؟'' میں نے پوچھا۔

''احتشام دراصل میرا دوست ہی نہیں بلکہ بہت ہی پیارا کزن بھی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی معصوم کی اُمنگیں اُجاڑے اور یوں وہ قیامت تک کے لیے اس کی بددعاؤں کی زد میں آجائے۔ سو میں نے زون کے ساتھ اسے بھی بچایا ہے۔'' نعمان نے جواب دیا تو یُوں گہرا سانس لے کر رہ گئی اور خدا حافظ کہہ کے ٹیلی فون بند کردیا۔

پھر میں نے دن رات ایک کر کے اسے اس قابل کیا کہ وہ اُٹھ کر ہمارے درمیان آجاتی، رات گئے تک لکھنے میں مصروف رہتی یا ڈراما وغیرہ دیکھنے چلی جایا کرتی۔

احتشام نے اس دوران بہت ٹیلی فون کیے بار ہا وہ گھر میں آیا لیکن زون ایک بار بھی اس سے مخاطب نہ ہوئی بلکہ نفرت سے اسے دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں بند ہوئی۔ وہ مجھ سے پوچھتا۔ ''کہ فرح! یہ مجھ سے ناراض کیوں ہے؟'' تو میں اسے دیکھ کے رہ جاتی۔ دل تو چاہتا کہ اس کا مُنہ نوچ ڈالوں، مگر زون کی قسم مجھے بے بس کردیتی۔ اس نے کہا تھا کہ احتشام کو یہ احساس مت ہونے دینا کہ مجھے اس کی ذلالت کا اندازہ ہوچکا ہے۔ جب وہ جان جائے گا تو اس کی آنکھوں میں فتح مندی کا احساس نمایاں ہوجائے گا جو میں برداشت نہ کرپاؤں گی سو میں چپ رہتی۔ آخر تھک ہار کر اس نے آنا ہی چھوڑ دیا۔

مجھے یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہوچلا تھا تب ہی گھر میں میری شادی کا شوشا اُٹھ کھڑا ہوا، یوں میں واپس لاہور آگئی جہاں سے ٹھیک چھ ماہ کے بعد مسز علی بن کر حیدرآباد چلی آئی۔

میری شادی میں زون نے بھرپور حصہ لیکن اس کی کیفیت مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ اس کی ہنسی کے ساتھ جو پانی آنکھوں سے بہ رہا ہے، وہ پانی نہیں درحقیقت آنسو ہیں، جنھیں وہ بیدردی سے لُٹا رہی ہے۔ تب سے اب تک وہ بالکل نارمل نہ ہوپائی تھی۔ میں سوچوں سے گھبرا کر حقیقت کی دنیا میں آگئی۔

علی کے دوست کی تھی، میں نے زون کو بھی زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ ''آخر یہ تم دونوں مجھے کیوں کباب میں ہڈی ثابت کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے جل کر میرے ایک ہاتھ مارا۔

''اس لیے بہنا کہ تمھیں احساس دلاسکیں کہ زندگی اس روپ میں بے حد حسین ہے۔ تم بھی اپنی زندگی کو حسین بنالو۔'' میں نے جواب دیا

''فرح تم بھی! جانتے بوجھتے مجھے تکلیف دے رہی ہو'' اس نے شاکی نگاہوں سے میری جانب دیکھا تو میں نظریں چُرا کر علی کی جانب بڑھ گئی۔

شادی میں سب نے زون کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جس کی وجہ اس کا اسٹیج ڈراما تھا جس میں اس کی اداکاری اور اسکرپٹ تھا وہ لوگوں میں گھری آٹو گراف دینے میں مصروف تھی کہ میری نگاہ احتشام پر پڑگئی جو سب سے ملتا ملاتا ہماری طرف آرہا تھا، میں نے گھبرا کر زون کی جانب دیکھا جس کا چہرہ بالکل سفید ہورہا تھا۔ ''ہیلو زون! کیسی ہو؟'' وہ اس کے قریب آگیا۔ سب لوگ ان طرف متوجہ تھے۔

''ٹھیک ہوں!'' زون نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

''میری منگیتر سے ملیں؟'' اس نے پوچھا تو زون نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''بہت خوب صورت ہے وہ!'' احتشام نے کہا اور ایک لڑکی کو زون کے پاس لے آیا۔ ''ان سے ملو شازیہ! یہ مشہور ڈراما نگار اور آرٹسٹ زون شاہ!'' اس نے تعارف کرایا۔

لڑکی بلاشبہ بے حد حسین و نازک تھی۔ ''مجھے آپ سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔'' وہ دھیرے سے

مسکرائی۔

زون اس سے باتیں کرتی تھی لیکن اس کا بدن لرز رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے والی ہے۔ میں راستہ بتاتی اس کے پاس آنے لگی کہ مجھ سے پہلے ہی کوئی شخص اس کا ہاتھ تھام کر ہجوم سے نکال لے گیا۔

میں حیران سی ان دونوں کے پیچھے چلی آئی۔ جو باہر پارکنگ ایریے کی جانب کھڑے تھے۔ ''آپ کی تعریف؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے نعمان صدیقی کہتے ہیں۔'' وہ میری طرف مڑا۔ اُونچا لمبا وجیہہ سا شخص مجھے پہلی نگاہ میں بہت اچھا لگا۔

پھر میں زون کی جانب متوجہ ہوگئی۔ ''کیا ضرورت تھی اس فضول شخص سے بات کرنے کی، بہانا بنا کر نہیں ہٹ سکتی تھیں؟'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''کیا بہانہ کرتی؟'' اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کیا تو میں چپ ہوگئی۔

''ہاں اب بتاؤ میں'' نعمان نے مخاطب کیا ''اچھا خیر، ویسے آپ کا شکریہ جو آپ نے اسے وہاں سے ہٹا لیا ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں یہ بے ہوش نہ ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''یہ آپ نے ہر بار شکریہ ادا کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے؟'' نعمان نے کہا۔

''اور آپ نے ہر بار زون کو بچانے کا ارادہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے اسے گھورا۔

''بہتر ہوگا ہم دونوں یہ موضوع بدل ڈالیں۔'' اس نے شاید زون کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ لیے تھے تب ہی بات کا رُخ بدلنے لگا۔

''سنیں آپ زون کو گھر ڈراپ کریں گے؟'' میں نے دور سے علی کو آتے دیکھا تو جلدی سے پوچھا' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن فرح !..... میں ٹھیک ہوں۔'' زون نے کسمسا کر کہا۔

''بکواس بند کرو اور جلدی سے گھر چلی جاؤ۔ میں تمھیں مزید اپنے درمیان ہڈی نہیں بنا سکتی۔ آخر تم میرے اور علی کے درمیان برا جمان رہنا چاہتی ہو؟'' میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''تو یوں کہوں نا میجر علی کی بیگم اپنے صاحب کے ساتھ تنہا رہنا چاہتی ہیں۔'' زون ہنسی۔

''ارے بھئی کون کس کے ساتھ رہ رہا ہے؟'' علی نے کہا۔ ''بھائی! یہ آپ کی بیگم صاحب چاہ رہی ہیں کہ میں گھر چلی جاؤں۔'' زون نے کہا۔

''اچھا یہ گستاخی ہماری بہن کی شان میں!'' علی میری جانب گھومے۔

''جانے دیں نا علی یہاں رہ کر یہ بور ہو رہی ہے اور پھر یہ کرے گی بھی کیا؟ میں تو آپ کے ساتھ ہوں گی۔'' میں نے کہا تو علی میری کیفیت دیکھ کر جان گئے کہ میں کیا چاہ رہی ہوں۔ ویسے بھی وہ احتشام کو دیکھ چکے تھے۔ انھیں صحیح معلوم نہ تو تھا لیکن یہ ضرور سمجھے تھے کہ زون کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ احتشام ہے سو انھوں نے زون کو جانے کی اجازت دے دی۔

''تم اندر جاؤ میں زون کو چھوڑ کر آتا ہوں۔'' انھوں نے کہا۔

''زون کو یہ گھر ڈراپ کر دیں گے۔'' میں نے نعمان کی جانب اشارہ کیا تو علی نے میری جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔ ''ارے آپ بھول گئے، یہ ڈاکٹر نعمان ہیں جنھوں نے زون کا ٹریٹ منٹ کیا تھا۔'' میں نے یاددہانی کرائی۔

''اوہ سوری ڈاکٹر! میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔'' علی نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر وہ دونوں گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ میں اور علی کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔

جب گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو میں علی کی جانب بڑھی۔ ''علی یہ ڈاکٹر اچھا ہے نا! کاش زون بھی اسے پسند کرے۔'' میں نے کہا۔

''پتا نہیں اس سر پھری لڑکی کو کب عقل آئے گی۔'' علی نے ٹھنڈا سانس لیا اور میرا ہاتھ تھامے

ہوئے اندر ہال میں آ گئے۔

گھر واپس آئی تو زون اپنے کمرے میں تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''خیریت تو ہے؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''فرح! وہ کہہ رہا تھا کہ میں وہ باب بند کر دوں اور کسی کا ہاتھ تھام لوں۔'' زون بولی۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' میں نے موقع مناسب جان کے کہا۔

''لیکن فرح! میں اپنے آپ کو کیسے مطمئن کروں۔ میں جو پھولوں سے تتلیوں سے محبت کرنے والی افسانوی سی لڑکی ہوں' کیسے اس بات پر آمادہ ہو جاؤں کہ سامنے والا جو بھی ہے اس سے جھوٹ بولتی رہوں۔ کہتی رہوں کہ مجھے اس سے محبت ہے جبکہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''دیکھو زون! ضروری نہیں ہے کہ جو دل پر پہلی بار دستک دے' ہمیں اس محبت بھی ہو جائے حالانکہ ایسا محسوس ضرور ہوتا ہے جیسے ہمیں محبت ہو گئی ہے لیکن جب وہ شخص دور ہو جائے' ہمیں نہ مل سکے اور نہ ملنے کے باوجود ہم زندہ رہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ہم نے محبت نہیں بلکہ ایک وقتی جذبے کے تحت اپنی ہار مانی تھی۔ اری پاگل! محبت تو آب جو ہے جو دلوں کے درمیان بہتی ہے اور اپنا آپ خود منواتی ہے مجھے یقین ہے کہ ایسی محبت تمہارا راستہ ضرور بنے گی جب تم اپنے دل سے مجبور ہو کر اس کا اقرار کرو گی، اس کی سچائی کو مان جاؤ گی اور جان! محبت ہر ایک کا نصیب بھی نہیں ہوتی اور جب کسی کا نصیب بنتی تو وہ شخص خوش قسمت ہوتا ہے۔'' میں نے بے حد پیار سے اس کے بکھرے ہوئے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے فرح! جیسے میرے وجود کے اَن گنت ٹکڑے ہو گئے ہیں اور میں اپنے ٹکڑے جمع کرتے ہوئے فنا ہوئی جا رہی ہوں۔ کون جانے فرح کہ کبھی میں اپنے ٹکڑے تلاش بھی کر پاؤں گی یا.....'' وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی اور کمرے سے باہر نکل آئی کہ میری آنکھوں میں بھی درد کا پانی بھر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ احتشام کے پاس جاؤں اور اس سے کہوں کہ کیوں تم نے میری زون کو سزا دے دی ہے؟ آخر اسے سکون کب ملے گا؟ میں دل ہی دل میں فریاد کناں تھی کہ شاید خدا میری سُن لے اور زون اس کشمکش سے باہر نکل آئے۔

زون کے پرپوزل آ رہے تھے، لیکن وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ گونگی بہری بنی وہ اپنے ڈراموں میں مصروف تھی۔ بڑی ممانی زیادہ کہتیں تو وہ رونے بیٹھ جاتی جس پر حسن ماموں گھبرا کر ممانی کو ہی چُپ کرا دیتے۔

وقت تھا کہ تیزی سے گزرا جا رہا تھا۔ اُس دن زون ریہرسل واپس آئی تو سخت غصے کے عالم میں تھی' آتے ہی سینڈل اُتار کے دور پھینکے اور چائے کا کہہ کر اپنے بالوں کی لٹیں بنانے لگی۔ یہ اس کی خاص ادا تھی کہ غصے میں اپنے لمبے بالوں کے چھلے سے بناتی رہتی۔ لمبے بال جو اس کے ہمیشہ سے کھلے رہتے تھے، اس کی خوب صورتی میں مزید اضافے کا باعث تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''ہونا کیا ہے، وہی مصبت شادی کب کر رہی ہیں..... میں پوچھتی ہوں آخر ان لوگوں کو تکلیف کیا ہے میرے شادی نہ کرنے سے؟ میری زندگی ہے جیسے چاہوں گزاروں!.....'' وہ بُری طرح سے جھلا اٹھی۔

''بھئی یہ دنیا ہے اور جب ہم دنیا میں رہتے ہیں تو لوگوں کے سوالوں کا ہمیں جواب دینا ہے۔'' میں نے متانت سے کہا۔

''اور لوگوں کو تو چھوڑیں وہ ہمارے پروڈیوسر صاحب بھی اس پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ میں ان کا کنٹریکٹ وہیں پھینک کر آئی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا نہیں کیا زون تم نے اس طرح سے تم دُنیا کی زبان کو خاموش نہیں کرا سکتیں۔'' میں نے تاسف

ے کہا۔

''اچھا ہو یا بُرا میں کچھ نہیں جانتی''۔ اس نے کہا اور اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

اس پر وڈیوسر کے ٹیلی فون آئے، معافی مانگی لیکن زون اپنی ضد پر قائم رہی کہ مجھے نہیں کرنا۔ سب نے سمجھایا لیکن اس نے کسی کی نہ سنی۔ سو تھک ہار کے خاموش ہو گئے۔

اور پھر انھی دنوں ایک عجیب بات ہوئی کہ زون کو مانگنے نعمان کے گھر والے چلے آئے، وہ خود بھی ساتھ آیا تھا۔ نعمان کی امی نے اپنی شائستگی سے بات کی کہ بڑی ممانی تو ان پر فدا ہو گئیں اور انہوں نے فیصلہ کر لیا اس بار وہ زون کی ہرگز بھی نہیں مانیں گی زون کو معلوم ہوا تو وہ پیلی پڑ گئی اور نعمان کی بہنوں سے معذرت کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ نعمان نے بے چینی سے میری جانب دیکھا تو میں سر جھکا کے رہ گئی۔ فرصت ہوتے ہوئے وہ میرے قریب چلا آیا۔

''فرح! میں ایک معمولی سا انسان ہوں لیکن محبت کی دولت سے مالا مال ہوں اور آپ یقین کریں میں زون کو بہت خوش رکھوں گا، آپ اسے بس راضی کریں۔'' اس نے کہا تو میں اسے دیکھ کے رہ گئی۔

''میں..... میں اس محبت کرتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ وہ خود اذیتی کی کیفیت سے باہر نکل آئے۔ آخر وہ کسی اور کی سزا مجھے کیوں دینا چاہتی ہے۔ اس سے کہیے گا کہ نعمان اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں پر جمع کرنا چاہتا ہے.....'' نعمان نے جذباتی لہجے میں کہا اور واپس مڑ گیا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے چلتی گھر کی جانب آ گئی۔

میں خود زندگی کے اس موڑ پر تھی، پھر زون پر تو یہ کیفیت گزر رہی تھی، نہ جانے وہ کیا محسوس کر رہی ہو گی؟ میں سوچتی رہی اُلجھی رہی لیکن خود میں ہمت نہ پا سکی کہ زون کے سامنے چلی جاتی۔

ساری رات وہ سوچتی رہی۔ اس کے کمرے سے تیز آواز میں ڈیک چلنے کی آوازیں آتی رہیں مگر اپنے کمرے میں بیٹھی آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار کرتی رہی۔

دوسرے دن میرے اُٹھنے سے پہلے وہ اپنے میگزین آفس جا چکی تھی۔ دوپہر کو بھی اس کی واپسی کے بجائے ٹیلی فون آ گیا کہ وہ ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف ہے اس لیے شام تک آئے گی اور جب وہ آئی تو میں علی کے ساتھ اُن کے یونٹ کی گرینڈ پارٹی میں جا چکی تھی، یوں ہم دونوں کا سامنا نہیں ہو سکا۔

رات گئے میں واپس آئی تو اس کے کمرے میں خاموشی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ سو چکی ہے۔

تیسرے دن نعمان کا ٹیلی فون آیا۔ ''آپ نے زون سے بات کی؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''مجھے کوئی مناسب وقت نہیں ملا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پھر میں خود آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں گھبراہٹ کے عالم میں باہر جا کھڑی ہوئی۔ ذرا ہی دیر میں وہ آ گیا۔ ''نعمان! وہ ڈپریس ہے زیادہ پریشان مت کرنا۔'' میں نے منت کی۔

''میں بھی بہت پریشان ہوں'' اس نے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو میں چُپ ہو گئی اور اسے لیے زون کے کمرے کے سامنے آ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ لکھنے میں مصروف تھی۔

''زون!'' میں نے اسے آواز دی۔

''کیا ہے؟'' اس نے سر اُٹھائے بغیر تیزی سے لکھتے ہوئے کہا۔

''یہ..... نعمان تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس کے ہاتھوں سے پین چھوٹ گیا اور بوکھلا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔'' اس کی آواز کانپی۔ کالے کپڑوں میں ملبوس وہ بے حد اداس دکھائی دے رہی تھی۔

''لیکن زون! میں اپنی بات کیے بغیر یہاں

سے جاؤں گا نہیں۔'' نعمان قدم بڑھا کے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا میں نے موقع غنیمت جانا اور کمرے سے باہر نکل آئی اور دروازے سے لگ کر اندر کا منظر دیکھنے لگی۔ ''زون جب میں نے تمھیں بچا یا تو میرے ذہن میں سوائے ہمدردی کے اور کچھ نہ تھا لیکن پھر کیپٹن راشد کی شادی میں تمھیں روتا ہوا دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا اور تمھیں وہاں سے نکال کر جب میں نے تم سے کہا کہ یہ چیپٹر بند کر کے کسی اور کا ہاتھ تھام لو تو اُس سے میرے دل نے کہا کہ کسی اور کا کیوں، میں خود تمھارا ہاتھ کیوں نہیں تھام لیتا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے تم سے ہمدردی نہیں بلکہ محبت ہے۔ میں تمھارے بغیر نہیں جی سکتا۔ خدارا زون! مجھے کسی اور کے حصے کی نفرت نہ دو۔'' اس نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''کاش کہ نعمان تم میرے لیے اجنبی ہوتے اور میں تمھاری بات مان لیتی لیکن نعمان! تم تو اس شخص کے کزن ہو، دوست ہو اس کی کمینگی سے پوری طرح واقف ہو، یہ بھی جانتے ہو کہ اس نے کس بُری طرح سے میرے دل کو روندا ہے۔ پھر تم چاہتے ہو کہ میں تمھاری محبت قبول کر لوں؟'' وہ رو دی۔

''زون! محبت کا دل بہت وسیع ہوتا ہے، وہ اپنے محبوب کی ہر لغزش کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے اور پھر تم نے تو کوئی لغزش بھی نہیں کی بلکہ وہ بدنصیب ہے جس نے اپنی محبت کو کھو دیا۔'' نعمان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں مان سکتی، یہ بات کل کو جب تمھیں دنیا والے طعنہ دیں گے کہ ایک ٹھکرائی ہوئی بے قیمت لڑکی کو تو نے اپنی عزت بنا لیا ہے تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے اور محبت کے بعد نفرت کا عمل بے حد اذیت ناک ہوتا ہے اور یہ میں برداشت نہ کر پاؤں گی۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا زون! کیوں کہ میں تمھیں جانتا ہوں اور اگر تم نے کوئی خطا بھی کی ہوتی تو زون میں وہ بھی بھول جاتا۔ تم ایک بار آزما کر تو دیکھو۔'' آخری کوشش کے طور پر کہا۔ ''نعمان! تم ایک بہت اچھے انسان ہو تمھارے ساتھ کی خواہش ہر لڑکی کر سکتی ہے اور جب بھی تمھارے ساتھ دل نے خواہش کی تو یقین رکھنا میں تمھیں خود پکاروں گی۔ اس اُمید کے ساتھ کہ تم جہاں کہیں ہو میرے، صرف میرے منتظر ہو۔'' اس نے کہا اور بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں گھس گئی۔

''میں اس دن کا انتظار کروں گا۔'' نعمان نے کہا اور واپس مڑ گیا۔

باہر آیا تو مجھے کھڑا دیکھ کر پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ''میری زون موم کی ہے کہیں یہ دکھوں کی تپش اسے پگھلا نہ دے۔'' میں نے بھرائی آواز میں کہا۔

''میں اس موم کو جمع کر کے ایک نئی زون تراش لوں گا۔ آپ یقین رکھیں۔'' نعمان نے پراعتماد انداز میں جواب دیا اور لمبے قدم اُٹھاتا اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

پھر نہ جانے اس نے اپنے گھر والوں سے کیا کہا کہ وہ بھی چُپ ہو گئے۔ بڑی ممانی اُٹھتے بیٹھتے

گزارشات

ایک معروف قانون دان عدالت میں اپنے مؤکل کے حق میں دلائل کے انبار لگا رہے تھے۔ جب قانون دان کو دلائل پیش کرتے ہوئے چار گھنٹے ہو گئے تو جج نے تنگ آ کر قانون دان سے کہا۔

''کیا فاضل وکیل یہ بتائیں گے کہ وہ کب تک اپنا شغل جاری رکھیں گے۔؟''

وکیل نے برجستہ جواب دیا۔

''جناب والا! یہ تو فاضل عدالت پر منحصر ہے کہ وہ کتنی دیر میں اس نکتے کو سمجھتی ہے۔ ویسے ایک اور جج صاحب پانچ منٹ میں میری گزارشات کو سمجھ سکتے تھے۔'' ☆

زون کے لیے دُعائیں مانگتی رہتیں ''نہ جانے یہ لڑکی آخر چاہتی کیا ہے۔'' وہ اکثر مجھ سے پوچھتیں تو میں آئیں بائیں شائیں کر کے رہ جاتی' میں انھیں کیا بتاتی کہ زون تو جلتے ہوئے صحرا میں سفر کر رہی ہے۔ شاید اس کے حصے کا نخلستان بھی بہت دور ہے۔

علی ایکسپریس سائز پر گئے ہوئے تھے میں سارا دن بور ہوتی رہتی تھی سو میں زون کے ساتھ سا کے ڈرامے کی ریہرسل دیکھنے چلی جایا کرتی۔ میرے جانے سے زون بہت خوش تھی۔ واپس آتے ہوئے ہم لوگ آئس کریم کھاتے نے تحاشا باتیں کرتے۔ یوں زندگی ایک بار پھر ہمارے لیے خوب صورت ہو رہی تھی۔ زون ہر چیز بھولے ہوئے اپنے ڈرامے مگن تھی۔ پرسکون ہونے سے اس کی حالت بھی ٹھیک ہو رہی تھی، آنکھوں میں جینے کی اُمنگ پھر سے دکھائی دینے لگی تھی میں اسے دیکھتے ہی خدا کا شکر ادا کرنے لگتی جس نے میری زون کے لبوں پر مسکراہٹیں سجادی تھیں ورنہ ہم تو پہلے والی زون کو ترس کے رہ گئے تھے جس کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔

''فرح! تم تیار ہو گئیں؟'' وہ اپنے بالوں میں برش کرتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

''میں تو تیار ہوں لیکن چائے پیے بغیر میں ہرگز اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گی۔'' میں نے اپنی ساری درست کی اور ریشماں کو آواز دی جو چائے بنانے میں مصروف تھی۔

''تم اپنے نام کی ایک ہو!'' اس نے ہنس کر کہا۔ پھر ذرا ہی دیر میں دونوں آڈیٹوریم کی جانب رواں تھے۔ آج فائنل ریہرسل تھی اس لیے سب میں کچھ زیادہ ہی جوش وخروش تھا۔ لوگ کافی موجود تھے جو ریہرسل دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ زون تو دوسرے آرٹسٹوں کی جانب بڑھ گئی اور میں وہاں لگی نشستوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے جا بیٹھی۔ ڈرامے کی ریہرسل جاری تھی کہ ایک دم تیزی سے کوئی اسٹیج پر نمودار ہوا۔ میری جانب اس کی پشت تھی سو میں نہ جان سکی کہ وہ کون ہے لیکن زون کے چہرے پر دہشت کے آثار دیکھ کر میں بُری طرح چونک اُٹھی۔

''تمھیں بے وقوف بنانے کے لیے اور کوئی نہیں ملا تھا جو تم نے میرے کزن کو اپنے جال میں پھانس لیا..... اور بہت لوگ ہیں جو تمھارے غلام بن سکتے تھے۔'' اس شخص کی آواز گونجی۔ زون چُپ کھڑی تھی۔

''اگر تمھیں مجھ سے کوئی بدلہ لینا ہے تو دوسرے کی دُلھن۔ تو یہ طریقہ بیحد گھناؤنا ہے۔ سو جو تو زون کہ ایک کی مجبوبہ بنیں تو دوسرے کی دُلھن میں پوچھتا ہوں تمھارے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟'' وہ چلایا۔

''ارے کیا تماشا لگا رکھا ہے؟ تمھیں یہاں اس طرح آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟'' اسٹیج پر وڈیوسر نے چونک کر کہا۔

''تماشا میں نہیں یہ لگا رہی ہے۔ پوچھیں اس سے کہ یہ شریف لڑکیوں کے پھنس ہوتے ہیں، ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرے کا ہاتھ تھام لیں۔ ارے یہ حقیقت میں مجھ سے محبت کرتی تو مر جاتی، اب تک زندہ کیوں ہے؟'' اس اثنا میں، میں اسٹیج پر آ گئی تھی میں نے اس شخص کی صورت دیکھتی تو احتشام میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

''تم ذلیل انسان!.....'' میں اس کی جانب جھپٹی۔ ''آج تک تو میں زون کی وجہ سے خاموش تھی لیکن آج تم نے کمینگی کی حد کر دی ہے تو میں بھی خاموش نہیں رہوں گی۔ احتشام! تم نے محبت کا کھیل رچا کر یہ سوچ لیا تھا کہ ایک اور معصوم لڑکی تمھاری فہرست میں شامل ہو جائے گی..... اُن لڑکیوں کی فہرست میں جنھیں تم ختم کر چکے ہو، لیکن ایسا نہ ہوا، اسے خدا نے بچا لیا تو تم کو بے چینی ہو گئی؟ پھر تم نے سوچا شاید وہ تمھارے پاؤں پکڑے گی تم سے محبت کی بھیک مانگے گی، مگر اس نے یہ بھی نہ کیا تو تم منتظر رہے کہ وہ تمھارے دیے گئے ناسور سے گھل گھل کے مر جائے گی لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔ اب جب خدا کی طرف سے عنایت کردہ شخص نے اپنی محبت کے مرہم

سے اسے زندہ کرلیا تو تم سے اپنی شکست برداشت نہ ہوسکی اور چلا اُٹھے کہ یہ بے وفائی ہے؟..... ارے احتشام کچھ لوگوں کے مقدر میں محبت نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ دوسروں کی محبت چھینتے رہتے ہیں، انھی چند لوگوں میں تم بھی شامل ہو تجھے محبت سے محروم لوگوں پر ہمیشہ ترس آتا ہے جھکو اُس رب کے آگے جو شاید تمھاری محرومی کو ختم کردے۔'' میں نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ اپنے نقوش کھو رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر زون کو دیکھا وہ ساکت کھڑی تھی۔ سفید لبادے میں ملبوس اس کے چہرے کا رنگ بھی سفید ہو رہا تھا۔ میں گھبرا کے اس کے قریب آئی۔ ''زون تم فکر مت کرو جان! سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' میں نے اس سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے اس کو تھامنا چاہا تو وہ بھربھری ریت کی مانند میرے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔ ''زون..... اُٹھو آنکھیں کھولو زون!..... مجھے دیکھو۔'' میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما مگر کوئی آواز نہ اُبھری۔ میں دہشت زدہ سی چلا اُٹھی' میری چیخیں آسمانوں پر تھیں میں اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔

ہوش میں آئی تو علی میرے سرہانے کھڑے تھے۔ ''زون کہاں ہے؟'' میں بیڈ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''وہ ہاسپٹل میں ہے۔'' علی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''ہاں ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے آنکھیں چرائیں۔

''سچ بتائیں ورنہ مجھے کچھ ہوجائے گا۔'' میں نے ان کے سامنے آکر کہا۔

''اس کا شدید نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ ڈاکٹرز کے کہنے کے مطابق آج رات تک اسے ہوش نہ آیا تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' علی کی آواز بھرا گئی۔

''ایسا نہ کہیں علی!'' میں بُری طرح رو دی۔

''فرح! میری بہن کو کچھ ہوگیا تو میں بھی.....'' علی سے آگے کچھ بھی نہ کہا جاسکا، بس بے بسی سے اپنی آنکھیں جھپکا کے رہ گئے۔

پھر میں علی کے ساتھ ہاسپٹل آگئی۔ زون انٹینسو کیئر میں تھی۔ نعمان بھی آچکا تھا اور مختلف ڈاکٹر سے صلاح مشوروں میں مصروف تھا' رات بھر نہ سونے کے باعث وہ بُری طرح تھکا ہوا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سنبھالے کبھی علی کو سمجھاتا تو کبھی بڑی ممانی کے بہتے آنسو روکنے کی کوشش کرتا۔ رات ہونے والی تھی' ہم سب کو برآمدے میں بیٹھے ہوئے پتا نہیں کتنے گھنٹے گزر چکے تھے لیکن کوئی احساس نہ

غور و فکر

حکمت

حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا۔
''حکمت کس سے سیکھی؟''
جواب ملا: ''اندھوں سے..... وہ پہلے زمین کو اچھی طرح ٹٹول لیتے ہیں تب آگے بڑھتے ہیں۔''

توبہ

جو انسان جتنا مؤثر ہوگا اس کا گناہ اتنا ہی بڑا ہوگا۔ ہم اپنے گناہوں کو حلقۂ تاثیر میں سند بنا دیتے ہیں اور یوں ہم زیادہ مستحق ہوجاتے ہیں۔ اگر توبہ برملا نہ ہو تو برملا گناہ معاف نہیں ہوتا۔ جتنے بڑے ہجوم میں جھوٹ بولا گیا ہو اُتنا ہی بڑا جھوٹ ہوتا ہے اور اس کے لیے اتنی ہی بڑی سزا ہے۔ اس سے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ اتنے ہی بڑے ہجوم میں توبہ کی جائے یا آئندہ ہجوم کے سامنے آنے سے توبہ کی جائے۔

(اقتباس۔ قطرہ قطرہ قلزم)

تھا بس ایک ٹک سب اس شیشے کی دیوار کو دیکھ رہے تھے جس کے پار ہم سب کی زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا کہ ایک دم ہلچل سی ہوئی' نعمان تیزی سے اندر بھاگا زون کو ہوش آرہا تھا یہ خبر سنتے ہی ہم سب پراُمید ہوگئے دروازہ کھلا، ڈاکٹر عالیہ نے باہر جھانکا میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''زون کو ہوش آگیا؟'' میں نے پوچھا۔

''فرح! تم جا کر اس سے مل لو لیکن یہ یاد رکھنا کہ شمع بجھنے سے پہلے ایک بار پوری آب تاب کے ساتھ روشن ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر عالیہ کے یہ الفاظ مجھے ہونق کر گئے۔

''جاؤ جلدی اس کے پاس وقت نہیں ہے۔'' عالیہ نے مجھے اندر دھکیلا۔

میں لڑکھڑاتی ہوئی اندر آئی۔ نعمان اس کے نزدیک ہی کھڑا ڈرپ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر چمک آگئی۔ ''فرح تم نے صحیح کہا تھا' محبت اور پسند میں بہت فرق ہوتا ہے اور اب میں نے یہ فرق جان لیا ہے' میری محبت تو نعمان تھا جب ہی تو میں اس کو اپنی خاطر ذلت نہ دے سکی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر یہ مجھ سے نفرت کرنے لگے تو میرا دل بند ہوگیا ہے۔ نعمان کی فرقت کے تصور نے ہی اس حال پر پہنچا دیا۔ اگر حقیقت میں ایسا ہوتا تو پتا نہیں کیا کرتی۔'' وہ بری طرح سے ہانپ رہی تھی۔

''تم بولو نہیں زون!'' میں نے اسے خاموش کرانا چاہا۔

''کہنے دو مجھے!'' اس نے کہا اور بہ مشکل تمام اپنے ہاتھ پر رکھے نعمان کے ہاتھ کو تھام لیا جو بے قراری سے ڈرپ کے لئے سوئی لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نعمان' مجھے تم سے محبت ہے۔'' اس کے لب کانپے تو نعمان کے ہاتھ سے ڈرپ چھوٹ گئی۔

''مجھے بھی تم سے بہت محبت ہے زون مگر یہ کیا کر ڈالا تم نے..... تم مجھ سے دور ہو رہی ہو اور میں تمہیں روک بھی نہیں پا رہا۔''

نعمان کی آنکھوں سے آنسو گر کر زون کے چہرے پر پھیل گئے۔

''میں تم سے دور نہیں بلکہ تمہارے دل میں زندہ رہوں گی نعمان کہ محبت کبھی نہیں مرتی زندہ رہتی ہے اپنے محبوب کی صورت میں۔ تمہارا تو مجھ پر احسان ہے کہ تم نے مجھے سچی محبت کے ذائقے سے آشنا کروایا..... گڈبائی مائی لو.....'' اس کی آواز معدوم ہوگئی۔ چمکتی آنکھیں ساکت ہوگئیں۔

کمرا لوگوں سے بھر گیا۔ علی روتے ہوئے بڑی ممانی اور ماموں کو لے کر باہر چلے گئے۔ میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو رگڑا کہ شاید کوئی آنسو میرے اندر کی جلن کو کم کر سکے لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں آہستہ قدموں سے اس کمرے سے باہر نکلنے لگی کہ ایک دم پلٹی سامنے ہی زون کا بیڈ تھا' جس کے سرہانے نعمان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور زون کے ہاتھ نے اس کا ہاتھ ابھی تک تھاما ہوا تھا' میرا دل کراہ اٹھا اور میرے اندر سے آنسوؤں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ نہ جانے کب تک یہ لڑکے معصوم لڑکیوں کے دلوں سے کھیلتے رہیں گے؟

خلیل جبران کہتا ہے کہ مارنے والے کو پھانسی کی سزا ہوتی ہے لیکن میرا بس چلے تو ان لوگوں کو سولی پر چڑھا دوں جو لوگ دل توڑتے ہیں اور دنیا کی کوئی عدالت انہیں مجرم نہیں مانتی' ایسا ہی ایک مجرم احتشام بھی تو تھا جس نے پھولوں سی نازک زون کو اس بری طرح سے روندا کہ وہ اپنی زندگی ہی ہار گئی اور ساتھ میں ایک شخص کو محبت کا کرب عطا کر گئی جو کوئی غیر نہیں' اس کا اپنا محبوب تھا اس کی محبت تھا اور شاید یہی محبت جو ہر لمحے ہر وقت نہ جانے کتنے رنگ بدلتی ہے۔

☆

احساس کی زنجیر

نوازش شاہین

خط پڑھ کر میں تڑپ اٹھی۔ فرحان نے کس انداز میں مجھے جھنجھوڑا تھا۔ مُیں تو کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ مجھے اپنا فرض یاد تھا۔ میں تو بس کچھ عرصے دور رہنا چاہتی تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ یہ رشتے اتنے نازک نہیں تھے کہ ٹوٹ جاتے۔ مُیں نے چچا سے کہہ دیا کہ میں واپس جارہی ہو جو کام رہ گیا ہے' وہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچادیں۔

اس شمارے کی ایک حساس و دل گداز سچی کہانی

وہ دھچکا ہی ایسا تھا میں دیوار کا سہارا نہ لیتی تو فرش پر گر جاتی۔ میرے وجود پر کپکپی طاری تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ میری پور پور سے جیسے لہو ٹپک رہا تھا۔ میرا اعتماد کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا تھا لیکن میں نے بڑی جرأت اور حوصلے کے ساتھ وہ باتیں سنی تھیں جنہوں نے میری حقیقت مجھ پر کھول دی تھی' میں اپنے مقابل کھڑی خود سے سوال کررہی تھی تم کون ہو؟

دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے وہ اپنی باتوں میں مگن تھے اور ان کی باتیں تیر بن کر میرے سینے میں پیوست ہو رہی تھیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ میں اسی حویلی میں ہوں۔ یہ لوگ جن سے چند لمحے قبل میرا خونی رشتہ تھا۔ میرے والدین' بہن بھائی اور بھابی تھیں لیکن اب ان سے میرا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ اتنی بڑی حقیقت جاننے کے باوجود میں چیخنے چلانے کی نہ تھی۔ میں نے ضبط اور تحمل کے ساتھ خود پر قابو پالیا تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

پھر اس ہستی کی آواز سنائی دی' جس نے اٹھارہ برس مجھے ممتا اور پیار دیا تھا۔ وہ میری ماں تھیں۔ ''پروین ہمارا خون نہیں ہے نجم! اور تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندان میں کسی ایسی لڑکی کو جگہ نہیں دی جاسکتی تھی جو.....''

''لیکن امی وہ دونوں بچپن سے اکٹھے رہے ہیں اور اب فرحان بہ ضد ہے کہ پروین ہی سے شادی کرے گا۔ تایا ابو سے کہہ دیں کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ سوچ لیں۔'' بھیا بڑے سنجیدہ لہجے میں بولے۔

''ہم مجبور ہیں بیٹے! بڑے بھیا خاندانی اصولوں کے سخت پابند ہیں اور وہ اس راز سے آگاہ بھی ہیں۔'' ابو نے افسردہ لہجے میں کہا۔

میں اس سے زیادہ نہ سن سکی اور لرزتے قدموں سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے اپنی کم مائیگی اور محرومیوں پر آنسو نہیں بہائے۔ میں نے ایک فیصلہ کیا کہ اس خاندان کو مسائل اور الجھنوں کا شکار نہیں ہونے دوں گی۔ میں ان کا بھرم قائم رکھوں گی کہ انہوں نے اٹھارہ برس ایک بے سہارا بچی کو اپنی ہی بیٹی جانا۔ اس کی پرورش کی' اسے ممتا' پیار اور شفقت دی۔

تمام رات میں سوچتی رہی کہ کون ہوں؟ میرے والدین کون تھے؟ میں کس کا خون ہوں؟ کیا میرا کوئی بھی نہیں؟ ان لوگوں سے تو اب کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔ اٹھارہ برس انہوں نے میرا راز چھپایا تھا۔ یہ شاید آج بھی زبان نہ کھولتے اگر فرحان اپنی ماں سے کہہ کر میرے رشتے کے طالب نہ ہوتے۔ فرحان میرے تایا کے بیٹے اور میرے بچپن کے ساتھی ہیں' چند دنوں سے گھر کے سبھی افراد پریشان تھے لیکن مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بھابھی اور نسرین بجیا نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ بھیا بھی چپ چپ تھے۔ میں سمجھتی تھی کہ نسرین بجیا کے پردیس جانے کی بنا پر سبھی اداس ہیں۔ بجیا دولہا بھائی کے پاس لندن جا رہی تھیں' میں چھٹی کا دن گزار کر پھر لاہور آ گئی تھی اور یہاں میری طبیعت بے چین رہی' جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کالج سے واپس ہوسٹل آئی تو کسی کل چین نہ تھا۔ میں اپنی روم میٹ سے کہہ کر اچانک واپس آ گئی۔ راستے میں بس خراب ہونے کی وجہ سے عشاء کے بعد پہنچی۔ حویلی کے گیٹ سے گزر کر میں اپنے کمرے میں آئی' بیگ رکھا اور امی سے ملنے ان کے کمرے کی جانب جا رہی تھی کہ بڑے کمرے سے باتوں کی آوازیں سنائی دیں اور اپنا نام سن کر میرے قدم رک گئے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ میں واپس آ گئی ہوں۔

فرحان میرے بچپن کے ساتھی تھے۔ ہم اسی حویلی میں کھیلتے کودتے شعور تک پہنچے تھے۔ ان سے مجھے محبت بھی تھی لیکن میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ ابھی ابتدائی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ تایا ابو اپنے نئے مکان میں چلے گئے تھے جو انہوں نے قصبے کی نئی آبادی میں بنوایا تھا' فرحان کبھی آتے بھی تو اب ہم پہلے کی طرح نہیں ملتے تھے۔ فرحان نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو میں بھی لاہور میں تھی اور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ وہ کبھی مجھ سے کالج یا ہوسٹل میں ملنے نہ آئے۔ چھٹیوں میں حویلی ہی میں ملاقات ہوتی۔ کبھی انہوں نے مجھ سے کوئی ایسی بات بھی نہ کی تھی۔ میں تصوراتی محلوں میں رہنے والی لڑکیوں میں سے نہ تھی اور نہ ہی میری تربیت اس انداز میں ہوئی تھی۔ فرحان کی شادی کی بات چلی تو انہوں نے اپنی پسند کا اظہار کر دیا۔ ہمارا بچپن کا ساتھ تھا اور بزرگ

اس سے بے خبر نہ تھے۔ پھر میرے والدین یا گھر کے کسی فرد نے مجھے غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ امی نے کبھی یہ نہ کہا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں۔ بھیا میری ہر خواہش پوری کرتے۔ بجیا اور بھابھی مجھ سے پیار کرتیں۔ تایا ابو اور تائی امی شفقت سے پیش آتیں۔ گو میں ناز و نعم میں پلی لیکن امی کی تربیت کا انداز منفرد تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ انسان کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ حالات بدلنے کے ساتھ وقت کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ امی نے مجھے ایسی تعلیم اور تربیت دی تھی کہ مجھ میں ہر دکھ سہنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھے چٹانوں سے ٹکرانے کی جرات بخشی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ الجھن اور دکھ کسی لمحے بھی جنم لے سکتے ہیں' اس لیے جرات و حوصلے کے ساتھ جینا سیکھو' صبر و تحمل کے ساتھ حالات کا سامنا کرو کہ جذباتی عوامل بہتر نتائج نہیں رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی حقیقت جاننے کے بعد میں نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ لیا تھا۔ آنسو نہیں بہائے تھے۔ حوصلہ نہیں ہارا تھا اور عزم و ہمت کے ساتھ جینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ اس عظیم عورت کی تعلیم و تربیت ہی کا اثر تھا کہ رشتے صرف خون ہی کے نہیں ہوتے۔ ان کی کہی ہوئی ایک ایک بات آج مجھ پر واضح ہوتی جارہی تھی۔ یقیناً ان کی نگاہیں مستقبل پر تھیں۔ اسی دن کے لیے تو انہوں نے مجھے یہ باتیں بتائی تھیں۔

میں خیال میں کھوئی ہوئی تھی کہ معاً مجھے ابو کی تھرتھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''پروین ہمارے خاندان کی بہو نہیں بن سکتی کہ اس کا اس خاندان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ پروین ہمیں فسادات کے دوران میں ایک کھیت کے اندر اس حالت میں ملی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی نعش کے بازوؤں میں پھنسی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ان دونوں میں اس علاقے کا تھانہ انچارج تھا۔ فضلو بابا نے بڑھ کر اسے اٹھالیا اور پھر تمہاری ماں کی گود میں دے کر ان سے کہا کہ آپ کی بچی چند روز قبل وفات پا گئی تھی۔ قدرت نے اتنی ہی عمر کی معصوم بچی دے دی۔ اسے ہی پروین سمجھے۔ نجم اور نسرین ان دونوں ننھیال میں تھے۔ پروین کی وفات کی خبر کسی کو ابھی نہیں دی گئی تھی' بھیا اسی روز ہمارے ہاں آئے تھے جب ہم اس چھ ماہ کی بچی کو لائے تھے جس کا نام ہم نے پروین ہی رکھا تھا۔''

ابو نے کچھ دیر بعد مزید کہا ''میں یہ راز کبھی ظاہر نہ کرتا لیکن فرحان نے جب والدین سے پروین کے رشتے کے لیے کہا اور مجھے بھی آج اس حقیقت کو تمہارے سامنے ظاہر کرنے پر مجبور ہونا پڑا ورنہ ہم یہ بھلا چکے تھے کہ یہ ہماری پروین نہیں ہے۔''

اس سے قبل کیا باتیں ہوئی تھیں مجھے علم نہ تھا میں فیصلہ کر چکی تھی کہ ان کے لیے الجھن نہیں بنوں گی۔ رات گئے مجھے نیند آئی۔ صبح آنکھ کھلی تو سورج نکل آیا تھا اور امی میرے بستر کے قریب بیٹھی تھیں' میں نادم تھی۔

انہوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''فضلو بابا نے بتایا کہ تم رات عشاء کے بعد آئی تھیں۔ شاید تمہاری طبیعت خراب تھی' آتے ہی سو گئیں۔ مگر شاید تم سو نہیں سکیں ٹھیک طرح۔''

میں نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آئیں میرا سر اوپر اٹھایا اور چہرے پر نگاہیں جما کر بولیں۔

''زندگی کی حقیقتیں انمٹ ہوتی ہیں۔ بیٹی! تم اگر خود آگہی کے چکر میں پڑ گئیں تو کیسے جی سکو گی۔ میں نے اسی دن کے لیے تمہیں تربیت دی تھی۔ میری تربیت کو نہ بھلاؤ بیٹی!''

پھر وہ میرے کمرے سے چلی گئیں۔ میں سوچتی رہ گئی کہ یہ خاتون جو میری ماں ہیں' کتنی بڑی نفسیات داں اور قیافہ شناس ہیں کہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا اور یہ ہر بات سمجھ گئیں۔ انہوں نے سچ ہی تو کہا تھا کہ زندگی کی حقیقتیں انمٹ ہوتی ہیں اور ان ہی حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تو انہوں نے مجھے اس نہج اور ان خطوط پر تربیت دی تھی۔ میں بستر سے اٹھی

اور منہ ہاتھ دھو کر بڑے کمرے میں آئی تو وہاں صرف امی بیٹھی تھیں۔ گھر کے دیگر افراد ناشتا کر چکے تھے۔ ملازمہ برتن اٹھا کر لے گئی تو امی نے پوچھا کہ میں اتنی جلدی کیسے آ گئی؟ میں نے بہانہ کیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اس لیے چلی آئی اور راستے میں بس خراب ہونے کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ میں نے کسی کو نہ بتایا' صرف سر بھاری تھا اب ٹھیک ہوں۔

امی مسکرائیں' پھر بولیں ''ذہن پر زور نہ ڈالو۔ ابھی ہم زندہ ہیں تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔''

ان کی باتیں ذو معنی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے جھوٹ بولا ہے اور تسلی بھی دی کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ میری ماں ہیں۔ بھابھی اور نسرین بجیا کہیں گئی ہوئی تھیں۔ ابو اور بھیا بھی گھر میں نہ تھے۔ صرف امی تھیں' میں خاموش بیٹھی تھی۔ امی بھی خاموش تھیں جیسے سوچ رہی ہوں۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔

پھر امی نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا ''بیٹی! تم نے رات ہماری باتیں سنی ہوں گی۔ ظاہر ہے پھر تم کیسے سو سکتی تھیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں کسی بات کا علم ہو۔ میں نے تم تینوں میں سمجھ فرق روا نہیں رکھا۔ ہم چند دنوں سے پریشان ہیں۔ تم پرسوں آئی تھیں تو تم نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ گھر کی فضا بدلی ہوئی تھی' تم نے اگر کوئی سوال نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے کہ تم بے خبر نہیں رہیں۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بھائی جان جو خود تم سے پیار کرتے ہیں۔ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ اس ضمن میں ایسا رویہ اختیار کریں گے۔'' امی کی آواز تھرتھرائی اور وہ ٹھہر کر گویا ہوئیں۔

''ہم نے جس بچی کو اپنی ہی بچی کی طرح پرورش کیا' اس کے لیے آج بھی ہماری ممتا' پیار اور شفقت میں کوئی فرق یا کمی نہیں آئی لیکن خاندانی اصولوں کے سامنے ہم بے بس ہیں۔ یہ لوگ اپنی آن اور برادری کی رسمیں نبھاتے ہیں تو ان کے دل پتھر ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اپنی اولاد کو بھی ان رسموں پر قربان کر دیتے ہیں۔

فرحان باغی ہو گیا ہے۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ اگر پروین ہمارے خاندان کا خون نہیں تو اسے اس سے غرض نہیں کہ اس کے خاندان کا خون اسپیشل کوالٹی نہیں رکھتا۔ ہم پریشان ہیں' بھیا نے اٹل فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ خاندانی اصولوں سے انحراف نہیں کریں گے۔''

میں ایک عزم کے ساتھ اٹھی اور بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں امی! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں اس خاندان کی آن قائم رکھوں گی' جس خاندان نے مجھے والدین اور بہن بھائیوں کی محبت دی ہے۔ آپ سے صرف ایک التجا ہے کہ مجھے فرحان سے ملنے کی اجازت دے دیں۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلی.....''

''پروین بیٹی!'' امی نے مضطرب لہجے میں میری بات کاٹ دی۔

''اس انداز میں نہ سوچو بیٹی! ہم تمہیں اپنی بیٹی ہی کی طرح اس گھر سے رخصت کریں گے۔ رہی فرحان سے ملنے کی بات تو تم اس سے کیا کہو گی؟ اور پھر تم جانتی ہو کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے! تمہارے ابو اجازت نہیں دیں گے۔''

''میرا ان سے ملنا بہت اہم ہے امی! ابو اور تایا ابو کے درمیان نفرت کی دیوار بھی اٹھ سکتی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ.....''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو پروین تمہارے ابو اپنے بھائی سے تعلق توڑ سکتے ہیں لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

وہ اب بھی اپنے شوہر کو میرے ابو کہہ رہی تھیں جنہوں نے مجھے باپ کی شفقت دی تھی' میرے ناز اٹھائے تھے۔ وہ میری ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے گھڑ سواری اور نشانہ بازی کی تربیت دی تھی۔ ڈرائیونگ سکھائی تھی۔ ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی تربیت دی تھی۔

حویلی کے بزرگوں کے سوا پہلے کسے علم تھا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں' جب ان کی بیٹی پروین کی ولادت ہوئی تھی تو بھیا اور نسرین بجیا اپنے ننھیال میں تھے۔

انہوں نے تو اپنی نوزائیدہ بہن کو دیکھا بھی نہ تھا۔ حالات بڑے دگرگوں تھے۔ جب قدرت نے مجھے ان کی گود میں ڈالا تو میں چھ ماہ کی تھی۔ اب بھی بات صرف حویلی کے مکینوں کے درمیان تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں ان کی بیٹی تو تھی لیکن مجھے بیٹی کے وہ حقوق حاصل نہ تھے جو اس خاندان کی بہو بننے کا شرف دے سکتے۔ امی نے گو مجھے بڑی تسلیاں دی تھیں لیکن میں جو کچھ سوچ چکی تھی مجھے اسی پر عمل کرنا تھا۔ ہر چند کہ فرحان سے ملاقات ان حالات میں ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی اور ماں ہی نے ایک بار کہا تھا کہ کم زور قوت ارادی کے انسان ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ جب کوئی الجھن یا مسئلہ درپیش ہو تو فکرمند ہونے کی بجائے اس پر ٹھنڈے دل و دماغ اور تحمل کے ساتھ غور کرو اور جب کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ تو اس پر عمل کرو' نتائج کو خدا پر چھوڑ دو' میں نے بھی یہ کیا۔

رات کو عشاء کی نماز کے بعد جب سب سونے کے لیے چلے گئے تو میں بھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ نسرین بجیا جلد سو جانے کی عادی تھیں۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی تھی۔ چند لمحوں کے بعد میں اپنے کمرے سے نکلی اور فضلو بابا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ان کا کمرا حویلی کے گیٹ کے قریب تھا اور وہ عشاء کے بعد حویلی کا ایک چکر ضرور لگاتے تھے۔ مجھے اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ حیران ہوئے اور پوچھا کہ ''خیریت تو ہے؟''

میں نے اپنے بارے میں ان سے بہت سے سوالات کیے۔ انہوں نے پہلے تو مجھے یہ باور کرانا چاہا کہ یہی میرے حقیقی والدین ہیں مگر جب میں نے ان سے کہا کہ میں حقیقت جان گئی ہوں تو اقرار کر لیا کہ میں نے جو کچھ سنا درست ہے۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ فرحان کو بلا لائیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔

وہ یہ سن کر حیران ہوئے اور بولے۔

''بیٹی! اس عمر میں مجھے ذلیل تو نہ کرو' صاحب کو معلوم ہو گیا تو مجھے.....''

وہ کسی طرح نہیں مان رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس خاندان کی آبرو پر قربان ہو جاؤں گی مگر حرف نہیں آنے دوں گی۔ میرا فرحان سے ملنا ضروری ہے اور یہ وقت بحث کا نہیں۔ اگر وہ جانے کے لیے تیار نہیں تو میں خود چلی جاؤں گی۔

وہ میرا عزم دیکھ کر نرم پڑ گئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ فرحان اپنے گھر میں نہیں بلکہ ٹیوب ویل پر ہوں گے۔ میں نے بابا سے گھوڑا تیار کرنے کو کہا اور اپنے کمرے میں آ کر لباس تبدیل کیا۔

پھر جب میں گیٹ کے قریب پہنچی تو بابا ابو کے گھوڑے کی لگام میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے۔

''بیٹی! جلدی واپس آ جانا۔ گھر کے کسی فرد کو بھی علم ہو گیا تو میری عزت خراب ہو جائے گی۔''

میں نے گھوڑے کی لگام تھامتے ہوئے انہیں تسلی دی اور حویلی سے کافی دور آ کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ پھر اسے ایڑ لگائی۔

ٹیوب ویل قصبے سے دو میل دور تھا اور یہاں دو کمروں پر مشتمل ایک کوارٹر تھا جس میں تایا ابو کا ایک ملازم رہتا تھا۔ فرحان گھر والوں سے ناراض ہو کر اسی کوارٹر میں چلے آئے تھے۔ میں نے کوارٹر سے باہر گھوڑے کی لگام کھینچ دی اور پھر کود کر کوارٹر کی جانب بڑھی تو فرحان کوارٹر سے باہر ایک درخت تلے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب بڑھے' میں حیران تھی کہ انہیں کس نے میری آمد کی اطلاع دے دی تھی کہ وہ میرے انتظار میں تھے۔

انہوں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''یہاں کس لیے آئی ہو؟ کہیں.....''

''مجھے یہ امید نہ تھی کہ آپ مجھے اس طرح رسوا کریں گے!'' میں نے بھی سپاٹ لہجے میں

کہا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تو میں بولی۔

''آپ نے جو کچھ کہا وہ آپ کا فعل ہے لیکن میری ایک بات غور سے سن لیجئے فرحان کہ میں آپ سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ اگر بزرگ آپ کی ضد کے سامنے جھک بھی گئے تو آپ اس گھر سے میری میت تو اٹھوا سکتے ہیں ڈولی نہیں۔''

وہ گم صم سے کھڑے تھے۔ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ میں اس انداز میں بات کروں گی۔

میں نے رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا ''آپ بھول رہے ہیں کہ میں اس خاندان کا خون نہیں' تھم البدل ہوں۔ میرا کوئی حسب نسب نہیں۔ میں اپنے محسنوں پر جان تو نثار کر سکتی ہوں لیکن انکی آن اور روایات کو نہیں توڑ سکتی۔ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا فرحان علی! یا میری موت.....''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟'' انہوں نے دکھ بھرے لہجے میں میری بات کاٹ کر پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے میں ڈگمگائی لیکن پھر سنبھل کر بولی۔

''یہ میرا اٹل فیصلہ ہے اور میں اسی یقین و اعتماد کے ساتھ آئی ہوں کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں گے۔''

''تو اب یہاں سے دفع ہو جاؤ! وہی ہوگا جو تم چاہتی ہو۔ ورنہ رسم و رواج میرے لیے بے معنی ہیں۔'' وہ بڑے غصیلے لہجے میں بولے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ!''

میں حویلی پہنچی تو فضلو بابا کی جان میں جان آئی' میں بھی سارے راستے خدا سے یہ دعا مانگتی آئی تھی کہ خدایا میری لاج رکھنا۔ میں نے جو قدم اٹھایا تھا' وہ دو بھائیوں کے مابین کسی غلط فہمی کو بھی جنم دے سکتا تھا اور میں بھی بدنام ہو سکتی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر میں سجدے میں گر گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ وہ مجھے حوصلہ دے اور ثابت قدم رکھے۔ مجھے وقت کا احساس نہ تھا۔ اچانک اپنی پشت پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہوئے میں نے سجدہ سے سر اٹھایا تو دیکھا امی میرے قریب بیٹھی ہیں۔

''سو جاؤ بیٹی! خدا بہتر کرے گا۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے سکھ کا سانس لیا کہ انہیں خبر نہیں ہوئی لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔

دوسرے روز امی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا۔ ''تم فرحان سے ملنے گئی تھیں؟''

میں گھبرا گئی' پھر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں ان سے کیسے مل سکتی ہوں۔''

امی نے میرے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ''جس جرات کے ساتھ تم نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اسی جرات کے ساتھ سچ بولو!''

میں نے سر جھکا لیا۔

وہ بولیں ''فرحان نے اپنی ضد چھوڑ دی ہے اور ماں سے کہا ہے کہ اسے ان کا ہر فیصلہ منظور ہے' لیکن اسے اپنی تعلیم سے فارغ ہو لینے دیں وہ واپس لاہور چلا گیا ہے۔ لیکن.....'' وہ لمحہ بھر توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

''اچانک یہ تبدیلی بے معنی نہیں ہے۔ سبھی حیران ہیں۔ مگر مجھے کوئی حیرت نہیں کہ میں نے رات تمہیں حویلی سے نکلتے دیکھا تھا۔ تم میری آواز پر نہ رکتیں تو'' انہوں نے ٹھہر کر پھر کہا۔

''بیٹی! مجھے تم پر اعتماد ہے لیکن تمہیں میں نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ہم ممنون ہیں کہ تم نے ہمیں اس پریشانی سے نجات دلائی۔ مگر کتنی بڑی قربانی دے کر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں اس گھر سے اسی طرح رخصت کریں گے جس طرح نسرین کو کیا تھا۔''

واقعی سب حیران تھے کہ فرحان جو ایک چٹان کی طرح اپنے مطالبے پر ڈٹے ہوئے تھے اور انہوں نے بزرگوں کی کوئی بات نہیں مانی تھی۔ اتنی جلدی کس طرح بدل گئے! بھابھی اور نسرین بیچاری کی خوش فہمی یہ تھی کہ تائی امی نے کسی عامل سے تعویذ

کروایا ہے۔ بھیا کو فرحان پر سخت غصہ تھا۔ ابو چپ تھے۔امی کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔

میں لاہور واپس آ گئی تھی۔ دو ہفتے کے بعد میں گھر آئی تو گھر والوں کا رویہ تو وہی تھا مگر ملازموں کی نگاہوں میں سوال تھے' جیسے سوال کر رہے ہوں۔ کیا میں اس گھر کی بیٹی نہیں؟ بھابھی نے انہیں بتا دیا تھا بھیا سخت برہم تھے۔ انہوں نے مجھے بھی میرے کمرے میں گھیر لیا۔

''میں سمجھا تھا کہ فرحان بزدل ہے جو رسمیں ان زنجیروں کو توڑنے کا عزم کر کے بھی بھاگ گیا لیکن یہ کیا دھرا تمہارا ہے'' تم نے خود اپنا حق کھو دیا پگلی! تم نے ہم پر بھروسا نہ کیا ہمیں نہ آزمایا۔'' ان کی آواز بھرا رہی تھی۔

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور بھیا کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔اس کے سوا کرتی بھی کیا۔

وہ پیار بھرے لہجے میں بولے۔ ''محبت کے رشتے اتنے نازک نہیں ہوتے پھر تم دونوں بچپن کے ساتھی ہو۔تم نے دلوں کے رشتے کیسے توڑ دیئے۔''

اسی لمحے بھابھی کمرے میں داخل ہوئی اور بھیا سے کہا کہ انہیں امی بلا رہی ہیں۔ بھیا کے جانے کے بعد وہ مجھ سے بولیں۔

''پروین! میری بات ذہن میں رکھنا کہ منہ بولے رشتے معتبر نہیں ہوتے۔تم اب نجم سے اس طرح نہ ملا کرو۔'' نجم میرے بھیا۔ یعنی ان کے شوہر کا نام تھا۔

''بھابھی!'' میں نے احتجاج کیا۔ ''وہ میرے بھیا ہیں۔آپ کو مجھ پر اعتماد ہونا چاہیے! ہمارے دل آئینہ ہیں۔ پھر برسوں کا حقیقی رشتہ لمحوں میں نہیں بدل سکتا۔''

''میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے پروین آگے تمہاری مرضی!'' وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔

میرے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آ گئی۔ میں سچ مچ پگلی تھی۔ میرے رشتے بدل گئے تھے۔ میں اب تنہا تھی۔نسرین باجی کو ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنے کے بعد میں سیدھی ہوسٹل آ گئی تھی۔ نسرین باجی نے مجھے تسلیاں دی تھیں۔ بھابھی کے رویے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ میں محتاط رہوں اور جب بھی مجھے ان کی ضرورت پڑے تو انہیں لکھ دوں۔

میں ایک ماہ تک گھر نہ گئی تو امی خود لاہور آ گئیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن خالہ بشریٰ کے یہاں ٹھہری تھیں۔ فضلو بابا کو بھیج کر مجھے بلایا اور جب میں خالہ بشریٰ کے ہاں پہنچی تو امی سخت ناراض ہوئیں کہ میں گھر کیوں نہ آئی؟ میں نے انہیں اپنا نہ سمجھا کیوں نہ کسی چیز کے بارے یں لکھا؟ کیا میرا ان سے کوئی بندھن نہیں رہا؟

میں نے مجبور ہو کر ان سے بھابھی کے بارے میں کہہ دیا اور معذرت چاہی کہ اسی بنا پر میں نہ آ سکی۔ کہ کہیں کوئی ایسی ابت نہ ہو جس سے میرا کردار متاثر ہو۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں اور پھر سنجیدہ لہجے میں بولیں۔

''بیٹی! مجھے ہر بات کا احساس ہے۔ اب تم ہوسٹل میں نہیں رہو گی۔ میں ہر ماہ تمہیں اخراجات بھیج دیا کروں گی۔ تم بشریٰ کے ہاں آ جاؤ۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی کی شادی ہو گئی ہے۔ چھوٹی میٹرک میں ہے۔ میں اور تمہارے ابو بھی تم سے یہیں آ کر مل لیا کریں گے۔ جب بھی تمہارا دل چاہے تم ہمیں پیغام بھیج دینا۔ میں خود آ کر تمہیں سامنے لے جاؤں گی' میں خود بھی نہیں چاہتی کہ تمہاری آبرو پر حرف آئے۔ بہو نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا۔ میں ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی۔''

''امی! آپ کچھ محسوس نہ کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنا بوجھ اب خود......''

''بیٹی!'' امی مضطرب لہجے میں بولیں۔ ''ہمیں ہماری نگاہوں میں اتنا نہ گراؤ۔'' ان کی آواز میں سسک اور تڑپ تھی۔

وہ مجھے تسلیاں دے کر چلی گئیں۔ وہ بھی مجبور تھیں' میں نے خود کو سمجھایا کہ ان رشتوں کے سہارے

کب تک جیوں گی۔؟ یہ رشتے' یہ ناتے' معتبر تو نہیں۔ میرا اب کوئی بھی نہیں۔ نہ کوئی گاؤں' نہ کوئی رشتہ دار' مجھے اپنی راہیں خود تلاش کرنا ہوں گی۔ بھابھی نے میری راہوں میں جو دیوار کھڑی کردی تھی' اسے گرانا ان لوگوں کے بس میں نہ تھا جو میرے والدین تھے میں تو ایک جملہ معترضہ تھی۔ بھابھی جانے کیوں اچانک بدل گئی تھیں' انہوں نے کچھ بھی نہ سوچا کہ بھیا کتنے مخلص' محب اور باکردار ہیں۔ بھابھی ان سے بہت قریب تھیں' ان کی جیون ساتھی تھیں پھر بھی انہیں بھیا پر اعتماد نہ تھا۔ بھیا نے کتنے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ میں کچھ محسوس نہ کروں۔ وہ میرے بھائی ہیں۔ پھر بھابھی نے کیوں مجھے ان مشفق ہستیوں سے دور کرنا چاہا جب کہ چار برس سے وہ مجھے دیکھ رہی تھیں اور میرے کردار پر انہیں اعتماد تھا۔ میری حقیقت کھلتے ہی ان کی نظریں بدل گئیں۔

میں نے بی اے فائنل کا امتحان دیا تو بشریٰ خالہ نے مجھے سے کہا کہ میں گاؤں جانا چاہوں تو وہ میرے ہمراہ جانے کو تیار ہیں۔ مگر میں ان سے معذرت کرلی۔ میں ملازمت کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی لیکن امی سے اجازت ضروری تھی کہ وہ آخر وہ میری ماں تھیں۔ دو روز بعد ہی بھیا اور بھابھی مجھے لینے آگئے۔ بھیا خفا تھے کہ میں نے گاؤں کا رخ نہ کیا۔ بھابھی نے بھی گلہ کیا تو میں حیران ہوئی۔ بھابھی نے کہا کہ میں منے کی پیدائش پر ہی آئی تھی پھر کیوں نہ آئی؟

میں نے امتحان کی تیاری کا بہانہ کیا۔ چھ سال بعد قدرت نے بھابھی کی گود ہری کی تھی اور میں صرف ایک روز کے لیے حویلی گئی تھی۔ وہ ناراض ہوئیں کہ مجھے منے سے پیار نہیں اور پھر اصرار کرکے مجھے ساتھ لے گئیں۔

حویلی میں پہنچی تو امی نے بڑھ کر سینے سے لگالیا۔ ابو نے دعائیں دیں اور میں سسک پڑی۔ امی نے بھی گلے کیا کہ میں اب اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتی' تب ہی امتحان سے فارغ ہونے کے بعد بھی نہ آئی۔ فضلو بابا بہت خوش تھے۔ وہ تو اکثر مجھ سے ملنے لاہور آتے رہتے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد امی نے مجھ سے کہا کہ میرے لیے اتنی تعلیم ہی کافی ہے۔ وہ میرے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتی ہیں' میرے لیے ایک اچھے گھرانے کا رشتہ آیا تھا۔ بھابھی کے بڑے بھیا کے دوست تھے۔ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔

بھابھی' امی کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئی تھیں' وہ لوگ بھی آئے تھے۔ بھابھی نے ان کی شرافت اور اخلاق کی بڑی تعریف کی تھی۔ امی کو بھی یہ رشتہ پسند آگیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ چاہتی ہیں مجھے بیٹی کی طرح رخصت کریں۔ انہیں میری خوشیاں عزیز تھیں۔ ان کے بس میں جو کچھ تھا وہ کرنا چاہتی تھیں' میری رخصتی کے بعد ہی فرحان کی کہیں نسبت طے کی جانا تھی۔

میں ان سے کیا کہتی وہ لوگ اپنا فرض جو کہ ان پر عائد نہیں ہوتا تھا پورا کرنا چاہتے تھے اور پھر نسرین بجیا نے بھی بی اے تک ہی تعلیم پائی تھی میں بھی ان پر کب تک بوجھ بنی رہتی۔

اس رات کو بڑے کمرے میں سبھی بیٹھے تھے۔ امی ہی نے بات شروع کی اور ابو خاموشی سے سنتے رہے۔

امی جب اپنی رائے دے چکی تو بھیا بولے۔

''امی! ہمیں اپنے طور پر بھی ان لوگوں کے بارے میں تحقیق کرلینا چاہیے تاکہ پروین کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو۔''

اس پر بھابھی اور امی نے کہا کہ انہیں ان لوگوں پر یقین ہے پھر یہ کہ بھابھی نے خود ان کا خاندان دیکھا تھا۔ اچھے رشتے مشکل سے ملتے ہیں۔

ابو نے فیصلہ دے دیا کہ انہیں اطلاع دے دی جائے کہ آکر شادی کا دن طے کرجائیں وہ جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔

بھابھی نے دوسرے روز ہی انہیں پیغام بھجوادیا

ان کے گھر سے ایک خاتون اور ان کے ہمراہ ان کی ملازمہ ہی آئی تھی۔ باتیں ہوئیں اور شادی کا دن مقرر کر دیا گیا۔

اس خاندان میں یہ شاید پہلی شادی ہوگی' جس میں رسموں کا خیال نہیں کیا گیا تھا۔ بھیا خفا تھے مگر امی نے انہیں سمجھایا کہ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔

ایک ماہ کے بعد میں اس گھر سے رخصت ہو رہی تھی جس میں میرا بچپن گزرا تھا۔ جہاں میں جوانی ہوئی تھی۔ نسرین بجیا بہت یاد آتی تھیں۔ امی نے واقعی مجھے بیٹی کی طرح رخصت کیا تھا' جب میں باہر کھڑی کار میں سوار کرائی جا رہی تھی تو پیچھے سے بھابھی کی آواز سنائی دی۔

''ہم نے بن ماں باپ کی اس بچی کو بھی اپنی نسرین کی طرح ہر چیز دی ہے۔''

میں مسکرادی۔ بھابھی کا دل صاف نہ تھا۔ وہ میرا بھرم رکھ لیتیں تو ان کا کیا جاتا' انہوں نے سب مہمانوں کو بتا دیا تھا کہ میں اس خاندان کی بیٹی نہیں ہوں۔ حالانکہ یہ بات تو ایسی سے واضح تھی کہ میں اس خاندان کی بہو نہیں بنی تھی۔ کسی غیر خاندان میں جا رہی تھی۔ میں نے خود سے کہا۔ حوصلہ رکھو پروین۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ سسرال کی دہلیز پر تمہارا استقبال کیسا ہوتا ہے۔ یہ ابھی دیکھنا ہے کہ یہ بندھن بھابھی ہی نے باندھا ہے۔ نہ جانے ان کے ترکش میں ابھی اور کتنے تیر ہوں۔

میرے اندیشے غلط نہ تھے۔ میں جب سسرال پہنچی تو دو ننھے منے بچوں نے ان الفاظ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

''امی آ گئیں..... امی آ گئیں''

میری ساس نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''گھبراؤ نہیں بہو۔ ان معصوم بچوں کو ممتا بھری گود کی ضرورت تھی اور تم بھی بن ماں باپ کی بچی ہو۔ تم انہیں ضرور پیار اور ممتا دو گی کہ تم نے خود محرومیوں کا یہ دور دیکھا ہے۔''

میں سوچ رہی تھی کہ یہ تھا بھابی کا بندھن' انتخاب مجھے غیریت کے احساس کے ساتھ تو رخصت کیا ہی تھا' میری آغوش میں دو معصوم بچے بھی دے دیئے تھے۔ انہوں نے میری سسرال والوں کو بتا دیا تھا کہ میں لے پالک ہوں۔ دلہن کے حسین سپنے تو سسرال کی دہلیز پر ہی بکھر گئے تھے اور مجھے ان تلخ حقائق سے سمجھوتا کرنا تھا۔ جنہیں میں جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ میں ہر چیلنج قبول کرنے کا حوصلہ لے کر آئی تھی۔ میں آنسو بہا کر یا فریدی بن کر ان زنجیروں کو نہیں کاٹ سکتی تھی۔ جو بھابھی نے مجھے پہنائی تھی۔ مجھے ان حالات سے نباہ کرنا تھا۔ میرے والدین کو خبر نہ تھی کہ بھابھی نے انہیں اندھیرے میں رکھا ہوگا۔ ان کے ترکش میں بڑے تیر تھے اور مجھے صرف حیرت اس بات پر تھی کہ انہوں نے مجھ سے کس بات کا انتقام لیا تھا۔ میں نے تو ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ کوئی دکھ نہیں دیا تھا۔

پھر دولہا میاں سے بڑی شان دار ملاقات ہوئی۔ وہ جب حجلہ عروسی میں تشریف لائے تو آتے ہی بغیر کسی تمہید کے بولے۔

''تو تم اپنے گھر والوں پر بوجھ تھیں۔ یا انہیں بہتر رشتہ نہیں مل رہا تھا یا یوں سمجھوں کہ وہ تم سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔''

میں سر جھکائے بیٹھی تھی اور ان کی باتوں پر حیران سی تھی۔

وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے۔

''اب تم اس گھر کی بہو بن کر آ ہی گئی ہو تو سنو میرے معصوم بچوں کی پرورش تعلیم تربیت اور میرے والدین کی خدمت کے فرائض میں کوتاہی نہیں کرنا ہوگی۔ مجھے شادی کا کوئی شوق نہ تھا کہ مجھے اپنی مرحومہ بیوی سے بے پناہ محبت سے اور اس کی وفات کے بعد کسی اور لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے والدین کی خواہش تھی جسے میں نے پورا کر دیا۔''

ایک ایک لفظ تیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے یوں مخاطب تھے جیسے اپنی کسی ملازمہ کو ہدایات دے رہے ہوں۔

''تمہیں میرے کسی فعل پر نکتہ چینی کا حق نہیں' میں تمہاری جانب سے یہ اطمینان چاہتا ہوں کہ تم اپنے فرائض نبھاؤ گی۔''

میں نے نگاہ اٹھا کر ان کی جانب دیکھا' وہ واقعی اپنی تصویر کی طرح تھے جو بھابھی نے مجھے دکھائی تھی۔ بارعب اور سنجیدہ لیکن ان کی باتوں سے میں کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی تھی۔

وہ سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے بوٹ کی ٹوہ سے مسلتے ہوئے بولے۔

''امید ہے کہ تم بہتر طور پر سوچو گی۔ اب سو جاؤ!'' اور وہ گھوم کر کمرے سے نکل گئے۔

میں نہ اپنی تقدیر پر آنسو بہا سکی' نہ ان سے کچھ کہہ سکی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا شب عروسی ایسی ہوتی ہے؟ آنسوؤں پر مجھے اختیار نہ رہا تو میں نے سر تکیے پر رکھ دیا۔ مجھے نہ تقدیر سے گلہ تھا نہ اپنوں سے شکایت تھی' جب یہی مقسوم تھا تو پھر کیا کرتی' کہاں جاتی راہیں تو کھو گئی تھیں۔ رسموں کی زنجیریں ہی توڑنا ہوتیں تو پھر اپنی بچپن کی محبت کو کھو کر انہیں پہنتی کیوں! جب یہی حقیقت تھی تو پھر اس سے انحراف کر کے رسوائی کے سوا کیا ملا۔ اب یہ بندھن تو نبھانا ہی تھا۔

میں نے اپنے فرائض سنبھال لیے تھے۔ کہ اس گھر کی برائے نام بہو تھی۔ میں تو آیا اور نوکرانی بن کر آئی تھی۔ میں نے حالات کو قبول کر لیا تھا۔ ان بچوں کا کیا قصور تھا کہ میں انہیں ہدف انتقام بناتی۔ ڈیڑھ برس کیسے گزرا۔ میں ہی جانتی ہوں' شوہر کی بے اعتنائی۔ ساس کی طنزیہ باتیں محلے کی خواتین کے زہریلے تبصرے سن سن کر بھی میں نے زبان نہ کھولی کہ اس سے کیا مل جاتا میں اپنے فرائض نبھاتی رہی۔

امی کے پیغام آئے لیکن میں ان سے ملنے نہ گئی۔ میں نے تو وہ رشتے ہی بھلا دیئے تھے۔ امی خود نہ آئیں نہ بھیا بھابھی آئے کیوں؟ میں جانتی تھی کہ بھابھی نے ان سے کیا کہا ہوگا۔ ادھر ساس نے مجھ پر کڑی پابندیاں لگا دی تھیں' میں محلے یا رشتے داروں میں سے کسی خاتون یا لڑکی سے علیحدگی میں کوئی بات نہ کر سکتی تھی۔ شوہر کا رویہ ایسا تھا جیسے گھر کی ملازمہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ عشاء کے بعد ہی گھر آتے اور صبح ناشتا کرنے کے بعد چلے جاتے۔ ان سے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ڈیڑھ سال میں ایک دو بار صرف اتنا کہا کہ میں نے ان باتوں پر عمل کر کے دکھا ہی دیا جو انہوں نے کہی تھیں۔

پھر جب فضلو بابا ابو کی بیماری کی خبر لے کر آئے تو میرے شوہر نے مجھ سے کہا۔ ''جاؤ' تیار ہو جاؤ! احسان فراموش نہ بنو' آخر انہوں نے تمہیں والدین کا پیار اور شفقت دی ہے۔''

ساس ساتھ جانے کے لیے مصر ہوئیں مگر میرے شوہر نے انہیں منع کر دیا۔

جب میں فضلو بابا کے ساتھ بیرونی دروازے کی جانب بڑھی تو ہمارے ساتھ ہی وہ باہر تک آئے اور مجھ سے کہا۔

''جلدی آنے کی سعی کرنا۔ بچوں کو کون سنبھالے گا کہ تم سے مانوس ہو گئے ہیں۔''

میں جب حویلی پہنچی تو بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے ان آنسوؤں کو بہنے دیا۔ فضلو بابا نے مجھ سے سارے راستے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ اتنا کہا تھا کہ گھر تو چلو۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ امی پر پڑی جو برآمدے میں کھڑی تھیں۔ میں بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گئی۔ انہوں نے مجھے بھینچ لیا اور پھر مجھے ساتھ لیے اندرونی حصے کی جانب بڑھیں۔ ہم بڑے کمرے میں آئے تو یہاں بھابھی' ابو اور بھیا بیٹھے تھے۔ ابو نے اٹھ کر مجھے پیار کیا۔ بھابھی اٹھنے لگیں تو بھیا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں حیران تھی کہ ماجرا کیا ہے؟ مجھے ابو کی بیماری کی اطلاع ملی تھی اور ابو بہ فضل تعالیٰ تندرست تھے۔ صرف ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

میں امی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تو بھیا نے سپاٹ

لہجے میں کہا۔

''تم نے ہمیں غیر سمجھا پروین کہ برسوں کے بندھن توڑ دیئے اور ہمیں کچھ نہ بتایا۔''

میں چپ تھی کہ ابو نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ہمیں افسوس ہے بیٹی کہ ہم نے دلہن پر بھروسا کیا اور ان لوگوں کے بارے میں کوئی تحقیق نہ کی۔ ہم نے تمہیں خوشیاں دینے کی بجائے دکھوں کے جہنم میں دھکیل دیا۔''

پھر بھیا بولے۔ ''تم نے ایک بار بھی آنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کیا تم نے ہمیں اس قابل نہ سمجھا کہ ہم اس ناانصافی کا کوئی حل سوچ سکتے اور اب ہم نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے کہ تم وہاں نہیں جاؤں گی اور.....''

''نہیں بھیا نہیں'' میں نے مضطرب انداز میں کہا۔

''کوئی فیصلہ نہ کیجئے..... میں اپنے گھر میں خوش ہوں' یہی بات انہوں نے چھپائی تھی کہ ان کے دو معصوم بچے ہیں۔ بھابھی بے قصور ہیں۔ انہیں بھی شاید دھوکے میں رکھا گیا تھا' ورنہ وہ میرا رشتہ وہاں طے نہ کراتیں۔''

''اور دولہا بھائی ٹی بی کے مریض ہیں۔ یہ بات بھی جھوٹ ہے کہ تم اس گھر کی بہو نہیں بلکہ آیا اور نوکرانی ہو'' بھیا نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ہمیں دکھ اس بات کا ہے کہ ہماری شریک زندگی نے تمہیں اس جہنم میں دھکیلتے ہوئے خوف خدا نہ کیا۔''

''آپ سے کس نے کہا بھیا کہ وہ ٹی بی کے مریض ہیں؟ میں بھابھی کو الزام نہیں دیتی؟''

''تو تم زندگی بھر سلگتے رہنے کا فیصلہ کر چکی ہو بیٹی اور ہمیں بھی یہ سزا بھگتنا ہوگی۔'' ابو نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

کمرے میں چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا۔ پھر بھابھی نے مجھ سے کہا۔

''مجھے معاف کر دو پروین! میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے ان باتوں کا علم نہ تھا۔ ورنہ تم سے میری کوئی دشمنی تو نہ تھی۔ تم اب وہاں نہیں جاؤ گی۔ میں خود ان سے.....''

''نہیں بھابھی!'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''آپ کچھ محسوس نہ کریں۔ یہی نوشتہ تقدیر ہے۔''

''پروین! تم اب کچھ نہیں کہو گی' یہ ہمارا حکم ہے۔'' ابو نے مجھے خاموش کر دیا۔

پھر ابو اور بھیا اٹھ کر چلے گئے۔ امی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بھابھی نے امی کو یقین دلایا کہ انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگیں کہ بھیا ان سے سخت خفا ہیں اور انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔ حالات ایسی صورت اختیار کر گئے تھے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے اس خاندان میں الجھنیں جنم لیں۔ بھابھی' امی کے حقیقی بھائی کی بیٹی تھیں اور یہ قریبی رشتہ تھا۔ بہن بھائی میں نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی اور خاندان کا سکون غارت ہو جاتا۔ میں نے امی سے التجا کی کہ وہ بھیا کو سمجھائیں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب میرا وہی گھر ہے اگر بات بڑھ گئی تو ایک جانب بھابھی کے والدین سے تعلق ختم ہو جائے گا دوسری جانب بھابھی کے والدین سے تعلق ختم ہو جائے گا' دوسری جانب میری سسرال سے جھگڑا ہو گا۔ میں نہیں چاہتی کہ ایسے حالات پیدا ہوں۔

امی نے مجھے بتایا کہ وہ کن مسائل میں الجھ گئی ہیں' ادھر خاندان میں کوئی لڑکی ایسی نہیں جس سے فرحان کی شادی ہو' وہ کسی ان پڑھ لڑکی سے شادی کرنے کو تیار نہیں۔ نسرین کے خطوط بتاتے ہیں کہ وہ بھی سکھی نہیں میرا دکھ بھی کم نہیں اور ان حالات میں مجھے بہت اہم فیصلے کرنا ہیں اور بڑی جرات و استقلال کے ساتھ حالات کی ان گتھیوں کو سلجھانا ہے۔ بہتر ہے کہ تم ابھی کوئی بات نہ کرو کہ تمہارے ابو اور بھیا سخت برہم ہیں۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ

پلٹ کر میکے کا رخ نہ کرنے کے سبب میرے والدین نے اپنے طور پر تمام معلومات حاصل کی تھیں' اس کے بعد ہی مجھے وہاں سے بلوایا تھا۔

پھر اچانک مجھے شوہر کی بیماری کی اطلاع ملی۔ انہیں لاہور لے آیا گیا تھا۔ میں بھیا کے ساتھ اسپتال پہنچی تو میرے سسر اور بچے باہر لان میں بیٹھے تھے۔ ساس کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ بھیا ڈاکٹر سے ملنے چلے گئے' تھوڑی دیر بعد انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ میرے شوہر کی حالت نازک ہے۔ انہیں پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے اور صرف ایک آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میری ساس کو گھر بھیج دیں۔ میں یہاں رہوں گی' بھیا خاموشی سے چلے گئے۔

تین دن رات آنکھوں میں کٹ گئے تھے۔ میری ساس بھی سخت بیمار تھیں۔ وہ واپس چلی گئیں اور میں ان کے کمرے میں رہ گئی۔

رات گئے انہیں ہوش آیا تو میں ان کے بستر کے قریب آئی۔ سسٹر باہر چلی گئی۔ انہوں نے میری جانب دیکھا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑی نحیف آواز میں بولے۔

''میں نادم ہوں پروین کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا لیکن میں بے قصور ہوں' میں شادی پر رضامند نہ تھا۔ یہ امی کی ضد تھی کہ وہ بچوں کے لیے ماں لائیں گی۔ میں نے یہ شرط رکھی تھی کہ میں کسی بے سہارا اور بیوہ عورت سے شادی کروں گا۔ تمہاری بھابھی نے جب رشتہ طے کیا تو مجھے کچھ نہ بتایا۔ امی بھی چپ رہیں۔''

وہ سانس لینے کے لیے رکے اور پھر ٹھہر کر بولے۔ ''تمہیں بیاہ کر لایا تو میری کزن نے مجھے حقیقت بتا دی اور مجھے دکھ ہوا۔ اسی بنا پر میں نے تم سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ تم مجھ سے نفرت کرو اور میں مناسب موقع دیکھ کر تم سے علیحدگی اختیار کر لوں' لیکن چند ہی دنوں میں بچے تم سے اتنے مانوس ہو گئے کہ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اور پھر تم نے بھی حالات سے غیر متوقع طور پر سمجھوتا کر لیا۔'' وہ چند لمحے خاموش رہے اور پھر گویا ہوئے۔

''شادی کے دو ہفتے بعد اچانک میں لاہور آیا اور ڈاکٹر فرحان سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے میرے گہرے مراسم تو نہ تھے لیکن ہم اکثر ملتے رہتے تھے۔ میرے سینے میں درد تھا۔ میں ان سے اسی لیے ملنے آیا تھا۔ انہوں نے جب میرا ایکسرے لیا تو مجھے کسی اسپیشلسٹ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ اور انہی کے ذریعے میں نے اپنا تفصیلی معائنہ کروایا اور یہ حقیقت سامنے آئی کہ مجھے ٹی بی ہے۔''

وہ چند لمحے پھر رک کر سانس درست کرنے لگے۔ میں نے انہیں باتیں کرنے سے منع کیا۔ مگر وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔

''میرا مرض لاعلاج نہ تھا۔ لیکن میں نے اپنے معالج سے تعاون نہ کیا اور پہلے سے زیادہ سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ دو ماہ قبل اکثر فرحان نے میرا پھر معائنہ کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ میں سینٹی ٹوریم میں داخل ہو جاؤں' مگر میں نے کوئی پروا نہ کی۔ اب میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ میں نے وصیت تیار کروا دی ہے۔ تم آزاد ہو پروین' لیکن.....'' ان پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد وہ رک رک کر بولے۔

''میری درخواست اور التجا ہے کہ ان بچوں کو خود سے جدا نہ کرنا کہ دادی انہیں پیار نہیں دے سکے گی اور میرے والد نے امی سے اس مقصد کے لیے شادی کی تھی کہ وہ ان کی دولت پر قابض ہو سکیں۔ جائیداد کے مالک بنیں لیکن میری امی نے تمام جائیداد میرے نام ہی کر دی تھی۔ میں اس وقت دس سال کا تھا۔ میرے چچا کو نگران مقرر کیا گیا تھا۔''

ان کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ وہ ستانے کے بعد پھر گویا ہوئے۔

''تم میری نصف جائیداد کی حق دار ہو اور نصف میں نے دونوں بچوں کے نام کر دی ہے۔ امی

کوکسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں نے کوئی شرط عائد نہیں کی۔ صرف تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ میرے بچے ......'' ان کا سانس اکھڑ گیا۔

وہ پے در پے خون تھوکنے لگے۔ میں تڑپ کر اٹھی' سسٹر کو آواز دی۔ اس نے آ کر دیکھا تو پلٹ کر ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔ وہ کافی خون تھوکنے کے بعد بے دم سے ہوگئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی سسٹر دو ڈاکٹروں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ان میں سے ایک فرحان تھے۔ انہوں نے مجھ سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''مسز فخر! آپ باہر تشریف لے جائیں۔''

میں دروازے کی جانب بڑھی۔ ایک لمحہ رکی تو میری چیخ نکل گئی۔ دوسرے ڈاکٹر نے آخری کلمات ادا کر کے میرے شوہر کا جسم سفید چادر سے ڈھاپ دیا تھا۔ فرحان سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔

شوہر کی وفات کے بعد ساس بھی چند روز بیمار رہ کر چل بسیں۔ ان پر دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

میرے چچا سسر نے مرحوم شوہر کی وصیت کے مطابق عمل کیا تھا اور میرے سسر خود ہی اپنے پرانے مکان میں چلے گئے تھے۔ چند ماہ میں وہیں رہی اور پھر چچا سسر کو زمین اور جائیداد کا نگران مقرر کر کے بچوں کے ہمراہ لاہور آ گئی۔ امی نے فضلو بابا کو میرے پاس ہی چھوڑ دیا تھا۔ فضلو بابا نے ہی لاہور میں سکونت کا انتظام کیا تھا۔ انہی دنوں نسرین باجی بھی واپس آئیں۔ امی مجھے بتا گئی تھیں کہ فرحان کے والد اس بات پر راضی ہوگئے ہیں کہ فرحان کی شادی ...ھ سے کردی جائے اور ابو بھی یہی چاہتے ہیں۔ ...ندان میں فرحان کے معیار کی کوئی لڑکی نہ مل سکی ...ی۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ لوگ ...ندانی اصولوں کا کتنا پرچار کرتے ہیں۔ پہلے میں ...ھ بھی نہ تھی۔ اب صاحب جائیداد تھی تو خاندانی ...ولوں میں لچک پیدا ہوگئی تھی۔ نسرین باجی کی آمد ... بعد میں ان سے ملنے گئی تو سبھی پریشان تھے۔

میں حیران تھی کہ بجیا کی آمد کی خوشی کی بجائے یہ پریشانی کیسی! اور پھر بھابھی ہی نے بتایا کہ نسرین بجیا کو طلاق ہوگئی ہے۔ شوہر سے نباہ نہیں ہوسکا تھا' اس نے طلاق نامہ ہاتھ میں دے کر وطن بھجوا دیا تھا۔ یہ خبر بجلی بن کر مجھ پر گری اور میں گم سم سی رہ گئی۔

اسی روز تائی امی اور تایا ابو ملنے آئے تو بڑے کمرے میں بزرگوں کا اجلاس ہوا جس میں بھابھی نسرین بجیا اور مجھے شریک نہیں کیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے تک اجلاس جاری رہا اور پھر تائی امی اور تایا ابو واپس چلے گئے تو امی نے بھابھی کو بلایا اور ان سے باتیں کیں۔ مجھے کچھ علم نہ تھا بھیا چپ چپ تھے۔

دوسرے روز جب میں واپس آ رہی تھی' امی نے نے اتنا کہا کہ فرحان کے والد نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے' میں نے کوئی سوال نہ کیا اور لاہور واپس آ گئی۔ تین دن نہیں گزرے تھے کہ نسرین بجیا گھبرائی ہوئی آئیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تایا ابو نے فرحان کے کے لیے انہیں منتخب کیا ہے۔ فرحان ہتھے سے اکھڑ گئے ہیں۔ تایا ابو نے انہیں عاق کرنے کی دھمکی دے دی ہے اور فرحان نے گھر چھوڑ دینے کی۔ امی سخت پریشان تھیں اور تایا ابو کو سمجھانے کی سعی کر رہی تھی۔

نسرین باجی نے مجھ سے کہا کہ میں فرحان سے شادی کر لوں۔ ایک تو عمروں میں فرق ہے۔ دوسرے وہ تمہیں چاہتے ہیں۔ گھر والوں نے خود ہی یہ فیصلہ کیا تھا اور اب اپنا فیصلہ بدل دیا تھا۔ انہوں نے مجھے تنبیہہ کی کہ میں کوئی بات نہ کروں۔ بھیا اور ابو تایا ابو کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنا فیصلہ نہ بدلیں۔

نسرین بجیا تو واپس چلی گئیں لیکن میں الجھن میں پڑ گئی۔ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے جو خود فیصلے کرتے اور خود ہی ان پر عمل نہ کرتے۔ ان کی روایات' رسمیں اور اصول ایسے ہی تھے۔ فرحان کے والد کو اب خیال آیا تھا کہ خاندان کی ایک لڑکی مطلقہ ہوگئی ہے اور اس کے معیار کا کوئی لڑکا بھی قریبی

رشتہ داروں میں نہیں تو بیٹے کو قربانی کا بکرا بنا دینا چاہیے۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا لیکن میرے لیے الجھن یہ تھی کہ فرحان ایک بار پھر اکڑ گئے تھے اور اسے میری رسوائی کا امکان تھا۔

بجیا کے شوہر نے انہیں اس بنا طلاق دے دی تھی کہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور وہ ان کے معیار کا ساتھ بھی نہیں دے سکی تھیں۔ معیار کے پیمانے میری سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔ میں نسرین بجیا کے دکھوں کو سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے لڑ گئی تھیں کہ میں دخل نہ دوں مگر مجھے ایک بار پھر فرحان سے ملنا تھا۔

میں نے فرحان کو اسپتال فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ رخصت پر ہیں۔ میں فضلو بابا کے ہمراہ گاؤں پہنچی۔ اپنی حویلی میں جانے کی بجائے میں فرحان کے گھر ہی گئی۔ وہاں امی ابو بھیجا۔ فرحان کے والدین اور فرحان خود موجود تھے۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو امی نے پوچھا ''خیریت تو ہے پروین'' وہ گھبرا گئی تھیں۔

میں ان سے مخاطب ہوئی۔ ''معذرت چاہتی ہوں امی کہ میں آج ڈاکٹر فرحان سے کچھ کہنے آئی ہوں۔'' پھر میں نے فرحان سے کہا۔

''ڈاکٹر فرحان! میں نے جب ایک بار آپ سے کہہ دیا تھا کہ مجھے آپ سے نفرت ہے تو پھر آپ کیوں مجھے رسوا کررہے ہیں۔ میں آج آپ سے آخری بار یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے رسوا کرنے کی سعی نہ کریں۔ میں ایک بیوہ ہوں اور دو معصوم بچوں کی خاطر میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آپ ایسی حرکت نہ کریں۔'' میں اتنا کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔ امی نے مجھے آواز بھی دی لیکن میں ٹھہری نہیں۔ فضلو بابا کے ساتھ واپس آگئی۔

میں نے سب کے چہروں پر حیرت کے آثار دیکھے تھے۔ میں بڑی جرات کے ساتھ ان کی موجودگی میں فرحان سے مخاطب ہوئی تھی اور مجھے خود بھی اپنی جرات پر حیرت تھی۔ میں نے کبھی ابو کے سامنے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔

اسی روز شام کو امی اور بھیا آگئے اور امی مجھ سخت ناراض ہوئیں کہ میں کیوں وہاں گئی؟ وہ لوگ تایا ابو کو سمجھانے اور کوئی فیصلہ کرنے جمع ہوئے تھے اور تایا ابو کو قائل کرنے کے لیے ابو نے آخر فیصلہ کرا تھا کہ وہ نسرین بجیا کے لیے فرحان کا رشتہ منظور کرے سے انکار کردیں گے لیکن میں نے بنا بنایا کھیل بگا دیا۔

بھیا نے مجھے بے تمیز اور بے لگام کے خطابا سے نوازا حالانکہ انہوں نے پہلے کبھی مجھے اس انداز میں کچھ نہیں کہا تھا۔

میں نے ان سے ایک ہی بات کہی کہ میں فرحان سے شادی نہیں کرسکتی۔ کہ یہ میری آن کا سوال ہے جب میں پہلے ان کے خاندان کی بہو نہیں بن سکتی تھی تو آج میرے خون نہیں بدل گیا۔ میں وہ پروین ہوں۔

امی میرے جواب پر گم صم رہ گئیں اور بھیا پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔ امی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں میں نے انہیں ٹھہرانا چاہا تو انہوں نے خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کچھ کہے بغیر بھیا کے پیچھے چلی گئیں۔ بھیا اپنی کار میں بیٹھے امی ہی کے منتظر تھے۔

پھر دو روز کے بعد نسرین بجیا اور بھابھی آئیں۔ بھابی نے بتایا کہ فرحان نے شادی کرنے ہی سے انکار کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں کسی لڑکی سے بھی بیاہ نہیں کرنا۔ ساری زندگی خدمت خلق میں گزار دیں گے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کسی مزار کی مجاور کرنے کا ارادہ ہے کیا؟''

''مذاق کی بات نہیں پروین۔ وہ سب سے تعلق توڑ آئے ہیں اور تایا ابو سخت غصے میں ہیں۔ ا اندیشہ یہ ہے کہیں باپ بیٹے میں ٹھن نہ جائے اور تا ابو کوئی.....''

''چھوڑیئے بھابھی۔ کچھ نہیں ہوگا۔ آ

مطمئن رہیں فرحان شادی کریں گے۔'' میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

''تم اب کیا کرو گی پروین' جب کہ تم نے سب کے سامنے اس سے کہہ دیا ہے کہ تمہیں اس سے نفرت ہے اور پھر پگلی تم اس سے کیسے نفرت کر سکتی ہو۔ یہ بچپن کا ساتھ ہے۔ میری مانو تو تم فرحان سے شادی کر لو تایا ابو دیکھتے رہ جائیں گے۔'' نسرین باجی نے کہا۔

میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں بھی اپنا فیصلہ بدل دوں گی تو یہ غلط ہے بجیا! میں فرحان کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دوں گی۔''

نسرین بجیا مصر تھیں کہ میں ضد چھوڑ دوں۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں فرحان کی ضد ختم کر دوں گی۔ نسرین بجیا نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ فرحان سے شادی نہیں کریں گی' خواہ انہیں بزرگوں کے سامنے انکار کرنا پڑے۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں گی۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ یہ بات نہ کہیں اور عمروں کے فرق کو بھلا دیں۔ میں ان کے لیے کوئی ایثار نہیں کر رہی۔ میں تو ان بچوں کا مستقبل سنوارنا چاہتی ہوں کہ ان کے مرحوم باپ نے مجھ سے یہ التجا کی تھی۔ بھابھی نے کوئی بات نہ کی۔ نسرین جی بھی مجھے قائل نہ کر سکیں۔ بھابھی کے رویے پر مجھے حیرت تھی۔

وہ رات کو بشریٰ خالہ کے ہاں رہیں اور دوسرے روز واپس چلی گئیں۔

میں نے فون اٹھایا۔ اسپتال کے نمبر ڈائل کیے ایک لمحے کے لیے میں خود گھبرا گئی کہ اگر فرحان نے بات کرنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟ مگر میں نے بات کر کے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ فرحان فون آئے تو میں نے انہیں گھر آنے کو کہا۔

وہ بولے ''اب کیا رہ گیا ہے بیگم فخر!''

ان کے طنزیہ انداز کو میں نے محسوس نہ کرتے ہوئے ان سے کہا کہ ''مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ آپ چند لمحوں کے لیے تشریف لے آئیں۔''

انہوں نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا تو میں مایوس ہوگئی۔ مگر مجھے ان کی خاموشی نے یقین دلا دیا تھا کہ وہ ضرور آئیں گے اور دوسرے روز دوپہر سے قبل وہ آ گئے۔

وہ جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو میں احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر سرد لہجے میں بولے۔

''اب کیا کہنا ہے بیگم فخر؟''

میں خاموش نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ بڑے ہی دکھی لہجے میں بولے۔ ''جب تمہیں مجھ سے نفرت ہے تو پھر کس لیے بلایا ہے۔؟''

ان کے لہجے کی کسک آواز کے سوز اور دل کے انداز نے مجھے تڑپا دیا۔ لیکن میں پروین تھی۔ وہ پروین جس نے خود ہی اپنے پر کاٹ دیئے تھے پرواز کی تمنا کھو دی تھی۔ محبت کو قربان کر دیا تھا۔ جس میں پربتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ تھا۔ اس کا چرچا نہیں کیا تھا۔ میں مٹ گئی تھی لیکن محبت نہیں مٹی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تشریف تو رکھیے ڈاکٹر فرحان!'' وہ بیٹھ گئے تو میں نے بھی ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''آپ کو پروین سے محبت ہے فرحان؟''

''یہ تم پوچھ رہی ہو!'' وہ حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں آپ سے رسوائی کی نہیں ایثار کی خواہاں ہوں۔ کیا آپ اپنی چاہت کے لیے کچھ نثار کر سکتے ہیں؟''

''میں نے اپنی جائیداد سے بھی محروم ہونا گوارا کر لیا ہے اور.....''

''بس ڈاکٹر فرحان!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہیں ڈاکٹر' یہ قربانی نہیں۔ بغاوت ہے' رسوائی ہے' لوگ تو بہت کچھ نثار کر دیتے ہیں۔ میں تو

آپ سے کچھ اور چاہتی ہوں۔''

انہوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں شاید بچوں کے مستقبل کا اندیشہ ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ.....''

''نہیں ڈاکٹر فرحان! مجھے ان کے مستقبل کی ضمانت نہیں۔ کچھ اور چاہیے' جو مانگوں گی دیں گے آپ؟''

''کیا چاہیے تمہیں؟'' وہ جیسے ہار مان کر بولے۔

''آپ کی زندگی!''

''میری زندگی'' وہ حیران سے ہوگئے۔

''ہاں ڈاکٹر آپ مسیحا ہیں' آپ سے مجھے یہی وعدہ لینا ہے کہ آپ کسی کی زندگی بچانے کی سعی کریں گے۔''

''میرا وعدہ ہے پروین کہ میں اپنے پیشے اور وقار کے بھرم کو قائم رکھوں گا'' وہ پراعتماد لہجے میں بولے۔

''تو پھر تایا ابو کی زندگی بچا لیجئے ورنہ وہ اپنی ضد پر جان دے دیں گے۔ آپ نسرین باجی سے شادی کرلیں۔''

میں نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

وہ گم صم سے رہ گئے۔ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ میں ان سے یہ کہوں گی۔ وہ تو کچھ اور سمجھ کر آئے تھے کہ ممکن ہے میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہو' ورنہ ان سے نفرت کا اظہار کرنے کے بعد رابطہ قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ چند لمحے بڑے طویل تھے' کمرے میں سکوت چھا گیا تھا۔

اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور منہ پھیر کر بولے۔

''صرف ایک بات بتادو پروین! تمہیں مجھ سے نفرت تو نہیں۔''

''فرحان!'' میں تڑپ کر بولی۔ ''مجھے کسی سے نفرت نہیں۔ آپ میرا مان رکھ لیجئے۔ میں پھر کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔''

''آپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اپنا وعدہ پورا کیجئے میں..... میں'' میری آواز بیٹھ گئی۔

وہ کچھ کہے بغیر کمرے سے چلے گئے۔

میں نے صوفے کی پشت سے سر ٹیک دیا۔ اسی لمحے باہر اسکول کی بس کا ہارن بجا اور پھر بچے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور میں نے آنسو پونچھ کر انہیں آغوش میں سمیٹ لیا۔

چند روز بعد ہی فرحان اور نسرین بجیا کا نکاح بڑی سادگی کے ساتھ پڑھا دیا گیا۔ صرف چند قریبی رشتے دار مدعو تھے میں خود اس شادی میں شرکت نہ کرسکی۔ مجھے امی کا پیغام مل گیا تھا کہ فرحان نے یہ شرط رکھی ہے کہ پروین سے اب ہمارا کوئی رشتہ نہیں اور ہمارے خاندان کا کوئی فرد اس سے نہیں ملے گا۔

میں نے لاہور سے باہر چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ بچوں کی تعلیم کی بنا پر میں فی الحال انہیں ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی۔ میں نے گھر کا تمام انتظام فضلو بابا کے سپرد کردیا تھا اور صرف انہی کو بتایا تھا کہ کہاں جارہی ہوں۔ بچوں سے صرف اتنی بات کہی تھی کہ میں چند دنوں کے لیے جارہی ہوں' جلد لوٹ آؤں گی۔ گھر کی پرانی ملازمہ میری ساس کی خدمت بھی کرتی رہی تھی' اس سے میں نے کہا کہ وہ بچوں کا خاص خیال رکھے۔

میں نے اپنی منزل کا پتا کسی کو نہیں بتایا تھا۔ میں اپنے چچا سسر کے ہاں آگئی تھی۔ مجھے یہاں کام بھی سرانجام دینا تھا۔ اس گاؤں میں جہاں میرے مرحوم شوہر کی زمین تھی ایک اسکول کی بنیاد رکھنا تھی کہ اپنی وفات سے قبل وہ اسکول کا نقشہ پاس کروا چکے تھے صرف تعمیر کا کام باقی تھا۔

میں ان سے کچھ عرصے دور رہنا چاہتی تھی جن سے میرا ہر بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ میری مصروفیت طول پکڑ گئی۔

مجھے یہاں آئے چھ ماہ گزر گئے تھے' چچا سسر بچوں کی خیریت دریافت کرآتے تھے اور فضلو بابا کو

اخراجات کے لیے رقم بھی دے نہیں دیتے تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میرے بارے میں انہیں نہ بتائیں کہ اس طرح میں اپنا کام مکمل نہ کرسکوں گی۔ وہ بھی میرے دکھوں سے آگاہ تھے۔ انہوں نے کسی کو نہ بتایا۔ میں نے اس گھر کو بھی سنوارا تھا' جس میں کبھی میری شوہر کے والدین رہتے تھے اور وہ ایک عرصے سے غیر آباد تھے۔ ایک روز میں اسکول سے واپس آئی تو چچی نے مجھے ایک خط دیا میں حیران تھی یہ خط کہاں سے آیا ہے؟

میں نے خط کھولا تو میری نگاہیں تحریر پر جم گئیں مخاطب میں ہی تھی۔ یہ خط فرحان لکھا تھا۔

''پیراہن زیست میں کتنے ہی پیوند لگا گئی ہو۔ احساس کا کواڑ تمہارے ہی ہاتھ میں ہے' جبھی تو پشت پر لکیریں ہیں۔ درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں تو تڑپ بھی نہیں سکتے۔ ذہن الجھ جاتا ہے' حالات کے تقاضے سوال کرتے ہیں تو گنگ ہو جاتا ہوں۔ میرے ضمیر پر ایک بوجھ سا ہے۔ میری خطا یہی تھی کہ میں نے رسموں کی زنجیریں توڑنے کی سعی کی تھی۔ تم نے مجھے دہکتی آگ میں جھونک دیا تو کیا چاہت کا یہ تقاضا نہ تھا کہ میں تم سے التجا کرتا کہ اس آگ سے دور ہٹ جاؤ' اپنے چہرے کو چھپا لو کہ اس آگ کی تپش سے جھلس نہ جائے تم مجھے اس الاؤ میں جلتا ہوا چھوڑ کر کہیں بھی چلی جاتیں تو مجھے گلہ نہ تھا۔ مگر تم تو اپنا فرض بھی پیچھے چھوڑ کر کہیں بھی چلی گئیں۔ میرے دامن میں تو تمہاری ہی خیرات ہے پھر یہ فرار کیا معنی جذبے یوں تو نہیں مرجاتے' کیا ایثار کی منازل اتنی کٹھن تھیں کہ تم جذبوں کی تپش محرومی کے احساس اور چاہت کے زخموں سے گھبرا گئیں؟ لوگ یوں تو نہیں جیتے کہ حالات کو شکست دے دیں مگر جراتیں کھودیں۔ مجھے تمہاری جستجو نہیں کہ میں نے تو ان دریچوں کو بند کردیا ہے جن سے تمہاری کوئی بھی جھلک دکھائی دے سکتی ہے۔ ضرورت تو ان معصوم بچوں کو ہے جنہوں نے تمہاری کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ مگر تم نے انہیں ممتا بھری آغوش دی تھی۔ جو تمہارا فرض تھا ایسا فرض جس پر تم نے بچپن کی محبت اپنوں کی چاہت' جذباتیت کے بشری تقاضے اور زندگی کی خوشیاں نثار کردیں۔ پھر تم انہیں چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟ شاید تم گھبرا گئی تھیں یا تمہیں خوف تھا کہ تمہارے اندر کی عورت تمہیں احساس کے شعلوں میں نہ دھکیل دے تمہارے کردار کے آئینے کو پاش پاش نہ کردے' تمہیں فرض کا بھی احساس نہ رہا اور تم نے وہ زنجیریں بھی کاٹ دیں جنہیں کبھی فرض سمجھ کر تم نے خود ہی پہنا تھا۔ اس طرح تو کبھی جی لیتے ہیں۔ مرحوم فخر بھی اسی انداز سے جیے تھے۔ یہ زندگی نہیں فرار ہے۔ یہ فرض نہیں ڈھونگ ہے سامنے آکر جرات کے ساتھ جیو کہ تم میں چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ ہے۔ لوٹ آؤ کہ دو معصوم بچے تمہاری راہوں پر نگاہیں بچھائے تمہارے منتظر ہیں۔ وہ اس یقین اور اس میں بندھے ہیں جو تم انہیں دے گئی ہو۔ انہیں تو فریب نہ دو جرات کے ساتھ کہہ دو کہ تم یہ فرض اور بندھن نہیں نبھا سکتیں۔ تمہاری وہ جرات ایثار اور حوصلہ صرف دکھاوا تھا' اپنے چہرے سے یہ نقاب نوچ دو تاکہ تمہارا یہ چہرہ وہ بچے بھی دیکھ لیں جو ممتا بھری آغوش کے منتظر ہیں۔ آئینہ سامنے رکھ کر بتاؤ۔ کہ تمہیں کسی نے ممتا بھری آغوش میں دی تھی؟ بہتر تعلیم وتربیت اور حوصلہ نہیں بخشا تھا۔ جس حوصلے اور جرات کے ساتھ تم نے حالات کو شکست دی اور پھر جیتی بازی ہار گئیں۔ خود ہار نے والے اتنے بے حوصلہ نہیں ہوا کرتے مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ میں نے تمہارا بھرم رکھا تو تم بھی میرا بھرم رکھو' میری طرح جیو۔ لوٹ آؤ کہ چمن زار حیات کے یہ پھول کملا رہے ہیں۔ اداس ہیں۔ میرا نہیں تو اپنا بھرم رکھ لو کہ آنٹی کہتی ہیں کہ تم پیکر جرات واستقلال ہو اور یہ ایک ماں کا یقین ہے۔''

خط پڑھ کر میں تڑپ اٹھی۔ فرحان نے کس انداز میں مجھے جھنجھوڑا تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ مجھے اپنا فرض یاد تھا۔ میں تو بس کچھ عرصے دور رہنا چاہتی تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ یہ رشتے اتنے

نازک نہیں تھے کہ ٹوٹ جاتے۔ میں نے چچا سے کہہ دیا کہ میں واپس جارہی ہو جو کام رہ گیا ہے وہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچادیں۔

میں واپس اپنے گھر آئی تو بچے مجھ سے لپٹ کر رو دیئے۔ انہوں نے ان گنت سوال کیے' میں انہیں کیا بتاتی میں بھی انسان تھی لیکن شکست وریخت کا تماشا نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

فضلو بابا بیمار تھے۔ انہی سے فرحان نے میرا پتا لیا تھا۔ میں نے ان کی مزاج پرسی کو تو مسکراتے ہوئے بولے۔ ''وقت پر آگئی ہو بیٹی۔ سانس کا رشتہ نہ جانے کب ٹوٹ جائے۔''

میں نے انہیں تسلی دی۔ میری آمد کی خبر انہیں تو مل گئی ہوگی جن کی میں نعم البدل تھی مگر ان میں سے کوئی نہیں آیا تھا میرے بچے۔ پپو نے بتایا کہ انکل اور آنٹی اکثر آتے رہتے ہیں' وہ انہیں بھی اپنے ساتھ سیر وتفریح کے لیے بھی لے جاتے تھے میں سمجھتی کہ شاید بھابھی اور بھیا آتے ہوں گے۔ لیکن جب پپو نے کہا کہ انکل ہی بابا کا علاج کرنے آتے ہیں تو میں حیران رہ گئی مجھے کیا خبر تھی کہ کانٹا میں ہی تھی۔ مجھ سے تو سب کو ملنے سے منع کردیا تھا لیکن میری عدم موجودگی میں ان بچوں کو میری کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

شام کا وقت تھا جب فضلو بابا کی حالت خراب ہوگئی میں پریشان تھی کہ پپو بھاگ کر اندر گیا۔ ریسیور اٹھایا اور پھر فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ میں فضلو بابا کے کمرے سے باہر کھڑی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے کسے فون کیا ہوگا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا کمرے میں آئی تو اس نے بتایا کہ انکل تو نہیں ملے' ان کے دوست آرہے ہیں۔ انکل امجد بھی بہت اچھے ہیں۔

ڈاکٹر امجد نے بابا کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھ کر دیتے ہوئے بولے کہ بہتر ہے۔ انہیں اسپتال میں داخل کروادیں مگر بابا نے انکار کردیا۔ ڈاکٹر امجد کے جانے کے بعد بابا نے کہا کہ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ جاؤں۔ پپو اور منی اندر چلے گئے تھے۔ میں ٹھہر گئی تھی۔

بابا چند لمحے چھت پر نگاہیں جمائے کچھ سوچتے رہے اور پھر انہوں نے کہا۔

''بیٹی! تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہارے والدین کے بارے میں جانتا ہوں تو میں نے کہا تھا کہ تمہارے والدین یہی ہیں میں نے غلط بات نہیں کہی تھی۔ شفو میرے خاندان کی بیٹی تھی۔ صاحب کو اس سے محبت تھی لیکن خاندانی اصول اور رسمیں سدراہ تھیں۔ صاحب ان دونوں دو بچوں کے باپ تھے' وہ شفو سے دوسری شادی کے خواہاں تھے لیکن اپنے والد کے سامنے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔''

بابا کہہ رہے تھے اور میں خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی اب کس راز سے پردہ اٹھنے والا ہے؟

بابا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''صاحب نے گھر والوں سے چوری چھپے شفو سے شادی کرلی۔ گو شفو کے والدین راضی نہ تھے لیکن میں نے انہیں منالیا تھا۔ پھر اس زمانے میں ایک تھانیدار کی بڑی حیثیت تھی اور صاحب تو زمیندار گھرانے سے بھی تعلق رکھتے تھے' خیال تھا کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے والدین پر ظاہر کردیں گے لیکن ایسا ممکن نہ ہوا۔ تمہاری ولادت کی خبر ملی تو صاحب شفو کے گھر پہنچے تین دن رہے اور لوٹ آئے۔ حالات ایسے تھے کہ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔ صاحب نے شفو کو ساتھ لانا چاہا مگر اس کے والدین رضامند نہ ہوئے۔''

مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ میں کون ہوں۔ بابا نے کتنے برسوں اس راز کو اپنے سینے میں دفن رکھا۔ میں بت بنی بیٹھی ہوئی تھی۔

بابا نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

''پھر فسادات زور پکڑ گئے۔ ان دنوں صاحب نے بیگم صاحب کو بھی اپنے میکے چلے جانے کو کہا تھا۔ بچے تو پہلے بھیج دیئے تھے مگر بیگم صاحبہ رضامند نہ ہوئیں۔ پھر صاحب بھی چپ ہوگئے۔ ایک روز

اچانک خبر آئی کہ شفو کے گاؤں پر حملہ ہوگیا ہے۔ صاحب مجھے ساتھ لے کر اس گاؤں کی جانب روانہ ہوگئے میرا گاؤں تو پہلے ہی جل گیا تھا اس طرح ہمیں تم ہی ملیں۔ تم اپنے مرحوم ماموں کے بازوؤں میں تھیں، صاحب نے مجھے سختی سے منع کردیا کہ میں اس بات کو راز رکھوں اور کسی کو کچھ نہ بتاؤں'' بابا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

میں ان کے چہرے پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔

''اپنے باپ کی مجبوریوں کی بنا پر انہیں معاف کردینا بیٹی! وہ تمہیں اپنی بیٹی اپنا خون بتا کر بیگم صاحبہ کی آغوش میں نہیں دے سکتے تھے۔ پھر وہ لاکھ کہتے کوئی یقین نہ کرتا۔ بڑے صاحب اسی روز آئے تھے جس روز ہم تمہیں لے کر آئے۔ تمہاری باپ نے تمہاری پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہ کی، بیگم صاحبہ نے بھی تمہیں اعلیٰ تربیت دی اور میں اس گھر کی چوکیداری کے فرائض اس لیے انجام دیتا رہا کہ تمہارے قریب رہوں۔ تم میرے خاندان کی آخری نشانی.....'' بابا کی آواز بیٹھ گئی اور وہ چپ ہوگئے۔

''بابا.....! آپ..... آپ نے مجھے یہ بات آج..... آج کیوں بتائی بابا پہلے..... پہلے کیوں نہیں بتائی.....!'' میں ان سے لپٹ کر بلک پڑی۔ میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''اس خاندان کے بزرگ بزدل ہیں جو اپنی بیٹی کو بیٹی نہیں کہہ سکتے لیکن رسمیں نبھانے کے لیے شہر جاتے ہیں۔''

معاً قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا فرحان، ڈاکٹر امجد کے ہمراہ دروازے میں کھڑے تھے۔ میں آنچل میں منہ چھپائے اندر چلی گئی۔

بابا کی حالت بگڑتی گئی۔ امی اور ابو بھی آگئے تھے۔ انہیں فرحان ہی نے اطلاع دی تھی۔ نسرین بجیا روزانہ آجاتی تھیں۔ بابا پندرہ روزہ بیمار رہ کر چل بسے۔ میرا برا حال تھا۔ بابا اگر کچھ نہ بھی بتاتے تو مجھے ان کی موت کا اتنا ہی دکھ ہوتا کہ انہوں نے مجھے گودوں کھلایا تھا۔

بابا کی وفات پر میں نے جی کھول کر آنسو بہائے تھے۔ ابو اور امی مجھے تسلیاں دے رہے تھے۔ بھیا سر جھکائے بیٹھے تھے اور مجھے کہیں دور سے بابا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ سیف الملوک کا یہ شعر اکثر گایا کرتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ قریب ہی کھڑے وہی شعر گا رہے ہوں۔

ڈک لے اکھیوں بہندے اتھرو تے کج نئیں
بندا رویاں
ایس حیاتی دے دکھ ڈاہڈے تے مکدے نئیں
بن مویاں

☆

ہنسیے

عقلمندی

حمید نے ایک مرتبہ بتایا کہ اس نے ایک محفل میں انچاس اُبلے ہوئے انڈے کھا کر ایک ریکارڈ قائم کردیا تھا

''تو ایک انڈا اور کھا لیتے تاکہ پورے پچاس ہی ہوجاتے۔'' سلیم نے مشورہ دیا۔

''کیوں کھا لیتا ایک اور انڈا؟'' حمید ذرا خفگی سے بولا۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں ایک انڈے کی خاطر اپنے آپ کو وہاں پبلسٹی ہو کر لیتا۔؟''

☆

اخبار پڑھ کر

ناشتے کی میز پر اخبار دیکھتے ہوئے رمضان نے بیگم کو بتایا۔

''پرسوں رات والی محفل موسیقی کی رپورٹ اخبار میں پڑھ کر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ کتنی کامیاب محفل تھی۔''

''جی ہاں۔ مجھے بھی اخبار پڑھ کر ہی پتا چلا ہے کہ ہم لوگ اس سے کتنے لطف اندوز ہوئے تھے۔'' رمضان کی بیگم نے جواب دیا۔

انتظار

کبیر احمد صدیقی

صبا کی پلکیں ایک انجانے سے بوجھ سے بند ہو گئیں پھر اس کی بند آنکھوں کے اندر طاہر حسین کا لمبا چوڑا اور صحت مند جسم آکر کھڑا' سُرخ و سفید رنگ' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ ...لیکن تھوڑی دیر بعد یہ خوب صورت صحت مند جسم خود بخود اس کی نگاہوں میں دھندلا پڑتا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک فالج زدہ اپاہج جسم میں تبدیل ہو گیا' دُبلے پتلے گال' پچکی ہوئی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں.....!!

اس شمارے کی ایک حساس و جذباتی کہانی

آج جمال کا خط دیکھ کر میڈم صبا کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ صرف ایک سطر کا انتہائی مختصر سا خط تھا۔ جس جمال نے صرف اتنا ہی لکھا تھا۔ ''چوبیس تاریخ کو تیز گام سے پہنچ رہا ہوں''۔

اور آج چوبیس تاریخ تھی یعنی آج ہی کے دن جمال آرہا تھا۔ کیا واقعی وہ آرہا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میڈم صبا نے دل ہی دل میں دیکھ کر محسوس کرنے کی کوشش کی آج کتنے سالوں بعد جمال کو ممی کے پاس آنے اور اس سے ملنے کا خیال آیا تھا۔ مگر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میڈم صبا ایک بار پھر سوالوں میں اُلجھتی چلی گئی۔ شاید یونہی ملنے آرہا ہو؟ مگر نہیں..... سوچتے سوچتے انکار میں اپنا سر ہلایا۔ وہ یونہی نہیں آرہا ہوگا، کوئی ہی بات ہوگی لیکن کیا؟ ابھی وہ آگے سوچ نہیں نہ پائی کہ اس کی سیکریٹری مس نوشابہ اس کے کیبن میں داخل ہوئی۔ نوشابہ نے دیکھا' میڈم صبا کیبن میں بالکل تنہا تھی لیکن کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ اس طرح اپنے سر کو جنبش دے رہی تھی' جیسے دھیرے دھیرے کسی سے باتیں کر رہی ہو' نوشابہ ایک لمحے تک دروازے پر رُک کر ہی میڈم صبا کو دیکھتی رہی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے اندر آجانے کے باوجود بھی میڈم صبا اس کی آمد سے بے خبر ہے، آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ جب بھی میڈم صبا نے اسے اپنے کیبن میں بلایا تھا۔ تو نوشابہ نے اسے اپنا منتظر ہی پایا تھا۔

آج دن بھر کے کام کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میڈم صبا نے اس سے انٹر کام پر بات کی تھی اور پھر اسے اپنے کیبن میں آنے کے لیے کہا تھا۔ مس نوشابہ کا خیال تھا کہ میڈم صبا اس کی راہ دیکھ رہی ہوگی لیکن اس وقت میڈم صبا اس کی آمد سے بے خبر کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دے رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک خط دبا ہوا تھا۔ نوشابہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی میڈم

صبا کی بڑی سی میز کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ نوشابہ کو اپنی ماں پر بڑا فخر تھا' اور وہ اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی، کیوں کہ نوشابہ کو معلوم تھا کہ میڈم تن تنہا ہی اپنی محبت اور لگن سے صبا ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو اس کی بہترین کارکردگی پر مختلف ایوارڈوں سے نواز کر اس ادارے کی خدمت کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ ٹی وی کمرشل کے ساتھ ساتھ میڈم صبا نے اخباری اشتہاروں کی دنیا میں بھی اپنی ایجنسی کو ایک نئے انداز سے متعارف کرایا تھا۔ اور اب تو اس ایجنسی کو اتنا بزنس ملنے لگا تھا کہ میڈم صبا کو ہر کام کے لیے حامی بھرنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ ہر کام میں میڈم صبا کی دلچسپی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اپنے کاروبار کے علاوہ دنیا کی کسی اور چیز سے اسے دلچسپی ہی نہ ہو اور ہر وقت اپنے کام کے بارے میں سوچنا ہی کا کام رہ گیا ہو۔ ایجنسی کے تمام اسٹاف سے اس کا سلوک دوستانہ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی نے بھی اسے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور اپنے اسٹاف کے تعاون سے ایجنسی روز بہ روز ترقی کی منزلیں طے کرتی جارہی تھی۔

''کوئی پریشانی ہے میڈم؟'' اچانک مس نوشابہ کی طرف دیکھا اور حسب عادت مسکرادی۔

''مگر کوئی بات ضرور ہے میڈم''۔ مس نوشابہ نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کس کا لیٹر ہے آپ کے ہاتھ میں؟''

صبا نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے خط کی طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔ اسے معلوم تھا کہ مس نوشابہ کی نگاہیں بڑی تیز ہیں' اس سے کسی چیز کا چھپا رہنا بہت مشکل ہے لہٰذا اس نے کہہ دیا۔ ''جمال کا خط ہے''۔

''جمال؟'' نوشابہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون جمال؟''

میڈم صبا نے ایک لمحے کے لیے نوشابہ کی طرف دیکھا اور پھر یکایک اسے نوشابہ کی صورت دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پلکیں بوجھل سی ہونے لگی ہیں لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو پوری طرح کھول کر بولی۔ ''میرا بیٹا ہے...''

یہ سن کر مس نوشابہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی' میڈم صبا کا اپنا کوئی خاندان بھی ہوسکتا ہے' یہ بات

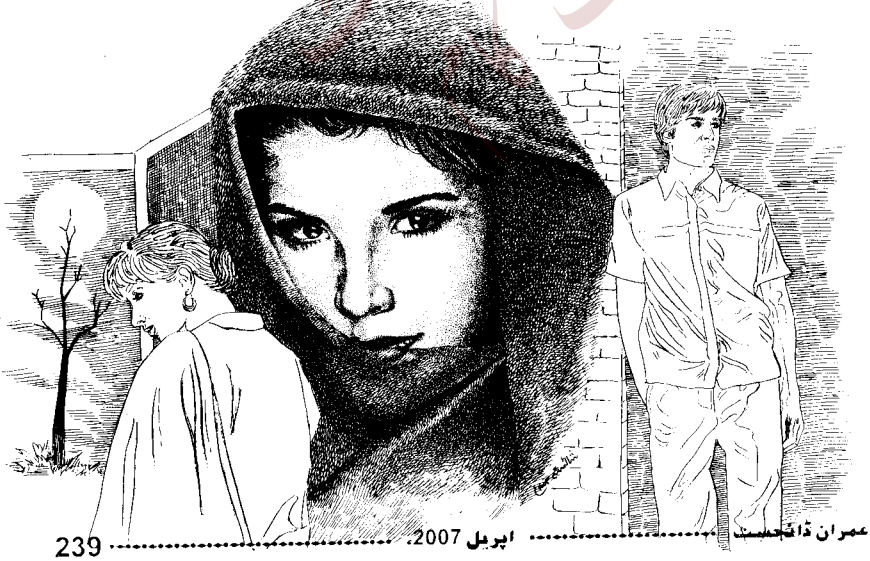

آج پہلی بار ہی معلوم ہوئی تھی۔ کیوں کہ میڈم صبا کی نجی زندگی کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ نہیں تھا۔ سب کو یہی علم تھا کہ کلفٹن کے ایک شاندار فلیٹ میں تنہا ہی رہتی ہے اس کے سوا کسی کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔

یکا یک میڈم صبا نے خط کو میز پر رکھ دیا اور نوشابہ سے کام کے سلسلے میں دن بھر کی تفصیلات پوچھنے لگی۔ جوں جوں مس نوشابہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرتی جاتی تھی۔ توں توں میڈم صبا کے چہرے کے خدوخال بدلتے جارہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے اپنے بیٹے کا خط دیکھ کر جو جذبات اُس کے چہرے پر اُبھر آئے تھے اب ان کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا' لنچ کے بعد دو میٹنگیں تھیں اور یہ دونوں میٹنگ ہی بے حد اہم ہیں۔ اس نے سوچا ان دو میٹنگوں کے ختم ہوتے ہوتے تو چار بج جائیں گے یا کچھ اور دیر بھی ہوسکتی ہے لہٰذا کیوں نہ ایک میٹنگ کو کینسل کر دیا جائے... دراصل اس نے ریلوے اسٹیشن جا کر جمال کو لانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اس لیے اس نے اپنی سیکٹری نوشابہ سے کہا۔ ''کینسل دی سیکنڈ میٹنگ مس نوشابہ''۔

''کیوں میڈم؟'' نوشابہ کو حیرت سی محسوس ہوئی۔

''میں جانتی ہوں وہ میٹنگ بہت اہم ہے''۔ میڈم صبا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے پارٹی ناراض بھی ہوسکتی ہے لیکن میں کیا کروں؟ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے''۔ مس نوشابہ نے ایک لمحے کے لیے میڈم صبا کی طرف دیکھا اور پھر اپنی ڈائری پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''آج آپ کو ایک ڈنر میں بھی جانا ہے''

''کیسا ڈنر؟'' میڈم صبا نے تفصیل پوچھی۔

ساری بات بتانے کے بعد مس نوشابہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اسے بھی کینسل...''

''نہیں ...نہیں...'' میڈم صبا نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔ ''اسے کینسل کرنے کی ضرورت نہیں ہے''۔

''اوکے'' نوشابہ ڈائری بند کر کے کھڑی ہوگئی اور میڈم صبا کے کیبن سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میڈم صبا ایک بار پھر کیبن میں تنہا رہ گئی تھی اور ایک بار پھر وہ اپنی ذات میں الجھتی چلی گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر کوئی چیز اوپر اُٹھی جارہی ہے' بالکل کسی لفٹ کی طرح۔ نیچے اوپر تک... جمال نے اپنے آنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔ اس لیے وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ آخر یہاں آ کیوں رہا ہے؟ کیوں کہ اتنے برسوں میں یہاں آنے کی بات تو درکنار اس نے تو کبھی ایک خط تک لکھا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کی خیر خیریت کی اگر کوئی خبر اسے ملتی بھی تھی تو وہ اسے خود جمال یا طاہر سے نہیں ملتی تھی بلکہ اِدھر اُدھر سے کچھ سنی سنائی خبریں اسے مل جاتی تھیں۔ طاہر کے خط وغیرہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جمال بھی اپنے باپ کی طرح صبا سے دور جا بیٹھا تھا' شروع شروع میں تو میڈم صبا کو اس دہرے صدمے نے تقریباً نڈھال کر کے رکھ دیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس پر دھول سی جم گئی تھی۔ طاہر اور میڈم صبا کو ایک دوسرے سے الگ ہوئے اب پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس وقت جمال صرف چھ سال کا تھا۔ طاہر تو باقاعدہ قانونی طور پر علیحدگی چاہتا تھا لیکن صبا اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''ہم نے چونکہ اپنی پسند اور شادی کی تھی اس لیے علیحدہ بھی ہمیں اپنی مرضی سے ہونا ہوگا''۔ اس کے بعد اس نے آگے کہا تھا۔ ''میں کبھی کسی سے کوئی فریاد نہیں کروں گی۔ میں ایسی عورت نہیں ہوں جو مجبور اور بے بس ہو جاتی ہے، مجھے تم سے کسی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے اور ہاں۔ تمھیں اگر دوسری شادی کرنی ہو تو اس کے لیے بھی تم آزاد ہو''۔

اس فیصلے کے بعد وہ پنڈی سے کراچی آگئی

تھی۔ کراچی میں اس کے والد کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا۔ اور اب چونکہ وہ اکیلے ہی تھے۔ اس لیے وہ ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ پھر دھیرے دھیرے اُس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔ شروع شروع میں جمال ہر برس اس سے ملنے کے لیے آتا رہا لیکن اس وقت بھی کبھی صبا نے اسے زبردستی اپنے پاس روکنے کی کوشش نہیں کی تھی جب تک اس کی مرضی ہوتی تھی' وہ رہتا تھا۔ اور پھر واپس چلا جاتا تھا لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا' اس کے آنے جانے کا سلسلہ کم ہوتا چلا گیا۔ اور اب تو پچھلے دس برس وہ اپنی ماں سے ملنے بھی نہیں آیا تھا شاید اپنے امیر باپ کے گھر میں اسے دنیا بھر کی نعمتیں حاصل تھیں۔

لنچ کے بعد شروع ہونے والی میٹنگ سوا تین بجے ختم ہوئی تھی' سب کو رخصت کرنے کے بعد وہ اپنے کیبن سے باہر نکلی اور نوشابہ سے کہا۔ ''میں جمال کو لینے اسٹیشن جا رہی ہوں اور پانچ بجے کے بعد گھر پر ہی رہوں گی۔ کوئی ضروری کام ہو تو فون کر سکتی ہو''۔

پھر وہ لفٹ کے ذریعے نیچے اتری اور کار پارکنگ سے اپنی سفید ٹویوٹا نکال کر روانہ ہو گئی۔ سڑکوں پر ابھی ٹریفک کے رش میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ سکون سے کار ڈرائیو کرتی ہوئی اسٹیشن پہنچ گئی۔ ٹرین کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ اسے پلیٹ فارم پر آئے ہوئے بہ مشکل پانچ منٹ ہوئے تھے کہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ فرسٹ کلاس کے ڈبّوں میں سے اترتے ہوئے مسافروں کو دیکھنے لگی۔ یکا یک ایک سوال نے اسے چونکا دیا۔ کیا وہ جمال کو پہچان سکے گی؟

لیکن اسے جمال کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی نیچے اترنے والے مسافروں جمال الگ تھلگ نظر آ رہا تھا' اپنے باپ طاہر حسین سے اس کی شکل صورت اور قد کاٹھ بہت ملتی تھی۔ یوں لگ تھا کہ پچیس سال پہلے کا طاہر اس کے سامنے چلا آ رہا ہو۔ مگر جمال کے پیچھے ایک دبلی پتلی خوب صورت سی لڑکی بھی کمپارٹمنٹ سے نیچے اتر رہی تھی۔ جمال نے دھیمے لہجے کچھ کہا تھا۔ اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

مگر صبا جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی پھر جب جمال کی نظر اس پر پڑی تو وہ فوراً ہی اس کی جانب لپکا۔ اور اپنی ماں سے لپٹ گیا صبا اسے سینے سے لگائے کھڑی کہ اس کی نظر پیچھے کھڑی لڑکی پر پڑی۔ ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ جمال نے اس کے کندھے پر سے اپنا سر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''یہ نوشین ہے۔'' اس کی آواز میں کپکپاہٹ سی تھی۔ اس نے لڑکی کا تعارف کرانے کے بعد اپنی ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ لڑکی نے دھیرے سے ایک قدم اٹھایا اور سر جھکا کر اسے آداب کیا۔

''خوش رہو۔ جیتی رہو۔'' کہہ کر صبا کی طرف دیکھا۔

''ممی آپ کو میرا خط ملا تھا نا؟'' جمال نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''اگر تمہارا خط نہ ملا ہوتا تو اس وقت میں اسٹیشن پر کیوں ہوتی؟'' صبا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تمہارے خیال سے کیا میں پنجاب سے آنے والی ہر گاڑی کو دیکھنے آئی ہوں؟''

جمال اپنی ممی کے اس جواب پر ذرا جھینپ گیا لیکن اپنی اس جھینپ کو چھپانے کے لئے وہ زبردستی ہنسنے لگا۔ نوشین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ مگر وہ کچھ ہچکچاہٹ ہی محسوس کر رہی تھی' اس لیے اس کے آنچل کا کونا اس کی انگلیوں میں لپٹتا جا رہا تھا۔

''چلو'' تھوڑی دیر بعد صبا نے کہا۔ ''نوشین بھی ہمارے ساتھ ہی آ رہی ہے نا؟''

''ہاں'' جمال ایک لمحے تک اپنی ممی کو گھور کر دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔ ''ہم لوگ تو آپ ہی سے ملنے آئے ہیں ممی۔''

''لیکن تم نے خط میں نوشین کا کوئی ذکر تو نہیں کیا تھا۔''

صبا نے مسکرا کر مگر ذرا طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس لئے مجھے اس کے بارے میں کیا معلوم ہوتا؟''

جمال نے کچھ نہیں کہا پھر وہ تینوں اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ صبا کی کار سڑک پر اپنی مخصوص رفتار دوڑ رہی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نوشین کی نگاہیں بار بار اسٹیرنگ پر بیٹھی ہوئی میڈم کو گھورنے لگتی تھیں۔ میڈم صبا کی عمر اب ڈھل رہی تھی۔ لیکن اس کے تو رنگ میں ابھی تک گرمی کی آنچ محسوس ہوتی تھی۔ سنہرے فریم والے چشمے کے اندر سے جھانکتی ہوئی اس کی آنکھوں میں ابھی تک دلوں کو خوف زدہ کر دینے والی چمک باقی تھی اور ان آنکھوں سے آگے کچھ بھی دیکھا نہیں جا سکتا۔ شاید میڈم صبا کی آنکھوں کے پیچھے ایک اونچی دیوار حائل ہے۔ جمال بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح سمٹا اور دبا ہوا سا بیٹھا تھا کہ جیسے کسی الجھن نے اسے گھیر رکھا ہو۔

میڈم صبا کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ کمپاؤنڈ کے گیٹ میں داخل ہو کر اس نے گاڑی روک دی۔ نیچے اتر کر جمال نے کار کی ڈکی میں سے اپنا سامان اتارنا چاہا تو صبا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''تم رہنے دو..... یہ رحمان بابا کرے گا۔''

کال بیل کی آواز سن کر رحمان بابا نے دروازہ کھول دیا۔ میڈم صبا کے پیچھے دو مہمانوں کو دیکھ کر کچھ حیرت سی ہوئی۔ ''گاڑی میں سے سامان نکال کر اندر لے آؤ بابا۔''

صبا نے اس سے کہا اور اندر داخل ہو گئی۔ نوشین اس وقت پیچھے مڑ کر سمندر کی شور مچاتی ہوئی لہروں کو دیکھ رہی تھی جو وہاں سے صرف ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھیں۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' یکایک صبا نے پلٹ کر نوشین سے پوچھا۔

''کچھ نہیں'' نوشین چونک کر بولی۔ ''یوں ہی دیکھ رہی تھی۔''

''یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ تم دیکھ سکتی ہو'' صبا نے مسکراتے ہوئے کہا اور جمال اپنی ممی کی آواز میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ممی نے اس پر کوئی طنز کیا ہے یا انھوں نے یونہی یہ بات کہہ دی ہے؟ لیکن اسے اپنی ممی کے چہرے پر کوئی خاص بات نظر نہیں آئی مگر وہ نوشین کو مسکراتے دیکھ کر یہ سوچنے لگا تھا کہ چونکہ اس کی ممی کی طرح نوشین کو بھی نفسیات سے دلچسپی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ ممی کی بات کا مطلب سمجھ گئی ہو اور اس لئے مسکرا دی ہو۔ اس خیال سے جمال کو ذرا راحت سی محسوس ہوئی اور اس کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود اسے اس بات کی فکر تو تھی ہی کہ ممی ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہیں؟ کیوں کہ وہ پچھلے دس برس سے اپنی ممی سے ملنے نہیں آیا تھا اور آج جب وہ آیا ہے تو تنہا نہیں ہے اس کے ساتھ نوشین بھی ہے۔ لیکن صبا کے چہرے کے تاثرات سے تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے نوشین کا آنا ان کے لئے کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں اس بات کا علم ہو اور وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح ہنس بول رہی تھی انھوں نے تو جمال سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ تم اتنے سالوں تک کیوں نہیں آئے تھے؟ اور اب اچانک کیوں آئے ہو؟ یہ لڑکی کون ہے؟ کیوں تمہارے ساتھ آئی ہے؟ یہاں تک کہ انھوں نے تو جمال سے کوئی خیر خیریت بھی نہیں پوچھی تھی۔

جمال سوچ رہا تھا کہ ممی آخر اس سے کچھ پوچھتی کیوں نہیں ہیں؟ کیوں کہ اسے تو اپنی ممی سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔ وہ تو اپنی ممی سے بہت کچھ کہنے آیا تھا لیکن گھر میں آنے کے بعد صبا تو اس طرح اپنے کام میں مشغول ہو گئی تھی۔ جیسے نوشین اور جمال اس کے مہمان نہ ہوں بلکہ وہ تو ہمیشہ سے ہی اس گھر میں رہتے آئے ہوں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے رحمان بابا کو کھانے کے

بارے میں ہدایات دیں اور پھر کہا۔ ''مجھے تو ایک ڈنر پارٹی میں جانا ہے' میں اسے کینسل بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس لئے تھوڑی دیر بعد میں تو چلی جاؤں گی۔''

پھر تقریباً ساڑھے سات بجے میڈم صبا تیار ہوکر چلی گئی اس کے بعد جمال کے چہرے پر اداسی اور نا امیدی کے گہرے سائے لہرانے لگے اور وہ ایک صوفے پر گم سم سا بیٹھا رہ گیا' تھوڑی دیر بعد نوشین نہا کر اور کپڑے تبدیل کر کے اس کے پاس آئی۔ ''ممی چلی گئیں؟'' اس نے جمال سے پوچھا۔

''ہاں'' جمال نے ایک گہرا سانس لے کر کہا اور نوشین کی طرف دیکھنے لگا۔ نوشین بھی اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی ''انھوں نے میرے بارے میں کچھ پوچھا تھا کیا؟ کیا کہا تم نے؟''

جمال نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ بیٹھا اپنی انگلی کے ناخن کو گھورتا رہا۔ پھر اچانک اس نے نوشین سے پوچھا ''کیسی لگیں تمہیں میری ممی؟''

''ایک بند بکس کی طرح.....'' نوشین کے پاس جواب تیار ہی تھا۔

''کیا مطلب؟'' جمال چونک پڑا۔

''مطلب یہ کہ اندر ایک بہت بڑا خزانہ بھی لے کر بیٹھی ہیں تمہاری ممی۔'' نوشین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''اور بکس کا ڈھکنا بڑی مضبوطی سے بند ہے' جس میں بڑے بڑے تالے بھی لٹکے ہوئے ہیں جمال۔''

''یہ کیا مذاق کر رہی ہو تم؟'' جمال نے ذرا ناراض لہجے میں کہا۔

''یہ مذاق نہیں ہے جمال۔'' نوشین اس گھمبیر آواز میں بولی۔ ''میں تو تم سے ایک کڑوا سچ کہہ رہی ہوں۔ ایک تلخ حقیقت...'' پھر اس سے پہلے ان کی گفتگو آگے بڑھتی رحمان بابا نے آکر انھیں کھانا کھا لینے کے لیے کہا۔ مجبوراً دونوں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کھانے کی میز پر آگئے۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی' رات کے تقریباً دس بجے کے بعد میڈم صبا گھر واپس آئی اور اس نے آتے ہی جمال سے پوچھا۔ ''تم لوگوں نے کھانا کھالیا؟''

''ہاں ممی''۔

''اچھا'' کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اپنا لباس تبدیل کر کے وہ اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی عادت کے مطابق دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور روزانہ کی طرح کمپاؤنڈ میں اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے لگی۔ نوشین بھی باہر آکر کمپاؤنڈ کے زینے پر بیٹھ گئی اور جمال کمپاؤنڈ کی ریلنگ سے لٹکے ہوئے جھولے پر آکر بیٹھ گیا۔ رحمان بابا اپنے کام سے فارغ ہوکر یہ پوچھنے باہر آگیا کہ مہمان کا بستر کہاں لگایا جائے گا؟

اس کا سوال سن کر میڈم صبا نے کہا۔ ''یہ تم جمال سے پوچھ لو''۔ یہ سن کر جمال ایک جھٹکے سے

سوچو.....!

یہ ہنسنا کیسا ہے!

ایک بار حضرت حسن رضی اللہ عنہ ایک نوجوان کے پاس سے گزرے وہ ہنس رہا تھا۔ فرمایا: ''اے بیٹا! کیا تم پل صراط سے گزر چکے ہو۔''

اس نے کہا: ''نہیں.....''

پوچھا: ''کیا تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم جنت ہی میں جاؤ گے۔''

کہا: ''نہیں''

فرمایا: ''پھر یہ ہنسنا کیسا ہے۔''

اس کے بعد اس نوجوان کو کسی نے ہنستے نہیں دیکھا۔☆

کھڑا ہو گیا اور لپک کر اپنی ممی کے پاس پہنچ گیا اسے دیکھ کر نوشین بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اپنی ممی کے قریب پہنچ کر جمال رُک گیا۔

''ممی'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''کیا بات ہے جمال؟'' میڈم صبا نے رک کر پوچھا۔ اس درمیان رحمان بابا اندر جا چکا تھا۔

''آخر آپ مجھ سے کچھ پوچھتی کیوں نہیں ہیں؟'' جمال نے کہا۔

''کیا پوچھوں؟''

''کیا مجھ سے پوچھنے کے لیے آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟'' جمال نے پوچھا تو صبا نے مسکرا کر اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی ''کیا واقعی کوئی بات ہے؟''

''آپ تو مجھ پر ناراض ہو رہی ہیں ممی'' جمال نے مُنہ پھیر کر کہا۔

''ناراض؟'' صبا نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''بھلا یہ کون سا لفظ ہے؟''

''یہ ناراضگی شاید اس لیے ہے کہ میں کافی عرصے بعد آیا ہوں... ہاں کئی سال بعد اپنی ممی کے پاس آیا ہوں۔ اور وہ بھی ایک لڑکی کو لے کر آیا ہوں میں...'' جمال جذباتی لہجے میں بولا۔

''تو؟'' صبا نے اُس کی طرف دیکھا ''تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے میں اس لڑکی کو دیکھ ہی نہیں پا رہی ہوں''۔

''نہیں آپ دیکھ تو رہی ہیں۔ لیکن جانتی کچھ بھی نہیں ہیں آپ'' جمال بولا۔

''مگر مجھے جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیوں جاننا چاہیے مجھے؟'' صبا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

جمال سے کوئی جواب نہیں بن پڑا' اس کی خاموشی دیکھ نوشین ان کے نزدیک آ گئی اور صبا کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''چلیے ...ممی ...اندر چلتے ہم اطمینان سے بیٹھتے ہیں''۔

میڈم صبا نے ایک لمحے کے لیے گھور کر نوشین کی طرف دیکھا پھر دھیرے سے بولی۔ ''چلو اطمینان سے بیٹھیں''۔

رحمان بابا نے دوسرے کمرے میں بستر لگا دیے تھے۔ ابھی میں سے ایک بستر پر صبا آ کر بیٹھ گئی اور اس نے تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ کر جمال کی طرف دیکھا جو بستر کے دوسرے سرے پر بیٹھا تھا۔

''ذرا آرام سے بیٹھو بیٹے'' صبا نے جمال سے کہا اور ایک تکیہ اس کی جانب اُچھا دیا۔ نوشین بالکل اس کے برابر میں تقریباً اس سے لگ کر بیٹھی تھی۔

''اب کہو.....'' صبا نے جمال سے کہا۔ لیکن جمال کچھ بھی بول نہیں سکا اس کی آنکھیں نیچے جھکی ہوئی تھیں' شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کی جائے لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا اس کی سماعت سے اس کی ممی کی آواز ٹکرائی۔

''دیکھو تمہیں جو کہنا ہے صاف صاف کہہ ڈالو تفصیل میں جانے کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔'' اس کی یہ بات سن کر نوشین کو ہنسی آ گئی۔ نوشین کو ہنستے دیکھ کر صبا خود بھی ہنس پڑی اور ہنستے ہوئے ہی نوشین سے بولی۔ ''ذرا دیکھو کتنا معصوم نظر آ رہا ہے یہ''

''لیکن ٹرین میں تو بڑی بڑی باتیں کر رہے تھے'' نوشین نے کہا۔ ''کہہ رہے تھے ممی سے یہ کہوں گا...اور وہ کہوں گا۔ مگر اس وقت تو کسی گنہگار کی طرح سر جھکائے بیٹھے ہیں''

''گنہگار کی طرح نہیں نوشین بلکہ کسی بچے کی طرح'' اپنی ممی کے ہونٹوں پر ہنسی دیکھ کر اس کے قریب سرک آیا۔ صبا نے نوشین کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور جمال سے پوچھا ''یہ تمہاری بیوی ہے؟''

''ہماری شادی ہونے والی ہے ممی ...آئندہ مہینے...'' جمال نے کہا۔

''تو مجھے دُلھن دکھانے لائے ہو؟'' صبا نے دھیرے سے پوچھا لیکن جمال نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کے اور زیادہ قریب کھسک آیا اور پھر اس نے گود میں اپنے دونوں ہاتھ لے کر گھمبیر لہجے میں

بولا ''نہیں ممی۔ میں تو آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں''۔

''کہاں؟'' صبا نے چونک کر پوچھا۔

''وہیں ممی... جہاں آپ کا گھر ہے''۔ جمال کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''میں آپ کو اسی گھر میں واپس لے جانے آیا ہوں''۔

''میرا گھر تو یہی ہے''۔ صبا نے کمرے کی چاروں دیواروں کی طرف نظر ڈالتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہی دیواریں میری ساتھی ہیں۔ میرا دُکھ بھی انھوں نے دیکھا ہے اور سکھ بھی۔ یہی میرا گھر ہے بیٹے''۔

''نہیں ممی یہ آپ کا نہیں ہے''۔ جمال جلدی سے بولا ''آپ کا گھر تو وہیں ہے۔ اور آپ کو وہیں جانا ہوگا''۔

''اب کوئی دوسری بات کرو جمال''۔ صبا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ تمھاری پڑھائی مکمل ہوگئی؟''

''ہاں ممی میں ٹیکسٹائل انجینئر بن گیا ہوں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''ویرگڈ... اب اپنے باپ کی مل کو ٹھیک سے چلانا''۔ اتنا کہہ کر صبا نے نوشین کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ ''اور تم کیا کر رہی ہو نوشین؟''

''میں بی ایس سی فائنل میں ہوں ممی''۔ نوشین نے بتایا۔

''تو فائنل میں آتے ہی جمال کی محبت میں گرفتار ہوگئیں؟'' صبا نے ہنس کر پوچھا تو نوشین نے شرما کر اپنا سر جھکا لیا اور اس بجائے جمال نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں ممی ہماری شادی ہماری محبت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ رشتہ ڈیڈی نے اور نوشین کے والدین نے طے کیا ہے اور پچھلے مہینے ہماری منگنی بھی ہوگئی ہے''۔

''اوہ...'' صبا نے ایک گہرا سانس لیا۔

''ہاں ممی ...میں آپ کو فون بھی کرنے والا تھا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا؟'' صبا نے بڑے سکون سے جواب دیا اس کے چہرے پر یا اس کی آواز میں کوئی کڑواہٹ نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جیسے ساری بات خیر و خوبی سے ختم ہوگئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد جمال نے پھر کہا۔

''اب یہاں سے اپنا سب کچھ سمیٹ لیں ممی۔ ہم آپ کو واپس لے کر جائیں گے''۔

اتنا کہہ کر جمال ایک پل کے لیے ٹھہر گیا اور نوشین کی جانب دیکھ کر بولا۔ ''یہ نوشین کی بھی خواہش ہے ممی کہ وہ آپ کی موجودگی میں ہمارے گھر آئے اور ڈیڈی بھی...''

جمال ابھی کہہ پایا تھا کہ صبا نے اچانک اس کے چہرے پر سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں اور وہ سامنے والی دیوار کو گھور رہی تھی لیکن جمال نے اپنی ادھوری بات پوری کرتے ہوئے آگے کہا۔ ''وہ ماہ قبل ڈیڈی

سوچو.....ا

صالح حکمران کی برکت

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ مسند خلافت پر جلوہ فرما ہوئے تو پہاڑیوں کے دامن میں رہنے والے چرواہے نے پوچھا۔ ''مسلمانوں پر یہ کون صالح، پاکیزہ خصلت خلیفہ مقرر ہوا ہے۔؟''

راوی نے پوچھا: ''یہ بات تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوئی۔؟''

چرواہے نے کہا: ''جب کوئی نیک اور صالح حکمران مسند نشین ہوتا ہے تو شیر اور بھیڑیے ہمارے جانوروں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔''

☆

پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا' جس کے نتیجے اس وقت وہ بستر پر ہیں۔ انھوں نے بھی کہا ہے کہ اپنی ممی کو ساتھ لیے آنا''۔

یہ سن کر صبا کی پلکیں ایک انجانے سے بوجھ سے بند ہوگئیں پھر اس کی بند آنکھوں کے اندر طاہر حسین کا لمبا چوڑا اور صحت مند جسم آ کر کھڑا' سُرخ و سفید رنگ' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ... لیکن تھوڑی دیر بعد یہ خوب صورت صحت مند جسم خود بخود اس کی نگاہوں میں دھندلا پڑتا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک فالج زدہ اپاہج جسم میں تبدیل ہوگیا' ڈبلے پلے گال' پچکی ہوئی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ چلنے پھرنے سے معذور جسم کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں اور زور سے بند ہوگئیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں شہنائی کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ڈھولک کی آواز پر شادی کے گیت گاتی ہوئی لڑکیوں کی آوازیں وہ دیر تک سنتی رہی۔ پھر اس نے دیکھا دور ایک بہت بڑا بنگلا تھا' جس کے دروازے سے جمال کے ساتھ ساتھ نوشین دُلھن بن کر اندر داخل ہو رہی تھی... لیکن صبا نے اپنے آپ کو وہاں اس بنگلے میں نہیں دیکھا۔

اس لیے دھیرے دھیرے اپنی بند پلکوں کو کھول دیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے جمال نوشین کو دیکھنے لگی۔ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک انتظار تھا شاید وہ بے چینی سے صبا کے جواب کے منتظر تھے، یکا یک صبا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پھر تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں داخل ہوگئی' اپنے کمرے میں اس نے اپنی الماری کھولی اور اس کے اندر سے زیورات کا ایک چھوٹا سا بکس نکال لیا۔ میں ایک وزنی سونے کا ہار تھا جسے لے کر وہ پھر اس کمرے میں آ گئی اور نوشین کے قریب آ کر بولی۔

''اٹھو بیٹی نوشین''۔ نوشین شرماتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی' صبا نے سونے کا وہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیا اس وقت اس کی آنکھوں میں دو آنسو آ کر رُک گئے تھے۔ نوشین کے گلے میں ہار پہنانے کے بعد اس نے اس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیا اور پھر بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔ ''آج تم میری نظر میں بھی میرے بیٹے کی بیوی اور میری بہو بن گئی ہو نوشین... میری دُعائیں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ ہیں تم جہاں بھی رہو ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہو۔ تمھاری زندگی میں کبھی کوئی نازک لمحہ نہ آنے پائے' جس میں کوئی غلط فیصلہ کرنے سے تمھیں عمر بھر پچھتانا پڑے''۔

''تو کیا ممی آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گی؟'' جمال نے اُٹھ کر صبا سے پوچھا۔

''نہیں بیٹے۔ اب میں وہاں کبھی بھی نہیں آؤں گی''۔ صبا نے دیوار کی جانب دیکھتے ہوئے گھمبیر آواز میں کہا۔ ''تمھارے ڈیڈی کو اگر میری ضرورت ہو تو ان سے کہہ دینا کہ تمھاری شادی کے بعد وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر یہاں اس گھر میں آسکتے ہیں۔ میرے گھر کے دروازے ان کے لیے اور تمھارے لیے ہمیشہ سے کھلے ہیں اور آیندہ بھی کھلے رہیں گے... کبھی کبھی اگر تم لوگوں کا جی چاہے تو تم لوگ بھی آتے رہنا... لیکن... لیکن... میں اور کہیں نہیں رہوں گی''۔ یہ کہتے کہتے ایک لمحے کے لیے میڈم صبا کی آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ آنکھیں کھل گئیں لیکن آنکھوں کے اس کھلنے اور بند ہونے کے درمیان جیسے بہت کچھ بدل چکا تھا نوشین کو یوں لگ رہا تھا جیسے میڈم صبا کے سامنے کھڑی تھی شاید گزرے ہوئے برسوں کی طرف اور شاید اب وہ کمپاؤنڈ کی ریلنگ پر لگے ہوئے جھولے میں جا کر بیٹھ جائیں گی اور آیندہ کئی برسوں تک وہیں بیٹھ کر کسی کا انتظار کریں گی لیکن پھر بھی اپنے چہرے اور اپنی باتوں سے وہ یہی ظاہر کرتی رہیں گی کہ ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور نہ ہی انھیں کسی کا انتظار ہے۔

☆

EBB-012

Noorani

یادش بخیر

ایم اے راحت

شادی کے چار ماہ بعد نئی نویلی دلہن کا جینز اور مردانہ قمیض کے ساتھ نارتھ اسٹار ٹائپ جوتے چڑھا کے یوں مصافحہ کرنا اور ایسی بے باکی سے اظہار خیال سگریٹ نوشی وغیرہ اب کوئی غیر اخلاقی یا معیوب بات نہیں' قدریں بدلتی رہتی ہیں اور مانگ میں ستاروں کی افشاں' حنا سے عارض پر شفق کا کھلنا۔ رنگ پیراہن کایا خوشبو زلف لہرانے کا نام اور حسن کی ادائے محبوبی اور نسوانیت کی نزاکت پرانی اصطلاحات اور استعارے ہیں لیکن محمود کا ذہن اس سے مطمئن نہ ہوا کیونکہ اس کے ارد گرد دنیا ابھی اتنی نہیں بدلی تھی اور خود محمود دنیا سے اتنا بے تعلق بھی نہیں تھا کہ کسی انقلاب سے ایشیاء بھی یورپ بن جاتا اور اسے خبر نہ ہوتی۔ خود شمائلہ کبھی عام عورت نہیں رہی تھی اور پیشے کے اعتبار سے بیسوا تھی مگر اس کے انداز دلبری میں بھی ایک رکھ رکھاؤ تھا اور اس کی نسوانیت میں بھی رعنائی حسن تھا۔

آپ کے پسندیدہ قلمکار کی تحریر.....اس ماہ کی خاص کہانی

بازار میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ستمبر کے آغاز سے ہی گرمیاں گزارنے کے بہانے مری آنے والوں کی گہما گہمی کم ہونے لگی تھی۔ اِکا دُکا کوٹھیوں کے بند دروازوں پر قفل دکھائی دینے لگے تھے اور رخت سفر باندھ کے روانہ ہونے والوں کی گاڑیاں دن بھر پہاڑی راستوں کے نشیب پر رینگتی رہتی تھیں۔ ملک کے ہر شہر اور ہر علاقے سے پہنچنے والی خواتین کے خوبصورت چہرے میک اپ کے باوجود ملول نظر آتے تھے۔ کسی کو گل بداماں وادیوں اور کوہساروں کی فرحت بخش فضاؤں کو چھوڑ کر سپاٹ میدانی علاقوں میں لوٹنے کا ملال نہیں تھا' جہاں اب بھی چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی کیونکہ اس سے زیادہ ٹھنڈک تو ان کے ایئر کنڈیشنڈ گھروں اور کاروں میں تھی اور یہی عیش و عشرت کے لوازمات وہاں بھی تھے جو دولت کی فراوانی سے حاصل ہوتے ہیں۔

مگر وہاں مصروفیات میں بیزار کن یکسانیت کا احساس ہوتا تھا اور خوشی بھی ایک کاروبار لگتی تھی۔ مری ان خواتین کو سالانہ فیشن کانفرنس کے لیے بہترین ماحول فراہم کرتی تھی۔ علاقائی ملک اور غیر ملکی فیشن کے امتزاج سے وجود میں آنے والے نئے فیشن پورا سال مروج رہتے تھے۔ صنعت کاروں' بڑے بڑے تاجروں اور اسمگلروں کے اہل خانہ کے ساتھ اوپر کی کمائی سے دولت مندوں کی صف میں شامل ہو جانے والے بدعنوان سرکاری حکام اور جاہل ٹھیکیداروں کے گھروں کی خواتین بھی تعلقات عامہ کو فروغ دینے کے لیے آتی تھیں اور عام پیشہ ور عورتوں کے ساتھ اعلیٰ قسم کی وہ طوائفیں بھی آجاتی تھیں جس کو کسی لکھ پتی خان کی نظر سے گرنے سے پہلے کسی کروڑ پتی کی نظر میں سما جانے کا فن آتا تھا۔ مری ایک لوکل سوئٹزرلینڈ تھا۔ میرج بیورو تھا اور ایمپلائمنٹ ایکس چینج تھا جو پندرہ مئی کو کھل کے پندرہ ستمبر کو بند ہو جاتا تھا۔

گزشتہ چند سالوں میں اس نے کئی بار شائلہ کو مری میں دیکھا تھا۔ ہر مرتبہ اس کے ساتھ نیا آدمی نظر آتا تھا۔ چنانچہ وہ نظر چرا کر یا اجنبی بن کر گزر جاتا تھا۔ وہ ہر سال چند دن تفریح میں گزارنے کی خاطر مری آتا تھا تو کسی بھی ہوٹل میں ٹھہر جاتا تھا۔ سیزن کے شروع میں کمرے یا تو ملتے نہیں تھے یا ملتے تھے تو دگنے کرائے پر۔

چنانچہ وہ ستمبر میں پہنچتا تھا۔ ہر سال اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ مری کی طرح شائلہ کے حسب شباب میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی عمر چالیس سال سے اوپر ہو چکی تھی مگر وہ اپنی اٹھارہ سال کی بیٹی کے ساتھ اس کی بڑی بہن لگتی تھی۔ ایک بار تو اس نے بیک وقت ماں' بیٹی کو ایک جیسے لباس میں اور آرائش جمال میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے دیکھا تھا تو حیران رہ گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ خود اپنی بیٹی نائلہ کا ہم سن ثابت کر کے وہ کس کو دھوکہ دیتی ہے۔ دنیا کو یا اپنے آپ کو۔

تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ شائلہ اب بھی بھرپور عورت تھی اور اسے دیکھ کر نوجوانی کی عمر سے گزر جانے والے مرد ٹھٹک کر رک جاتے تھے۔ ان میں خود محمود بھی شامل تھا۔ شائلہ کا بڑا لڑکا تو اب بیس سال کا ہو چکا تھا۔ محمود کی کبھی شائلہ سے براہِ راست مراسم نہیں رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ شائلہ کس قماش کی عورت ہے انیس سو اسی میں جب وہ پشاور کے ایک کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی اور اس کے کاروباری والد ویسٹرج کے علاقے میں رہتے تھے تو ایک رات ڈاکوؤں نے گھر میں کود کر سب کچھ لوٹ لیا۔ مزاحمت کے دوران اس کے والدین مارے گئے بلکہ گھر کو بھی آگ لگا گئے۔ ڈاکو بااثر لوگ تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا' وہ ایک انتقامی کارروائی تھی۔

شائلہ کو کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کارروائی کا جواز کیا تھا' وہ سال بھر کسی دور افتادہ گاؤں کی حویلی میں مقید رہی۔ اگر وہ بیوقوف ہوتی تو اسی حویلی کے احاطے میں دفن کر دی جاتی مگر اس نے بڑی چالاکی سے کام لیا اور چوہدری صاحب کا دل جیتنے میں کامیاب ہوگئی۔ سال بھی کے بعد جب اس کی بچی دو

ماہ کی تھی۔ اسے تقدیر نے موقع فراہم کیا' جس کے انتظار میں اس نے ایک سال گزارا تھا۔ ایک ٹوکے سے اس نے چوہدری سمیت دو مجرم بھائیوں' ان کی بیویوں اور ایک بہن کے سر تن سے جدا کیے۔ ان میں سے ایک کی بیوی کے چار سالہ بچے کو باہر نکالا۔ اپنے بچے کو سمیٹ کر بغل میں دبایا اور حویلی کو آگ لگا کر فرار ہوگئی۔ اس کے لیے واپس اپنے گھر یا کسی عزیز کے گھر جانا ناممکن تھا۔ وہ جانتی تھی پولیس والے اور چوہدری کے رشتے دار اسے تلاش کرتے ہوئے کہاں کہاں پہنچ سکتے ہیں۔

بچے کو اس نے تین دن بعد شہر کے ایک خوبصورت علاقے میں کوٹھی کے پورچ میں کھڑی ہوئی کار کے اندر لٹایا اور اس کے ساتھ ہی ایک رقعہ چھوڑ دیا کہ میں بحالت مجبوری اس بچے کو چھوڑ رہی ہوں کیونکہ اس کے بدقماش باپ نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے ساتھ اس معصوم کی جان لینا میرے لیے مشکل ہے اور ایک صاحب ثروت کے لیے اس کی پرورش کا بار اٹھانا کوئی مشکل نہیں۔ اس کا اجر خدا دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کی چال کامیاب رہی۔ وہ بچہ اس گھر میں پرورش پانے لگا۔ یتیم خانے میں پہنچا۔

خود شائلہ نے کئی جگہ ناکام ہونے کے بعد بالآخر ایک دولت مند رنڈوے کی ملازمت قبول کرلی جس نے بالآخر اس سے نکاح کیا کیونکہ شائلہ نے پولیس کے پاس جاکے اپنا حق طلب کرنے کی اور اس کی عزت خاک میں ملا دینے کی دھمکی دے دی تھی۔ وہ دل کا مریض تھا اور سال بھر شائلہ کو بے اولاد چھوڑ کر مر گیا۔ اس کی جائیداد پر لعنت بھیج کر شائلہ نے نقد مال سمیٹا اور غائب ہوگئی۔

قانونی وراثت کے چکر میں اسے نقصان کے سامنے پیش ہونا پڑتا اور بہت جھوٹ بولنا پڑتا۔ زیورات کی مالیت ہی پچاس ہزار سے کم نہ تھی اور اس نے گھومتے پھرتے اور ٹھکانے بدلتے اس سال گزار دیا۔ شوقین مزاج رئیس زادے آسانی سے اس کے دام حسن میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور پھر اپنے عزت دار والدین کے ڈر سے شوق کی بہت بھاری قیمت دے کر جان چھڑاتے تھے۔ شائلہ کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوا تو مغل پورہ کے ایک بدمعاش کا اس پر دل آ گیا۔ اس نے شائلہ سے باقاعدہ شادی کی اور شائلہ دھڑلے سے شانی کے ساتھ گھومنے لگی۔ مشہور یہ تھا کہ وہ بدمعاشی میں بھی اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور دلیری کے باعث چوری' ڈکیتی کی متعدد وارداتوں میں شریک ہوئی لیکن کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں آئی۔ اس بدمعاش سے اس کی بیٹی نائلہ پیدا ہوئی تھی جو سال بعد ڈاکہ ڈالنے کی ایک ناکام کوشش میں مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ شائلہ جو گاڑی لیے انتظار کر رہی تھی' آخری وقت میں فائرنگ کرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کا سراغ ملا تو وہ ایک بہت معزز شخص کی بیوی تھی۔ اس نے یہ ثبوت بھی فراہم کردیا کہ یہ ازدواجی تعلق پرانا ہے۔ کسی معزز اور معتبر آدمی کی بیوی پر جو وارادت کے وقت ملتان میں ہو' یہ الزام کون لگاتا کہ وہ ایک بدمعاش کی بیوی تھی اور ڈاکے میں شریک تھی۔ شانی بدمعاش مر چکا تھا اور باقی ملزم ہنوز روپوش تھے۔ مغل پورہ کے اس بدمعاش نے بھی شائلہ کے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا اور اس کاروباری ذہن رکھنے والی عورت نے اپنا سب کچھ نقد رقم کی صورت میں جمع کر رکھا تھا۔ اس کی اپنی زندگی عیش و عشرت میں اور بہت آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ مغل پورہ کے شانی بدمعاش کے بعد وہ بہت محتاط ہوگئی تھی اور اس نے جرائم سے کنارہ کشی اختیار کرکے باعزت زندگی گزارنی شروع کردی تھی۔ یعنی باعزت لوگوں کی داشتہ بن کے رہنے لگی تھی اور یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس نے ایک کوٹھی اسلام آباد میں خریدی تھی اور دوسری مری میں۔ بحریہ ٹاؤن میں ایک کنال پر محیط اسلام آباد کی کوٹھی اسی کوٹھی کے جلے ہوئے کھنڈر پر تعمیر ہوئی تھی جو شائلہ کے والدین کا مقتل تھی اور جہاں سے اس کی تباہی کی داستان کا آغاز ہوا تھا۔ سولہ سال بعد حالات ہی نہیں' وقت بھی

اور لوگ بھی بدل گئے تھے اور کسی کے ذہن میں نہ اس چونچکاں سانحے کی یاد تھی اور نہ اس لڑکی کی صورت کا عکس تھا جو انتقال کی آگ میں جل کر خاک ہو جانے والے گھر کا ایک ہی روشن چراغ تھی۔ شائلہ کی موجودہ مالکوں سے نئی کوٹھی خریدنے کے لیے اصل قیمت سے دو لاکھ زیادہ پیش کرنے پڑتے تھے اور اتنے فائدے کو دیکھتے ہوئے وہ مجبور ہو گئے تھے کہ دوسری' اس سے بڑی اور بہتر کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ نئی کوٹھی کے نقشے میں ردوبدل ضرور ہوا تھا مگر بہت کچھ وہی تھا' چنانچہ وہ کمرہ بھی موجود تھا جہاں اس کے والدین کا لہو گرا تھا۔ اس نے یہ کمرہ مقفل کر دیا تھا اور سال میں بڑی عقیدت سے اس مزار پر دو موم بتیاں روشن کرتی تھی' جہاں دیکھنے والوں کو موزائیک کے خوبصورت فرش پر کہیں خون کا داغ تک نظر نہ آتا تھا۔

اور یہ سب باتیں محمود کو اس لیے معلوم تھیں کہ وہ معتبر اور معزز شخص جس نے شائلہ کے شوہر مغل پورہ کے بدمعاش شانی کے مارے جانے کے بعد یہ جھوٹ بول کر شائلہ کو بچا لیا تھا کہ سال بھر سے وہ اس کی منکوحہ ہے' خود محمود تھا۔

محمود کا کل اسباب ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا جس میں چند سوٹ' شب خوابی کے لباس' شیونگ کا سامان اور ایسی ہی کچھ ذاتی ضروریات کی چیزیں تھیں۔ شائلہ کی رہائش گاہ بہت عالی شان تو نہ تھی مگر مری میں اتنی بڑی جگہ کی ملکیت بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ سامنے کے حصے میں پھیلا ہوا لان تقریباً تیس گز لمبا اور تیس گز چوڑا تھا اور اندر جانے والے راستے کے دائیں ہاتھ پر تھا۔ گھنے درختوں کے دامن میں کاٹج ٹائپ مکان کے شمالی اور شرقی حصے میں ایک ہی برآمدہ تھا جس میں کھلنے والی کھڑکیوں کی تعداد سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ نچلی منزل پر کم سے کم چار بیڈروم ضرور ہوں۔ دو کمرے اوپر کی منزل پر بھی تھے اور ان کا رخ مغرب کی جانب تھا۔ جدھر گیراج اور سرونٹ کوارٹر کی دیوار کے بعد سوفٹ سے زیادہ کی گہرائی تک نشیب تھا اور غیر آباد جنگل تھا۔ دوسرے مکان بائیں جانب تقریباً ایک قطار میں مگر اتنے فاصلے پر بنے ہوئے کہ درمیان میں حائل درختوں اور جھاڑیوں کے باعث صاف دکھائی نہ دیتے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے چار افراد پر مشتمل ایک گروپ لان کے آخری کنارے پر نظر آیا۔ وہ سب رنگین پلاسٹک کی سیٹول والی گارڈن چیئرز پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تاش کے پتے تھے۔ کھیلنے والوں میں تین مردوں کے ساتھ ایک عورت بھی شامل تھی۔ ان کے سامنے زود اور سرخ رنگ کے مشروب سے بھرے ہوئے گلاس رکھے تھے۔ زرد مشروب صرف عورت کے پاس تھا اور دور سے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ گلاسوں میں سے ناب ہے یا اصطلاحاً کوئی سوفٹ ڈرنک شائلہ کے لیے یا اس کے گھر کے مہمانوں کے لیے حرام و حلال کے تصورات آؤٹ آف ڈیٹ تھے۔ رات کے دوسرے حصے میں صرف دو گانا نہیں ہو رہا تھا' ورنہ پورا منظر کسی رومانی فلم کا حصہ تھا اور شوٹنگ میں حصہ لینے والے چاکلیٹ ہیرو ٹائپ نوجوان کے ساتھ جو لڑکی ہیروئن بنی بیٹھی تھی' وہ بھی دھان پان سی تھی۔ وہ دنیا مافیہا سے بے نیاز مکالمے بولنے سے مگن تھے کہ سیٹ پر محمود نے قدم رکھا اور نوجوان اس دخل اندازی پر برا مانتا ہوا اٹھ کے آگے بڑھا۔ جب وہ اس کے قریب آیا تو مختیار نے اس کی صورت کے نقوش میں شائلہ کی جھلک دیکھی اور سمجھ گیا کہ وہ شائلہ کا بیٹا ہے۔

''جی؟''

وہ محمود کے آگے واجبی شائستگی سے بولا۔ ''کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''آپ کی امی سے۔'' محمود نے کہا۔

''کیا کہتے ہیں آپ انہیں۔ ممی یا امی؟'' وہ چونکا۔

''آپ مجھے جانتے ہیں؟''

''میں نے تو کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔''

''دیکھا تو میں نے بھی نہیں تھا تمہیں۔'' محمود نے بزرگی کا انداز اختیار کیا۔

''اور مجھے تمہارا نام بھی نہیں معلوم لیکن یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے۔''

نوجوان کو محمود کی یہ بے تکلفی کی ادا پسند نہیں آئی۔ ''آج تک مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ ممی کے دوستوں کی تعداد کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ خود انہیں بھی یاد نہیں۔''

وہ بولا اور محمود کو اس کے لہجے میں طنز اپنے زیادہ حقارت اور تلخی کا واضح احساس ہوا۔ اگر وہ مشتعل ہوتا تو دوست کی جگہ ''یار'' اور ''آشنا'' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی نہ ہچکچاتا۔ بیٹے کی نگاہ میں شائلہ جیسی ماں کے لیے پُرتقدس احترام کا جذبہ نہیں تھا تو اس کا قصوروار وہ نوجوان نہیں تھا جس نے تین سال کی عمر سے باپ کے بغیر صرف ماں کی آغوش میں پرورش پائی تھی لیکن محبت کا یہ دروازہ کسی گھر کی خلوت کا محافظ اور امانت دار نہیں تھا۔ یہ شارع عام پر واقع مکان کا دروازہ تھا۔ شائلہ اپنے بیٹے کو نفرت کا یہ ردعمل ہی دے سکتی تھی۔

''تم ان سے جا کے کہو مسٹر محمود آئے ہیں۔''

اس نے متانت سے کہا۔ اسی وقت برآمدے کا دروازہ کھول کے شائلہ نمودار ہوئی۔ محمود کو دیکھ کر اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔

''محمود صاحب۔'' وہ اس کی طرف لپکی۔

''آپ یہاں؟ آپ نے تو کمال کر دیا۔''

قریب آکر وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئی۔

''احمد! یہ تمہارے پاپا کے دوست ہیں مسٹر محمود صاحب یہ میرا بیٹا ہے۔''

احمد نے اخلاقاً ہاتھ ملایا۔

''انہیں معلوم ہے یہ تو رابعہ کو بھی جانتے ہیں۔''

اس نے پھر طنز سے بات کی۔ اس کی مسکراہٹ صاف سوال کر رہی تھی کہ آخر تم یہ بات کیسے بھول گئے تھے کہ تم پاپا کے دوست تھے۔

''اچھا تم ان کا سامان اندر پہنچاؤ۔''

شائلہ نے ہنس کر تھوڑی سی خفت کے ساتھ بات ٹالی۔ ''اوپر والا کمرہ.....''

''اوپر ایک میں پروڈیوسر صاحب مقیم ہیں' دوسرے میں ڈائریکٹر صاحب۔'' احمد نے مطلع کیا۔

''ان کو ایک کمرے میں کر دو۔''

شائلہ نے تھوڑا سا چڑ کے کہا۔

''آؤ محمود! تمہیں دوسرے مہمانوں سے ملواؤں مگر پہلے مجھے یہ بتاؤ' تم یہاں کیسے آپہنچے اور آئے ہو تو کچھ دن یہاں رہو گے نا؟''

یہ سب رسمی قسم کے سوال یہ تاثر برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھے کہ وہ اچانک بھول کر آجانے والا کوئی بے ضرر قسم کا پرانا ملاقاتی ہے۔ باقی لوگ اب اس کی طرف متوجہ تھے اور اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجیب الخلقت چیز ہو۔ سوا آٹھ فٹ کا یا سوا فٹ کا قد یا ہاتھی جیسے کانوں والا۔ ان کی یہ دلچسپی کس حد تک تشویش آمیز تھی یا یہ محض محمود کے احساس کا کرشمہ تھا کیونکہ اس کے ذہن میں شائلہ کی بات تھی۔ احمد کی بیوی نے بڑی شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے باقاعدہ مصافحہ کیا۔ عام معاشرے میں عورت کا مرد سے ہاتھ ملانا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر یہاں ساس کے سامنے بہو اس بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھی تو اس کی وجہ بھی وہی تھی کہ یہ گھر عام معاشرے کی اخلاقی اقدار کا پابند نہ تھا۔ خود بہو کا لباس روایت سے بغاوت کی نمایاں مثال تھا۔

''رابعہ کا اصل نام زینب النساء ہے۔'' شائلہ نے کہا۔

''احمد اب رابعہ کہتا ہے۔ یونیورسٹی میں احمد کے ساتھی۔''

''ممی! میں احمد سے ایک سال آگے تھی۔'' رابعہ نے فخر سے بتایا۔

''وہ تو ڈگری بھی نہیں لے سکا۔ نالائق۔''

''رابعہ نے نفسیات میں ایم اے کیا ہے۔''

شائلہ نے ناگواری سے خشک لہجے میں تسلیم

کیا۔ ''لیکن میں ماہر نفسیات نہیں ہوں۔''

وہ بے تکلفی سے ہنسی اور آلتی پالتی مار کے زمین پر بیٹھ گئی۔

''کتنا عرصہ ہوا ہے ان کی شادی کو؟'' محمود نے شائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی چار مہینے ہوئے ہیں۔'' شائلہ نے کہا۔

اس وقت رابطہ اپنی جیب سے ایک خمیدہ کمر سگریٹ نکال کر سیدھا کرنے میں مصروف تھی۔

''لیکن جناب!'' پیچھے سے آواز آئی۔ ''یہ دیکھیے کہ میں نے ممی کو دادی بننے کی خوشخبری سنادی ہے۔''

محمود بھونچکا رہ گیا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں' ورنہ شادی کے چار ماہ بعد نئی نویلی دلہن کا جینز اور مردانہ قمیض کے ساتھ نارتھ اسٹار ٹائپ جوتے چڑھا کے یوں مصافحہ کرنا اور ایسی بے باکی سے اظہار خیال سگریٹ نوشی وغیرہ اب کوئی غیر اخلاقی یا معیوب بات نہیں' قدریں بدلتی رہتی ہیں اور مانگ میں ستاروں کی افشاں حنا سے عارض پر شفق کا کھلنا۔ رنگ پیراہن کا یا خوشبو زلف لہرانے کا نام اور حسن کی ادائے محبوبی اور نسوانیت کی نزاکت پرانی اصطلاحات اور استعارے ہیں لیکن محمود کا ذہن اس سے مطمئن نہ ہوا کیونکہ اس کے اردگرد دنیا ابھی اتنی نہیں بدلی تھی اور خود محمود دنیا سے اتنا بے تعلق بھی نہیں تھا کہ کسی انقلاب سے ایشیاء بھی یورپ بن جاتا اور اسے خبر نہ ہوتی۔ خود شائلہ بھی عام عورت نہیں رہی تھی اور پیشے کے اعتبار سے بیسوا تھی مگر اس کے انداز دلبری میں بھی ایک رکھ رکھاؤ تھا اور اس کی بازنیت میں بھی رعنائی حسن تھی۔

محمود نے کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائف میں بھی وہ عورت دیکھی تھی جو اپنے بناؤ سنگھار سے اور عشوہ غمزہ ادا سے ہوشمند مرد کو دیوانہ کردیتی تھی۔ معلوم نہیں اس نیم مردانہ عادات واطوار والی عورت اور نیم زنانہ ٹائپ مرد کے درمیان ربط اور کشش کے جذبات کی شدت بھی وہ ہے یا نہیں پھر اس نے خود کو یاد دلایا کہ حسن تو ایک حیوانی جذبہ ہے اور ذہن کے ایک کیفیت کا نام ہے اور آگے بڑھ گیا۔ تاش کھیلنے والے مردوں میں ایک فلم پروڈیوسر تھا جس نے پہلی پنجابی فلم بنانے کا اعلان کردیا تھا۔ وہ چالیس سال کا ایتھلیٹ ٹائپ صحت مند شخص تھا۔ دوسرا اسی فلم کا ڈائریکٹر تھا۔ اپنی صحت اور قد وقامت میں پروڈیوسر اگر سیر تھا تو وہ تولہ کم سولہ چھٹانک تھا۔ انہیں ساتھ ساتھ دیکھ کر محمود کو منکر نکیر کا خیال آیا۔ تیسرا شخص عمر میں کچھ زیادہ تھا لیکن پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ یہ شائلہ کا تازہ ترین شوہر تھا اور تعارف پر اس نے بڑی خوش دلی اور خوش اخلاقی کے ساتھ محمود سے مصافحہ کیا۔ ان کے ساتھ والی عورت پنجابی بھی ٹھیک سے بس بول سکتی تھی لیکن وہ مجوزہ پنجابی فلم میں متعارف کرائی جانے والی تہلکہ خیز ہیروئن تھی۔ بظاہر وہ ایک عام قسم کی عورت نہ تھی اور اسے حسین کہنا بھی مشکل تھا مگر محمود جانتا تھا کہ اسکرین ٹیسٹ کے لیے چہرے کا ''فوٹوجینک'' ہونا ضروری ہے۔

حسین ہونا شرط نہیں۔ یہ کیمرے کی آنکھ کی نامعقولیت ہے کہ حسین کو حسین نہیں دیکھتی اور بدصورت کو اتنا خوبصورت بنا کے دکھاتی ہے کہ دلوں پر قیامت ڈھائے۔ اس عورت کی ادائیں بھی اتنی بھونڈی نہیں تھیں کہ آنے والی پنجابی فلم کی ہیروئن کی حیثیت سے اس کی کامیابی کے بارے میں محمود کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ یلی مجنوں پھر سابقہ پوز اور پوزیشن میں آچکے تھے۔ چنانچہ محمود نے اجازت چاہی۔ زیراستعمال مشروب کو قبول کرنے سے معذرت کے ساتھ انکار کرتے ہوئے محمود نے کہا کہ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکے ترجیحاً کافی' ورنہ چائے پیے گا۔

شائلہ سے بات کرنے کا موقع اسے آدھے گھنٹے کے بعد ملا۔ اس نے شائلہ کی ''بہو'' اس کے فلمی مہمانوں پر تبصرے سے گریز کیا مگر شائلہ خود ہی خاصی غیر مطمئن' خفت زدہ اور پریشان سی تھی۔

''تم نے میرے شوہر کو دیکھا' نظامی کو؟'' وہ

بولی۔ ''باقی سب اس کے دوست ہیں' میرے نہیں۔''

''تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟'' محمود نے کافی بناتے ہوئے کہا۔ ''آدمی تو معقول لگتا ہے' مجھے نظامی۔''

''اس کی نامعقولیت یہی ہے کہ وہ کچھ نہیں کرتا۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔''

''پھر تم نے یہ چنڈال چوکڑی کیوں پال رکھی ہے؟'' محمود نے کہا۔ ''کیا مجبوری ہے تمہیں؟''

''تم مانو گے نہیں۔'' وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''مجھے اپنے شوہر سے واقعی محبت ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔ میں نظامی کی ہر جائز ناجائز خواہش پوری کرتی ہوں۔ اس کے سو ناز اٹھاتی ہوں اور زرخرید لونڈی کی طرح اس کی تابعدار ہوں۔ میں جانتی ہوں' اس میں کوئی خوبی نہیں اور اس کی ذات کی خامیاں کیا ہیں۔ تم سے پہلے خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا کہ مجھے کیا مجبوری ہے اور جواب یہی تھا کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ اچھا یا برا' نظامی جیسا بھی ہے۔''

''شانی سے بھی اتنی ہی محبت تھی تمہیں؟'' محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جانی۔'' وہ خلاء میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کی محبت کا موازنہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد مرد تھا۔ اس جیسا کوئی دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بڑی آرزو تھی کہ احمد دوسرا شانی بنے۔ پیشے کے اعتبار سے نہیں' اس میں وہی مردانہ صفات ہوں' وہ اتنا دلیر اور جرأت مند اور بے باک اور کھرا ہو کہ قول اور ایمان کو سمجھنے والا یار کہہ کر یاری پر جان دینے والا' اپنی ذات پر اعتماد کے سہارے بڑے سے بڑے طوفان کا چیلنج قبول کرنے والا اور ساری دنیا کو اپنی ٹھوکر میں رکھنے والا مگر اس میں ایک بھی ایسی بات نہیں' وہ خود کو شاعر اور افسانہ نگار کہتا ہے لیکن میرا خیال ہے۔ اس میں کچھ جھوٹ ہے۔ اس نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے محمود۔''

''اور تم نے..... تم نے اسے بالکل مایوس نہیں کیا؟'' محمود نے کہا۔ ''تم نے خود کو ایک مثالی ماں ثابت کیا ہے۔''

شمائلہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ''نہیں شیلا! میں نے اسے زیادہ مایوس کیا۔ میں اس ماں کا عکس بھی نہ تھی جس کے قدموں کے نیچے بیٹے جنت تلاش کرتے ہیں پھر وہ سعادت مند کیسے ہو سکتا تھا۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے اسے اور اس کی بیوی کو۔''

''کیا انہی مسائل کو تم اپنی زندگی کے لیے خطرہ تصور کرتی ہو؟'' محمود بولا۔

''نہیں محمود! یہ تو سرے سے مسائل ہی نہیں۔ وہ کچھ اور بات ہے۔'' شمائلہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تم نے چوکیدار کے مارے جانے کی خبر تو سنی ہو گی؟'' محمود نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں ابھی دو دن پہلے ہی پہنچا ہوں۔ یہ کب کی بات ہے؟''

''یہ چار ہفتے پرانی بات ہے۔ مری میں اس سے بڑی سنسنی پھیلی تھی۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''وہ میرا پرانا چوکیدار تھا۔ جب میرے پاس ملازم ہوا تھا تو بارہ سال کا تھا اور اوپر کے چھوٹے موٹے کام کیا کرتا تھا۔ آٹھ سال تک میرے ساتھ ہی رہا۔ یہاں اس کی ماں بھی تھی۔ اس کا گھر مری کے نواح میں تھا۔ باپ سردیوں کی برفباری میں راستے سے بھٹک گیا اور اس کی نعش کئی دن بعد برف پگھلنے کے بعد ملی تو آدھی سے زیادہ بھیڑیے کھا چکے تھے پھر میں نے اسے یہاں بھیج دیا۔ سارا سال یہیں رہتا تھا۔ گرمیوں میں ماں بھی ادھر اُدھر کسی کوٹھی میں ملازمت کر لیتی تھی۔'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی اور محمود کو اس کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ نظر آئے۔

''آج کل وہ ایک بہت خطرناک عورت کے پاس ملازم ہے جو میرے سارے مصائب کی ذمہ دار ہے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ چوکیدار کو اسی نے قتل کرایا ہے؟'' محمود نے کہا۔

''معلوم نہیں۔ پولیس کے سامنے میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔'' وہ پہلو بدل کر بولی۔ ''چوکیدار کو کسی نے بڑی بے رحمی سے خنجر کے وار کر کے قتل کیا تھا اور اس کی نعش سرونٹ کوارٹر کے ساتھ خاردار تاروں کی باڑھ پر ڈال دی تھی۔ اس کی دشمنی کسی سے نہیں تھی' اس کا مقصد مجھے دہشت زدہ کرنا تھا۔

''یہ اندازہ کیسے کیا تم نے؟'' محمود چونکا۔

''لوگوں کی باتوں سے نجانے کس نے یہ افواہ پھیلائی کہ قاتل کا اصل نشانہ میں تھی اور چوکیدار تو خوامخواہ مجھے بچاتا ہوا مارا گیا۔ خود پولیس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ یہ بکواس ہے۔ آپ اس سے پوچھیں جو یہ بات کہتا ہے لیکن اس سے مجھے ایک نقصان یہ ہوا کہ دوسرا چوکیدار مجھے نہیں ملا۔ سیزن میں ملازموں کی ویسے ہی قلت رہتی ہے۔ اس پر قتل کی دہشت اور یہ باتیں کہ اب جو میرا محافظ بنے گا' پہلے مارا جائے گا۔ یہ بات جان بوجھ کر مشہور کی گئی تھی۔''

''کیوں؟ کون ہے جو تمہیں دہشت زدہ کرنے کی خاطر ایک بے گناہ کو قتل کرے گا؟'' محمود نے کہا۔

''اور کیا فائدہ ہوگا اس کو؟ کرنا ہوتا تو وہ پہلے تمہیں نہ قتل کر دیتا۔ میری سمجھ میں تو تمہاری یہ منطق نہیں آتی۔ شائلہ اس لڑکے کا کسی سے تنازعہ ہوگا۔ پٹھان ایک نسل کا انتقام دوسری نسل سے بھی لیتے ہیں۔''

''پہلے میری بات تو پوری سن لو۔'' شائلہ نے نروس لہجے میں کہا۔ ''اس واقعہ کو دو ہفتے گزر رہے تھے کہ مجھے ڈاک سے ایک پارسل ملا۔ اس میں سے کپڑے کی بنی ہوئی گڑیا نکلی۔ گڑیا کی گردن کٹی ہوئی تھی اور صرف ایک دھاگے سے لٹک رہی تھی۔ سرخ روشنائی کو خون کے طور پر استعمال کیا گیا تھا جس سے گڑیا کے کپڑے تک لال ہو رہے تھے اور گردن کا زخم بالکل حقیقی لگتا تھا۔''

''یہ کسی کا بے ہودہ مذاق بھی ہوسکتا ہے۔'' محمود نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''قتل کے سانحے کے بعد تم دہشت زدہ تھیں۔ تم نے پولیس کو بتایا تھا؟''

شائلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ گڑیا پارسل میں سے نکلی ہے مگر محمود! تم اسے مذاق کیوں کہتے ہو۔ دھمکی کیوں نہیں سمجھتے۔ دو دن بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ کسی نے میرے بے ضرر سے پالتو کتے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور میری کار میں ڈال دیے۔ میں سیٹوں پر سفید کور رکھتی ہوں۔ اگلی پچھلی سب سیٹوں پر خون ہی خون تھا۔ سر کہیں پڑا تھا' دھڑ کہیں' ٹانگیں الگ الگ۔'' اس کی آواز کانپنے لگی اور اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہوگیا۔

لان پر تاش کھیلنے والے گاڑی میں کہیں جا چکے تھے اور لیلیٰ گھاس پر لیٹے آسمان کو تک رہے تھے۔ محمود نے شائلہ کا ہاتھ تھاما تو وہ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

''دیکھو شائلہ! تم ایک بہت بہادر عورت ہو۔ کیا میں یہ بات نہیں جانتا پھر اتنی معمولی بات پر خوف.....'' وہ بولا۔

''یہ معمولی بات نہیں ہے محمود۔'' شائلہ نے لرزتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پھر دھمکی دی گئی تھی کہ ہم تمہیں کتے کی موت مار سکتے ہیں۔''

''بفرض محال یہ بات مان لی جائے تو محض دھمکی کا مقصد؟'' محمود نے کہا۔ ''کیا اس کے بعد بھی کوئی بات ہوئی؟''

''ہاں پھر دو دن کے وقفے سے کسی نے میری کھڑکی میں منڈیر پر آ کے بیٹھنے والے ایک کبوتر کا ایئر گن سے نشانہ لیا اور زخمی کبوتر پھڑ پھڑاتا ہوا ٹوٹے ہوئے شیشے سے کمرے میں میرے بستر پر آ گرا۔ میں چیخ مار کر بھاگی۔ خون کے چھینٹے مجھ پر بھی پڑے تھے اور بستر کو پھڑکنے والے کبوتر نے لہو میں رنگ دیا۔ میں نے دوسروں کو بتایا تو سب نے ادھر ادھر کا علاقہ دیکھا مگر کسی کو شکاری نہ ملا۔

ایئر گن تو یہاں بارہ تیرہ سال کے بچے بھی لیے پھرتے ہیں۔ پولیس کو میں نے کتے کی موت کا

بتایا تھا تو انہوں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ بیگم صاحب! اب ہم ان کی خاطر تین سو دو کے تحت ایف آئی آر تو درج کرنے سے رہے۔ معلوم کریں گے کہ کون آپ کو پریشان کر رہا ہے۔ کبوتر والے واقع پر بھی ان کا ردعمل یہی رہا کہ کسی بچے کی حرکت تھی جو بھاگ گیا۔ میں دہشت زدہ تھی اور ان کے رویے نے مجھے مشتعل بھی کر دیا۔ میں نے انہیں گالیاں دے کر اور دھمکیاں دے کر نکال دیا۔ پولیس کو تم جانتے ہو مری آنے والے لوگوں کی بیگمات سے ذرا دب جاتے ہیں اور کوئی ہوتا تو بند کر دیا جاتا اور پولیس افسر کو بے عزت کرنے کا خمیازہ بھگت لیتا۔

مزید دو دن گزرے تھے کہ کسی نے اڑتی چڑیا کا نشانہ لیا اور چڑیا لان پر میرے قریب آ کر گری۔ میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ مجھے ہر روز ایک لہولہان چڑیا ملنے لگی۔ کبھی باتھ روم میں اس کا ایک روشن دان باہر کھلتا تھا۔ کبھی تکیے کے نیچے کبھی کپڑوں کے اندر جو الماری میں لٹکے رہتے ہیں۔ یہ مذاق کی بات نہیں تھی۔ مجھے سمجھایا جا رہا تھا کہ تمہاری جان ایک چڑیا سے زیادہ اہم نہیں ہے مگر ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے' وہ مجھ سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔''

''وہ.....؟'' محمود نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''وہ کون ہے؟ کیا بات' کیسی بات' کھل کر کہو؟''

''میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ایک خطرناک عورت کا ذکر کیا تھا۔'' شائلہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں اگر تم کہتی ہو تو وہ خطرناک ہی ہوگی۔'' محمود نے کہا۔ ''کون عورت ہے وہ؟''

''وہ اسی اسٹریٹ میں چھٹے گھر میں رہتی ہے۔'' شائلہ نے کہا۔ ''میری سوکن نظامی کی چہیتی۔''

''تمہارے شوہر نے پہلے شادی کر رکھی تھی۔'' محمود نے چونک کر کہا۔ ''یا بعد میں کی تھی۔''

''اس نے شادی تو ابھی نہیں کی ہے لیکن وہ میرے شوہر کو مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔ ان کے مراسم بھی خطرناک حد تک بڑھ گئے ہیں۔'' شائلہ نے رونا شروع کیا۔ ''نظامی کو میری ذرا پروا نہیں ہے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ ارے شائلہ! تم کیا بزدل گھریلو عورتوں کی طرح رونے بیٹھ گئی ہو۔'' محمود نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ ''ذرا اپنے ماضی کے کارناموں پر نظر ڈالو۔ کوئی عورت تم سے تمہارا شوہر لے سکتی ہے؟''

''میں..... میں اب وہ شائلہ نہیں ہوں محمود۔'' وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔ ''وہ شانی تھا جس نے مجھے اتنا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ اس وقت میں کچھ بھی گنوانے سے نہیں ڈرتی تھی کیونکہ سب کچھ میری دسترس میں تھا پھر جانی مر گیا اور اس کے ساتھ ہی میں مر گئی۔ میں ڈر ڈر کر زندگی گزارتی رہی۔ عیش و عشرت کی زندگی سے پیار کرنے لگی۔ مستقبل سے پیار کرنے لگی۔ میرے پاس اب نقد لاکھوں جمع ہیں۔ میری دو کوٹھیاں ہیں اور ایک شوہر ہے جس سے مجھے بہت محبت ہے۔ میرے بچے جوان ہیں اور اب ان کے بچے ہونے والے ہیں۔ اب میں مرنا نہیں چاہتی محمود' مجھے اپنی یہ زندگی بہت عزیز ہے جس میں سکھ اور راحت کے سوا کچھ نہیں۔ میں کسی قیمت پر اس خوشی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں اور وہ عورت مجھے کھلی دھمکی دے رہی ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

محمود کا ذہن واقعات کا تجزیہ کرنے کے عمل میں الجھا ہوا تھا۔ واقعات بڑے پُراسرار تھے اور ان کا یقیناً کوئی مقصد بھی تھا مگر اس کی عقل میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ایک عورت یہ سب کھیل محض رقابت میں کھیل رہی ہے۔

دوسری ناقابل فہم بات یہ تھی کہ مردہ پرندے شائلہ کے تکیے کے نیچے یا الماری کے کپڑوں میں کیسے پہنچ جاتے تھے۔ اڑنے والے پرندے کا یا کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھے کبوتر کا کسی ماہر نشانے باز کے ہاتھوں زخمی ہو کر شائلہ کے بستر پر یا اس کے پاس آ کر گر جانا تو سمجھ میں آتا تھا مگر گھر کے کسی فرد کی مدد

کے بغیر مردہ جانور کا گھر کے اندر سے ملنا سمجھ آنے والی بات نہیں تھی۔

''ان واقعات کے بعد تم نے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں؟'' محمود نے کہا۔

''میں نے اپنا کمرہ بدل دیا تھا۔'' شائلہ نے کہا۔ ''میرے لیے اس بستر پر سونا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں کھڑکیاں اور روشن دان بند رکھنے لگی تھی۔ یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ میرے پاس ایک ریوالور بھی ہے جو میرے پہلے شوہر شانی نے مجھے دیا تھا اور کہا تھا۔ شائلہ! یہ میرا سب سے قابل اعتماد دوست ہے۔ اسے اپنے ساتھ رکھنا۔ یہ تیرا سب سے اچھا محافظ ثابت ہوگا۔ اگر تو نے سوچے سمجھے بغیر اس کا استعمال نہیں کیا' اس نے مجھے ریوالور چلانے کی تربیت بھی خود ہی دی تھی۔

اور اس وقت میرا نشانہ اتنا کچا ہو گیا تھا کہ میں بیس فٹ کے فاصلے سے موم بتی کا شعلہ بجھا دیتی تھی لیکن موم بتی نہیں گرتی تھی۔ بعد میں شانی سرکس والوں کی طرح سر پر سیب رکھ کر کھڑا ہو جاتا اور مجھے مجبور کرتا کہ نشانہ لو اور میرا نشانہ اس لیے خطا نہیں ہوتا تھا کہ میں شانی کی جان لے ہی نہیں سکتی تھی۔ اب بھی مشق نہ ہونے کے باوجود میں اس ریوالور سے اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ دشمن سامنے آ کر وار نہیں کرتا۔''

''شاید وہ جانتا ہے کہ تم کتنے مضبوط اعصاب کی مالک ہو یا نہیں ہو اور اب وہ اندازہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح تمہیں ذہنی طور پر خوف زدہ کر سکتا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''ایک اور بات محمود۔'' شائلہ نے کہا۔ ''اس چوکیدارنی ماں کو جوان بیٹے کی موت نے تقریباً پاگل کر دیا ہے۔ وہ میرے پاس آئی تھی تو ایک ہی بات بار بار دہرا رہی تھی۔''

''میں اپنے بیٹے کا خون معاف نہیں کروں گی۔ وہ میرا دودھ تھا جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ماسی تم جانتی ہو میں نے اسے اپنے گھر میں کتنے عرصے رکھا۔ میں اس پر کتنا اعتماد کرتی تھی۔ اسے کبھی مجھ سے کسی قسم کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اب لوگ بے پر کی اڑا رہے ہیں کہ وہ میری وجہ سے مارا گیا' یہ سب غلط ہے۔'' معلوم نہیں اس کی سمجھ میں میری بات آئی یا نہیں' وہ باؤلی سی عورت ہے' سوکھی چرخ مگر بلا کی سخت جان۔ اس عمر میں بھی سیدھا چلتی ہے اور ہر روز تین میل دور سے پہاڑوں کے نشیب و فراز طے کر کے سورج نکلتے ہی کام کر کے پہنچ جاتی ہے۔ شام کو غروب آفتاب کے بعد تنہا واپس جاتے نہیں ڈرتی۔ وہ خلاء میں گھورتی رہی اور ایک ہی بات کہتی رہی۔ وہ اس گھر میں مارا گیا ہے۔ میں اس گھر سے انتقام لوں گی۔ اس کو مارنے والا زندہ نہیں رہے گا۔ بیگم صاحب! اور اپنی جنونی کیفیت میں اسی طرح واپس چلی گئی۔ اگر لوگوں کی بات اس کے دل میں بیٹھ گئی یا اسے کسی نے قائل کر دیا کہ اس کے بیٹے کی موت کا سبب میں ہوں تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ اصل قاتل کا سراغ نہ ملے تو مجھے نشانہ بنا لے۔ پاگل پن میں آدمی کیا نہیں کر سکتا۔''

محمود نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کسی پاگل کا نہیں' انتہائی ذہین اور چالاک آدمی کا کام ہے۔ وہ بڑھیا سامنے آ کر تم پر خنجر سے حملہ کر سکتی ہے مگر دہشت زدہ کرنے کے لیے ایسے پُراسرار طریقے اختیار نہیں کر سکتی۔ اس سے فائدہ بھی کیا ہے اس کو اور اس گھر میں تم ہی تو نہیں ہو۔ یہ چنڈال چوکڑی کب سے تمہارے ساتھ ہے۔''

''مئی سے۔ یہ سب لوگ سیزن کے آغاز میں ہی ہمارے ساتھ آئے تھے۔'' شائلہ نے کہا۔ ''احمد کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ان کے لیے یہ ہنی مون تھا۔ نظامی نے کہا تو میں جنگل میں منگل کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ میرے ساتھ میرے یار بھی چلیں گے۔ یہ پروڈیوسر چوہدری فضل دین ہے۔ دوسرا اس کا چھوٹا بھائی نواز دین دونوں ایک دوسرے کو چھوٹے میاں بڑے میاں کہہ کر بلاتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے لوگ

بھی یہی کہتے ہیں۔ شہر میں ان کی سائیکلوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے بلکہ تھی جسے انہوں نے فلم بنانے کے لیے بیچ دیا اور ایک بہت بڑا مکان بھی ٹھکانے لگا دیا۔ معلوم نہیں اس سے کتنا پیسہ ملا اور اب کتنا باقی ہے۔

پنجابی فلم پر زیادہ خرچ تو نہیں ہوتا اور ہیروئن تو شاید یہ شاہی محلے سے پکڑ لائے ہیں۔ چھوٹے میاں کی منظور نظر ہے۔ خدا نے چاہا تو وہی انجام ہوگا کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔'' چھوٹے میاں اور بڑے میاں وہیں۔ سائیکلوں کی دکان پر پنکچر لگاتے نظر آئیں گے۔ بڑے میاں صاحب دو چار فلموں میں اسٹنٹ مین رہے ہیں۔ مار دھاڑ کے مناظر میں ڈبل بھی کرتے تھے۔ وہیں سے ہیرو بننے کا شوق چڑھا۔ اب معاہدہ یہ ہوا ہے کہ ہیروئن چھوٹے میاں صاحب کی اور ہیرو خود بڑے میاں صاحب۔ پروڈیوسر کہلائیں گے۔ چھوٹے میاں صاحب تو ہدایت کار۔ بڑے میاں صاحب تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے مگر میں نظامی کی وجہ سے مجبور ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ گئے تو میں بھی چلا جاؤں گا۔''

''فلم بنانے کا اعلان کر کے یہ لوگ یہاں آ کر بیٹھ گئے؟'' محمود نے کہا۔

''نہیں ایک ڈیڑھ مہینے شوٹنگز چلی تھی۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''میں نے تو زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ احمد کو انہوں نے مکالمے اور منظر نامہ لکھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بگڑ گیا کہ میں اتنا گیا گزرا ادیب نہیں ہوں۔ رابعہ کو سائیڈ ہیروئن یا ویمپ کا کردار دینا چاہتے تھے اور وہ بھی تیار تھی مگر احمد نہیں مانا۔ شہر سے کچھ لوگ آتے رہے اور لوکیشن پر شوٹنگ بھی ہوتی رہی۔ یہاں کے لوگ اس کے عادی ہیں، اس لیے زیادہ سنسنی نہیں پھیلی۔ ورنہ گھر میں مجمع لگ جاتا یا دروازے پر ہجوم کھڑا رہتا۔ خیریت ہوئی کہ وہ لوگ جون کے آخر میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر چلے گئے۔ یہ گھر بالکل مسافر خانہ بن گیا تھا۔ میرا بس چلتا تو کسی ہوٹل میں منتقل ہو جاتی لیکن نظامی بڑا خوش تھا کہ یہی تو رونق ہے۔ کچھ ایکٹر وغیرہ بھی چند روز مقیم رہی تھیں۔ دن رات ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ اب ان کا کہنا ہے کہ باقی شوٹنگ ان ڈور ہے اور شہر کے بڑے بڑے نگار خانوں میں ہوگی۔ ایسے لوگ فلمیں بنائیں گے تو فلمیں کیا ہوں گی اور صنعت کیا ترقی کرے گا۔''

محمود ہنسا۔ ''تمہیں بعد میں اس وقت مایوسی ہوگی جب یہی فلم باکس آفس پر ہٹ ہو کر سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی کرے گی۔ یہ بے وقوف لوگ نہیں ہیں، بزنس مین ہیں۔ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت کہ جب تک دنیا میں بے وقوف موجود ہیں، عقل مند بھوکے نہیں مر سکتے۔''

احمد اور عینی اندر جا چکے تھے اور غالباً ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ گیٹ سے شمائلہ کی ٹویوٹا مارک ٹو اندر داخل ہوئی، جسے بڑے میاں صاحب چلا رہے تھے۔ چھوٹے میاں صاحب اور نظامی پچھلی سیٹ پر تھے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی گھوم کر ان دونوں پر پڑی تو انہیں احساس ہوا کہ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا ہے۔ چنڈال چوکڑی کے ہر رکن نے بطور خاص اس بات کو نوٹ کیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم بھی سب کے ساتھ مل کر کھانا کھا لو، اندازہ ہو جائے گا کہ کیسے لوگ ہیں۔''

''تمہارے شوہر کے دل میں رقابت کی آگ تو نہیں بھڑک اٹھے گی؟'' محمود نے اس کی تقلید کی۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''وہ جانتا ہے کہ میں کتنی مجبور ہوں۔'' شمائلہ بولی۔ ''پر پنچھی کے بارے میں یہ فکر کون کرتا ہے کہ وہ پنجرے سے نکل کر اڑ جائے گا۔ یہ آگ تو میرے دل میں بھڑک رہی ہے اور خود نظامی نے لگائی ہے۔ تم کیوں ڈرتے ہو۔''

محمود نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر انگڑائی لی اور صبح کی بے حد لطیف اور تازگی بخش ہوا میں گہرے سانس لینے لگا۔ حد نگاہ تک ہر طرف ایک دوسرے

سے ملے ہوئے درختوں کی فصیل تھی جن کے سپاٹ تنے ڈیڑھ سو اور دو سو فٹ تک بلند تھے۔ نیچے بھی زمین پر وہی صورت حال تھی کہ سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی' بن گیا روئے آب پر کائی۔ خودرو پودوں میں ہر رنگ وروپ کے پھول کھلے ہوئے تھے اور فضا یوکلپٹس کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ گیراج کے کھلے دروازے میں سرخ رنگ ٹیوٹا دکھائی دے رہی تھی۔

ساتھ والے سرونٹ کوارٹر میں تالا پڑا ہوا تھا اور چھت کی چمنی کے ساتھ کبوتروں کی ایک چھتری پر تین کبوتر اداس بیٹھے تھے۔ یہ شاید مقتول چوکیدار کا شوق تھا۔ اچانک ان میں سے ایک کبوتر اڑا اور اسی کھڑکی کی دہلیز پر آ بیٹھا جس میں سے محمود صبح کا نظارہ کر رہا تھا۔

کبوتر نے دانہ چگنا شروع کیا تو محمود کو حیرانی ہوئی۔ دہلیز کے باہر سیمنٹ کی منڈیر پر دانہ پہلے سے موجود تھا اور کبوتر شاید اس کی انگڑائی کو اشارہ سمجھ کر آیا تھا یا پالتو کبوتر تھے جو ایک قسم کے ریموٹ کنٹرول کو سمجھتے تھے۔ اس نے کبوتر کے نرم پروں پر ہاتھ پھیرا اور کبوتر نے اس محبت کے جواب میں غٹرغوں سے ''تھینک یو'' جیسی بات کی۔ گھر میں ابھی مکمل سکوت تھا جس کا مطلب تھا کہ جگانے کے لیے بیڈ ٹی لے کر حاضر ہونے والے ملازم بھی ڈیوٹی پر ابھی نہیں پہنچے ہیں۔ دم بدم پھیلتے ہوئے اجالے میں محمود کو ایک متحرک سایہ نظر آیا۔ اس نے نظر جما کر دیکھا۔ ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر کوئی دیہاتی عورت آہستہ آہستہ چلتی ایک گھر کے عقب میں پھیلے ہوئے نشیب سے اوپر جا رہی تھی۔ اگر اس کے پاس دوربین ہوتی تو وہ صورت کے نقوش کو قریب لا کر دیکھ سکتا تھا۔

مگر اتنے فاصلے پر بھی یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وہ کوئی دبلی پتلی اور عمر رسیدہ عورت ہے۔ فاصلے کو دیکھتے ہوئے محمود نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عورت اس چوکیدار کی ماں ہو سکتی ہے۔ وہ پانچویں چھٹے گھر کی طرف رواں تھی جو شائلہ کے کہنے کے مطابق اسی خطرناک عورت' یعنی اس کی سوکن کا گھر تھا جو نظامی کو حاصل کرنے کے لیے ایک دہشت زدہ کرنے والا ڈرامہ رچا رہی تھی۔ خادمہ کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جو مری میں فیشن اور ضرورت کے تقاضے پورے کرتی ہے اور بوڑھوں یا جوانوں کے ہاتھ میں چڑھائی پر سہارا دیتی ہے اور اترائی پر بریک کا کام کرتی ہے۔

محمود نے وہیں سے دوسرے کمرے کی پوزیشن دیکھی۔ اوپر کے دو کمرے نچلی سطح کے دو کمروں کی چھت پر تھے اور ایک کمرہ جو اس کے اپنے کمرے کے نیچے تھا۔ شائلہ اور اس کے شوہر کا بیڈروم ہو سکتا تھا۔ چھوٹے اور بڑے میاں صاحب اوپر مقیم تھے جس کا مطلب تھا کہ باقی تین بیڈرومز میں سے ساتھ والا مستقبل کی عظیم ہیروئن کا تھا۔ اس نے ذرا آگے جھک کر دیکھا تو اسے بند کھڑکی ہی نہیں' منڈیر پر بکھرے ہوئے باجرے کے دانے بھی نظر آ گئے۔ یہ کھڑکی مقتول چوکیدار کے سرونٹ کوارٹر اور گیراج کے علاوہ تقریباً پچاس فٹ کی گہرائی پر نظر آنے والی سیاہ پتھر کی چٹان سے بھی نشانہ بنا سکتی اور نشانہ بنانے والا اگلے لمحے کود کر گھنے جنگل اور نشیب میں یا درختوں کی اوٹ میں کہیں بھی غائب ہو سکتا تھا۔ اس نے نیچے جلے بنفس نفیس اس صورت حال کا بغور جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ صبح کی ہواخوری کا عذر کسی کے لیے شک کا سبب نہیں بن سکتا تھا۔

ابھی وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹا ہی تھا کہ اسے تالی بجنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی جو صبح کے سکوت میں کسی چھوٹے سے پٹاخے کی طرح تھی مگر وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ ابھی وہ پلٹا بھی نہ تھا کہ پھڑکتا ہوا کبوتر اس سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ نیلی اور سفید دھاریوں والے شب خوابی کے لباس پر خون کے دھبے چمکنے لگے۔ وہ تکلیف سے فرش پر لوٹ لگاتے کبوتر کو چھوڑ کر کھڑکی کی طرف لپکا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔

کبوتر کا نشانہ یقیناً نیچے سے لیا گیا تھا' ورنہ وہ اچھل کر اوپر نہ آتا۔ وہ خادمہ بھی نظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ محمود کو ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ اس کے

ہاتھ میں سہارے کے لیے لاٹھی تھی یا ایئر گن مگر ایئر گن سے اتنے فاصلے پر نشانہ لینا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ محمود نے جو آواز سنی تھی یا شاید یہ اندازے کی غلطی تھی۔

نیچے پچاس گز تک درختوں میں اڑنے والے پرندوں کے سوا کوئی ذی روح متحرک نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی بند کی اور پردے برابر کر دیے مگر درمیان کی ایک جھری سے جھانکتا رہا۔ دس منٹ کے بعد جب کبوتر بھی سرد پڑ چکا تھا' اس نے اس ساکت منظر کو نگاہ میں رکھنا بے سود سمجھا۔ اگر کوئی فائر کر کے فوراً چھپ گیا ہوتا تو اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یقیناً نکل آتا اور غائب ہو جاتا۔ اس نے خون آلود کپڑے تبدیل کیے۔ مردہ کبوتر کو الماری میں بچھا ہوا پرانا اخبار نکال کر لپیٹا اور فرش پر سے خون کے داغ' اپنے اتارے ہوئے کپڑوں سے رگڑ کر صاف کیے۔

پوری طرح مطمئن ہو کر وہ اخبار کا پیکٹ اٹھائے ہوئے باہر آیا تو پو پھٹ چکی تھی۔ سرمئی پہاڑوں کے اوپر سنہرا رنگ یوں لگتا تھا جیسے اس بلندی کے پیچھے جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ اجلی دھوپ نے آسمان کو روشن کر دیا اور اس نے چھٹے گھر کے سامنے رک کر اندر دیکھا۔ دو بیڈ روم کی مختصر سی کاٹیج کے گرد چار فٹ اونچی دیوار تھی اور دیوار پر ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے رنگ برنگ تیز دھار والے نوکیلے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ لوہے کے گیٹ کے باہر لیٹر بکس پر صرف کاٹیج نمبر لکھا ہوا تھا۔ گیٹ سے دائیں ہاتھ والے ستون پر سنگ مرمر کی چھوٹی سی تختی پر اصل مالک کا نام اور کاٹیج کا سن تعمیر لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ صاف ظاہر تھا کہ وہ موجودہ مکین کرائے دار تھا۔ وہ گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہوا اور سیدھا برآمدے تک آ گیا اور کبوتر کی بید کو میز پر رکھ کر اطمینان سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔

پچاس قدم چل کر اس نے مڑ کر دیکھا' وہی عمر رسیدہ عورت ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر سیدھی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی بے نیازی سے چلتا گیا پھر ایک پتلی سی سڑک پر دائیں جانب مڑ گیا۔ ایک دیوار کے ختم ہوتے ہی اسے نشیب کی جانب اترنے والی پگڈنڈی نظر آئی اور وہ اس بل کھاتے ہوئے راستے پر چل پڑا جو انسانی قدموں نے برسوں میں تراشا تھا۔ اب وہ شمائلہ اور اس کی سوکن کے گھروں کی قطار کے پیچھے والی وادی میں تھا اور اسے اوپر بنے ہوئے گھروں کی منڈیریں اور مخروطی چھتوں کے روشن دان' دو منزلہ گھروں کی اوپری منزل کے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ چمنیوں سے اٹھنے والا دھواں باورچی خانے میں ناشتے کی تیاریوں کی خبر دیتا تھا۔

کہیں کہیں کسی گھر میں زندگی کے آثار بھی تھے۔ ایک صاحب ننگے پاؤں شبنم آلود گھاس پر ٹہل رہے تھے۔ ایک گھر میں صبح کا آغاز اسٹیریو نے کیا تھا۔

شمائلہ کے گھر میں نیچے پہنچ کر محمود نے اندازہ کیا کہ اتنی دور سے شکاری رائفل لے کر بھی کوئی وہ کام نہیں کر سکتا جو کوئی اپنی ایئر گن سے کر رہا تھا۔ ذرا اوپر آ کے وہ آدمی کے قد سے اونچی سیاہ پتھر کی چٹان پر کھڑا ہوا' تب بھی اسے سرونٹ کوارٹر اور گیراج کے عقب کی دیواروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ درختوں کی کثرت کے باعث کاٹیج کی جھلک سی نظر آتی تھی۔ وہ کچھ اور اوپر آنے کے لیے چٹان پر سے اترا ہی تھا کہ اسے چھوٹے اور بڑے میاں صاحب دکھائی دیے۔

وہ دونوں ہی آدھی آستین والے چست اور رنگین بنیان' کینوس کے جوتے اور کریز سے بے نیاز گہرے رنگ کے کارٹرائے کی پتلون پہنے ہوئے تھے۔ بیک وقت وہ دونوں سامنے سے راستہ روک کے یوں کھڑے ہو گئے کہ چٹان اس کے پیچھے رہی۔ ان کے جارحانہ انداز دیکھ کر وہ رک گیا۔

''بڑے میاں صاحب۔'' ایک نے دونوں بازوؤں کو باندھ کر سینے پر رکھا۔ پیر پھیلائے اور سر کو تھوڑا سا خم کر کے کہا۔

''یہ تو اپنے محمود صاحب لگتے ہیں۔'' اس کے طاقتور بازوؤں کی مچھلیاں اور نمایاں ہوگئیں۔

''شک کی کیا بات ہے چھوٹے میاں صاحب۔'' دوسرے نے سگریٹ کو لبوں میں دبا کے کہا۔ ''چوکھٹا نہیں دیکھتے' میں نے تو کل بھی کہا تھا کہ فردوس کو چھوڑیں ان کو ڈالیں۔''

ان کے عزائم کے بارے میں اب تک شبہ نہیں رہا تھا۔ محمود نے دونوں ہاتھ نائٹ گاؤن کے اندر سے نکال لیے۔ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود وہ دونوں جوکروں سے نمٹ سکتا تھا جن کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ باکسنگ چھوڑنے کے بعد بھی محمود ریلوے کی ٹیم کا کوچ رہا تھا اور نیشنل باکسنگ چیمپئن شپ میں ریفری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

''اس فضول بکواس کا کیا مطلب ہے؟'' محمود نے برہمی سے کہا۔

''محمود صاحب کا غصہ تیز ہے بڑے میاں صاحب۔'' دوسرا بولا۔ ''پہلے آپ کہو۔''

''اچھا۔'' پہلے نے کہا۔ ''تو اپنے محمود صاحب آپ کرتے کیا ہیں کام دھندہ۔''

''کرنے کو بہت کچھ کرسکتا ہوں میاں برادران۔'' محمود نے غرا کر کہا۔ ''مگر میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔''

''واہ جی واہ..... کیا ستھری بات کی ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''رکھنا بھی چاہیے' اپنے محمود صاحب تو بڑے سمجھ دار آدمی ہیں۔''

''نہیں بڑے میاں صاحب! یہ ذرا بھی سمجھ دار ہوتے تو یہاں کیوں آتے۔ بھلا یہ کوئی وقت ہے ادھر آنے کا۔'' پہلا بولا۔

''او جی..... پھر کیا ہوا۔ یہ اب چلے جائیں گے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''غلطی بندے سے ہی ہوتی ہے' جانے دو ان کو۔''

''تم دونوں کو کس بات کا نشہ ہے؟'' محمود نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ ''شراب کا یا بدمعاشی کی طاقت کا؟ میرا ابھی یہاں سے جانے کا کوئی پروگرام نہیں۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

محمود کی نگاہ ایک پل کے لیے بھی ان پر سے نہیں ہٹی تھی مگر وہ دونوں اداکاری سے دھوکہ دینے کے ماہر تھے۔ چھوٹے میاں نے کھڑے کھڑے اتنی پھرتی سے ہاتھ گھمایا اور محمود کے منہ پر مکا مارا کہ وہ سنبھل نہ سکا اور پیچھے چٹان سے ٹکرا کر گرا۔

''ہم بھی تو یہی کہتے تھے محمود صاحب کہ راستے سے ہٹ جاؤ۔'' بڑے میاں نے یوں سگریٹ کی راکھ جھاڑی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ چھوٹے میاں صاحب بھی پھر اسی پوز میں بالکل پُرسکون کھڑے تھے۔ ''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی خدانخواستہ۔''

''ابھی تو نہیں آئی لیکن اگر کوئی بڑا حادثہ ہوگیا۔ خدانخواستہ تو..... نہ جانے کیا ہوجائے.....'' چھوٹے میاں صاحب بولے۔

''اللہ بچائے چھوٹے میاں صاحب۔'' بڑا بولا۔ ''پہاڑوں میں آدمی کا پیر بھی پھسل جاتا ہے اور بارش ہو نہ ہو' حادثات تو یہاں بڑے ہی خوفناک ہوتے ہیں۔''

محمود کو غیر متوقع وار اور چٹان پر سر لگنے سے چکر آ گیا تھا لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اس کے کان دھمکی کے ہر لفظ کا مفہوم اس کے ذہن تک پہنچا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ سنبھل کر پھر کھڑا ہوگیا۔ اس کے اندر کا باکسر اب حریف کا ناک آؤٹ کردینے کے لیے بیدار ہوچکا تھا۔ اس نے بیک وقت ان دونوں کو ایک مشتعل کردینے والی غلیظ گالی دی۔

''تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اتنی آسانی سے شائلہ کو ٹھکانے لگا دو گے؟ اسے دہشت زدہ کرکے پاگل کردو گے تاکہ وہ پہاڑ پر سے کود کر خودکشی کرے یا کسی حادثہ کا شکار ہوجائے اور پھر تم نظامی کے مال کو اپنا سمجھ کر ہڑپ کرسکو۔ میرے ہوتے ہوئے تم کو اس کے پیسے سے کفن بھی نصیب نہیں ہوگا۔'' محمود نے دیکھا کہ وہ دونوں گالی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے ہیں اور اس کی بات پر بھی یوں مسکرا رہے ہیں جیسے یہ

کوئی لطیفہ ہے۔

محمود نے بڑے میاں کے منہ پر تھوک دیا۔ حسب توقع چھوٹے میاں نے پھر ہاتھ گھمایا مگر اب محمود پوری طرح تیار تھا۔

اس نے وار کو ایک ہاتھ پر روکا اور دوسرے ہاتھ کی بھرپور قوت سے اس کے جبڑے پر بھرپور مکا مارا۔ چھوٹے میاں صاحب چار قدم دور جا گرے۔ محمود نے بڑے میاں کو بالکل مہلت نہیں دی۔ دوسرا زبردست گھونسا اس کی ٹھوڑی کے نیچے پڑا۔ وہ گھوم کر کراہا اور مضحکہ خیز طریقے پر بھائی کے پاس جا لیٹا۔ چھوٹے میاں ہاتھ کے سہارے سے اٹھ کر ہونٹ کے کنارے سے رسنے والے خون کو صاف کر رہا تھا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی خدانخواستہ ملک صاحب۔'' محمود نے پُرسکون لہجے میں طنز سے کہا ''جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' ابھی میرا قیام یہیں مری میں ہے اور اسی گھر میں رہے گا اور جب تک رہے گا جب تک شائلہ کے گرد منڈلانے والے مردار خور گدھ دفع نہیں ہو جاتے۔ سمجھ دار کو اشارہ ہی کافی ہونا چاہیے۔ چھوٹے میاں اور بڑے میاں صاحبان۔'' وہ حقارت سے ہاتھ جھاڑ کر چل پڑے۔

اس وقت دونوں بھائی سنبھل گئے تھے اور محمود کو خون آشام نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کھلی دھمکی تھی کہ محمود کو اپنے کام سے کام رکھنے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ لیکن محمود یہ چیلنج بہت پہلے قبول کر چکا تھا۔ اس وقت جب اس نے ہوٹل چھوڑ کر شائلہ کے گھر رہنا منظور کیا تھا۔

وہ گھر سے بیس قدم دور تھا۔ جب اس نے شائلہ کے چیخنے کی آواز سنی اس کی آواز میں خوف کا ہسٹیریا تھا اور وہ باری باری نظامی اور محمود کو پکار رہی تھی۔ محمود بے تحاشا دوڑا اور گھوم جانے کے بجائے خاردار تاروں کی باڑھ پر سے کود گیا۔ جب وہ اس کمرے میں پہنچا جو اس کے انداز کے مطابق شائلہ اور نظامی کا مشترکہ بیڈ روم تھا تو اسے شائلہ بستر پر گٹھڑی سی بنی دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے زور زور سے روتی نظر آئی۔ کمرے میں اس کے علاوہ چار افراد تھے۔ اس کا شوہر نظامی نائٹ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سرہانے کی طرف بالکل سیدھا اور کچھ پریشان کھڑا تھا۔ یوں جیسے اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو۔

شائلہ کا بیٹا احمد دروازے کے قریب موجود تھا اور اس کی صورت پر نفرت آمیز خفت زدہ سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے اپنی ماں کے کردار پر۔ اس کے ناقابل فہم رویے پر ہسٹریا کے اس دور سے ہر بار ڈھونگ پر وہ محض رشتے کی مجبوری کی وجہ سے چپ ہے۔ ورنہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لیے غیر اہم ہے اور قابل افسوس ہے اور باعث صد ملامت' صرف احمد کی بیوی رابعہ نے اسے سنبھال رکھا تھا اور اسے پانی کے چند گھونٹ لینے پر مجبور کر رہی تھی۔ پنجابی ہیروئن کبوتر کی موت پر زیادہ غمگین لگتی تھی۔

''کیا بات ہے۔'' محمود نے بے اختیار سوال کیا۔ ''کیا ہوا ہے شائلہ کو؟'' پھر اس کی نظر کھڑکی پر پڑے لہولہان کبوتر پر پڑی جو کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے اسی طرح اندر آیا تھا۔ جیسے اوپر کی منزل پر کچھ اس کے کمرے میں آ گرا تھا۔ اس نے کھڑکی کا قریب سے جائزہ لیا۔ اس کی منڈیر پر باجرے کے دانے اب بھی پڑے تھے۔ محمود کی نگاہ خود بخود ٹوٹے ہوئے شیشے سے دکھائی دینے والی اس چھتری پر چلی گئی جو مقتول چوکیدار کے کوارٹر کی چھت پر جھول رہا تھا۔ اس پر اب ایک ہی کبوتر سہما ہوا سا پر سمیٹے بیٹھا تھا۔ کسی کا آخری شکار محمود نے سوچا..... اور اس کے بعد..... مگر یہ فرض کر لینا کہ اس کے بعد شائلہ خود شکار ہو گی قبل از وقت تھا۔

بالآخر نظامی نے اپنی بیوی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ محمود نے اسے حوصلہ رکھنے کی رسمی سی تلقین کی اور احمد کی بیوی اسے ایک سکون بخش گولی کھلانے میں کامیاب ہو گئی۔ ہسٹریا کے دورے کی پہلی شدید لہر گزر چکی تھی۔ شائلہ خود بھی اتنے سارے لوگوں کے سامنے تماشا بننے کے احساس سے کچھ پشیمان تھی۔ وہ

آنکھیں بند کر کے بستر پر سیدھی لیٹ گئی۔

''ممی کا یہ نفسیاتی مسئلہ دن بدن زیادہ پریشان کن ہوتا جارہا ہے۔'' رابعہ نے سر کی جھاڑ جھنکار بالوں کو کھجا کر کہا۔

''کیسا نفسیاتی مسئلہ'' محمود نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''یہی فوبیا'' رابعہ نے نفسیات کی مخصوص اصطلاح استعمال کی۔ ''پرنس کا خوف۔ ان کی دہشت کچھ لوگ بظاہر بلاوجہ بند کمروں میں خائف رہتے ہیں۔ کھڑکیاں' دروازے کھلے رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ کچھ بلندی کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں یا پانی سے ڈرتے ہیں اور کشتی میں بیٹھ کر دریا تک پار نہیں کر سکے۔ جھیل کی سیریوں کرتے اور بحری جہاز کا سفر اختیار نہیں کرتے۔ جانوروں سے یہ ڈر بہت عام ہے۔ ممی کے لاشعور میں بچپن کے ایک ناخوشگوار حادثے کی یاد باقی ہے۔''

پنجابی ہیروئن اس عالمانہ گفتگو سے بڑی مرعوب ہوئی تھی اور احمد اپنی بیوی کی لیاقت کے مظاہرے پر مطمئن تھا جو صورت حال کو سنبھالنے کے بعد اس کا معقول تجزیہ بھی کر رہی تھی۔

''وہ کیا حادثہ تھا؟'' محمود نے انجان بن کر سوال کیا۔ جواب وہ جانتا تھا۔ شائلہ بچپن سے ہی انتہائی شریر اور چنچل لڑکی تھی اور لڑکوں والے کھیل کھیلتی تھی اور اپنی خوبی کے مظاہرہ کا خمیازہ کئی بار بھگت چکی تھی۔ ایک ہی اولاد ہونے کے باعث اس کی خطرناک شرارتوں سے والدین کی جان سولی پر لٹکی رہتی تھی اور اس کی ماں چلاتی رہتی تھی کہ لڑکی تو خود بھی نہیں جئے گی اور ہمیں بھی نہیں جینے دے گی۔ بعد میں تقدیر نے سچ کر دکھایا۔ گو اس کی ذمہ دار شائلہ میں تھی۔ ایک بار وہ شرط لگا کر چھت پر سے صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر کودی اور اندازہ غلط ہو جانے کے باعث پٹی سے ٹکرائی تو پٹی کے ساتھ ہی اس کی ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ وہ تین مہینے پلستر چڑھائے لیٹی رہی اور قبل از وقت اٹھنے کی کوشش میں گری تو ہڈی پھر ٹوٹ گئی۔

دوسری بار ماں نے واضح کر دیا کہ وہ اب رسی سے پلنگ کے ساتھ باندھ دے گی اور دھمکی کو موثر بنانے کے لیے رسی منگوا کر بھی رکھ لی۔

ایک سال بعد وہ درخت پر چڑھ کے پرندوں کے گھونسلوں میں جھانک رہی تھی اور اندر سے برآمد ہونے والے انڈوں پر اور بچوں پر بے حد متعجب ہو رہی تھی کہ اچانک ایک پرندے نے اپنے گھر کی تباہی پر آمادہ نظر آنے والے حملہ آور پر یلغار کی۔ گھونسلے میں اس کی مادہ انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی اور نر کا یہ کام تھا کہ اس کی حفاظت کرے۔

پرندے کا حملہ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ شائلہ گھبرا گئی۔ پرندے نے چلا چلا کر اس پر کئی بار حملے کیے اور اپنی چونچ سے اور اپنے پنجوں سے شائلہ کی آنکھیں نکال لینے کی بھرپور کوشش کی۔ شائلہ نے دونوں ہاتھ سامنے رکھ کر چہرے کو بچاتے ہوئے نیچے اترنا شروع کیا۔ مگر مشتعل پرندے نے حملے جاری رکھے۔ اس کے پر کئی بار شائلہ کے منہ پر لگے اور اس کی نرنازک کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی۔ خون بہتا ہوا دیکھ کر وہ بدحواس ہوگئی اور اپنا توازن کھو بیٹھی اور اس بار شائلہ کا بایاں ہاتھ دو جگہ سے ٹوٹا اور وہ چار مہینے تک گلے کا ہار بنائے ہوئے پھری۔

سوئے ہوئے والدین شائلہ کی چیخوں سے بھاگے آئے۔ تو وہ بے ہوش پڑی تھی اسپتال میں اسے دو دن سکون بخش دواؤں سے سلائے رکھا گیا۔ مگر اس کے باوجود زمین پر طاری دہشت کا یہ حال تھا کہ جیسے ہی دوا کا اثر کم ہونے لگتا۔ وہ ایک ہاتھ منہ کے سامنے لے جا کر آہستہ آہستہ کراہنے لگتی تھی۔

''امی مجھے بچاؤ..... مجھے بچاؤ..... امی..... وہ دیکھئے۔ وہ پھر آرہا ہے اور وہ میری آنکھ پھوڑنا چاہتا ہے امی۔''

''یہ نشان دیکھا ہوگا آپ نے۔'' رابعہ نے شائلہ کی پیشانی پر ایک پکے سے داغ کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اسی ناخوشگوار حادثے کے زخم کی نشانی

ہے۔''

محمود نے اس کی ساری بات نہیں سنی تھی۔ مگر اس نے سر ہلایا۔ ''میں نفسیات کی اس تاویل سے اتفاق کرتا ہوں مگر یہ مسئلہ کچھ شکاریات کا بھی ہے یہ کبوتر تو کسی فوبیا میں مبتلا نہیں تھا؟''

احمد نے برا سا منہ بنایا۔ ''ہم تو امی کی فریاد وفغاں پر آئے تھے اس وقت یہ کبوتر یہیں موجود تھا۔''

''ہاں..... جناب'' پنجابی ہیروئن نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کہا۔ ''میں بھی اپنے کمرے سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ کبوتر فوت ہو چکا تھا۔''

''میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔'' نظامی نے سر کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی نائٹ گاؤن کی جیب سے سگریٹ نکالا اور دوسری جیب میں لائٹر کے لیے ہاتھ ڈالا۔

''میں کچن میں اپنے لیے کافی بنا رہا تھا' خانسا ماں حرام خورا کثر بھول جاتا ہے کہ میں آنکھ کھلتے ہی اس کا عادی ہوں۔'' اس نے لبوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو بڑے سکون سے جلایا۔ اس شخص کی صورت میں ہی نہیں انداز و اطوار میں بھی ایک پرکشش وقار آمیز متانت تھی۔

''تم سب اپنی اپنی صفائی پیش کرتے ہو۔'' شمائلہ نے اچانک بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں مرجاؤں گی.....''

''ممی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔'' رابعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہم سب کے ہوتے ہوئے ان کبوتروں کو مارنے والا آپ کو نہیں مار سکتا۔ اس خوف کو ذہن سے نکال دیجیے۔''

''کیسے نکال دوں اسی خوف کو ذہن سے؟'' شمائلہ برہم ہو کر بولی۔ ''نشانہ کسی نے کبوتر کو نہیں بنایا تھا۔ مجھے بنایا تھا لیکن میں بچ گئی۔''

''ممی گولی کبوتر کو لگی تھی۔'' احمد نے دیوار کے ایک نشان کی طرف اشارہ کیا جو کھڑکی کے سامنے دیوار پر نظر آ رہا تھا۔

''ہاں ..... ہاں مجھے معلوم ہے.....'' شمائلہ چلائی۔ ''لیکن فائر ایک نہیں دو ہوئے تھے۔ منڈیر پر تو ایک ہی کبوتر بیٹھا ہوا تھا۔''

کمرے میں ایک لمحے کے لیے بوجھل قسم کی خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ جس میں ہر شخص کے خیالات کی بازگشت الگ تھی۔

پھر باہر کہیں دور سے ائرگن کے شاٹس کی آواز آئی اور احمد نے موقع سے فائدہ اٹھا کے اس جمود کو توڑا۔ ''یہ سن لیجیے ممی' یہاں تو لونڈے سارا دن ایرگن اُٹھا' چڑیاں کوے مارتے پھرتے ہیں۔ آپ کی جان کو کوئی خطرہ وغیرہ لاحق نہیں ہے ممی۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' شمائلہ نے تلخی سے کہا۔

''میں ہی کچھ سٹھیا رہی ہوں اور حالات یہی رہے تو بالکل پاگل ہو جاؤں گی۔''

''ایسا نہیں ہوگا شمائلہ'' محمود نے کہا۔ ''اگر کوئی تمہیں پاگل بنا کر فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو.....''

''تمہارا مطلب جانتے بوجھتے کوئی یہ سب کر رہا ہے؟'' احمد نے مشتعل ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں'' محمود نے پلٹ کر سخت لہجے میں کہا۔

''نہیں تو مجھے بتاؤ اس منڈیر پر کبوتروں کے لیے دانہ کس نے ڈالا ہے؟ دیکھو۔''

احمد آگے بڑھا' اس نے کھڑکی کھولے بغیر باہر دیکھا اور چند سیکنڈ ساکت وجامد کھڑا رہا۔ پنجابی فلموں کی ہیروئن نے محسوس کیا کہ کمرے میں اس کی موجودگی قطعی غیر ضروری ہے۔ چنانچہ وہ یوں باہر آ گئی جیسے یہ منظر کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی ہے۔ پھر محمود نے فرش پر پڑے ہوئے کبوتر کو ٹانگ سے اٹھایا۔

''اسے کہاں لے جا رہے ہو؟'' احمد نے پلٹ کر کہا۔

''یہ ٹرافی ایک خاتون کو پیش کرنی ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ان کا ان معاملات سے

گہرا تعلق ہے۔"

"کیوں نظامی صاحب آپ کو اعتراض تو نہیں۔"

نظامی کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اس نے عادتاً بالوں میں ہاتھ کی انگلیاں پھیریں۔ "معلوم نہیں آپ کس کا حوالہ دے رہے ہیں۔"

"پوشہ جہاں کا" رابعہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "وہ جو سوات سے......"

"رابعہ!" احمد نے دہاڑ کر کہا۔ "اپنی بکواس بند کرو۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں ان معاملات میں پڑنے کی پہلے ہی ہماری عزت کا بھرم بڑی مشکل سے قائم ہے۔ ہرا یرے غیرے کو گھر میں بلا کر ہر بات بتانے سے کیا ہوگا۔ مسٹر محمود اپنی سراغرسانی کا دفتر سمیٹو۔ ٹھہرنے کو یہاں ہوٹل بھی ہیں۔"

"احمد۔" اس کی ماں چلائی۔ محمود آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔

"میاں صاحبزادے" اس نے احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"شاید تمہیں علم نہیں کہ میں دس دن سے ہوٹل میں مقیم تھا اور تمہاری ممی کے اصرار پر یہاں آیا ہوں۔ میں ان کا مہمان ہوں۔ تمہارا نہیں۔ سمجھے؟ اور میں اپنی عزت کرانا بھی جانتا ہوں۔ آئندہ مجھے ایرے غیرا جیسے الفاظ سے مخاطب کیا تو تمہارا حلیہ بگاڑ دوں گا۔ آئینے میں خود کو پہچان بھی نہ سکو گے۔ پہلی بار ہے اس لیے معاف کرتا ہوں۔"

احمد کا رنگ اڑ گیا تھا' اسے احساس ہوگیا تھا کہ سامنے کھڑے ہوئے محمود کے مقابلے میں وہ کتنا مختصر اور کمزور ہے۔ شائلہ کے شوہر نظامی نے غیر جانبدار معتبر کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ رابعہ کچھ پریشان اور پشیمان سی کھڑی تھی۔ اس کے لبوں سے نکلنے والے چند الفاظ نے یہ ناخوش گوار صورت حال پیدا کی تھی۔ محمود کمرے سے نکلتے نکلتے اس کے قریب رکا۔

"آپ اگر نام نہ بتائیں تب بھی فرق نہ پڑتا۔ میں معلوم کر لیتا مجھے اس کا گھر معلوم ہے۔" وہ بولا۔

"یہ تم نے اچھا کیا شائلہ" نظامی کی آواز آئی پرسکون ٹھہری ہوئی منجمد۔

"میں نے زندگی میں کبھی اچھا نہیں کیا نظامی جس کا اچھائی سے زندگی میں واسطہ ہی نہ رہا ہو وہ کیا جانے اچھائی کو۔" شائلہ نے کہا۔

چھوٹے اور بڑے میاں صاحب اپنے حلیے ٹھیک کر کے اوپر سے نیچے آرہے تھے۔ محمود ان کے سامنے سے گزرا اور ان کی طرف دیکھے بغیر نکل گیا۔

خانساماں سخت پریشان تھا کہ صبح دم یہ کیا ہنگامہ ہے کہ کسی کو ناشتے کا خیال نہیں اور ٹی کوزی کے نیچے بھی چائے کب تک گرم رہے گی۔ محمود نے کہا کہ ناشتے پر اس کا انتظار نہ کیا جائے اور باہر چلا گیا۔ اس گھر پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ خانساماں نے طے کیا۔

چوکیدار مارا جا چکا تھا اور یہ سب ان کبوتروں کی بددعا تھی جن کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ سید ہوتے ہیں۔ اس نے فوری طور پر کسی اور گھر میں ملازمت کے امکانات کا جائزہ لیا مگر سیزن ختم ہو رہا تھا۔ اب تو خدا خیریت سے چند دن گزار دے تو اچھا ہے۔ اگلے سال دیکھا جائے ا۔ مقدر میں کس گھر کا آب و دانہ ہے۔ اگر اگلے سال تک جئے۔

محمود کبوتر کو ٹانگ سے لٹکائے اطمینان سے چلتا گیا۔ سڑک پر اب لوگ آنے جانے لگے تھے۔ معزز خواتین کی ایک فیشن ایبل ٹکڑی نے اتنی سنجیدہ عمر کے آدمی کو کبوتر شکار کرنے کی نامعقول حرکت پر افسوس سے دیکھا۔ ایک لڑکا سائیکل پر زوم سے گزرا۔ اس کے کندھے پر بھی ایر گن تھی۔ چنانچہ اس نے محمود کو رشک سے دیکھا۔ محمود کسی کی طرف دیکھے بغیر اس گھر کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں وہ کچھ دیر پہلے وہ ایک مردہ کبوتر چھوڑ گیا تھا۔ یہ دوسرا تحفہ اس نے خود پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ گیٹ اب کھلا ہوا تھا وہ سیدھا اندر داخل ہوگیا۔

اٹھارہ انیس سال کا ایک پپی نوجوان اچانک

اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔

''بیل کی طرح اندر آتا اولڈ مین باہر بیل کس کے واسطے ہے؟'' وہ بولا اور چھرانچ کے دہری دھار والے خنجر سے ایک خشک شاخ کو چھیلتا رہا۔ وہ ٹیلی ویژن کی مار دھاڑ سے بھرپور فلموں کا دیسی ماڈل بدمعاش نظر آنے والا بنیان جس پر آڑی سرخ اور زرد دھاریاں تھیں۔

ٹینم کی بدوضع پتلون جس کے گھٹنوں پر خاکی کینوس کے گول پیوند تھے افریقن طرز کے پھولے ہوئے سیاہ گھنگھریالے بال.....

''مجھے پلوشہ جہاں سے ملنا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔'' محمود نے انگریزی میں کہا۔

''وہ گھر پر نہیں ہے۔'' اس نے محمود کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''گڈ بائی'' چاقو کا پھل شاخ کو چھیلتا ہوا ایک جھٹکے سے دور ہوا اور محمود کے بہت قریب آ گیا۔ نوجوان نے چیونگ کو زور سے تھوکا۔ یہ سب تحقیر و تذلیل کے اور بدمعاشی جتانے کے شریفانہ طریقے تھے۔ جس سے کسی کو بھی مشتعل کیا جاسکتا تھا۔ محمود نے بڑی پھرتی سے ہاتھ مارا اور صرف نوجوان کی کلائی پر یوں پڑی کہ وہ درد سے کراہا۔ چاقو خود بخود اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ اس نے غوطہ مار کر چاقو اٹھانے کی کوشش کی لیکن محمود نے پینترا بدل کے اپنا بھاری بھرکم پاؤں جوتے سمیت اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مردہ کبوتر محمود کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ دائیں بائیں ہاتھ سے اس نے نوجوان کا دوسرا ہاتھ کلائی سے پکڑ لیا۔ وہ بالکل بے بس ہوگیا۔

''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ نوجوان دن بدن بدتہذیب اور گستاخ ہوتے جارہے ہیں۔''

محمود نے کہا۔ ''آج دوسری بار مجھے ثابت کرنا پڑا ہے کہ بوڑھے اب بھی آپ کے باپ ہیں۔'' اس نے آہستہ سے گھٹنا اٹھا کے نوجوان کو دور دھکیل دیا اور خنجر اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

''خنجر ہر ایک کا قابل اعتماد ساتھی نہیں ہوتا۔''

''خبیث تم نے میرا ہاتھ توڑنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' نوجوان نے پلٹ کر کہا اور بے تحاشا بھاگا۔

''محمود ہاتھ کی جگہ سر ہوتا تو یقیناً توڑ دیتا۔'' وہ بولا اور اطمینان سے اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ اسے پلوشہ جہاں کو تلاش کرنے میں گھر کا کونا کونا چھان مارنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس نوجوان نے یہ خبر پہنچا دی تھی کہ کوئی بلڈوزر قسم کا ملاقاتی اس سے ملنے آیا ہے جو کسی عذر کسی رُکاوٹ سے روکا نہیں جاسکا۔ وہ خود برآمدے میں محمود کے استقبال کے لیے نکل آئی۔ ایک لمحے کے لیے محمود کو اس کے حسن و جمال کی آب و تاب نے مبہوت کر دیا۔

وہ تقریباً تیس سال کی عورت تھی۔ مگر اس کی جلد تازہ گلاب کی پتی کی طرح نرم و نازک اور بے داغ تھی۔ صحت مند رخساروں میں لہو یوں جھلکتا تھا۔ جیسے بلور کے جام میں مٹے ارغوانی اس کے بال روشنی کے پس منظر میں سنہری مہلک دیتے تھے اور سبز آنکھوں سے ہپناٹائز کرنے والی نرمی روشنی پھوٹتی تھی۔ سورت کا حسن یہ شاہکار دست قدرت کی جمال آفرینی کا بے مثال نمونہ تھا۔ نظامی اگر شائلہ جیسی عورت کو چھوڑ کر اس کے دام عشق کا اسیر تھا اور شائلہ اس عورت کو خطرناک عورت کہتی تھی اور اس سے ڈرتی تھی تو اس کا جواز تھا۔

''آؤ..... مسٹر بہادر..... نہیں ٹارزن'' وہ ہنسی اور اس کے موتی جیسے دانتوں کی چمک دکھائی دی۔ محمود کو یوں لگا جیسے فرش پر کسی نے مٹھی بھر چاندی کے سکے اچھال دیئے ہوں۔

''اسے مار کر دل خوش ہوا؟''

''اس..... اس لڑکے نے بدتمیزی کی تھی۔'' محمود نے کہا۔

''اور میں نے اسے مارا ہوتا تو وہ اٹھتا کیسے۔؟''

''بے وقوف ہے۔ سمجھتا ہے کہ کسی کے گھر میں

جانے سے پہلے کال بیل بجانی چاہیے اور اگر کوئی نہ ملنے کے لیے گھر پر نہ ہونے کا بہانہ کرے تو خاموشی سے لوٹ جانا چاہیے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''مگر تم شریف آدمی نہیں ہو اس لیے یہ بات نہیں سمجھو گے۔''

''بہت اچھا ہوا کہ تم نے یہ بات سمجھ لی۔'' محمود نے مردہ کبوتر اس کے قدموں میں ڈال دیا۔

''ورنہ تم کیا کرتے؟ پلوشہ کو بھی مارتے؟'' وہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بولی۔

''لوگ تو خود پلوشہ جہاں پر مرتے ہیں۔'' اس نے پھر کہا۔

''پھر پلوشہ جہاں بے زبان کبوتروں کو کیوں مارتی ہے۔'' محمود نے کہا۔

''اور عورت ہو کر عورت کا سہاگ کیوں اجاڑنا چاہتی ہے؟''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔'' وہ اسے غور سے دیکھ کر بولی۔

''لیکن تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ یہ کیا مذاق ہے۔ یہ کبوتر مارنے کا کیا چکر ہے۔''

اس نے نیچے پڑے ہوئے کبوتر کی طرف اشارہ کیا۔ ''آج صبح بھی کوئی ایک مردہ کبوتر اخبار میں لپیٹ کر چھوڑ گیا تھا۔ وہ بھی تمہاری حرکت تھی ناں۔''

''ہاں..... میرا خیال تھا کہ وہ وارننگ کافی ہوگی۔'' محمود نے کہا۔

''مجبوراً مجھے خود بات کرنے آنا پڑا۔''

''یہ کوئی لمبی بات ہے تو بیٹھ جاؤ.....'' اس نے برآمدے میں پڑی ہوئی بید کی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود محمود سے پہلے بیٹھ گئی۔

''بات بہت مختصر ہے۔'' محمود نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کبوتر مار کر شائلہ کو کیوں ارسال کرتی ہو۔''

''میں.....'' وہ حیران ہوئی اور پھر ہنس پڑی۔ ''یہ تم سے کس نے کہہ دیا میں ایسا بے ہودہ مذاق نہیں کرتی، شائلہ کون ہے؟''

''بات کو مذاق میں مت ڈالو اور یہ مت سمجھو کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' محمود نے برہمی سے کہا۔ ''شائلہ کا شوہر نظامی ہے۔''

''اچھا؟ نظامی کی کوئی بیوی بھی ہے؟'' وہ بالوں کو ایک ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ ''اس نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا۔''

''تو تم نظامی کو جانتی ہو؟ اس سے تمہارا ناجائز مراسم ہیں۔ یہ بات تسلیم کرتی ہو تم؟''

''ہاں، مگر تعلقات ہوتے ہیں جائز کیا اور ناجائز کیا۔''

وہ بولی۔ ''وہ جو بات تمہارے نقطہ نظر سے ناجائز ہے۔ وہ میرے لیے بالکل جائز ہے۔ تم کیا کرتے ہو ٹارزن۔ جائز طریقے سے روزی کماتے ہو؟''

''میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''اس میں کوئی بات ناجائز نہیں۔''

''جو دھندہ میں کرتی ہوں وہ میرے لیے ناجائز نہیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''پیسہ تم بھی کماتے ہو۔ پیسہ میں بھی کماتی ہوں۔ فرق ہمارے پیشوں کا ہے۔ ضروریات کا نہیں۔ اس عمر میں تم بھی زیادہ سے زیادہ کمانا چاہتے ہو۔ تاکہ بڑھاپے میں کام آئے۔ یہ ہی میں بھی چاہتی ہو۔ تم جانتے ہو تمہاری جسمانی صلاحیت عمر کے ساتھ ساتھ ختم ہوگی۔ یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں۔''

محمود اس کی باتوں پر حیرانی سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔

''لیکن نظامی ایک شادی شدہ مرد ہے۔''

''پھر میں کیا کروں۔ میرے لیے تو وہ دس ہزار روپے ماہانہ کی آسامی ہے۔'' پلوشہ جہاں نے سپاٹ لہجے میں کہا ''اس نے مجھے یہاں اپنی مرضی اور خوشی سے بلایا ہے۔ یہ مکان لے کر دیا ہے۔ میں انکار کیوں کروں اور یہ کیوں پوچھتی پھروں کہ نظامی

تمہاری کتنی بیویاں ہیں اور کتنے بچے ہیں اور یہ رقم آپ مجھے آپ کہاں سے دیں گے۔ زمانہ کسی کا نقصان ہوتا ہے تو میں کیوں فکر کروں مجھے اپنا فائدہ دیکھنا ہے۔ ابھی تم مجھے ساڑھے دس ہزار کی آفر دو میں نظامی کو چھوڑ کر تمہاری ہو جاؤں گی۔ کوئی گیارہ ہزار والا مل گیا۔ تو تمہاری بھی چھٹی' تم کاروبار میں گھاٹے کا سودا کرتے ہو۔''

''یہ کوئی قابل فخر کاروبار تو نہیں ہے۔ خصوصاً تمہارے جیسی عورت کے لیے۔'' محمود نے نرمی سے کہا۔

''میرے جیسی عورت ہی تو اس کاروبار میں کامیاب رہتی ہے۔'' وہ بولی۔

''اور قابل فخر کون سا کاروبار ہوتا ہے؟ تجارت جس میں لوگ مٹی کو سونا بنائے ہیں۔ ملازمت جس میں رشوت سے گھر بھر لیتے ہیں۔ یا وہ سیاست جس میں ضمیر بیچتے ہیں۔؟ پلوشہ نے اپنے حسن و شباب کے سرمائے سے ڈالی ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ گھٹتا ہے۔''

''تمہیں اس بدنامی سے بالکل ڈر نہیں لگتا جو بڑھتی جا رہی ہے؟'' محمود نے کہا۔

وہ ہنسی ''نیک نام تو وہ بھی نہیں جو معاشرے میں اخلاق و کردار کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرتے ہیں' خواہ یہ جدوجہد نیت کے ساتھ ہو۔ بدنام تو سیاست میں لیڈر کہلانے والے بھی ہیں۔ خدا کے لیے اب یہ مت پوچھ بیٹا کہ میرے جیسی عورت نے یہ پیشہ کیوں اختیار کر لیا۔ اپنا گھر کیوں نہیں بسایا۔ جو ہر عورت کے ارمانوں کی جنت ہوتی ہے۔ جہاں اس کی ممتا کے پھول کھلتے ہیں اور محبت کا سنہرا سایہ رہتا ہے۔ یہ کتابی باتیں ہیں اور لوگوں نے ہمیشہ عورتوں سے پوچھی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انکا جواب کیا ہوگا۔ گھر کی جنت کے خواب بھی تم ہی دو غلے مردوں نے تراشے ہیں۔ جو خلوت میں میرے سامنے ناگ رگڑتے ہیں اور جلوت میں کہتے ہیں کہ ان کی ناک بہت اونچی ہے اور جو بے وقوف عورتیں کچھ نہیں کر سکتیں یہ خواب قبول کر لیتی ہیں۔''

''تم اپنی باتوں سے بہت تعلیم یافتہ لگتی ہو اور ذہین بھی۔'' محمود نے جیب سے سگریٹ نکالی۔

''بی اے' ایم اے تو میں نہیں ہوں۔'' وہ مسکرائی۔ ''انٹر کر کے کالج چھوڑ دیا گیا۔ مگر پڑھتی اب بھی ہوں۔ ایک دولت مند رشتہ آ گیا تھا۔ چنانچہ غریب ماں باپ نے فوراً سودا کر لیا اور مر گئے۔ شوہر کو میں نے مار دیا۔ میں اس کی بیوی نہیں رشوت تھی جو وہ اعلیٰ حکام کو پیش کرتا تھا۔ تاکہ اس کے کاروبار کو تحفظ حاصل رہے۔ میں نے سوچا کسی کی آلہ کار بننے کے بجائے میں خود یہ کام کیوں نہ کروں۔ کنیز بن کر کیوں رہوں۔ پولیس کے ایک بڑے آفیسر نے مجھ پر آنچ نہیں آنے دی۔''

وہ ہنسی۔ ''بعد میں وہ خود مر گیا۔ حادثات تو سب کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔''

محمود ہکا بکا بیٹھا ایک اور شمائلہ کی زندگی کا افسانہ سنتا رہا۔ جس میں کردار اور واقعات مختلف تھے۔ مگر فرضی نہیں تھے۔ ''تم ..... تم ہر ایک کے سامنے اعتراف کر لیتی ہو..... ان سب باتوں کا''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سب لوگ قابل اعتماد کہاں ہوتے ہیں' تم ہو تمہارا چہرہ بتاتا ہے۔''

محمود ہنس پڑا۔ ''چہرے تو بہت دھوکا دیتے ہیں۔ پلوشہ جہاں چہروں پر تو نقاب بھی ہوتی ہے۔''

''میرے سامنے ہر چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔'' اس نے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

''اگر تم اعتماد کے قابل نہ ہوتے تو میں اپنے بھائی کو ریوالور دے کر کہتی کہ اس بدمعاش کو گولی مار دو۔ جو زبردستی گھسا ہے اور پھر پولیس کو فون کر دو۔ لیکن میں تمہیں دیکھ چکی تھی اور تم مجھے اچھے لگے تھے۔''

محمود نے محسوس کیا کہ وہ نروس ہو رہا ہے۔ ''تم نے مجھے پہلے بھی دیکھا تھا۔؟''

''ہاں ..... آج صبح جب تم ایسا ہی ایک تحفہ لے کر آئے تھے۔ میں اس وقت باغ میں ٹہل رہی تھی

اور بعد میں بہت دیر تک غور کرتی رہی کہ اس حرکت کا مقصد کیا ہوسکتا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ تم آؤ گے تو پوچھ لوں گی۔'' وہ بولی۔

''اوہ تمہیں یقین تھا کہ میں آؤں گا؟'' محمود نے اس عورت کی بے پناہ کشش کے خلاف مزاحمت جاری رکھی۔

وہ ہنسی ''کیا یہ یقین غلط تھا کہ تم تو اس کے بعد بھی آؤ گے کیا پلوشہ جہاں تمہیں اچھی نہیں لگی؟''

''میرے پاس پلوشہ جہاں کو دینے کے لیے ساڑھے دس ہزار روپے ماہانہ اور کالج کا کرایہ نہیں ہے۔'' محمود نے کہا۔

''وہ تو نظامی دے ہی رہا ہے۔ مگر پلوشہ جہاں جیل میں نہیں ہے کہ کسی سے نہ ملے۔'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔ اس کی یہ ادا بھی محمود کو بہت پیاری لگی۔

اچانک وہ دروازہ کھلا اور وہ بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔

''بیگم صاحب جی! ناشتہ ادھر حاضر کروں؟''

اس نے نگاہ جما کر محمود کو دیکھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جسے محمود صرف ذہانت ناک کہہ سکتا تھا۔ محمود کو اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ وہ نظریں اس کے وجود میں سوئیوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔

''ناشتہ یہیں لاؤ۔ ایک مہمان بھی ہے۔''

پلوشہ جہاں نے سکون سے کہا۔ محمود خاموش بیٹھا رہا۔ حالات کا وہ دھارا جو اس پلوشہ کے پوچھنے پر بتایا کہ کس طرح چوکیدار کے قتل کے بعد سے اب تک کوئی شائلہ کو مسلسل دہشت زدہ کر رہا ہے۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی اور مسکراتی رہی۔ محمود نے اسے یہ بھی بتادیا کہ شائلہ سے اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ وہ اسے کتنا چاہتا ہے اور اس کی خاطر کیا کچھ کرسکتا ہے۔ کئی سال پہلے اس نے شائلہ کی زندگی بچانے کے لیے ایک ایسا جوا بھی کھیلا تھا جس سے اس کا ازدواجی مستقبل خطرے میں پڑسکتا تھا اور جھوٹ کھل جاتا تو اسے جیل بھی جانا پڑتا۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اس نے پولیس سے کہا تھا کہ شائلہ اس کی بیوی ہے اور بڑی کوشش سے سال بھر پہلے کا نکاح نامہ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا تھا۔

شائلہ کے ماضی کا ذکر بے سود تھا اور یہ بتانے سے بھی کوئی فائدہ نہ تھا کہ شائلہ کسی قماش کی عورت تھی یا ہے۔

ان تمام واقعات کو دہرانے سے محمود کو یہ فائدہ ہوا کہ اس خوبصورت عورت کی کشش کا وہ طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ جس میں وہ مکڑی کے جالے میں پھنس جانے والی مکھی کی طرح گرفتار ہوگیا تھا۔ اس کا سابقہ اعتماد لوٹ آیا اور اپنی ذمے داری کا احساس پھر غالب آگیا۔ پلوشہ جہاں کی صورت پر نمودار ہونے والے مایوسی کے سائے اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ عورت جو تسخیر کے لیے بڑھتی ہے۔ ہزیمت اٹھا کے پلٹتی ہے۔ تو ہتھیار نہیں ڈالتی۔ زیادہ خطرناک ہوجاتی ہے۔ اس کے رویے میں یکلخت سرد مہری آگئی۔

''تمہیں اپنی بیوی سے بھی بہت محبت ہے اور اس عورت شائلہ سے بھی بہت محبت ہے۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''پھر میں کیا کروں؟''

''تم یہ کھیل ختم کردو۔'' محمود نے کہا۔ ''اور یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ شائلہ کی خوشی ہے جو مجھے بہت عزیز ہے۔ تم خود کہتی ہو کہ تمہیں چاہنے والوں کی کمی نہیں۔ تمہیں دوسرا نظامی مل جائے گا۔ شائلہ صرف اسی نظامی کو چاہتی ہے۔ تو اسے بخش دو۔''

''خیرات زبردستی تو نہیں لی جاسکتی۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''اچھا تو مجھ سے سودا کرلو۔ کاروباری سودا۔ جس میں تمہیں بھی نقصان نہ ہو اور شائلہ کو بھی۔'' محمود نے کہا۔ ''قیمت بتاؤ۔''

''مجبور تم ہو یا تمہاری شائلہ ہے۔'' وہ اٹھ کر بولی۔

''مجبوری کی کیا قیمت ہوتی ہے محمود صاحب''

''میں پچیس ہزار تک میں معاملات طے کرا سکتا ہوں۔'' محمود نے زور دے کر کہا۔

''میں پچاس پر بھی بات نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں بھی مجبور ہوں وہ سر کے بل آئے اور میرے سامنے ہاتھ جوڑے' میرے پاؤں پڑے تب بھی نہیں کر سکتی۔ مسٹر ٹارزن تم بہت دیر سے آئے ہو۔'' وہ بولی۔

''لوگ کہتے ہیں پر آید درست آید۔'' محمود نے کہا۔ ''لیکن تم شاید دیر کے ساتھ اندھیر کی قائل ہو۔''

''میں ایک بات بتاؤں؟'' وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''اس عورت سے کہو کہ مجھ سے کہو کہ مجھ سے نہ ڈرے۔ میں نظامی سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ شوہر وہ اسی کا رہے گا۔ اس کے لیے زیادہ خطرناک شہری عورت ہے' میری خادمہ جس کی مامتا کا خون اس گھر کی زمین نے پیا ہے۔ اب وہ قاتلوں کے لہو سے اپنے پیاس بجھانا چاہتی ہے۔ اس میں معاف کرنے کا حوصلہ نہیں ہے اور وہ روح کے اس ناسور کا عذاب اپنی قبر میں ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ وہ اس قرض کو اپنی زندگی میں ضرور چکائے گی۔ ڈرو اس کے انتقام سے۔ ڈرو اس کی آہ..... سے مجھ سے کیا ڈرنا۔''

وہ پلٹی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد وہی لڑکا ہاتھ میں ریوالور لیے نمودار ہوا اور اس نے ریوالور کو اچھالا اور بڑی مہارت سے کیچ کر لیا۔

''چلو میں تم کو دروازے تک سی آف کر آؤں'' اس نے محمود کو اشارہ کیا۔

''آئندہ بیل کی طرح سیدھی اندر نہ آنا۔ پہلے بیل بجانا اور ہاں یہ اپنا شکار اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ تم آن اولڈ مین۔''

محمود چلتے چلتے رک گیا۔ کسی نے بڑی راز داری کے ساتھ اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

''شش.....'' آواز پھر آئی۔ اس مرتبہ محمود نے

باتیں دانائی کی

☆ آدمی کی قابلیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ اچھے کام کے لیے کسی خاص وقت کا انتظار نہ کرو فوراً شروع کر دو۔ (حضرت ابوذرؓ)

☆ جب یہ پتا چلتا ہے کہ زندگی کیا ہے تو یہ آدھی خرچ ہو چکی ہوتی ہے۔ (امام غزالیؒ)

☆ اگر آپ کچھ بننا چاہتے ہیں تو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں۔ (قائداعظمؒ)

☆ اچھے ضمیر کے بعد اچھی صحت زندگی کی دوسری بڑی نعمت ہے۔ (آئزک والسن)

☆ ان کے لیے دنیا ایک طربیہ ہے جو سوچتے ہیں اور ان کے لیے ایک المیہ ہے جو محسوس کرتے ہیں (ارل آف آرنفورڈ)

☆ کسی انسان کی عظمت و شرافت پرکھنے کا آخری پیمانہ یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا رویہ ان لوگوں سے کیسا ہے جو اسے کچھ نہیں دے سکتے۔

خوف خدا.....

☆ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے خدا اس کے لیے آسانی پیدا کر دیتا ہے اور کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کے متعلق اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

☆ اے لوگو! اپنی پرہیزگاری نہ جتایا کرو (اللہ) پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔

دوستی

دوستی کتنا اچھا لفظ ہے دل میں اتر جانے والا، دل و دماغ میں ٹھنڈک پہنچانے والا! مگر دوست وہی اچھے اور پیارے ہوتے ہیں جو دوست کی گہرائیوں میں جھانک کر اس کی ذات کو مکمل طور پر پہچان سکیں۔ مخلص دوست یقیناً ہمارے لیے وہی ہوتے ہیں جن کو ہم سوچتے اور محسوس کرتے ہیں جو صرف اور صرف خلوص اور پیار کی راہ بتاتے ہیں۔ دنیا میں اگرچہ دوستوں کی کمی نہیں لیکن اچھے دوست قسمت سے ملتے ہیں۔☆

پتھر کی چٹان کی آڑ میں کھڑی ہوئی رابعہ کو دیکھ لیا۔ انگلی اس کے ہونٹوں پر تھی اور وہ اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ یوں جیسے اسے خطرہ ہے کہ اگر وہ سامنے آئی یا محمود نے بات کی تو کام خراب ہو جائے گا۔ محمود نے اس کی نظر کو بڑے پراسرار طریقے پر اپنے پیچھے مرتکز دیکھا۔ کوئی سوال کیے بغیر وہ خود بھی اسی چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔ اب وہ رابعہ سے دو منٹ کے فاصلے پر تھا۔

''کیا بات ہے؟'' محمود نے آہستہ سے کہا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''ادھر دیکھو!'' رابعہ نے کہا۔ ''پلوشہ جہاں کا بھائی تمہارے تعاقب میں ہے اچھا ہوا میں نے دیکھ لیا۔''

محمود نے دیکھا۔ تو اسے پلوشہ جہاں کا پچی بھائی ہاتھ میں بندوق لیے آگے بڑھتا نظر آیا۔ وہ ایک سے دوسرے درخت کے تنے تک یوں دبے پاؤں بڑھتا تھا کہ آہٹ تک نہیں ہوتی تھی۔ چند سیکنڈ توقف کرنے کے بعد وہ ادھر ادھر جھانکتا تھا اور بے آواز قدموں سے ڈور کر تیرے درخت کے پیچھے پہنچ جاتا تھا۔ محمود خاموشی سے اسے اپنے قریب آتے دیکھتا رہا۔ جب وہ چند سیکنڈ کے فاصلے سے گزرنے لگا۔ تو محمود نے یکلخت سامنے آکر اس کی بندوق پر ہاتھ مارا۔

ایک جھٹکے میں بندوق محمود کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے نال کی جانب سے پکڑ کے بندوق کو چٹان پر دے مارا بندوق کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس نے نیچے پھینک دیئے۔ ''اب دفع ہو جاؤ۔ ورنہ تمہارے بھی ٹکڑے کر دوں گا۔'' محمود نے زور سے دہاڑ کر کہا۔

''یہ جنگل کسی کی ملکیت نہیں ہے۔'' وہ سرکشی سے بولا۔ ''اور میں تمہارے گھر میں بیل بجائے بغیر نہیں آیا ہوں کہ تم مجھے دفع ہو جانے کا حکم دے رہے ہو۔''

''تم میرا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟'' محمود نے چراغ پا ہو کر کہا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ مسٹر'' وہ سکون سے بولا۔

''میں تو جنگلی کبوتروں کا شکار کرنے نکلا تھا۔''

''شکار کس لیے۔ کس کے لیے؟'' محمود نے چلا کر پوچھا۔

''تفریح کے لیے اور کس کے لیے۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔

''ویسے شکار کیے ہوئے کبوتر پکائے بھی جا سکتے ہیں۔ تم نے میرے بندوق توڑی ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ مگر تم نے جرم کیا ہے۔ شرافت سے اس کی قیمت ادا کرو۔''

محمود نے اسے مکار رسید کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

''شرافت کے بچے قیمت لو اپنی بہن سے جس کی کمائی کھا کے اینڈتے ہو۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے مقابل وہ ایک بچہ ہی تو تھا۔

وہ لڑکا محمود کو آگے بڑھتا دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ چند قدم دور جا کر وہ رکا۔ ''وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔'' اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''تم نے اس کے بیٹے کو قتل کیا تھا۔ وہ تمہیں بھی قتل کر دے گی۔''

وہ پھر بھاگا اور درختوں میں گم ہو گیا۔

محمود کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بے وقوف لڑکے نے یہ بات کیوں کہی تھی اور کس سے کہی تھی۔ اس نے رابعہ کی طرف دیکھا تو وہ اب بھی ادھر ہی نظریں جمائے کھڑی تھی۔ جدھر وہ لڑکا غائب ہوا تھا۔ پھر وہ یکلخت سنبھل گئی اور محمود کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ پلوشہ جہاں کا بھائی میرے پیچھے لگا ہوا ہے؟'' محمود نے کہا۔ ''کیا تم اس کے پیچھے تھیں۔''

''ہاں......'' وہ بولی۔ ''اور معاف کرنا میں چھپ کر تمہاری اور پلوشہ جہاں کی گفتگو بھی سن رہی

تھی۔''

محمود بھونچکا رہ گیا۔ ''کیوں؟'' یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''ہاں'' اس نے بیا کے گھونسلے جیسے بالوں کو کھینچا۔

''اچھی بات تو نہیں ہے مگر اس میں مزہ آتا ہے۔ لوگوں کی ساری قلعی کھل جاتی ہے کہ وہ سامنے کیا کہتے ہیں اور پیٹھ پیچھے کیا۔ جب تم کبوتر کا جنازہ لے کر نکلے تھے۔ نا تو میں سمجھ گئی تھی کہ اب ہوں گی مزیدار باتیں' میرا شوہر مجھے کئی بار ٹوک چکا ہے۔''

''تمہاری یہ عادت تمہیں دوسروں کی نظر میں ذلیل بھی کرسکتی ہے۔'' محمود نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہم سب کی کوئی نہ کوئی عادت ہمیں دوسروں کی نظر میں ذلیل کرتی ہے۔ خواہ وہ اچھی عادت ہو یا بری۔'' اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''مثلاً شمائلہ کو ہی لے لو وہ نظامی کی محبت میں ذلیل ہورہی ہے۔ حالانکہ محبت کرنا کوئی بری بات نہیں۔''

''کیا تم نفسیات پڑھتے پڑھتے خود نفسیاتی کیس نہیں بن گئی ہو؟''

''ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہاں..... مگر یہ بھی سچ ہے کہ نفسیاتی کیس سب ہیں۔'' وہ ہنسی ''تم میری بے تکلف گفتگو کا برا تو نہیں مانتے۔ نا تصنع سے مجھے چڑ ہے۔ ادب آداب۔ چھوٹی مروت ظاہری شائستگی خوبصورت لباس میک اپ' یہ سب جھوٹ کے پردے نہیں تو کیا ہیں۔ بھئی میں جیسی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔ دل چاہتا ہے تو بات کرو ورنہ مت کرو۔''

''چھوٹے میاں' اور بڑے میاں کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہے تم نے؟''

''ان کے بارے میں میرے مستند رائے یہ ہے جناب کہ دونوں فراڈ ہیں۔'' رابعہ نے اطمینان سے کہا۔ ''میں نے چھپ کر ان کی جو گفتگو سنی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نظامی صاحب کی یاری سے

غور و فکر

حضرت خدیمؓ بن فاتک کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی اور رخ مبارک لوگوں کی طرف پھیرا تو خلاف معمول بیٹھے رہنے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے کھڑے ہوگئے اور تین بار فرمایا:

''جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا، دونوں برابر کے گناہ ہیں۔''

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بتوں سے دور رہو' جھوٹی بات کہنے سے دور رہو' خدا تعالیٰ کے لیے یکسو ہوجاؤ، شرک چھوڑ دو، توبہ اختیار کرو۔''

اقوال زریں

☆ عبادت جو مخلوق کے لیے کی جاتی ہے' زمین میں دھنسا دیتی ہے اور عبادت جو خالق کے لیے کی جاتی آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔

☆ جس کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ عالم ہے' جس کا باطن، ظاہر سے افضل ہے، وہ ولی اللہ ہے اور جس کا ظاہر باطن سے افضل ہے' وہ جاہل و مکار ہے۔

☆ خوش مزاج شخص وہ ہے جو دوسروں کو خوش مزاجی دے۔

☆ درویشی بادشاہت سے بہتر ہے بشرطیکہ دنیا کا تعلق شامل نہ ہو۔

☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ ہے کہ جو کچھ بھی سنے بیان کردے۔

☆ جو اپنی ضرورتیں بڑھا لیتا ہے اسے اکثر محرومی کا غم رہتا ہے۔

☆ بدترین جھوٹ وہ ہے جس میں کچھ سچ بھی شامل ہو۔

☆ برے آدمی سے نیکی ایسے ہے جیسے نیک آدمی سے برائی کردی جائے۔

☆ غصے پر قابو پانا ہی دانش مندی ہے۔☆

ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ خود تو اپنا سب کچھ بیچ کر اس پنجابی فلم میں لگا چکے جو ابھی چوتھائی بھی نہیں بنی۔ بغرض محال بن بھی گئی تو تیسرے دن اتر جائے گی۔ لیکن یہ جو اوہ نظامی کی بیوی اور احمد کی ماں کے پیسے سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ وہ قرض لینا بھی نہیں چاہتے۔ اب یہ چاہنے کے چکر بڑا لمبا چکر ہے۔ چھوٹے میاں اس ہیروئن کو چاہتے ہیں گویا دونوں فلم کی تکمیل سے اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں فلم پیسہ چاہتی ہے۔ پیسہ اب صرف شائلہ کے پاس ہے۔ جو نظامی کو چاہتی ہے مگر نظامی پلوشہ جہاں کو چاہتا ہے۔

چنانچہ اس کے دوست چاہتے ہیں کہ نظامی اپنی بیوی کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے اور اس سے کم از کم چار پانچ لاکھ مار لے۔ نظامی یہ نہیں چاہتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے چھوٹے اور بڑے ملک کے پاس رقم کی واپسی کی کوئی ضمانت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک چوتھائی فلم ڈبے میں بند کر کے باقی رقم پانٹ لیں اللہ اللہ خیر صلا۔ پیسہ وہ بھی مارنا چاہتا ہے۔ مگر ان دونوں بدمعاشوں کو دینے کے لیے نہیں۔ اس کی اپنی ضروریات بھی تو نہیں۔''

''اور احمد کیا چاہتا ہے؟'' محمود نے اچانک کہا۔ ''یہ باتیں تم نے اسے بھی بتائی ہوں گی۔''

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''وہ چاہتا ہے۔ ہم سب پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل جائیں۔ مگر میں نے اسے پٹا ڈال رکھا ہے۔ میری بات کا برا مت ماننا میں اسے چاہتی ہوں میں نے سے سمجھایا ہے کہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں یہ سب کچھ اس کا حق ہے۔ جس پر مردار گدھ منڈلا رہے ہیں۔ دو کوٹھیاں اور لاکھوں نقد چھوڑنے میں کونسی عقلمندی ہے۔ احمد کہتا ہے لعنت ہے اس پیسے پر تم تو جانتے ہو کہ دونوں ماں بیٹوں کے درمیان نفرت کی خلیج تمام عمر حائل رہی ہے۔ دونوں ایک دوسری سے سخت ناخوش ہیں۔ شائلہ اس لیے ناخوش ہے کہ احمد نے مجھ سے شادی کیوں کی۔ احمد اس لیے ناخوش ہے کہ شائلہ نے نظامی سے شادی کیوں کی۔ دونوں احمق ہیں۔'' وہ ہنسی۔

''تمہارے مقابلے میں تو واقعی احمق ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''تھینک یو۔'' رابعہ نے سر خم کر کے کہا۔

''احمد کہتا ہے' ممی سے نیکی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ انہیں سب سے عزیز وہ شخص ہے جسے ان کی خاک پرواہ نہیں۔ اسے پلوشہ جہاں سے بچانے کی خاطر وہ سب کچھ قربان کرنے کی حماقت کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ان کا پیسہ چھوٹے بڑے میاں صاحبان کو ملے نہ ملے نظامی کو ضرور مل جائے گا اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ میرا خیال ہے جب ان کو دادی کہلانے کا شرف حاصل ہوگا۔ تو نفرت کی اس خلیج کا وجود خود بخود مٹ جائے گا۔ جو ماں بیٹے کے درمیان حائل ہے۔''

''یہ خلیج تم تو نہیں ہو؟'' محمود نے مذاق میں کہا۔

''نفرتوں کے بہت سے چھوٹے بڑے دریا ملتے ہیں تو ایک سمندر بن جاتا ہے۔ جس میں ڈوبنے والے کا سراغ نہیں ملتا۔'' اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی اور دھواں فضا میں منتشر کر دیا۔

''شائلہ کو مجھ سے پلوشہ جہاں سے نظامی کے دوستوں سے حتیٰ کے احمد سے نفرت ہے۔ ان سب سے نفرت رکھنے کے بعد اسے اپنی ذات سے پیار کیسے ہو سکتا ہے۔ تم خود کو دیکھو ایمانداری سے سوچو تم کس کے خلاف نفرت میں مبتلا ہو۔''

''تم تو ہر بات میں اپنی نفسیات لے آئی ہو۔'' محمود نے کہا۔

''یہاں عملی مسائل بھی ہیں' مثلاً اس چوکیدار کا قتل..... اسے کس نے قتل کیا اور کیوں کیا؟''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ سگریٹ کا کش لے کر کھانسی۔ ''اسے چھوٹے میاں نے قتل کیا ہے۔''

محمود بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے اتنے دو ٹوک فیصلہ کن اور قطعی جواب کی بالکل امید نہیں تھی۔

''تم نے یقین کے ساتھ کہہ رہی ہو۔ جیسے..... جیسے تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''قتل ہوتے تو آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر اور بہت کچھ تو دیکھا ہے مثلاً میں نے اس چوکیدار کو دیکھا تھا۔ بے حد صحت مند' اسمارٹ اور ہینڈسم مرد تھا۔ احمد میرے منہ سے ایسی بات سن لے تو دھواں دینے لگے۔'' وہ ہنسی ''لیکن ایک عورت کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو وہ واقعی بہت پرکشش تھا اور پنجابی فلم کی یہ چوتھائی ہیروئن اس پر مرمٹنے تھی۔ وہ بھی دیہاتی اور کچھ کم عمری کے باعث جذباتی نوجوان تھا اور ایک ہیروئن کے التفات نے اسے گھن چکر بنا دیا تھا۔ ہیروئن خیر سے شاہی محلے کی خاک کا خمیر ہیں۔ ان کے لیے عشق کیا ہے۔ وفا کیا ہے۔ ایک حیوانی جذبہ تھا۔ جس کی پست میں آکر وہ دونوں مصلحت کے تقاضوں کو بھی بھول گئے۔ میں نے رات کے وقت انہیں زور زور سے بولتے سنا تھا تو میری آنکھ کھل گئی۔ اس سے وقت یہ واردات ہوچکی تھی۔ ہیروئن جائے واردات سے فرار ہونے۔ میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن لڑکا۔ مارا گیا تھا۔

بعد میں بڑے صاحب کی مداخلت نے حالات کو مزید سنگین ہونے سے بچالیا تھا چھوٹے میاں کو ٹھنڈا کیا۔ ہیروئن کو برا بھلا کہا اور انجام سے خوفزدہ کیا۔ قتل تو ایک ایک لمحے کا ردعمل ہوتا ہے۔ جب عقل اور ہوش ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ لمحہ گزر گیا تھا۔ چنانچہ چھوٹے میاں کی حالت بھی غیر تھی کہ انہوں نے کیا کردیا اور کس کے لیے۔ جب انہوں نے مل کر سراغ مٹائے جانے کا فیصلہ کیا تو میں واپس اپنے کمرے میں بھاگ آئی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ احمد نہیں جاگا تھا۔''

محمود کو یہ کہانی ہر اعتبار سے قابل یقین لگی۔ ''اگر میاں صاحبان تمہیں دیکھ لیتے تو تم کو بھی ٹھکانے لگا دیتے۔''

''یہ خیال مجھے بعد میں آیا تھا۔'' رابعہ نے اعتراف کیا۔

''اور اسی لیے میں خاموش رہی۔ تم بھی خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔''

''چوکیدار کی لاش کو خاردار تاروں پر کس نے ڈالا تھا۔؟'' محمود نے کہا۔

''غالباً کسی نے نہیں' اس نے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ تاروں میں الجھ گیا۔''

رابعہ نے کہا ''پولیس کو خنجر نہیں ملا اور اس رات شدید بارش ہوئی تھی۔ چنانچہ قدموں کے نشانات وغیرہ سب برابر ہوگئے۔ اس کے علاوہ تھانیدار کو تفتیش کا دائرہ اس گھر سے باہر رکھنے کی قیمت بھی ادا کردی گئی تھی۔ میاں صاحبان کے علاوہ یہ تو سب ہی چاہتے تھے' تھانیدار نے یہاں رسمی سے کارروائی کی۔ صرف ایک دن اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ اس نے یہ مفروضہ قائم کرلیا تھا۔ کہ کسی پرانے خاندانی تنازعے پر انتقامی نوعیت کی ایسی واردات کا دائرہ اگر سوات یا غیر علاقوں تک پھیلا دیا جائے۔ جہاں پولیس کی رسائی نہیں تو کیس خود بخود فائل ہوجاتا ہے۔''

یہ بات حالات سے مطابقت رکھتی تھی۔ میاں برادران نے اس قتل سے دیگر فوائد بھی حاصل کیے۔ ایک یہ کہ چوکیدار کی جگہ خالی رکھنے کے لیے باتیں مشہور کردیں۔ ایک جاں نثار اور وفادار چوکیدار کا احساس تحفظ نہ رہا۔ تو شمائلہ کو دہشت زدہ کرنا اور بھی آسان ہوگیا۔ پھر یہ کہ بے وفا ہیروئن کو ایک عملی سبق دے دیا گیا۔ کہ وہ دوبارہ ایسے غلطی نہ کرے۔

اب مسئلہ ثبوت کا تھا۔ کیونکہ جو کچھ رابطہ نے دیکھا اور سنا تھا منطقی اور مفروضات پر مبنی تھا اور واحد گواہ وہ خود تھی اور وہ اتنی چالاک عورت تھی کہ محمود سے کہی ہوئی تمام باتوں سے صاف مکر سکتی تھی' کہہ سکتی تھی کہ وہ محمود سے اندر یا باہر کبھی اکیلے میں ملی ہی نہیں۔ گھر کے معاملات میں محمود کی مداخلت کی ذمہ داری شمائلہ کی تھی۔ الزام اسی پر آسکتا تھا۔ کہ اس نے محمود کو ساری باتیں بتائی ہیں۔ اس ناکام و نامراد ہیروئن سے البتہ یہ توقع کی جاسکتی تھی۔ کہ وہ ڈرانے دھمکانے سے یا سمجھانے سے مان جائے۔ پیشہ ور

عورت کا کیا ہے۔ اگر اسے یقین دلایا جائے کہ اعتراف حقیقت کے بعد وہ محفوظ رہے گی تو شاید وہ چھوٹے بڑے میاں صاحب کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے قانون سے تعاون کرلے۔ لیکن دوسری طرف سے امکانات یہ بھی ہے کہ مالی نقصانات کے خیالات سے وہ چھوٹے میاں صاحب کی وفادار رہے۔

کیونکہ کیس تو فائل کرا ہی دیا گیا ہے اسے امید ہوگی کہ شائلہ کا پیسہ جب نظامی کو اور نظامی کے ہاتھوں میاں برادران کو ملے گا تو چھوٹے میاں صاحب کا مال اسی کی جیب میں آئے گا۔

''تم کس فکر میں پڑ گئے۔؟'' رابعہ نے کہا۔

''تم کچھ ثابت نہیں کرسکتے۔ تم شائلہ کی بھی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ کیونکہ وہ نظامی کے عشق میں تمہاری عقل کا مشورہ قبول نہیں کرے گی۔ تم تفریح کرو اور چلے جاؤ۔ بھول جاؤ ساری باتیں۔''

''ماشاء اللہ تم بہت ذہین اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ عاقل و بالغ ثابت ہوئی ہے۔''

محمود نے کہا ''اور تمہارے بارے میں میرے ابتدائی تاثرات بالکل غلط تھے کہ تم نئی نسل کی نمائندہ غیر ذمے دار اور بے راہ قسم کی لڑکی ہو۔ یہ بتاؤ شائلہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ اسے قتل کرنے کی سازش؟ اور ہے تو کون کررہا ہے یا کرسکتا ہے۔''

''سازش کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جاسکتا؟'' وہ مسکرائی۔ ''تمہارے ذہن میں کس کا آنا آتا ہے۔''

''سوال میں نے پہلے کیا تھا۔''

محمود نے کہا۔ ''اپنے خیال کا اظہار میں بعد میں کروں گا آپس کی بات ہے۔''

''اچھا'' وہ ہنسی۔ ''دو افراد کو میں شبہے سے بالا تر سمجھتی ہوں ایک نظامی کو۔ دوسری اس پنجابی ہیروئن کو۔ باقی لوگوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

''میں تو ابھی کسی ایک کو بھی اتنے یقین کے ساتھ بری نہیں کرسکتا۔'' محمود نے بے بسی سے کہا۔

جو درحقیقت اپنے شکوک کا اظہار نہ کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔ محمود کا ذہن بہت سے نتائج کی بھیڑ میں سے ایک نتیجہ نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

شائلہ اندھیرے کمرے میں بالکل اکیلی بیٹھی تھی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے شائلہ؟'' محمود نے لائٹ آن کرتے ہوئے کہا۔ ''باقی لوگ کہاں گئے؟''

''میں کیا بتاؤں' کہاں گئے ہیں۔'' وہ دیوار کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم خود بھی تو گھر پر نہیں تھے۔ کسی کو بھی میری فکر نہیں۔ نہ میرے شوہر کو' نہ میرے بیٹے کو۔ ان کی بلا سے میں کل مرتی آج مرجاؤں اور کسی دن یہی ہوگا۔ مجھے اکیلا پاکر وہ مجھے گولی مار جائیں گے۔''

''وہ کون؟ کس کی بات کررہی ہو تم؟'' محمود نے کہا۔

''ایسے انجان مت بنو۔'' وہ چلائی۔ ''میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ میرا خیال تھا تم میری حفاظت کرو گے۔ میرا خیال رکھو گے۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ خوف کی ہسٹیریا میں اس کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید ہوگیا تھا۔ وہ بیڈ پر اپنے پیر لٹکائے اور دونوں ہاتھوں سے گود میں رکھے ہوئے ریوالور کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھی تھی۔

''لیکن تمہیں بھی فرصت نہیں ہے۔ کس کو کیا' شائلہ مرے یا جیے۔''

محمود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''تمہیں کیا ہوگیا ہے شائلہ؟ تم تو بہت حوصلہ مند عورت تھیں۔''

''اب نہیں ہے مجھ میں حوصلہ۔ میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ میرے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''اب مجھ میں کسی سے مقابلے کی سکت نہیں رہی۔ میں کوئی صدمہ برداشت نہیں کرسکتی اور کسی خطرے کا سامنا نہیں

کرسکتی۔ میں ایک بزدل اور بیوقوف عورت بن گئی ہوں۔ حالات نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔''

''یہ سب اس ماحول کا تصور ہے شائلہ!'' محمود نے کہا۔ ''یہاں سے نکل چلو میرے ساتھ۔''

''تمہارے ساتھ۔'' وہ سہم کر بولی۔ ''نہیں نہیں' نظامی کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جاسکتی۔ وہ مجھے چھوڑ دے گا۔''

''بیوی نہیں تو کیا' میرے گھر میں میری ماں ہے۔ میرے بھائی بہن ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔'' محمود نے کہا۔ ''یہاں تمہارے اردگرد گدھ منڈلا رہے ہیں۔ ان کی بھوکی نظریں تم پر نہیں' تمہاری دولت پر ہیں۔''

''دولت مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تو نہیں ہے۔'' وہ سنبھل کر بولی ''جس کو چاہیے لے لے مگر مجھے سکون سے جینے دے۔ مجھے معلوم ہے کہ نظامی کو ایک لاکھ کی ضرورت ہے۔ آج اس نے میرے سے ایک لاکھ مانگے تھے تاکہ وہ بھی اس میں فلم سرمایہ لگا سکے اور وہ فلم مکمل ہوجائے تو اس کا نام بھی فلمسازوں میں آئے گا۔ اس نے کہا کہ جب فلم سے ایک کے دس وصول ہوں گے تو وہ میرا سرمایہ بمعہ سود ادا کردے گا لیکن محمود یہ سب جھوٹ ہے' دھوکا ہے۔ وہ فلم کبھی نہیں بنے گی اور نظامی بے وقوف نہیں ہے کہ یہ بات نہ سمجھتا ہو۔ وہ ان بدمعاشوں کا پارٹنر نہیں بنے گا۔ وہ ایک لاکھ اپنی پلوشہ جہاں پر لٹا دے گا' اسی لیے میں نے آج اسے کورا جواب دے دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ نظامی مجھے مجبور کرنے کے لیے میری کمزوری سے فائدہ اٹھائے گا۔ مجھے دھمکی دے گا کہ میرا اور تمہارا تعلق ختم لیکن محمود! بعد میں مجھے افسوس ہوا' میں اس کا مطالبہ پورا کردوں گی۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے کہ اس کے بعد وہ کوئی مطالبہ نہیں کرے گا۔ یہ ایک لاکھ اسے کافی ہوں گے؟'' محمود نے کہا۔

''تو جتنے اسے چاہئیں لے لے۔'' شائلہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

واہ بھئی واہ

دلیل

''کیا آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ آپ عین آپریشن کے وقت آپریشن تھیٹر سے فرار کیوں ہوگئے تھے؟'' ہسپتال کے منتظم نے ادھیڑ عمر مریض سے پوچھا۔

سہمے ہوئے مریض نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور اپنی کیفیت پر قابو پاکر بولا: ''مجھے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تو میں تھوڑا سا پریشان ضرور تھا مگر خوفزدہ ہرگز نہیں تھا۔ ایک نوجوان اور حسین نرس نے کہا کہ آپ پریشان اور خوفزدہ نہ ہوں۔ یہ کوئی بڑا آپریشن نہیں ہے۔ آپ کامیابی سے اس مرحلے سے گزر جائیں گے۔''

''تو اس میں آپریشن تھیٹر سے فرار ہونے کی کیا بات تھی؟''

''آپ سمجھے نہیں جناب۔ نرس نے وہ جملے ڈاکٹر کو مخاطب کرکے کہے تھے!''

شادی

کروڑ پتی تاجر نے رازدارانہ انداز میں اپنے گہرے دوست سے کہا ''میری عمر تقریباً اڑسٹھ برس ہوچکی ہے۔ میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی محبت میں گرفتار ہوں' میں اس فتنۂ قامت کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ سترہ سال کی اس خوش جمال لڑکی نے میری راتوں کی نیند حرام کردی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' اگر میں اس دوشیزہ کو اپنی عمر پچاس سال بتاؤں تو کیا وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہوجائے گی؟''

''میں تمہیں ایک بہترین مشورہ دے رہا ہوں۔'' بے تکلف دوست نے کہا: ''اگر تم اس لڑکی کو اپنی عمر اسی سال بتاؤ تو وہ یقینی طور پر شادی کرنے پر آمادہ ہوجائے گی۔''

☆

''جتنے کا کیا سوال۔ وہ تم سے سب کچھ لے لے گا اور اس کے بعد پلوشہ کے پاس چلا جائے گا۔'' محمود نے کہا۔

''وہ کل کی بات ہے اور کل بہت دور ہے۔ ابھی میں اسے اپنا سب کچھ کہاں دے رہی ہوں۔ میں اگر دوں گی تو تھوڑا تھوڑا کر کے تاکہ وہ دولت کی اس زنجیر سے بندھا رہے۔ اس سے امید کا دامن بندھا رہے گا کہ شاید کل پلوشہ جہاں کو چھوڑ دے یا خود پلوشہ جہاں اسے ٹھکرا دے۔''

''تم پاگل ہوگئی ہو شائلہ! یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم ان کا طویل عرصے تک مقابلہ کرو گی۔ وہ تمہیں یوں بیچ کھائیں گے۔'' محمود نے چٹکی بجا کر واضح کیا ''اور تم خوار ہو جاؤ گی۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''تم..... تم کیا تم گدھ نہیں ہو؟'' شائلہ نے ریوالور اٹھا لیا۔ ''تم اکیلے ہی میرا مال ہضم کرنا چاہتے ہو۔ مجھے میری نظامی سے چھڑانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔ تمہارا کیا بھروسہ تم تو مجھے بلیک میل بھی کر سکتے ہو کیونکہ تم وہ سب کچھ جانتے ہو جو دوسرے نہیں جانتے۔ میں اپنی حفاظت خود کر لوں گی۔ تم جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے نکل جاؤ میرے گھر سے۔'' وہ چیخ کر بولی۔

شائلہ واقعی پاگل ہوگئی تھی۔ محمود نے ایک قدم آگے بڑھایا اور رک گیا۔ ریوالور شائلہ کے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا اور گولی بلا ارادہ بھی چل سکتی تھی۔

''میں تم سب کو مار دوں گی اور خود بھی مر جاؤں گی۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

''شائلہ..... پلیز.....'' محمود نے نرمی سے کہا لیکن اس سے زیادہ اسے کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ کھڑکی کا شیشہ زبردست چھناکے سے ٹوٹا اور کوئی چیز پتھر کی طرح اندر آ گئی۔ اڑتی ہوئی کرچیاں بستر تک پھیل گئیں۔ شائلہ نے ایک چیخ ماری اور بستر پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔ اس کے سامنے ایک مردہ کبوتر آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ کبوتر کی گردن کٹی ہوئی تھی اور اس کے پر بھی کاٹ کر باندھ دیے گئے تھے۔ گردن سے نکلنے والے لہو کی مقدار دیکھ کر محمود کو تعجب ہوا۔ اس نے کبوتر کو انگلی سے دبا کر دیکھا۔

کبوتر کا جسم سرد اور اکڑا ہوا تھا۔ اسے مرے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن خون کا رنگ سرخ اور تازہ تھا۔ محمود نے خون کو چھو کے انگلی کے پورے سے سونگھا۔ اس میں تازہ لہو کی مہک بھی نہ تھی۔ یہ خون نہیں سرخ رنگ تھا۔ کسی نے کبوتر کو مار کے رکھ لیا تھا کیونکہ اسے براہ راست نشانے سے اندر پہنچانے کے امکانات نہ رہے۔ کبوتر کے پاؤں چھوٹی رسی سے بندھے ہوئے تھے اور اسے گھما کر کھڑکی میں پھینک دیا گیا تھا۔ آٹھ شیشوں میں سے کسی ایک کو توڑ کر کبوتر کا اندر گرنا عین ممکن تھا۔

محمود نے کھڑکی کے قریب جا کر دیکھا۔ مری کے پہاڑوں پر ابر آلودہ آسمان اور اندھیری رات پھیلی ہوئی تھی۔ بلند قامت درخت تیز ہواؤں کی یلغار میں تھے جو بادلوں کو اڑاتی سنسناتی اور سرسراتی ہوئی وادیوں میں سے گزر رہی تھی۔ یہ شور ایک مہیب سناٹے کی بازگشت بن کر ہر طرف گونج رہا تھا۔ اچانک ایک کار کی ہیڈ لائٹس دھوم کر گیٹ پر آئیں اور لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے پٹ روشن ہوگئے۔ آڑھی لکیروں کا سایہ دیوار پر پڑا مگر اندھیرے اجالے کی لکیروں کے اس جال میں ایک شخص کا سایہ بھی گرفتار تھا جو پٹ کے قریب کھڑا تھا۔ اتنے فاصلے سے اس کے کوٹ پتلون کا یا ٹائی کے رنگ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا مگر ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی سے اس کے لباس سے بھی چوڑائی کے رخ دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ اوسط قد و قامت کا نوجوان آدمی تھا جس کی صورت کے نقوش بھی سایوں کی دھوپ چھاؤں میں گم تھے۔ دوسرے لمحے وہ جھاڑیوں کی باڑھ کے پیچھے گم ہوگیا اور محمود نے چھوٹے میاں کو کار سے اتر کر گیٹ کھولتے دیکھا پھر بڑے میاں صاحب نے کار آگے بڑھا دی اور محمود نے پلٹ کر دیکھا تو شائلہ ابھی تک بستر پر آڑی لیٹی

لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے شائلہ کو سیدھا لٹایا اور اس کا ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر کبوتر کو اٹھالیا اور پھر کچھ سوچ کر اس نے کبوتر وہیں پھینکا اور باہر نکل آیا۔

بیڈروم کا دروازہ بند کر کے وہ کچن کی طرف لپکا۔ پچھلی طرف کھلنے والے دروازے سے گیراج کی طرف جانے کے بجائے وہ دوسری سمت سے گھوم کر گیٹ تک جانا چاہتا تھا تاکہ اس پُراسرار شخص کو دیکھ سکے جو بند گیٹ کے پاس کھڑا تھا اور کار کو دیکھتے ہی غائب ہوگیا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار پلوشہ جہاں کے بھائی کا خیال آتا تھا۔ اگر وہ شریفانہ لباس پہن لے تو شاید ایسا ہی لگے۔

پہلے ہی موڑ پر اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہے۔ سر پر پڑنے والی ایک ضرب سے وہ چکرا گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے جگنو سے جگمگانے لگے۔ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے سرکنے لگی اور اس نے بے اختیار مدمقابل کو پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلائے جس کا وجود ایک سیاہ ہیولے کے سوا کچھ نہیں تھا مگر تاریکی اور خلاء کے سوا اس کے ہاتھوں میں کچھ نہ آیا۔ وہ نیچے گرا اور بے حسی کے سمندر میں ڈوب گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو ایک ہاتھ اسے سہارا دیے ہوئے تھا۔ کوئی نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ اس نے غور کیا یہ آواز اسے جانی پہچانی لگی پھر اسے یاد آیا' یہ احمد کی آواز تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھنے سے اس پر انکشاف ہوا کہ وہ وہیں لیٹا ہے' جہاں گرا تھا اور شاید زیادہ دیر ہوش سے بیگانہ نہیں رہا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

''کیا..... کیا ہوا محمود صاحب!'' احمد نے شاید تیسری بار پوچھا۔

''تمہیں..... تمہیں..... کچھ..... کچھ نہیں معلوم؟'' محمود نے سر کو جھٹک کر کہا۔ ''تم نے نہیں دیکھا کہ وہ کون تھا؟''

''وہ کون؟'' احمد نے کہا۔ ''کوئی اور بھی تھا یہاں۔ میں نے تو کسی کو بھی نہیں دیکھا۔''

ہنسیے.....!

خوشی اور غم

پہلا شخص: ''یہ یورپ اور امریکا وغیرہ میں شادی کے وقت دلہن سفید لباس کیوں پہنتی ہے؟''

دوسرا شخص: ''اپنی خوشی کے اظہار کے لیے.....!''

پہلا شخص: ''اوہ! اب سمجھ میں آیا کہ دلہا ہمیشہ کالا سوٹ کیوں پہنتا ہے۔''

ایمرجنسی

ایک ادھیڑ عمر شخص نے اوزاروں کا بکس اُٹھائے ایک خوبصور مکان کی اطلاع گھنٹی کا بٹن دبایا۔ ایک خوبصورت خاتون نے دروازہ کھولا اور استفہامیہ نظروں سے ادھیڑ عمر شخص کو دیکھنے لگی۔

''بی بی! میں پلمبر ہوں اور آپ کا نل ٹھیک کرنے آیا ہوں۔''

''لیکن میں نے کسی پلمبر کو طلب نہیں کیا' پھر آپ نے کیوں زحمت فرمائی ہے۔؟''

''کیا کہا؟ کیا آپ مسز جمیل نہیں ہیں؟''

''جی نہیں۔ وہ تین ماہ قبل مکان تبدیل کر چکی ہیں۔ ہم نئے کرائے دار ہیں۔''

''کمال ہے! لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ پلمبر کو بلواتے ہیں، کہتے ہیں ایمرجنسی ہے، پھر پلمبر آتا ہے تو وہ مکان تبدیل کر چکے ہوتے ہیں۔''

صد شکر

ایک عظیم موسیقار چل بسا' اس نے بہت تاکید سے وصیت کی تھی کہ اسے اس کی بانسری کے ساتھ دفن کیا جائے۔

موسیقار کے دوست نے تدفین کے بعد بیوہ سے کہا: ''آپ کا کیا خیال ہے' آپ کے آنجہانی شوہر کی وصیت عجیب نہیں تھی؟''

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے شوہر نے پیانو کے ساتھ دفن ہونے کی وصیت نہیں کی ورنہ ہمیں بڑی پریشانی ہوتی۔'' ☆

محمود اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے جھاڑ کر اس نے احمد کو غور سے دیکھا۔ ''میرا خیال ہے' تم عملاً غلط بیانی کر رہے ہو۔ کسی نے ابھی ابھی.....'' وہ رک گیا۔ احمد اس کی بات کا سخت برا مان کے پلٹ چکا تھا۔ محمود نے ایک گہری سانس لی اور چند فٹ وہیں کھڑا اس حادثے پر غور کرنے کے علاوہ اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر وہ اندر گیا تو شائلہ کے کمرے میں اسے رابعہ نظر آئی۔ وہ وہیں رک کر ان کی باتیں سننے لگا۔

رابعہ بستر کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی شائلہ کو سکون بخش گولی اور گلوکوز ملے پانی کا گلاس دے رہی تھی۔ ''ممی! آخر اس میں دہشت زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ مردہ آدمی بھی کسی بچے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ تو بے ضرر سا پرندہ ہے اور وہ بھی مردہ..... آپ کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''تم..... تم شاید ٹھیک کہتی ہو بیٹی!'' شائلہ زبردستی مسکرائی۔ جس لہجے میں اس نے رابعہ کو بیٹی کہا تھا' وہ محمود کے لیے بہت اجنبی تھا۔ ''بس جب میں اکیلی رہ جاتی ہوں نا تو معلوم نہیں کیوں خوف طاری ہو جاتا ہے مجھ پر۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ بیٹی..... میں اب..... بوڑھی ہونے لگی ہوں۔ میری دیکھ بھال اگر تم نہیں کرو گے تو کون کرے گا..... تم میرے احمد کی بیوی ہو۔ اکیلے ہونے والے بچے کی ماں ہو۔ میرے پوتے کی ماں..... وہ بھی تو میرا ہی خون ہیں' ہیں نا۔'' وہ خوف کی ذہنی کیفیت میں بولتی جا رہی تھی۔ ''میں نے اب تک تمہارے اور احمد کی ساتھ بڑی زیادتی کی۔ میں اس کی تلافی کر دوں گی۔''

''ممی۔'' رابعہ اٹھلا کر بولی۔ ''آج اچانک یہ خیال کیسے آ گیا آپ کو' پہلے تو کبھی آپ نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔''

''کبھی نہ کبھی ہر شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے بیٹی.....'' شائلہ نے کہا۔ ''بس تم میرے پاس رہو۔''

''لیکن ممی..... احمد نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ اب ہم الگ رہیں گے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''ہمیں یہاں کوئی اپنا نہیں سمجھتا۔''

''یہ غلط ہے' تم مالک ہو اس گھر کی۔'' شائلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میں تمہیں اپنا سمجھتی ہوں۔ میرا جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے' کل میں دو لاکھ سے اس بچے کا اکاؤنٹ کھول دوں گی۔ وہ پیدائشی لکھ پتی ہوگا۔'' وہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔

''یہ آپ رشوت دے رہی ہیں مجھے' اس لیے کہ آپکو تنہائی سے خوف آتا ہے اور آپ ہمیں ہر قیمت پر روکنا چاہتی ہیں۔'' رابعہ نے روکھے لہجے میں کہا۔

''آج آپ کی زبان بیٹی کہنے لگی ہے۔ کل کو میں پھر بہو بن جاؤں گی۔ آپ مجھے لالچی ہونے کا طعنہ دیں گی۔ ایسے دو لاکھ کس کام کے۔''

''ایسا نہیں ہوگا' میں وعدہ کرتی ہوں۔ احمد کو سمجھا لے' وہ تیری بات نہیں ٹالے گا۔'' شائلہ اس کی منت سماجت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تیرے بچے کی زندگی کی قسم کھاتی ہوں۔''

''اور نظامی صاحب؟ ان کا کیا ہوگا؟'' رابعہ نے کہا۔

''ہم سب ساتھ رہ لیں گے' آخر وہ میرا شوہر ہے۔ رابعہ..... احمد کا باپ نہیں تو کیا۔'' شائلہ نے کہا۔ ''وہ احمد کا دشمن بھی نہیں ہے۔''

''اچھا میں بات کروں گی احمد سے۔'' رابعہ جانے کے لیے اٹھی۔ دروازے کے قریب اسے محمود نظر آیا تو وہ یوں ٹھٹک کر رکی جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

''میں بھی وہی کر رہا تھا جو تم کرتی ہو۔'' محمود نے آہستہ سے کہا۔

''تم اندر مت جانا۔'' وہ سرگوشی میں محمود سے مخاطب ہوئی۔ ''معلوم نہیں کیوں شائلہ تمہارے اتنے خلاف ہو رہی ہے اور اس پر ہپناٹیزم یا کالے علم کا ابھی تک اثر ہے۔ تکیے کے نیچے میں نے ابھی ایک ریوالور بھی

دیکھا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" محمود نے کہا۔ "تم اس کا کہا چھوڑ دو۔ شائلہ تو آج اپنی [illegible] تم [illegible] [illegible] تل گئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے کوئی گڑبڑ ہو جائے۔"

رابعہ نے اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر اسی وقت شائلہ نے پکار کر کہا۔ "رابعہ بیٹی! کس سے باتیں کر رہی ہو؟"

"کوئی نہیں امی......" رابعہ نے کہا۔ "میں تو کسی سے بات نہیں کر رہی ہوں۔"

محمود بوجھل مگر بے آواز قدموں سے پھر باہر نکل آیا۔ رات کچھ اور سیاہ اور سنسان اور پُرشور ہو گئی تھی۔ ہوا کے جھکڑ درختوں کو ہلا رہے تھے اور پہاڑوں میں گونجنے والا یہ شور چڑھتے ہوئے سمندر کی طوفانی لہروں کی گرج لگتا تھا۔ وہ لان کے آخری حصے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور واقعات کی گتھیاں سلجھانے لگا۔ جن میں تازہ ترین اضافہ اس پر حملہ تھا۔ حملہ آور جو بھی تھا' شاید اسے مار کر کسی گہرے کھڈ میں پھینک دیتا۔ میاں برادران کی دھمکی اس کے ذہن میں تھی۔ پہاڑوں میں آدمی کا پیر بھی پھسل جاتا ہے۔ حادثات تو یہاں بڑے ہی خوفناک ہوتے ہیں لیکن میاں صاحبان اسی وقت کار لے کر پہنچے تھے اور جب اس پر حملہ ہوا تو شاید گیراج سے باہر بھی نہیں آئے تھے۔

حملہ آور وہ دوسرا نامعلوم شخص بھی ہو سکتا تھا جسے محمود نے گیٹ کے اندر روشنی اور سائے کی لکیروں میں کیموفلاج کی طرح اور پھر اگلے لمحے غائب ہوتے دیکھا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ پلوشہ جہاں کا بھائی ہو جو واقعی اسے قتل کرنے آیا ہو۔ پلوشہ جہاں نے محسوس کیا ہو کہ اس کے مستقبل کے لیے خطرات کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر شائلہ کی کار سے اتر کے آنے والا احمد اچانک نہ آ جاتا تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ گھر کے دریچوں کی ہر روشنی بجھ گئی مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔

خدمت

اینڈ کمپنی

ہنری پر اس کے مالک مکان نے مقدمہ دائر کر دیا۔ کوئی وکیل ہنری کا جاننے والا نہیں تھا چنانچہ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے وکلاء کی ایک فرم کا نام اور ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیا۔ وکلاء کی فرم کا نام "کوارٹ، کوارٹ، کوارٹ اینڈ کوارٹ تھا۔ ہنری نے فون نمبر ڈائل کیا اور رابطہ قائم ہونے پر بولا۔ "کیا مسٹر کوارٹ تشریف رکھتے ہیں؟"

"جی نہیں۔" ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "وہ کسی کام سے باہر گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' پھر آپ میری بات دوسرے مسٹر کوارٹ سے کرا دیں۔" ہنری نے بے تابی سے کہا۔

"ان کا ہماری فرم سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔" بھاری آواز والے شخص نے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔ تب پھر آپ تیسرے مسٹر کوارٹ سے میری سے میری بات کروا دیں۔"

"وہ ایک ہفتے کے کاروباری دورے پر نیویارک گئے ہیں۔"

"بہت خوب، ازراہ کرم چوتھے مسٹر کوارٹ سے میری بات کروا دیں۔"

"بول رہا ہوں' فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

☆

پھر اس کے خیالات کی رو اچانک ٹوٹ گئی۔ اس اندھیرے گھر میں سے چوروں کی طرح نکلا تھا۔ اس کی چال اور قدوقامت کے علاوہ بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے کی عادت کے باعث محمود نے پہچان لیا تھا کہ وہ نظامی ہے۔ اب وہ اندھیرے میں کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے ڈائل پر روشن ہندسے تھے۔ محمود چوکس ہوگیا۔ اتنی رات گئے یہ انتظار کس لیے؟ اس نے آہٹ کیے بغیر درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اور قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے سوچا۔ اس کے سوال کا جواب دس منٹ بعد ہی مل گیا۔ نظامی نائٹ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر آنے والے راستے پر ٹہلتا ہوا اس کے سامنے اور گیٹ کے بہت قریب پہنچ چکا تھا کہ باہر سے ایک سایہ نمودار ہوا' یہ پلوشہ تھی۔

''تمہیں پلوشہ نے بلایا تھا۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''تم نے آنے سے انکار کردیا۔ کیا پاؤں میں مہندی لگا رکھی تھی؟''

''میں نے تمہارے اس بے وقوف بھائی کو بتا دیا تھا کہ میں بیمار ہوں۔'' نظامی نے کہا۔ ''وہ تمہارا پیغام لے کر آیا تھا۔''

''پلوشہ جہاں کا بھائی بے وقوف نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس نے تمہیں باہر سے آتے دیکھا تھا۔''

''وہ..... وہ تو میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔'' نظامی نے چڑ کر کہا۔ ''اور وہ بے وقوف اس لیے ہے کہ گیٹ بند تھا اور وہ اندر کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں دوسروں کی نظر پڑی یا نہیں۔ تمہیں میرا رقعہ مل گیا تھا؟''

''ہاں..... اب یہ بتاؤ کہ ایسی کون سی ضروری بات تھی جس کے لیے آج اور اسی وقت میرا آنا ضروری تھا۔'' پلوشہ جہاں نے کہا۔

''میں تم سے ایک مجبوری بیان کرنا چاہتا تھا۔'' نظامی نے کہا۔ ''میں اب تم سے مزید تعلق نہیں رکھ سکتا۔''

خاموشی کا مختصر وقفہ آیا پھر پلوشہ جہاں نے کہا۔

''تم بدعہدی کررہے ہو نظامی!''

''میرا تم سے نکاح تو نہیں ہوگیا تھا۔'' نظامی نے برہمی سے کہا۔

''جب تک میرا تم سے تعلق رہا' میں نے تمہیں منہ مانگا معاوضہ دیا ہے۔ یہ کاروباری تعلق تھا' زندگی بھر کا ٹھیکہ نہیں تھا۔''

''تمہارا لہجہ بھی بہت بدلا ہوا ہے نظامی!'' پلوشہ جہاں نے کہا۔

''جب تم نے مجھے خوبصورت وعدوں کے سبز باغ دکھائے تھے تو تمہارا لہجہ کچھ اور تھا۔ تمہیں یاد ہے' تم نے کیا کہا تھا اور تم کس مقصد کے تحت مجھے یہاں لائے تھے۔ اگر وہ کاروباری معاہدہ تھا تو اس کی تکمیل کہاں ہوئی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ شمائلہ رقابت میں پاگل ہوجائے گی اور تمہاری خاطر سب کچھ دے کر بھی اپنا ازدواجی مستقبل بچانے کی کوشش کرے گی اور اس سب کچھ میں اسے آدھا پلوشہ جہاں کا ہوگا جو تمہارے اپنے کہنے کے مطابق دو لاکھ سے کم نہیں ہوگا۔''

''ہاں..... لیکن اب وہ معاہدہ نہیں چل سکتا۔ بہت سی مجبوریاں درمیان میں حائل ہوگئی ہیں۔'' نظامی نے کہا۔

''مجبوری کو بہانہ مت بناؤ' تمہاری نیت میں فتور آگیا ہے۔'' پلوشہ جہاں نے کہا۔ ''غلطی پلوشہ جہاں کی ہے' اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ دغا کرسکتا ہے' اس بیوی کے ساتھ جو واقعی اسے چاہتی ہے' کیا وہ ایک طوائف سے کیے گئے معاہدے کا احترام کرے گا۔ تم مجھے شہر سے اس ویرانے میں لے آئے۔ مجھ پر اپنی اجارہ داری رکھی اور میرے بہت سے چاہنے والوں سے میرا تعلق ختم کردیا اور اب کہتے ہو' جاؤ وہیں لوٹ جاؤ' جہاں سے آئی ہو۔ دو لاکھ کو بھول جاؤ۔ میں نے سوچا تھا کہ دو لاکھ اکھٹے ملیں گے تو میرا بھائی کاروبار کرے گا اور میں باعزت زندگی گزاروں گی۔ کسی شریف آدمی سے شادی کرلوں گی۔ تم نے میرے سارے خواب

توڑ دیے کمینے..... دھوکے باز.....''

نظامی ہنسا۔ ''زبانی وعدوں پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ خصوصاً ایک طوائف کو جس کے اپنے عہد و پیمان صبح و شام بدلتے ہوں۔ سمجھ لو کہ تم نے یہ گھاٹے کا سودا کیا۔ تمہارے جذبات مجروح ہوئے تو مجھے کیا، تم خود بھی تو دوسروں کے جذبات سے ایسے ہی کھیلتی ہو۔''

''اگر یہ کھیل تھا نظامی تو تم کو یہ مہنگا پڑے گا۔ تم پچھتاؤ گے۔'' پلوشہ جہاں نے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں پلوشہ جہاں کیا کر سکتی ہے۔ کل تک سوچ لو..... اس کے بعد بھی اگر تمہارا فیصلہ یہی رہا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ گھاٹے کا سودا کس نے کیا تھا۔ میں تمہیں تباہ کر دوں گی۔''

''اس سے پہلے میں تجھے قتل کر دوں گا۔ فاحشہ..... تو مجھے بلیک میل نہیں کر سکے گی۔'' نظامی دانت پیس کر آگے بڑھا۔

پلوشہ جہاں ہنسی۔ ''آگے مت بڑھو نظامی! پلوشہ جہاں کبھی رات کے وقت نکلتی ہے تو اپنی زندگی کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتی۔ میرا جوان بھائی جانتا ہے کہ پلوشہ جہاں کا دوست کون ہے اور دشمن کون۔ پلوشہ جہاں کبوتر نہیں ہے کہ اس کھیل میں خوامخواہ جان سے جائے۔'' وہ پلٹی اور اطمینان سے چلتی ہوئی رات کے اندھیرے میں شامل ہو گئی۔

نظامی غصے اور بے بسی کے عالم میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ محمود ابھی پلوشہ جہاں کے آخری جملے پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس نے نظامی کو آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ گیٹ سے باہر نکل کر وہ کچھ دیر تذبذب میں مبتلا رہا اور ادھر دیکھتا رہا جدھر پلوشہ جہاں گئی تھی پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ آگے بڑھا۔ محمود اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے وہ اپنی کانچ کے گرد گھوم کر نشیب کی جانب ہو لیا تو محمود سمجھ گیا کہ پلوشہ جہاں نے عقل سے کام لے کر جو اپنی جان بچانے کی کوشش کی تھی، وہ ناکام ہو چکی ہے۔ وہ خود چوری چھپے

ہنسیے.....!

قطب مینار

دو افیمی پینک میں تھے۔

قطب مینار کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک کو خیال آیا کہ یہ تاریخی مینار دھوپ میں کھڑے کھڑے خراب ہو گا اس لیے اس کو سائے میں کر دینا چاہیے۔ دونوں مل کر قطب مینار کو دھکے لگانے لگے۔ دن گزر گیا اور شام ہو گئی تو دونوں مطمئن ہو گئے کہ بالآخر ان کی کوشش کامیاب ہو گئی۔

پلٹ کر دیکھا تو ان کے جوتے غائب تھے۔

ایک افیمی نے کہا ''ہماری جوتیاں؟''

دوسرے نے کہا..... ''بے وقوف وہ دو میل پیچھے دھوپ میں پڑی ہیں جہاں سے ہم نے مینار کو دھکا لگانا شروع کیا تھا۔''

مشورہ

کوک کے ٹن پر لکھا تھا: ''اس بات کو غلط ثابت کر دیجیے کہ آپ بے وقوف ہیں'' اس کے نیچے جلی حروف میں درج تھا ''براہ کرم ڈبے کو دوسری طرف سے کھولیے یہ پیندا ہے۔''

جدید طریقہ

ایک بے روزگار انجینئر کو سفارش کے بعد محکمہ زراعت میں ملازمت مل گئی۔ چند روز کی تربیت کے بعد اسے گاؤں میں بھیجا گیا کہ کسانوں کو زراعت کے پرانے طریقے ترک کرنے اور جدید زراعت کے اصول اپنانے پر راغب کیا جائے۔ نوجوان نے ایک باغ کے مالک کو جدید طریقوں کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ فرسودہ طریقے استعمال کر کے تم اس درخت سے پانچ سیب بھی حاصل کر لو تو مجھے تعجب ہو گا۔

''تعجب تو مجھے ہو گا'' کسان نے کہا ''کیونکہ وہ درخت ناشپاتی کا ہے۔'' ☆

عقبی راستے سے نکل کر آئی تھی اور اس کے بھائی کو شاید اس کی عدم موجودگی کا علم بھی نہیں تھا۔ واپسی کے لیے بھی سڑک چھوڑ کر اس نے گھروں کے پیچھے نشیبی راستے کا انتخاب کیا تھا اور نظامی اس کی چال کو سمجھ گیا تھا۔

اب پلوشہ جہاں کی زندگی خطرے میں تھی، صبح اگر اس کی لعش کھڈ میں پڑی ملتی تو اس حادثے کا الزام نظامی پر کبھی نہیں آتا۔ اس کی بیوی حلفیہ بیان دیتی کہ وہ تمام رات اس کے ساتھ تھا۔ محمود نے قدم تیز کردیے۔ اسے نظامی کے بھاری قدموں کی اور جھاڑیوں کو پیچھے ہٹا کے آگے بڑھنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاخیں چیخ رہی تھیں اور خشک پتے چور ہو رہے تھے۔ اس کے جوتوں سے گرنے والے پتھر کنکر مسلسل نیچے لڑھکتے جا رہے تھے اور شاخوں سے الجھتی دامن چھڑاتی اونچے نیچے راستوں پر ٹھوکریں کھاتی اور سنبھلتی بھاگ رہی تھی۔ دوبارہ محمود نے اس کی خوفزدہ دبی دبی چیخ سنی۔ نظامی مستقل درندے کی طرح غرانے لگا تھا اور شکار کو قریب پا کر اس کے خون کی پیاس جاگ اٹھی تھی۔ محمود بھی اب اندھا دھند بھاگنے لگا تھا۔ پلوشہ جہاں کو بچانے کے علاوہ اس کے ذہن پر اس ذلیل انسان کو مار مار کر ادھ موا کردینے کی خواہش بھی غالب تھی جس نے پہلے محبت کرنے والی بیوی کو ٹوٹنے کے لیے ایک طوائف کا سہارا لیا تھا اور پھر اس طوائف کو بھی دھوکہ دیا تھا۔

رات کے سناٹے میں اچانک ایک فائر کی آواز گونجی اور نظامی کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی۔ پہلے کوئی بھاری وجود شاخوں سے الجھ کر گرا اور پھر محمود دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گر گیا۔ اس نے زمین پر نزع کے کرب میں مبتلا نظامی کو دیکھا جس کے کنپٹی کے سوراخ سے لہو کا فوارہ ابل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نظامی سے کچھ پوچھتا، گھات میں بیٹھے ہوئے چیتے کی طرح کسی نے اس پر جست لگائی۔ محمود نے بڑی پھرتی سے حملہ آور کو اچھال دیا اور کروٹ لیکر کھڑا ہوگیا۔ حملہ آور پھر اس کی طرف لپکا اور رک گیا۔ ''تم۔'' چھوٹے میاں نے حیرت اور خوف سے کہا۔ اپنے سامنے محمود کو موجود پا کے وہ شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہوا تھا۔ وہ پلٹ کر بھاگا اور محمود نے اس کے پیچھے تعاقب میں دوڑ لگائی۔ چند قدم کے فاصلے پر محمود نے اسے دبوچ لیا۔

''محمود صاحب..... پلیز میری..... بات سن لیں..... خدا کی قسم میں نے اسے نہیں مارا۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''پھر کس نے مارا ہے؟'' محمود نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑلی۔ ''تمہارا بھائی کہاں ہے؟''

''مجھے..... مجھے..... مجھے نہیں معلوم..... ہم ایک ساتھ نکلے تھے لیکن ہم نظامی کو قتل کرنا نہیں چاہتے تھے۔'' چھوٹے میاں نے کہا۔ ''ہم تو صرف اس کا تعاقب کررہے تھے۔''

''کیوں؟'' محمود نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور ہتھیار ڈال چکا تھا۔

''اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج کل میں ہمیں ایک لاکھ دے گا۔'' چھوٹے میاں نے کہا۔ ''اس کی بیوی نے فی الحال اتنی ہی رقم دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ نظامی یہ رقم اس فاحشہ پر لٹادے گا۔ وہ عموماً رات کو اس سے ملنے جاتا ہے۔ آج ہم۔ پہلے سے پلوشہ جہاں کے گھر پہنچ گئے تھے۔ اگر وہ کوئی ایسی ویسی بات کرتا تو ہم سن لیتے مگر وہ زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ آج اس نے پلوشہ جہاں کو ادھر بلوالیا۔ ہم پلوشہ جہاں کے پیچھے پیچھے آئے تھے اور باہر ہی رک گئے تھے۔''

''اگر تم نے اسے نہیں مارا تو اسے کس نے مارا ہے؟'' محمود نے کہا۔

''میں کیا بتا سکتا ہوں۔'' چھوٹے میاں نے کہا۔ ''تم خود ہی سوچو کہ ہم نظامی کو مار دیتے تو ہمیں اپنی فلم کی تکمیل کے لیے سرمایہ کون فراہم کرتا۔ شائد تو ہمیں آج نکال یا باہر کرے۔ ہماری ساری امیدیں نظامی سے وابستہ تھیں۔''

چھوٹے میاں صاحب کی بات سو فیصد منطقی تھی

مگر اب محمود کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔ وہ شائلہ کو کیسے بتائے گا کہ نظامی کی نعش اس ویران جنگل میں پڑی ہے اور اس کے سر میں کسی نامعلوم دشمن کی گولی نے سوراخ کر دیا ہے۔ وہ دشمن انہی میں ہے جو دوستی کے اور رشتوں کے نظر فریب نقاب میں چہرے چھپائے اس کے آس پاس موجود ہیں۔ وہ کیسے بتائے گا کہ یہ خون اس کی ذرا سی کوتاہی' معمولی سی غفلت اور تھوڑی سی تاخیر کے باعث ہوا۔ اگر وہ نظامی کو گھر سے نکلتے ہی روک لیتا' اسے دس قدم پہلے پکڑ لیتا تو وہ زندہ رہتا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر کی طرف چلنے لگا۔ میکانکی انداز میں چھوٹے میاں صاحب اس کے پیچھے۔

کسی عورت کی دل دہلانے والی چیخ ان کے کانوں سے اس وقت ٹکرائی جب وہ کاٹیج سے چند قدم دور تھے۔ محمود بے اختیاری طور پر بھاگا۔ تاریک گھر کے دریچے ایک ایک کر کے روشن ہونے لگے اور وہ دلخراش چیخ پھر سنائی دی اور محمود برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے اندر داخل ہوا تو اسے مختصر سے کاریڈور میں اپنے سامنے احمد نظر آیا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے دیوار سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ محمود کو اس کی بزدلی اور کم ہمتی پر تعجب ہوا۔ اندر جا کر اپنی بیوی سے چیخ و پکار کا سبب پوچھنے کے بجائے وہ یہاں دبکا بیٹھا ہے۔ شائلہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس میں شائی کے خون کا ذرہ برابر اثر نہیں ہے۔ یہ تو محمود کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ آواز کس کی تھی۔

''احمد۔'' محمود نے چلا کر کہا۔ ''کیا ہوا ہے رابعہ کو؟''

''وہ..... وہ چڑیل..... خونی ڈائن.....'' وہ کراہا اور تب محمود نے دیکھا کہ اس کی بغلوں سے خون کا سرخ رنگ جھلک رہا تھا۔ احمد کے دونوں ہاتھوں پر خنجر کے وار کی گہری لکیریں تھیں جن سے خوف بہہ رہا تھا۔ اس خون کو روکنے کے لیے احمد نے اپنے ہاتھ بغلوں میں دبا لیے تھے۔ ''میں اس کو نہیں

مُسکرائیے.....

یاددہانی

نشہ میں دھت ایک شخص لندن کی سڑک پر اس طرح جا رہا تھا کہ اس کا ایک پاؤں فٹ پاتھ پر تھا اور دوسرا سڑک پر۔ ایک کانسٹیبل نے اسے دیکھا تو قریب جا کر اسے فٹ پاتھ پر کر دیا اور تاکید کی کہ اتنی نہیں پینی چاہیے کہ آدمی ہوش کھو بیٹھے۔

راہ گیر نے کانسٹیبل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ''توجہ دلانے کا شکریہ! ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں لنگڑا ہو گیا ہوں۔''

انتظار

سخت دھوپ میں اسکول کے بچے بہت دیر سے ڈرل کر رہے تھے۔ ڈرل ماسٹر نے آخری ڈرل کرانے کے بعد کہا: ''جب میں ''ڈس مس'' کہوں تو تمام لڑکے بھاگ جائیں۔ ابھی ڈرل ماسٹر نے ''ڈس'' ہی کہا تھا کہ ایک کے سوا تمام لڑکے بھاگ گئے۔

ڈرل ماسٹر نے اس اکیلے لڑکے سے پوچھا: ''تم کیوں کھڑے ہو؟''

لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا ''سر! میں آپ کی مس کا انتظار کر رہا ہوں۔''

قصوروار

پروفیسر کو کالج جانے کی جلدی تھی۔ عجلت میں کپڑے تبدیل کرتے ہوئے وہ قمیض سے جنگ کر رہے تھے۔ بالآخر تنگ آ کر انہوں نے کہا: ''میرا خیال ہے ہمیں دھوبی بدل دینا چاہیے۔ اس نے قمیض کو اتنا سکیڑ دیا ہے کہ میرے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔''

''دھوبی کا کوئی قصور نہیں ہے'' بیوی نے توجہ دلاتے ہوئے کہا ''قمیض کی آستین سے سر واپس نکال کر گریبان میں ڈالیے سانس ٹھیک ہو جائے گا۔''

روک سکا۔''

اس نے بے بسی سے محمود کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ محمود اس کے بیڈروم کی طرف دوڑا۔ خواب آور گولیاں کھا کے سونے والی شائلہ بھی اب بیدار ہو چکی تھی اور مسلسل پکار رہی تھی۔ ''احمد..... احمد..... یہ کیا ہے۔ نظامی..... نظامی۔''

محمود کمرے میں داخل ہوا اور رک گیا۔ دو دیواروں کے سنگم پر رابعہ کا جسم نیچے پھسلتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے خنجر کے اس دستے کو تھام رکھا تھا جس کا پھل سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست تھا۔ خون اس کے پیٹ کے چاک سے بھی ابل رہا تھا اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی پلوشہ جہاں کی خادمہ بڑے سکون سے اسے مرتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے بوڑھے ہاتھوں نے پہلے وار میں رابعہ کا پیٹ چاک کیا تھا اور دوسرے وار میں اس کے دل کو نشانہ بنایا تھا۔ رابعہ سے پہلے وہ زندگی ختم ہو چکی تھی جو رابعہ کے وجود میں جنم لینے والی تھی۔ پیدائش سے پہلے لکھ پتی ہو جانے والا بچہ اپنی ماں سے پہلے مر چکا تھا۔

''یہ..... یہ تم نے کیا کیا؟'' آواز محمود کے حلق میں پھنس گئی۔

''کچھ نہیں۔'' بڑھیا سکون سے بولی۔ ''اس نے نظامی کو مارا تھا' میں نے اسے مار دیا۔''

محمود نے رابعہ کو دیکھا جو بڑے مضحکہ خیز طریقے پر گٹھری بنی پڑی تھی اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی محمود پر جمی تھیں۔ وہ آدھی رات کو بھی جیکٹ' ڈینیم کی پتلون اور وہی جوتے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے لباس' سر کے بالوں میں اور جوتوں میں خس و خاشاک شاخوں سے ٹوٹے ہوئے تازہ سبز پتے اور سبز گھاس کے خوشے الجھے ہوئے تھے۔ وہ واقعی ابھی ابھی باہر سے آئی تھی۔ وہ بوڑھی عورت شاید غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔'' محمود نے کہا۔ ''کیا تم نے دیکھا تھا؟''

''میں پلوشہ جہاں کے ساتھ ہی گھر سے نکلی تھی۔'' وہ بولی۔ ''مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ میں کام کاج سے فارغ ہو کر گھر جانے کے لیے روانہ ہوئی تھی کہ مجھے اندھیرے میں دو آدمی نظر آئے جو کھڑکی کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور محمود نے پلٹ کر دیکھا' وہ چھوٹے میاں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ''میں بہت دیر تک ان کو دیکھتی رہی۔ پھر پلوشہ جہاں باہر آئی تو یہ اس کے پیچھے چلنے لگے۔ میں پلوشہ جہاں کو آواز دے کر خبردار کرنا چاہتی تھی مگر میں نے سوچا کہ کہیں یہ مجھے بھی ٹھکانے نہ لگا دیں۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ جب تک میں اپنے بیٹے کے قاتل سے انتقام کی آرزو پوری نہ ہوتی میں مر بھی نہیں سکتی تھی۔ اب میں مطمئن ہوں' میں نے انتقام لے لیا۔ نظامی کے قتل سے مجھے کیا' میں نے تو اس کو اپنے بیٹے کے قتل پر سزائے موت دی ہے۔ اس نے میرے جوان بیٹے کو مارا تھا۔ ایک نہ ایک دن مجھے یہ قرض اتارنا ہی تھا۔ آج میں نے پلوشہ جہاں کے ساتھ واپس آتے ہوئے اسے دیکھ لیا مگر پلوشہ جہاں کو معلوم نہ تھا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ میں تھوڑے فاصلے سے اور ذرا ہٹ کر چل رہی تھی۔ میں نے اسے نہ دیکھا ہوتا تو پلوشہ جہاں گھر چلی جاتی اور میں نیچے چلی جاتی اپنے گھر کی طرف مگر مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔

اچانک نظامی ایک درخت کے پیچھے سے نکلا اور اس لڑکی نے گولی چلا دی پھر یہ بھاگی اور میں اطمینان سے اس کے پیچھے چلی آئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گھر کے کتنے لوگ باہر ہیں۔ صرف اس لڑکی کا شوہر میرا راستہ روک سکتا تھا مگر وہ مجھے نہ روک سکا۔''

محمود کو پورے اعتراف جرم کے دوران ایک لفظ پر بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ رابعہ نے وہ گولی اس ریوالور سے چلائی ہوگی جو شائلہ کے تکیے کے نیچے موجود تھا۔ یہ بات شائلہ کو معلوم تھی۔ شائلہ کے سو جانے کے بعد اس کے لیے ریوالور کا حصول مشکل نہ

تھا۔

''اب تم پولیس کو بلالو' میں نے ایک قاتل کو مار دیا ہے۔'' بڑھیا قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس کی یہ دیوانی ہنسی مرگھٹ میں قید ہونے والی چڑیل جیسی تھی۔ آسیب زدہ اور بھیانک۔ ''قاتل تو میں بھی ہوں نا۔ پکڑو مجھے' میں پھانسی سے نہیں ڈرتی' میں موت سے نہیں ڈرتی' میں کسی سے نہیں ڈرتی کیونکہ میں نے قتل نہیں کیا' انصاف کیا ہے۔ دنیا نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔''

وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی پھر اچانک نیچے بیٹھ کر اس نے رابعہ کے بہتے ہوئے خون میں ہاتھ بھر کے منہ پر مل لیے۔ ''ہاہاہا.....'' وہ چیخیں مار مار کر ہنسنے لگی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ میں اپنے بیٹے کے خون کا بدلہ ضرور لوں گی۔'' وہ پھر چلانے لگی۔ ''اس نے میرا گھر اجاڑا تھا' میں بہت خوش ہوں' بہت خوش۔''

وہ پاگل ہو چکی تھی۔ محمود نے دیکھا کہ دروازے میں منجمد چھوٹے میاں کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی کھڑا تھا۔ ان کے ساتھ وہ فلمی ہیروئن بھی کھڑی تھی اور ان سب کے پیچھے احمد اپنے ہاتھوں سے ٹپکنے والے خون سے بے نیاز کھڑا ہے مگر ان میں سے کسی کی نگاہ شمائلہ پر نہیں تھی جوان کے قدموں میں بے ہوش پڑی تھی۔

مری کی رونق اور گہما گہمی پر موسم سرما کی ویرانی اور بے سروسامانی غالب آ چکی تھی۔ بازار یوں سنسان پڑے تھے جیسے کبھی آباد ہی نہ تھے اور ان کے مقفل دروازوں کے سامنے کتے لوٹ رہے تھے۔ کافی ہاؤس اور فیشن ایبل خواتین کے شاپنگ سینٹر بیوٹی پارلر' سنیما اور پُرہجوم ہوٹل سب آئندہ موسم گرما میں ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے بند تھے جو اگلی بہار تک زندگی کی مسرتوں' نعمتوں اور آسائشوں سے بہرہ ور ہونے کے لیے زندہ رہیں گے۔

تنہا درخت اور سرسبز وادیوں میں اکیلے رہ جانے والے پھول خزاں کے انتظار میں تھے اور صرف ایک ماہ قبل حسن و نکہت و نور کی جلوہ گری پر اب

مُسکرائیے.....

آمدنی

لندن میں ایک پلمبر نے اپنے بریف کیس میں سے چند اوزار نکال کر ذرا سی دیر میں نل درست کیا اور وکیل صاحب کو اپنا بل تھما دیا۔

بل دیکھ کر وکیل صاحب چراغ پا ہو گئے۔

''دو سو ڈالر فی گھنٹہ..... میں تو دن بھر میں بھی اتنی رقم نہیں کما پاتا۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' پلمبر نے پورے خلوص سے تائید کی۔ ''وکالت میں میرا بھی یہی حال تھا' اب خدا کا شکر ہے۔''

کاہلی

ایک کاہل پیڈی نوجوان سے اس کے دوست نے کہا۔

''سنو! سردار کی خوبصورت بیٹی شادی کرنا چاہتی ہے۔ اگر تم گھر جا کر نہا لو اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر سردار کی بیٹی سے مل لو تو مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بیوی بننا قبول کر لے گی۔''

نوجوان جماہی لے کر بولا: ''ہو سکتا ہے..... لیکن فرض کرو' میں جا کر نہا لوں اور میں نے صاف ستھرے کپڑے بھی پہن لیے اور سردار کی بیٹی نے پھر بھی مجھ سے شادی نہ کی تو.....؟''

تحفہ

پہلا دوست: ''میں نے اس بار بیوی کی سالگرہ پر اسے ایک ہیروں کا سیٹ دیا ہے۔''

دوسرا دوست: ''اس سے بہتر تھا کہ کوئی سستی سی گاڑی لا دیتے۔''

پہلا دوست: ''تو کیا نقلی گاڑیاں بھی ملتی ہیں؟''

☆

کسی آسیب زدہ شہر کا گمان ہوتا تھا جس کے مکین کسی بلائے آسمانی سے مرگ ناگہاں کا شکار ہو گئے ہوں۔

اپنے آبائی شہر کی طرف روانہ ہونے والی واحد بس میں' میں بیٹھا ہوا تھا۔ محمود سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس سال مری نہ آتا یا شائلہ سے نہ ملتا اور اگر یہ بھی ناگزیر تھا تو اس سے ہمیشہ کی طرح دامن بچا کے نکل جاتا تو اگلے سال مری آ کے کتنا خوش ہوتا لیکن کیا آئندہ سال جب وہ مری آئے گا تو کیا یادوں کے آسیب اس کا پیچھا نہیں کریں گے۔ مری کے قبرستان میں دو کچی قبروں پر کتنی برف پڑ چکی ہوگی اور آنے والے موسم کے کتنے خزاں رسیدہ پتے ڈھیر ہو چکے ہوں گے' وقت کی راہگزر پر ایک سال پیچھے رہ جانے والوں کا ہمسفر کون ہوگا۔ سوائے ان کی اپنی تنہائی کے۔

اس کانٹج میں جہاں پلوشہ جہاں تھی' کوئی اور دلربا خاتون ہوگی اور اس کی چاہت کا نذرانہ ہوگا۔ دس یا بیس یا پچاس ہزار سکہ رائج الوقت اس کے حسن و شباب کی غارت گری کے تناسب سے متاع حسن خریدار کے مطابق اس چوکیدار کی قبر پر کون جائے گا جو کسی کا رقیب نہ تھا مگر رقابت میں گیا۔ صرف اس لیے کہ وہ رابعہ کے الفاظ میں بے حد صحت مند' اسمارٹ اور ہینڈسم مرد تھا۔

اور اسی شہر کی ایک پڑھی لکھی نفسیات میں ایم اے کرنے والی خطرناک حد تک عیار عورت اس پر مرمٹی تھی۔

رابعہ نے اس کے بارے میں جو کچھ محمود کو بتایا تھا' جھوٹ تھا' وہ جھوٹ جو سچ نظر آتا تھا۔ اس چوکیدار کے مقابلے میں احمد کی مردانہ شخصیت دب کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ رابعہ نے ایک ٹکٹ میں دو مزے لینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے چاہا تھا کہ وہ دولت مند احمد کی بیوی رہے اور اس کی ماں کی طرف سے ملنے والی تمام دولت کا وارث بنا دے اور اپنی حیوانی خواہشات کی تسکین کے لیے ایک بے حد صحت مند' اسمارٹ اور ہینڈسم خریدے لیکن وہ مرد برائے فروخت نہیں تھا۔ وہ نمک حرام' بے غیرت اور بے ضمیر نہیں تھا۔ اس نے رابعہ سے کہا۔

''رابعہ بی بی..... آپ اس گھر کی عزت ہو' جہاں میں پل کر بڑا ہوا ہوں اور میں اس کی عزت کا رکھوالہ ہوں۔ اگر کوئی اور بھی اس کی عزت کو تماشہ بنانے کی کوشش کرے تو خدا کی قسم میں اس کو عبرتناک تماشہ بنا دوں گا۔''

لیکن تماشائے عبرت وہ خود بنا جس کے زخم زخم لاش خاردار تاروں کی باڑھ پر جھولتی ملی تھی۔ احساس ذلت اور شکست کے صدمے نے رابعہ کو اپنی نظروں میں رسوا کر دیا تھا۔ اس جیسی تعلیم یافتہ مہذب اور شہری لڑکی کو ایک دیہاتی نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ اس عورت کی انا کے غرور کا آئینہ پاش پاش کر دیا تھا اور معمولی ملازم ہونے کے باوجود مالکوں کو بے توقیر کر دیا تھا۔

آتش غضب نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔ اس دیہاتی سے جو وفاداری اور شرافت اور جاں نثاری کے پرانے اصولوں پر کاربند تھا' یہ خطرہ تو نہیں تھا کہ وہ رابعہ کو بلیک میل کرے یا اس بات کی تشہیر سے رسوائی کا سبب بنے مگر رابعہ کے لیے اس کا وجود ہی باعث ندامت تھا۔ وہ اس کے سامنے نظر اٹھا کے نہیں چل سکتی تھی اور احساس جرم و گناہ میں مبتلا رہتی تھی۔ اس نے اپنے عیار ذہن کی مدد سے عذاب ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے ایک ایسا منصوبہ بنایا جو ایک تیر سے دو شکار کرنے کے مترادف تھا۔ وہ ماہر نفسیات نہیں تھی مگر نفسیات کو سمجھتی تھی۔ اس نے مبہم اشاروں میں چھوٹے میاں پر واضح کیا کہ اس کی محبوبہ دلنواز' پنجابی ہیروئن نے ایک نیا ہیرو منتخب کر لیا ہے۔ اس نے ایسے مواقع بھی پیدا کیے کہ چھوٹے میاں کے شکوک کو تقویت ملی۔ مثلاً ایک بار اس نے لالٹین چھپا کر بجلی کا فیوز اڑا دیا۔ بڑے میاں صاحب' نظامی اور شائلہ کے ساتھ احمد بھی شاپنگ کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ رابعہ نے چوکیدار سے کہا کہ وہ اپنے کوارٹر سے لالٹین لے آئے۔ اس کے

جانے کے بعد رابعہ نے میاں صاحب کی محبوبہ سے کہا کہ ''گیراج میں لالٹین رکھی ہے' اٹھالاؤ۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔'' ان دونوں کے جانے کے بعد رابعہ نے لالٹین جلائی اور میاں صاحب کو دکھایا کہ ہیرو اور ہیروئن کدھر سے آرہے ہیں۔ اس پنجابی فلموں کی ہیروئن نے بعد میں محمود کو بتایا کہ رابعہ کی سازش کو وہ سمجھ نہیں سکے تھے۔ واپسی پر وہ لالٹین رابعہ کے ہاتھ میں دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ چوکیدار نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا تھا مگر میاں صاحب نے اپنی محبوبہ سے سوال کیا تھا کہ وہ کہاں گئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ گیراج سے لالٹین لینے گئی تھی' تو میاں صاحب نے اس کی بات پر اعتبار نہیں کیا تھا۔

پھر رابعہ نے ایک اور چال چلی۔ اس نے چھوٹے میاں صاحب کی محبوبہ کے کپڑوں کا ایک جوڑا' ایک سینڈل' اس کی کنگھی میں اٹکے ہوئے بال اور اس کی استعمال کی مخصوص خوشبو کے چند قطرے چوکیدار کے کوارٹر میں اس کے بستر پر چھڑکے اور خاموشی سے لوٹ آئی۔ اس عورت کو شاید پتہ بھی نہ چلا کہ کپڑوں میں ایک جوڑا کم ہے یا ایک سینڈل موجود نہیں ہے پھر اس نے چھوٹے میاں صاحب کو مطلع کیا کہ ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات کب ہوگی اور چونکہ وہ ہیروئن کی رازدار سہیلی ہے' اس لیے اسے معلوم ہے۔ رات کے وقت اس نے دیکھا کہ وہ فلمی ہیروئن باغ میں ٹہل رہی ہے اور چھوٹے میاں صاحب باتھ روم میں ہیں۔ اس نے باتھ روم کے دروازے پر جا کر کہا۔ ''ملک صاحب جا کے دیکھ لو۔''

پھر وہ باہر آنے سے پہلے عقبی راستے سے نکل گئی اور چوکیدار کے ایک کمرے والے کوارٹر کے پیچھے جا چھپی۔ وہ جانتی تھی کہ میاں صاحب کو باہر آنے میں چند منٹ ضرور لگیں گے اور وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھا چوکیدار کے کوارٹر میں جائے گا۔ حسب توقع پانچ سات منٹ بعد میاں صاحب ایک دھماکے سے چوکیدار کے کوارٹر میں کودا۔

رابعہ نے پچھلی طرف والی کھڑکی کو دھکا دیا اور بھاگی۔ چوکیدار اسی وقت واپس پہنچا تھا اور کپڑے بدل رہا تھا۔ اس نے ابھی بستر پر اپنے کسی جرم کے ثبوت پر غور ہی نہیں کیا تھا' وہ میاں صاحب کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا مگر میاں جی نے اس کی گردن دبوچ لی۔ چوکیدار کی وضاحت بے سود ثابت ہوئی۔ میاں جی نے کھڑکی کے پٹوں کی آواز سن لی تھی اور سمجھ گیا تھا کہ اس کی بے وفا محبوبہ فرار ہوگئی۔ کمرے میں اس کے کپڑے موجود تھے اور اس کی موجودگی کی گواہ خوشبو تھی۔ چھوٹے میاں جی نے خنجر نکال لیا تو چوکیدار بھاگا مگر میاں جی نے اسے باہر ہی جالیا اور پے در پے وار کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ اتنی دیر میں رابعہ وہاں پہنچ چکی تھی اور لان میں ٹہلنے والی ہیروئن بھی اندر آگئی تھی جسے کچھ علم ہی نہ تھا کہ اس کے نام پر کیسا خونی ڈرامہ کھیلا گیا ہے۔ چھوٹے میاں نے واپس آکے اسے پکڑ لیا مگر بڑے میاں صاحب کی موجودگی کے باعث وہ بچ گئی۔ تاہم اس کی بے گناہی کا کسی نے یقین نہیں کیا۔ چھوٹے میاں صاحب قسم کھانے کو تیار تھے کہ وہ چوکیدار کے کوارٹر میں موجود تھی مگر ان کے اندر کودتے ہی وہ جوتے کپڑے چھوڑ کر کھڑکی کے راستے فرار ہوگئی۔

اور گھر میں آتے ہی اس نے لباس تبدیل کرلیا۔ رات کے اندھیرے میں کسی نے اس کو عقبی راستے سے آتے جاتے نہیں دیکھا اور جیسے ہی وہ چوکیدار کے کوارٹر کی کھڑکی سے فرار ہوئی تھی' ایسے ہی اپنے کمرے کی کھڑکی کے راستے اندر پہنچ گئی۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات وہی تھے جو رابعہ نے بیان کیے تھے۔ یعنی دونوں بھائیوں نے حالات کو سنبھال لیا اور جرم کے داغ مٹا دیے۔ رہی سہی کسر بارش نے پوری کر دی تھی اور تفتیش ختم کرادی گئی تھی۔

یہ سب باتیں چھوٹے میاں صاحب اور ان کی محبوبہ نے اپنے اپنے بیانات میں بتائی تھیں۔ چھوٹے اور بڑے میاں صاحبان دونوں بیل میں تھے۔ نادانستگی میں سہی' قتل تو انہوں نے کیا ہی تھا اور چھپایا بھی تھا۔ تاہم رابعہ کے منصوبے کا دوسرا حصہ

ناکام رہا۔ اس کا خیال ہوگا کہ چوکیدار کو قتل کرنے کے بعد چھوٹے میاں صاحب اس عورت کو بھی بے وفائی کی سزا دیں گے اور اگر پھانسی نہیں پائیں گے تو جیل تو بہرحال جائیں گے۔ شائلہ کی دولت پر منڈلانے والے گدھ اڑ جائیں گے اور چوکیدار ایک بیزار عورت کی تذلیل کی وہ سزا پائے گا جس کا وہ مستحق تھا مگر دونوں میاں صاحبان زیادہ دوراندیش ثابت ہوئے اور قتل کا الزام ان پر نہیں آیا۔ تاہم جس بے تکلفی سے رابعہ نے محمود کو بتایا تھا کہ چوکیدار کا قاتل کون ہے' اسی بے تکلفی سے اور رازداری سے اس نے شائلہ کو بھی خبردار کر دیا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے تاکہ وہ مزید بدظن ہو جائے۔ شائلہ نے نظامی سے بات کی تھی مگر نظامی بگڑ گیا تھا کہ وہ اس کے دوستوں کو گھر سے نکالنے کا بہانہ چاہتی ہے اور ایک مکار لڑکی کی باتوں پر یقین کر رہی ہے۔ غالباً نظامی نے رابعہ کی فطرت کو بہتر طور پر سمجھ لیا تھا۔ یہ سب شائلہ نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

رابعہ نے یہ کوشش بھی کی تھی کہ شائلہ کے نفسیاتی خوف سے فائدہ اٹھائے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شائلہ جانوروں سے ڈرتی ہے اور اس کا سبب کیا ہے۔ یہ نفسیات کی اصطلاح میں فوبیا تھا۔ اس نے شائلہ کو دہشت زدہ کر کے دیوانگی کی سرحد تک پہنچا دیا تھا اور اگر وہ زندہ رہتی تو شائلہ کو یقیناً پاگل کر دیتی۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پاگل آدمی کا کیا ہے۔ خوف اور دہشت میں پہاڑ سے کود جائے۔ اسے یہ بھی امید تھی کہ پاگل ہونے سے پہلے شائلہ یقیناً نظامی کو چھوڑ دے گی' جس کے تعلقات پلوشہ جہاں سے بڑھتے جا رہے تھے اور جسے اپنی بیوی کی قطعی پروا نہ تھی۔ اگر یہ دونوں مرحلے طے ہو جائے تو شائلہ کی تمام دولت کا وارث احمد رہ جاتا۔ نظامی اور اس کے حواری جو اس دولت میں حصہ بٹانا چاہتے تھے۔ دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیے جاتے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی مگر جان دینے کے بعد اب احمد بلاشرکت غیرے تمام دولت کا مالک تھا۔

مگر خود سے ویرانے میں دو گز زمین کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ بعد میں اس کے بیڈ کے نیچے سے ایک ایئر گن ملی تھی۔

رابعہ جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کے عیار اور شاطر ذہن کو شکست دینے والی ایک بوڑھی' کمزور' کم عقل اور جاہل عورت تھی جسے رابعہ نے کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا تھا اور اس طرح نظرانداز کیا تھا جیسے اس کا وجود ہی نہیں مگر اس عورت نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔

''بیٹا تو میرے لیے قابل فخر ہے کہ نمک حرام اور بے غیرت یا بے ضمیر نہیں مگر وہ عورت ناگن ہے' وہ تجھے ڈس لے گی' اس سے ہوشیار رہنا۔'' جب دوسری بار بیٹے نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ رابعہ واقعی اس کے خلاف سازش کر رہی ہے۔

''معلوم ہے آج کیا ہوا ماں!'' اس نے کہا تھا۔ ''بجلی چلی گئی تو رابعہ نے مجھ سے کہا کہ کوارٹر سے لالٹین لے آؤ پھر اس نے دوسری عورت سے کہا کہ گیراج میں سے لالٹین اٹھا لاؤ۔ جب اسے معلوم تھا کہ لالٹین گیراج میں ہے تو اس نے مجھے کوارٹر میں کیوں بھیجا اور کمال یہ ہے کہ لالٹین گیراج میں بھی نہیں تھی۔ جب ہم واپس آئے تو وہ لالٹین جلائے کھڑی تھی۔''

''ہم کون؟'' اس کی بوڑھی ماں نے کہا تھا۔

''وہ عورت اور میں اور اس کا ایک چاہنے والا ہے۔ چھوٹے میاں جی! وہ نجانے کیا سمجھ رہا تھا۔'' بیٹے نے کہا تھا۔

''بیٹا۔'' ماں نے چلا کر کہا تھا۔ اس زخم خوردہ ناگن سے بچ' وہ تجھے مار دے گی یا مروا دے گی۔''

چنانچہ جب اس کا بیٹا قتل ہوا تھا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اس قتل کی ذمہ دار کون ہے۔ یہ سب اس نے اپنے بیان میں بتا دیا تھا۔ اب وہ بھی جیل خانے میں تھی مگر اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا اور اس پر خطرناک قسم کے دورے پڑتے تھے۔ محمود کو یقین تھا کہ مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے وہ مر جائے گی۔

☆